Mr. Syed Ahmad Kazmi
Student of History Honors
School,
9 Sir Syed Court,
Muslim Univer
Aligarh

علی گڑھ میگزین

علی گڑھ میگزین

جلد (۳) | تعطیلات نمبر | قیمت سالانہ چار روپیہ - مع محصول ڈاک
نمبر (۵) | | قیمت فی رسالہ مرادی آٹھ آنہ

فہرست مضامین

مرتبہ :- اشفاق حسین بیخود

پرنٹر و پبلشر - محمد مقتدیٰ خاں شروانی مینیجر مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علیگڑھ

یادِ رفتگاں

مسٹر سجاد علی انصاری مرحوم (ساکن ضلع بارہ بنکی) کالج میگزین ہی سے وابستہ نہ تھے بلکہ ہمارے قدیم ایم اے او کالج سے بھی ان کو خاص تعلق تھا، یعنی وہ یہاں کے اولڈبوائے تھے اور یہیں سے بی اے پاس کیا تھا۔ پھر الٰہ آباد ایم ۔سی کالج سے ایل ایل بی پاس کرکے بارہ بنکی میں پریکٹس کرتے تھے۔ ابھی مرحوم کو وکالت کرتے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یکایک موکلِ اجل نے ان کے مقدمۂ حیات کا خاتمہ کردیا۔ اور مرحوم ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے ہم سے جُدا ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حقیقی معنوں میں سجاد صاحب کی موت نے دنیائے ادب میں بہت دیر یا صفِ ماتم بچھادی ہے۔ ایسی ادبی ہستی کا پیدا کرنا معمولی گردشِ ایّام کا کام نہیں مرحوم سجاد کی نظم ونثر دونوں کا اندازۂ تحریر قابلِ قدر ہے۔ اُنھوں نے ایک ڈراما بھی لکھا تھا اور میگزین کے سابق اڈیٹر صاحب سے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ میگزین کے لیئے مخصوص کردینگے مگر افسوس کہ اس ایفائے عہد کے لیے اُن کی عمر نے وفا نہ کی۔ ہمیں جناب اصغر کے ایک خط سے یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ مرحوم نے اپنے تمام کلام اور ڈراما وغیرہ کے متعلق وصیت کی ہے کہ وہ اصغر صاحب کے پاس رہے اور انھیں کے اہتمام سے شائع ہو۔ دعا ہے کہ ایزدِ غفار ان کی آمرزش فرمائے اور پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے اور ان کی یادگار کے شائع ہونے کی کوئی صورت جلد پیدا کرے۔

سید زین العابدین مرحوم (ساکن نواحِ دہلی) ۱۹۲۲ء میں انٹرمیڈیٹ کالج کے ایک طالب علم تھے، اور پچھلی ناکامیِ امتحان کی وجہ سے پیوستہ سال پرائیویٹ طور سے مسلم یونیورسٹی کے امتحان

میٹرک میں شریک ہوئے تھے، مرحوم نہایت ملنسار اور خلیق نوجوان تھے ابھی مرحوم کی عمر نے شاہراہ زندگی کے صرف بیس مرحلے طے کیئے تھے کہ یکایک چند خانگی امور سے تنگ آکر خودکشی کرلی آمرزگار اُن کے گناہِ عظیم کو معاف فرمائے اور دامانِ رحمت میں جگہ دے۔

جنابِ عالیہ بیگم صاحبہ والی بھوپال (چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) دام اقبالہا کے صدماتِ پیہم کا ذکر کرنا کیا خیال کرتے ہوئے جگر پاش پاش ہوتا ہے۔ یوں تو ہر ذی حیات کو ہر وقت اور ہر آن انقلابات کا سامنا رہتا ہے لیکن جناب ممدوحہ کو یکے بعد دیگرے امسال جو صدمات اٹھانے پڑے ہیں وہ نہایت درد انگیز اور حسرت خیز ہیں، ابھی بہت دن نہیں ہوئے کہ آپ کے منجھلے صاحبزادے کرنل حافظ عبیداللہ خاں صاحب کی وفات کے صدمۂ عظیم پر صفِ ماتم بچھ چکی تھی کہ یکایک بڑے صاحبزادے یعنی ولی عہد رعیت جناب صاحبزادہ نصراللہ خاں صاحب کے انتقالِ پر ملال نے دوسری بساطِ غم گستر بچھادی اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ان متواتر صدمات وسانحات کا جس قدر اثر ایک شفیق ماں کے دل و دماغ پر ہوگا اس کا اندازہ دوسرے کو نہیں ہوسکتا۔ جنابِ عالیہ بیگم صاحبہ باوجود ایک فرمانروا اور والیِ ملک ہونے کے علم و اخلاق کی بھی خاص سرمایہ دار ہیں اُن کے صبر و تلقین کے لیئے کسی اخلاقی اور مذہبی وعظ و نصیحت کا سلسلہ چھیڑنا تحصیل لاحاصل ہے جنابہ عالیہ جانتی ہیں اور ہم سے زیادہ جانتی ہیں کہ ؎

درین حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش ست　　زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش ست

فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ ۔

انٹرمیڈیٹ کالج کے بند ہونے سے پہلے اور درجہ نہم کے سالانہ امتحان کے بعد دو سانحۂ عظیم ایک ہفتے کے درمیان میں واقع ہوئے، اوّل چوبیس و پچیس جون کی درمیانی شب میں انٹرمیڈیٹ کالج کے سید عبدالحق نامی ایک حیدرآبادی طالب علم نے ٹائی فائڈ میں مبتلا ہوکر انتقال کیا، مرحوم اپنے کلاس میں نہایت ہونہار اور خاموش طالب علم تھا اور امتحان کے چند پرچے بھی کرچکا تھا کہ

یکایک مرض میں مبتلا ہوا اور داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ اُن کے اقربا کو توفیق صبر عطا فرمائے
اسی دوران میں مشرقی افریقہ کا ایک طالب علم یوسف ابراہیم جیسٹ جو کہ یونیورسٹی کا انٹرمیڈیٹ
کالج میں چند روزہ علالت کے بعد ۹ جولائی کو دنیا سے رخصت ہوگیا۔ مرحوم نہایت قابل طالب علم
اور ہونہار نوجوان تھا۔ اِس کی موت نہ صرف غریب الوطنی کے لحاظ سے بلکہ اس کی سعادت کے
لحاظ سے نہایت پرحسرت ہے۔ لیکن مشیت ایزدی میں کسی کا کچھ چارہ نہیں۔ رضینا بقضاء اللہ تعالےٰ

نہایت افسوس اور دلی رنج کے ساتھ یہ خبر لکھی جاتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے فاضل قابل ہر دلعزیز
اور نامور پروفیسر مولنا عبدالحق صاحب حقی اعظمی بغدادی ازہری نے اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔
مرحوم آج سے ۲ ماہ قبل حج کے ارادے سے روانہ ہوئے تھے، روانگی سے پہلے شہر کے متعارفین
اور مسلم یونیورسٹی کے تمام چھوٹے بڑے واقفین و متعلقین سے بلا استثنا، فرداً فرداً اسی طرح سے
ملے تھے کہ وہ ملاقات مشرقی اخلاق کا زندہ نمونہ تھی۔ اِن کی وفات کی خبر سے ان کی وہ
یادگار ملاقات ملنے والوں کے دلوں پر عجب حسرت ناک اثر ڈالتی ہے۔ مرحوم کی خصوصیات کا
مختصر تذکرہ مسلم یونیورسٹی گزٹ نے کیا ہے اُس کی نقل بیان کی جاتی ہے جس کے پڑھنے سے اُن کے
حالات پر عبور ہو سکے گا۔

"نہایت افسوس ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے قابل، ہر دل عزیز اور نامور پروفیسر مولانا عبدالحق حقی
اعظمی بغدادی ازہری کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم بغداد شریف کی محلہ اعظمیہ کے باشندے اور جامع ازہر
(مصر) کے تعلیم یافتہ تھے۔ علامہ رشید رضا (صاحب المنار) سے بھی تلمذ تھا۔ مرحوم وارد ہندوستان
ہونے کے بعد کچھ روز بمبئی رہے۔ پھر حیدرآباد (دکن) میں کتابوں وغیرہ کی تجارت کرتے رہے اور
سولہ سترہ سال سے علی گڑھ کالج کی ملازمت میں تھے۔ کتابوں کی تجارت کا سلسلہ بھی بدستور
جاری تھا۔ نہایت قابل پروفیسر تھے۔ درس نہایت بلند آواز اور لحن کے ساتھ دیا کرتے تھے۔
اور اگرچہ ان کے پڑوس میں درس دینے والے بعض پروفیسروں کو ضرور گونہ دقت محسوس ہوتی تھی

مگر مولنا کے درس سے ایک شان مشرقیت ضرور پیدا ہو جاتی تھی۔ اور جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "میں اشعریوں کے مکانوں کو اُن کی قرات قرآن سے پہچان جاتا ہوں"۔ اسی طرح مولنا کا درس دوسرے سے متمائز ہو جاتا تھا۔ علاوہ ایک مشاق مدرس کے ان کا ادب اور تاریخ ادب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اور وہ ہمیشہ کتابیں پڑھنے اور تصنیف کرنے اور نظم و نثر مضامین لکھنے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ عربی اخبار و رسائل میں اُن کے نظم و نثر مضامین نکلتے رہتے تھے اور اُن کو عربی کے احیا سے خاص شغف تھا۔ اور نظم و نثر میں اکثر و بیشتر یہی ان کا مبحث ہوتا تھا۔ کالج کے جلسوں میں ان کی افتتاحی تلاوتِ قرآن نہایت پر لطف ہوتی تھی۔ اور بعض اوقات کالج کی جامع مسجد میں جب وہ کوئی خاص خطبہ دیتے تھے تو وہ بہت دلچسپ اور پُر معنی ہوتا تھا۔ اُنھوں نے یکے بعد دیگرے تین عقد کیے جن میں سے دوسرے قبیلے سے اُن کے تین بچے ہیں۔ بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی ہے لڑکا یونیورسٹی اسکول کی کسی چھوٹی جماعت میں تعلیم پاتا ہے اور ایک اور چھوٹی لڑکی ہے جو سفر میں مرحوم کے ساتھ بھی تھی۔ اُن کے اخلاق نہایت عالی اور وسیع تھے اور وہ ہر صحبت میں نہایت دلچسپ انسان ثابت ہوتے تھے۔ مرحوم وسط فروری میں حج کے ارادے سے علی گڑھ سے چلے تھے اور بغداد شریف بیت المقدس مدینہ منوّرہ ہوتے ہوئے ایام حج میں مکہ مکرمہ پہنچ گئے تھے۔ مدینہ طیبہ پہنچنے کی اطلاع کے بعد سے ان کا کوئی خط نہیں آیا تھا اور ان کے تمام احباب مشوش تھے۔ کہ یکایک گزشتہ یکشنبہ کو بمبئی سے تار آیا کہ ۱۹ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ چھوٹی لڑکی اور بی بی ہمراہ تھیں جواب واپس بمبئی پہنچ گئی ہیں ہم مرحوم کے لیے دل سے دعا کرتے ہیں اور اُن کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اُن کے احباب اُن کے چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کا ضرور کوئی معقول انتظام کریں گے۔"

بیخود (علیگ)

(اڈیٹر)

علی گڑھ میگزین

جلد (۳)	تعطیلات نمبر	قیمت سالانہ چار روپیہ مع محصولڈاک
نمبر (۵)		قیمت فی رسالہ مرادی آٹھ آنہ

تصوّف اور تغزّل

مولوی حامد علی صاحب صدیقی کو ترکی ادبیات سے خاص ذوق ہے چنانچہ ماہ دسمبر ۲۳ء کے میگزین میں آپ کی ایک تصنیف "حدیقۂ عثمانیہ" کے چند صفحے ہدیہ ناظرین ہو چکے ہیں جن میں ترکی شعر و سخن کی ترقی پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے اس مرتبہ مولانا کی تازہ تالیف سے ایک خاص مبحث لے کر پرچہ میں نقل کرتے ہیں۔ درصل ایک جرمن ڈاکٹر جارج جیکب مدرس ترکی جامع ارلنجن نے سلطان محمد الثانی عونی کے کلام پر اپنی زبان میں تبصرہ کیا ہے سلسلہ بیان میں تغزل کی بحث بھی چھڑ گئی ہے۔ یہ حصہ نہایت دلچسپ ہے اور تاریخی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے صدیقی صاحب کی تحریریں دو خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ بلحاظ ادب تحریر پر ہمیشہ مشرقی اور مغربی دو رنگتیں بے ساختہ پن کے ساتھ ابھری ہوئی ہوتی ہیں۔ دوسرے مورخانہ

تحقیق و تدقیق (ریسرچ) کے نتائج سے تحریر تر ہوتی ہے۔ چنانچہ ذیل کے چند سطور سے واضح ہوگا جن میں جرمن مولف کے خیالات کی نہ صرف ترجمانی کی گئی ہے بلکہ خود ان کے نتائج فکری بھی شامل ہیں۔

ادیٹر

یہ امر مسلمہ ہے کہ ترکی کا ادب، فارسی کا پروردہ ہے مگر ساتھ ہی یہ ترکی کے فارسی سے کم رتبہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ یونانی اور لاطینی میں بھی یہی ادب و ذوق کی نسبت ہے مگر باایں ہمہ لاطینی ادب اپنی شان الگ رکھتا ہے۔

ترکی نظم میں تغزل کی حقیقت سمجھنے کے لئے اب سے چند صدیاں پیچھے ہٹ کر ذہن کو ادھر حافظ شیرازی اور ادھر گئٹے اور بوڈن سٹڈ کے زمانے میں منتقل کرنا چاہیئے۔ گو ان میں آخرالذکر زیادہ دقیق النظر تھا۔ مگر حافظ کی نسبت دونوں متفق الرائے ہیں کہ ان کا کلام محض حسیات یا جذبات جسیہ پر مبنی ہے مگر دوسری جانب فرکس کو یہ اصرار ہے کہ خواجہ کے کلام کو ایران ہی کے دیدہ وروں کے اصول پر بالکل صوفیانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ اسی طرح عام سخن سنج جماعت اور طبقۂ فقہا کا زاویۂ نظر حافظ کے متعلق ایک دوسرے سے جدا ہے، معلوم نہیں کس کی رائے صحیح ہے ہم تو دونوں کو صحت پر سمجھتے ہیں اس لئے کہ کلام کے دونوں رُخ دونوں کے پیش نظر ہیں۔ ایک رُخ ایک فریق کے اور دوسرا دوسرے کے سامنے ہے شاید حافظ کا بھی یہی مقصود تھا کہ اپنے رشحاتِ قلم سے مختلف مذاق کے آدمیوں کو محظوظ و مسرور اس وقت کردے معمول سے زیادہ زکی الحس اور دقیق النظر طبقہ کے لئے مقتضا یہ تھا کہ طرز ادا میں دنیائے محسوسات کی رنگ آمیزیاں داخل کی جائیں اس لئے خواجہ کا کلام پڑھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ابھی طارم اعلیٰ کی سیر بین آنکھوں سے لگی ہے تو ابھی پردہ بدلا خیال نے اچانک ایک جست لی اور یہ اور خاکدان دنیا کے جلوے پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ کلام دونوں جہان کے علوم و معارف سے ایک ساتھ آگاہ کرتا چلا جاتا ہے۔ شعر اور شاعری دونوں پر سرتاپا تصوف کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ تصوف کے علمائے اور حاملانِ طریقت خالص ملکات علمی و سخنوری کو مردہ و پژمردہ محض بے کار سمجھکر کلام میں کہیں بھی دکھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ جو خیال ہے، جو مفہوم ہے۔ جذبات محض کے سمندر میں اٹا ڈوبا ہوا ہے۔ کلام کیا ہے ایک دلآویز نغمہ ہے جسے ہر شخص محو ہو کر سنتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ اس کی گہری معنوی خوبیاں سمجھ میں آتی ہیں کہ نہیں آتیں۔

مگر یہ خصوصیت کچھ خواجہ حافظ اور دوسرے مشرقی شعرا ہی کے کلام میں نہیں۔ اساتذۂ مغرب میں بوڈن سسٹڈ کا سارا کلام اسی رنگ میں ہے اس کی کوئی نظم یا غزل جب پڑھنے والوں کو دقیق اور پر از جذبات معلوم ہوتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتی۔ تو شارح اور مفسر اسے ذوالوجہتین بتا کر ثابت کر دیتا ہے کہ کلام مغلق یا مہمل نہیں بلکہ سمجھ کا قصور ہے۔ مثلاً یہ شعر (شمس تبریزیؒ)

عشق ست در آسماں پریدن

صد پردہ بہ ہر نفس دریدن

پڑھکر مغرب کا مادہ پرست اس کے معنوں کو ٹٹولے اور بالآخر اہمال و ابہام کا عیب لگائے مگر شرح پڑھکر مطمئن ہو جائے بہرحال بوڈن سسٹڈ کا کلام پڑھتے ہوئے بھی وہی دو رخے جلوے پیش نظر ہو جاتے گویا شاعر کے دماغ سے علوی اور سفلی دونوں عالموں کے چشمے اُبل رہے ہیں اور دونوں یکساں طور پر حور و غلمان اور فردوس و جنان کے اثر میں ہیں۔

کوزک آچ دیدار و جنت حور و غلمان بوندہ در

"(اے تہیو فانی!) آنکھ کھول اور دیکھ کہ جنت اور دیدار الٰہی حور اور غلمان کے جلوے زمین ہی پر موجود ہیں"

خلاصہ یہ کہ صوفیانہ شاعری کی بنیاد معمول سے زیادہ پیچیدہ اسباب پر ہے۔ مشرق و مغرب کی تاریخ ادبیات پر سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح "بک اوڈینیل" (کتاب دانیال) کے مضامین اور طرز ادا سے مذہبی لٹریچر (ادبیات) میں ایک نئی شاخ پھوٹی جس کا دامن "ڈینین پروفیسیز" (ڈینین کی پیشین گوئی) کے زمانے بلکہ اس سے بھی آگے تک پھیلتا چلا گیا ہے اور جس طرح سالومن نے "سانگ بک" (گیتوں کی کتاب) لکھکر مغرب کے مذہبی ادب میں ایک جدید صنف کا اضافہ کیا۔ بعینہٖ اسی طرح "سانگ آف سالومن" کے نام سے ایک جدید کتاب پیش ہوئی۔ جس سے اس زمانے کے علم ادب پر بہت بڑا اثر پڑا۔ "سانگ او سالومن" یا سلیمان کے گیت کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مشرق کے صوفیانہ کلام کی طرح اس میں بھی اصل مطالب و معانی کو فرضی پیرایوں میں اس خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والوں کا دل کھنچتا ہے۔ چنانچہ اوریجنز نے ایک کتاب میں اس طرح کی عشقیہ غزلوں کی شرح بیان کرتے ہوئے صاف بتایا ہے کہ ہر شعر اور ہر مصرع دو دو معنی رکھتا ہے۔ ایک ظاہری اور دوسرے باطنی۔ اسی طرح گریگری (ڈنیا) نے سانگ آف سالومن پر تبصرہ کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں لکھا ہے کہ اس نظم کے استعارے میں افلاطون کا وہ پرانا عقیدہ مضمر ہے کہ قربت موت

فنا اور فنا سے وصال الٰہی حاصل ہوتا ہے۔" ان وجوہ کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ صوفیانہ کلام۔ عامیانہ گیت یا گیت نہیں بلکہ ادبائے زمانے کے دماغ سوز افکار کے نتائج ہیں۔

اس امر کی سراغرسانی کے لئے کہ مسلمانوں میں تغزل کا آغاز کب ہوا لازم آتا ہے کہ مغربی تہذیب کے دور متقابل کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ نصرانی شعراء اور سخنوروں کا مطمح نظر کیا تھا ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور عشق انگیز کلام ہی سانگ اوسالومن تھا۔ عرصہ دراز تک مغرب کی بزم شعر و سخن پر اسی کا قبضہ۔ ولولہ اور جوش پیدا کرنے کے لئے اسی کو پڑھتے اور سنتے تھے اور اسی کے پرپیچ معانی و مفاہیم کو ذہن نشین کرکے خدا سے لَو لگانے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر خاک پاک شام (فلسطین) سے ایک اور سحر نگار شاعر سیڈولی اٹھا جس کے صوفیانہ کلام نے تغزل کے کوچہ میں ایک غیر معمولی نشان امتیاز قائم کیا اور صوفیانہ رنگ کو اور اُبھارا۔ سیڈولی کی سوانح عمری جرمنی کے ایک مستشرق عالم فراتھنگم نے "ہیروتھیوز" (نامور قدما) نامی ایک کتاب میں لکھی ہے جو لیڈن سے ۱۸۸۵ء میں چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ ادھر مشرق میں بودھ مذہب کی تہذیب نے اپنا اثر جما کر عوام کو نروان اور فناء و بقاء سے آشنا کر دیا تھا۔ یہ سب مابعد الطبیعہ اور مابعد الموت کے مسائل ہیں اور انسان کے خیال کو کسی نہ کسی طرح عالم سفلی سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور پیچھے ہٹ کر قدامت کے صفحے اُلٹیں تو تغزل خصوصاً صوفیانہ کلام کا آفتاب۔ بابل کی چار دیواری سے طلوع ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ اہل بابل کا فلسفہ حیات جن عقائد کی تعلیم دیتا ہے ان میں سب سے زبردست عقیدہ جو آج تک زندہ ہے یہ تھا کہ زمین (عالم اجسام) کا جغرافیائی نقشہ بعینہٖ آسمان (عالم ارواح) کے جغرافیائی نقشے کے مطابق ہے۔ چنانچہ اب تک مانا جاتا ہے کہ ایک ایسا ہی یورشلیم عالم علوی میں آباد ہے یا ایک ایسا ہی بیت المعمور آسمان پر ہے۔ گویا اہل بابل کا عقیدہ افلاطون کے تخیل کے پہلو بہ پہلو آج تک چلا آتا ہے۔ عشق روحانی کی کیفیات کو شعراء جسمانی اور مادی پیرایوں میں ادا کرتے ہیں کلام اکثر دو نوں طرح کے جذبات کا تماشہ گاہ ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے میں اس قدر گندھے ہوئے بلکہ پیوست ہوتے ہیں کہ جدا کرنا مشکل ہے۔

شعر و سخن میں عموماً اور تغزل میں خصوصاً۔ کلام کا حسن بیشتر بلاغت پر منحصر ہے۔ مشرقی شاعری کا تو یہ خاص نشان معروف ہے۔ بلاغت میں سب سے زبردست قوت تشبیہ و استعارہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اہل بابل کے عقیدہ نے گویا سب سے پہلے مشبہ بہ پیش کئے۔ شعراء نے دنیاوی مقامات اور کیفیات کو عالم بالا کی کائنات سے تشبیہ دینا انہی سے سیکھا۔ جرمنی کے ایک اور مستشرق علامہ فلوگل نے

مانی بہزاد مصور کے حالات و کمالات میں ایک مبسوط کتاب لکھی ہے جو اسی نام "مانی" سے موسوم ہے سلسلہ بیان میں فلوجل نے اس دور کے نصرانی شعرا اور اشراف ملۃ کے عقائد بھی بتائے ہیں۔ اُس وقت عام عقیدہ یہ تھا کہ دنیا کا "رب اعلیٰ" بہ شکل محبوب و معشوق ہے اور موجود فی الخارج ہے (مانی مولفہ فلوجل صفحہ ۳۸۴ - ۰۰) چنانچہ یہ عقیدہ اب تک مردہ نہیں ہوا کہ اللہ جمیل و یحب الجمال۔ ایک ترکی شاعر تمناحی نے کیا خوب کہا ہے۔

اے صنم سن مظہر اللہ سک

(اے صنم تو خدا کا مظہر ہے)

خواجہ حافظ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت صوفی و زاہد اور شیخ و واعظ سے ایک طرح کی چشمک ہے جو تقریباً ہر غزل میں ملتی ہے۔ ریاکار، مکار، زہدفروش، زہدآلود کر کے لکھتا ہے فارسی کے اکثر غزال ان سے بیزار ہیں۔

اے زاہد زہدآلود بشنو تو حدیث من

مقصود خدا عشق ست باقی ہمہ افسانہ

ایرانیوں کے عقیدہ میں تصوف گویا اسلام کے خلاف ایک انقلاب انگیز سازش ہے جو انسان کو رفتہ رفتہ بابی بنا دیتی ہے۔ چنانچہ آج کل ایران میں بیشتر افراد کا یہی عقیدہ ہے۔ ترکی شعرا اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:۔

ہر قیم اوقور فارسی۔ گیدر دینک یاریسی (رتزک ضیا پاشا)

(ترجمہ - جس نے فارسی حاصل کی وہ آدھا لامذہب ہوگیا)

اس میں شک نہیں کہ آج اکثر ترک ایرانی خیالات سے متاثر ہیں مگر بدمتی کے اثر سے پاک و صاف ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ کا ترکی شاعر فارسی کے اساتذہ کا ویسے ہر طرح بجا مقلد ہے مگر یہ مجال نہیں رکھتا کہ اشعار میں بعض شعراء ایران کی طرح بیباک ہو کر قرآن پاک کے بعض پیچیدہ اور مختلف فیہ مسائل کو محض حسن کلام اور حسن قبول کے لئے تماشہ بنالیں۔ ترکی سخنوران باتوں میں اساتذہ فارسی کی تقلید نہیں کرتے اور اگر بعض ترکی قدما نے شعراء ایران کی متبعیت میں چند قدم اُٹھائے تو اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان میں شعر و سخن کی قابلیت تو تھی مگر سلیقہ نہ رکھتے تھے۔ یعنی وہ مادّہ رکھتے تھے جس کی مدد سے انھیں اپنی مذہبی اور ملی روایات سابقہ پر پورا عبور تھا۔ مگر اُس کا استعمال بالخیر نہ جانتے تھے۔

متقدمین مشرق کے کلام میں ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہی کہ حسن ترکیب و بندش کو معنوی خوبیوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ مگر آج کل کے ترکی شعرا اس کے پابند بھی نہیں رہے۔ بلکہ شوکت لفظی اور عبارت آرائی کی پست سطح سے رفتہ رفتہ بلند ہوکر اس رستہ پر پہونچ گئے ہیں کہ ترکیب و بندش کے حسن ظاہری پر کسی کی نظر ہی نہیں رہی فیضی اور باقی کی زبان اور کلام کا حسن خواجہ حافظ او شامی سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہی۔

سن سن ادل پندم بود ور۔ تما جو نلدہ جار ایکی
(تو۔ تو ہی ہو مگر میری نصیحت یہی ہی۔ کہ دل سے دو دوست کبھی نہ بنانا

بر آلو جاز۔ ایکی اولمیز۔ اولماسین زنہار ایکی
(دوست ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہی۔ دو نہیں ہوتے۔ خبردار کبھی ایک سے دو نہوں)

رباعیات صفی

۱

لو سوئے چراغ صبحگاہی نہ لگا
دل جز طرف یاد الٰہی نہ لگا
پیری کو نہ دے خضاب رنگ شباب
اے شیخ سفیدی میں سیاہی نہ لگا

۲

یہ آئینہ خانہ بزم امکانی کا
دیتا ہی پتا جلوۂ یزدانی کا
دریائے بقا رواں ہی بین العدمین
پل اس پہ بندھا ہی ہستی فانی کا

۳

رخ تو نے مری طرف سے پھیرا ایسا
چھایا ہی کچھ آنکھوں میں اندھیرا ایسا
وحدت کا اک آئینہ ہی کثرت لیکن
خود عکس ترا نہیں ہی تیرا ایسا

حضرت صفی لکھنوی

لمعات صدق

جناب صدق نے تغزل کی زمین میں جس قدر ندرت خیال، شستگی زبان، صفائی بندش اور جدت مضامین سے کام لیا ہی اس کی مثال اس دور میں ملنا محال ہی۔ آپ جس محنت اور جگر کاوی سے بہترین خیال کو اعلیٰ ترین الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں اسے دیکھکر کہنا پڑتا ہی کہ آپ کے اشعار جواہر پارے نہیں بلکہ جگر پارے ہیں جو انمول ہیں اور جن کی قدر دوم درجہ کی طبیعت نہیں کر سکتی اس عمر میں آپ کے کلام میں جو استادانہ جھلک اور پختگی پائی جاتی ہی اس سے صاف ظاہر ہی کہ " ایں سعادت بزور بازو نیست الخ"

آپ سے التجائے غزل کی گئی تھی اور آپ نے بے نیازی سے صرف چند متفرق اشعار عنایت فرمائے ہیں انھیں کو تبرکاً بطور " مشتے نمونہ از خروارے " پیش کیا جاتا ہی۔ آمید ہی کہ دوسری اشاعت آپ کی ایک مکمل غـــزل سے مزین ہو کر نکلے گی۔ (اڈیٹر)

وہ تو وہ پروا ہی کس نے کی دلِ ناشاد کی — جس سے چاہی داد اُس نے اک نئی بیداد کی
کتنے جھگڑوں میں ہو جاں اک بلبلِ ناشاد کی — جورِ گلچیں کا ستم گل کے جفا صیاد کی

وہ عمر ہی غرور کا دل میں گزر نہیں — پڑتی ابھی کسی سے کسی کی نظر نہیں
وہ کہہ چکے فسانۂ دل میں اثر نہیں — اب ان سے کچھ کہے یہ کسی کا جگر نہیں
تڑپائیے کسی کو سنا کر یہ کس لئے — مانا کہ آپ قائلِ دردِ جگر نہیں

دن گن رہا گھڑیاں پیمانِ دلربا کی — وعدہ کیا ہی کس نے دھن ہی کسے وفا کی
ان کی نظر سے گر کر نقشہ وہی ہی دل کا — صورت جو رہ گزر میں ہوتی ہی نقشِ پا کی

اللہ رے اس کے حسن کی شوخی نقاب میں — بجلی سی ایک کوند رہی ہی سحاب میں
آتی ہی کس میں بوئے محبت تمھیں کہو — میرے سوال میں کہ تمھارے جواب میں

مرزا تصدق حسین صدق جائسی

بہاریہ نظم

خزانہ تھا مسرت کا ملالِ ابرِ باراں میں
اُگے اشکوں سے لیکن پھول ہنستے ہیں گلستاں میں

ہرے ہو ہو کے کانٹوں نے نکالا اپنی کاوش سے
وہ تھوڑا فرق جو باقی تھا عاشق کی رگِ جاں میں

نویدِ آمدِ فصلِ بہاری سُن کے موسم سے
زمیں کی قوتیں ہیں صرف استقبالِ مہماں میں

رہیں تیار دل والے ابھی سے سیرِ گلشن پر
وہ سب ہوگا جو ہوتا ہے رخِ رنگینِ جاناں میں

پہنچ جائے گا رفتہ رفتہ بزمِ حسن و خوبی تک
چراغِ داغ جو اب تک ہے میرے دل کے ساماں میں

درازی عمرِ سنبل میں! کہ اُمیدیں تو نکلیں گی
وہ سب دیکھیں گے جو دیکھا کئے خوابِ پریشاں میں

گراں سر تھی زمینِ باغِ ہستی دورہ دے سے
فلک نے جب کبھی خورشید کو تولا ہے میزاں میں

ہوائے دامنِ آردی بہشت اب روح پھونکے گی
وہ گوہر آفریں جوشش آچلا ہے طبعِ نیساں میں

غریقِ ابر یعنی غنچہ و گل کے نظارے سے
وہ دل اُبھرے ہیں جو ڈوبا کئے چاہِ زنخداں میں

یہ قدرت کے کرشمے ہیں کہ سوسن ڈھونڈھ لاتی ہے
زبانیں کھو گئی تھیں جس قدر شہرِ خموشاں میں

میں ثاقب ہوں جو حسن و عشق کا عالم دکھاتا ہوں
فقط اک بابِ سعدی کو ملا سارے گلستاں میں

اُردو شاعری

"ہمایوں" کے اپریل نمبر میں اس عنوان سے ہمارے ایک ادبی دوست جناب عظمت اللہ خاں بی اے کا ایک فاضلانہ مضمون شائع ہوا ہے جس کا موضوع سخن اُردو شاعری کی اصلاح و ترمیم ہے۔ میں فاضل مضمون نگار سے ذاتی طور پر بالکل ناواقف ہوں لیکن مضمون کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ لائق دوست کے دل و دماغ پر مغربی خیالات کا اثر بہت زیادہ مستولی ہے مضمون میں بظاہر اگرچہ جدت اور اجتہاد سے کام لیا گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ اجتہاد تمام تر یورپ کی کورانہ تقلید پر مبنی ہے جو ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کا خاص کارنامۂ فخر و امتیاز ہے، کسی غیر قوم کی خوبیوں سے استفادہ کرنا میرے نزدیک کوئی جرم نہیں، لیکن اس جوش اتباع میں اپنی ذاتی اور قومی خصوصیات کو نظر انداز کر دینا سخت غلطی ہے۔

چند سال سے اردو شاعری کے "ادبی استبداد" یعنی "قافیہ" اور "ردیف" کی قدیم پابندی کے خلاف ایک خاص تحریک کا آغاز کیا گیا ہے، جس کے علم بردار ہمارے قدیم کرم فرما جناب مولانا تاجور نائب مدیر ہمایوں ہیں۔ یہ مضمون بھی اسی غلغلہ کی صدائے بازگشت ہے جس میں اُردو شاعری کے متعلق متعدد غیر معمولی اصلاحی تجویزیں پیش کی گئی ہیں جن کے بغیر اُردو شاعری حقیقی ترقی کی شاہراہ سے روشناس نہیں ہو سکتی۔

سب سے پہلے ہمارے لائق دوست نے ادبیت کا ایک معیار قائم کیا ہے جس کی تشریح ان عجیب و غریب الفاظ میں کی گئی ہے۔

"لکھائی اور چھپائی کے دور دوروں میں ہر بات نقش بقا کی صورت اختیار کر سکتی ہے اور کتابیں ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑتی ہیں لیکن ادب کی حشراتی آبادی میں سے شخصی اور سماجی تجربات ان ہی چیزوں کو گمنامی اور موت سے بچاتے ہیں جو اصلی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں اور رجان میں ڈوبے چرچیے ہوتے ہیں، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ پیٹ کے ہلکا پن کا پکا انھیں باتوں کو دہرواتا اور محفوظ رکھواتا ہے جن میں روزمرہ کی زندگی کے کسی پہلو کا ہو بہو خاکہ کھینچا ہیں سے سماجی حیات اور انسانی فطرت کا کوئی رخ روشن ہوتا ہو جن سے زندگی کو الجھاؤ میں داؤ پیچ سیکھنے یا جوڑ توڑ کا مزہ ملتا ہو اور جن کو ایسے حسن بسے الفاظ شکر لپٹے مصروں اور تخیل کو بھڑکاتے اسلوب میں ادا کیا گیا ہو کہ انسان کا دل اور اس کی زبان دونوں ہمیشہ چٹخارے لیتے رہیں

حافظہ اس قدر لذت اندوز ہو کہ اپنے آپ بلا تکلف ایسی چیزیں اس پر نقش ہو جائیں اس رنگ ڈھنگ کی باتیں ادب کا وہ حصہ ہوتی ہیں جو انمٹ ادب ہے جسے انگریزی میں کلاسک کہتے ہیں"
ہر اعلیٰ ترقی یافتہ زبان کے اس قسم کے غیر فانی ادب میں یوں تو عموماً ہر خیال لطیف اور بلند ہوتا ہے لیکن اس کا بھی ایک چنا ہوا حصہ اس کا ایک عطر ہوتا ہے یہ اعلیٰ ادب کا نفیس تر عطر مادی یا انسانی فطرت کے ان خصائص اور سچائیوں کا مرقع ہوتا ہے جو ہر جگہ اور ہر زمانہ میں صداقت کی تصویر ہوتی ہے"۔

اس معیار پر اردو شاعری کو پرکھنے کے بعد عظمت صاحب جس نتیجہ پر پہونچے ہیں وہ یہ ہے:

" اردو شاعری کے سرمایہ کو دیکھ کر ایک اچنبھا سا ہوتا ہے اس زبان کو پیدا ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن سے بیش نہیں ہوئے اور اس کا شاعری کا خزانہ بعض صدیوں عمر والی زبانوں سے مقدار میں ٹکرا سکتا ہے اس کے شعرا کی فہرست جلدوں میں سما سکتی ہے اور اس کے شعرا کے دواوین اور کلیات کی تعداد اور ضخامت قابل احترام ہے لیکن جب اس ذخیرہ کو انمٹ ادب کی کسوٹی پر کسا جائے تو اس طومار میں سے جو کچھ حصہ بقا کے قابل برآمد ہوگا وہ اردو شعر کے کل خزانہ سے رطب ویابس مردہ کوڑے کرکٹ سمیت حصے سے اگر کم نہیں تو بہت کچھ زیادہ بھی نہیں نکلے گا۔

اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا، کہ حقیقی شاعری وہ ہے جو حیات انسانی کے اسرار و معارف کا آئینہ ہو، جس میں ہر قسم کے لطیف اور بلند جذبات اور احساسات کی مصوری کی گئی ہو لیکن اس فرض سے ہر شاعر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا صرف چند مخصوص شعرا ہوتے ہیں جن کی نکتہ سنجیاں ہمیشہ ادب کے لئے سرمایہ ناز ہوتی ہیں ان ہی کے کلام کے بنا پر شاعری کے متعلق رائے قائم کی جا سکتی ہے ایران میں ہزاروں لاکھوں شعرا پیدا ہوئے لیکن بقائے دوام کی سعادت صرف چند حقیقت شناس شعرا کو نصیب ہوئی اور ان ہی کا کلام آج ایرانی شاعری کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔ فردوسی، نظامی، سعدی، انوری، حافظ، نظیری، عرفی، مولانا روم وغیرہ بھی وہ چند نفوس کامل ہیں، جن کی جدت طرازیوں سے ایرانی شاعری کی بلند پایگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، انگلستان نے سینکڑوں شاعر پیدا کئے، لیکن کیا ہر شاعر کا کلام شکسپیر، ملٹن، ورڈسورتھ، بائرن، شیلے، کیٹس، ٹنی سن کی ہمسری کا دعوی کر سکتا ہے؟ کیا بجز ان افراد کے اور بھی کسی کا کلام ہمارے لائق دوست کے "انمٹ ادب" کی کسوٹی پر پورا اتر سکتا ہے؟ فاضل نقاد کو یہ امر تسلیم ہے کہ اس قسم کا لطیف ادب جو فطرت انسانی کے رموز و اسرار کا خزانہ ہو، مقدار میں نہایت کم ہوتا ہے لیکن اردو شاعری پر تبصرہ فرماتے ہوئے یہ بھول

نظرانداز ہوجاتا ہے، چنانچہ ہمارے دوست کی حقیقت رس نگاہ کو اردو شاعری کے وسیع ذخیرہ ادب میں بجز "رطب ویابس" کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن اس بدگمانی اور چشم پوشی کا بجز اس کے اور کیا جواب ہو سکتا ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اس میں شبہ نہیں کہ اردو شاعری کا دائرہ خیال کسی قدر محدود ضرور ہے لیکن کیا اس کا دامن جیسا کہ لائق مضمون نگار کا خیال ہے رموز فطرت کے جواہر پاروں سے بالکل خالی ہے؟ کیا اردو شعرا بجز بے کیف لفظی اور مبالغہ آفرینی کے جذبات عالیہ کی مصوری سے بالکل قاصر ہیں؟ کیا ان کی نگاہیں مناظر قدرت کی رنگینیوں سے قطعاً ناآشنا ہیں؟ میر انیس نے جس لطیف اور بلیغ پیرائے میں مختلف اور گوناگوں جذبات انسانی کی تصویر کھینچی ہے کیا شیکسپیئر کے ڈرامے اس سے نازک اور شاندار مثالیں پیش کر سکتے ہیں؟ غالب نے تغزل کے رنگ میں جن فلسفیانہ حقائق کو بے نقاب کیا ہے کیا وہ ارباب نظر کے لئے سرمایہ حیات نہیں ہیں؟ کیا خواجہ میر درد کا تصوف محض عامیانہ خیالات کا مجموعہ ہے؟ کیا دبیر و انیس کے مرثیوں میں تسلسل خیال اور مناظر قدرت کی تصویریں نظر نہیں آتیں؟ کیا میر حسن کی مثنوی بدر منیر میں واقعہ نگاری کی اعلیٰ ترین مثالیں موجود نہیں ہیں؟ کیا بائرن اور کیٹس کے مقابلہ میں میر اور مومن کے پرگداز عاشقانہ جذبات ایک نگاہ غلط انداز کے بھی مستحق نہیں ہیں؟ کیا ان بزرگوں کا منتخب کلام ذوق سلیم کے لئے ابدی لذت کا سرچشمہ نہیں ہے؟ کیا حقیقت سنجی اور واقعہ نگاری صرف انگریزی شعرا کے لئے مخصوص ہے؟ کیا مشرقی دل و دماغ اس جوہر سے بالکل معرا ہے؟ میر، غالب، مومن، انیس، میر حسن وغیرہ کے کلام کا انتخاب کیا جائے، تو کیا اس میں سے کوئی ایسا حصہ نہیں نکل سکتا، جو بقائے دوام کا مستحق ہو؟ لیکن ہمارے دوست کو یہ مطلع باوجود اتنے روشن ستاروں کے بالکل تاریک نظر آتا ہے، اس بدگمانی اور کم نظری کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اردو کے مستند اور منتخب شعرا کے کلام سے بے خبر ہیں یا اُس کی خصوصیات تک نظر پہنچ نہ سکی میرا قیاس ہے کہ عظمت صاحب نے امیر مینائی، رند، وزیر وغیرہ ایسے نام نہاد شعرا کے کلام کو دیکھ کر یہ افسوس ناک رائے قائم کی ہے حالانکہ ان بزرگوں کو شاعری سے کیا نسبت؟ بے شبہ ان حضرات کے ضخیم دواوین و کلیات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اس ضخامت کے چار شعر بھی نہیں نکل سکتے جن پر ذوق صحیح وجد کر سکے لیکن میرے نزدیک وحشت انگیز پرگوئی کوئی شاعری نہیں، اور نہ ایسے شعرا کا کلام معیار سخن ہو سکتا ہے اس لئے ہمارے لائق دوست کو اردو شاعری کی عظمت کا اندازہ کرنا ہے تو اُن کو غالب، انیس، مومن، وغیرہ ایسے جدت طراز شعرا کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جن کا کلام سرتاپا ادبی لطافت کا مرقع ہے لیکن افسوس ہے کہ ایک شخص جو

انگریزوں کے سطحی خیالات کو اعلیٰ ترین معیار ادب سمجھتا ہے وہ غالب ایسے دقیقہ سنج اور لطافت آفریں دماغ کی کیا داد دے سکتا ہے!

لائق نقاد نے اردو شاعری کی اس حیرت انگیز بے مائگی کے جو اسباب بتائے ہیں وہ یہ ہیں

"سماجی آب و ہوا اور گرد و پیش ہی وہ سانچہ ہے جہاں انسان کی ہر چیز ڈھلتی ہے اور اس زمانہ کے مطالعہ میں سب سے پہلے مسلمانوں کے عہد کی اس خصوصیت کو پیش نظر کر لینا ناگزیر ہے کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں عام تعلیم کا کوئی نظام نہ تھا دولت نے اس بات کو ابھی محسوس نہیں کیا تھا کہ حکمرانی کی بقا کا انحصار آخر میں چل کر تمام تر دار و مدار لوگوں کے کیرکٹر پر ہوتا ہے۔ دانش مند حکومت ہمیشہ اپنی زیر نگیں آبادی کے کیرکٹر کو ڈھالنے کے لئے ایسا سانچہ تیار کرتی ہے کہ حکومت کی روز افزوں ضرورتوں کے مطابق لوگ پیدا ہوں اس قسم کے نظام تعلیم کا احساس بدقسمتی سے اس وقت نہ تھا یہ ضرور ہے تعلیم سرے سے ناپید نہ تھی، اور نہ یہ بات تھی کہ ارباب حل و عقد علمی ترقی کی ضرورت کا احساس نہ رکھتے تھے لیکن عملی طور پر یہ کہنا درست ہے کہ اس وقت عام نظام معارف تعلیم کا ایک جال پوری پوری عضوبندی کے ساتھ حکومت کی جانب سے وجود میں نہیں آیا تھا خواہ سوسائٹی کتنی ہی لاپروا اور پست حالت میں ہو، ایک انجان احساس نئی پود کو تعلیم دینے کا اپنے آپ پیدا ہو ہی جاتا ہے اس قسم کی تعلیم کسی واضح اصول پر اور گرد و پیش کی پبلک ضرورتوں اور زندگی کی موجوں سے دست و گریباں نہیں ہوتی اور نہ اس قسم کی تعلیم ملک کے ہر گوشہ میں مسلسل اور یکساں ہوتی ہے ہر گھر اپنی قسم کا ایک مکتب خانہ ہوتا ہے اور وہاں بغیر کسی سخت ضبط اور بدون کسی وسیع خیالی کے درس و تدریس ہوتی ہے۔ پڑھانے والے عموماً بے کیرکٹر کٹ ملا سے پیدا ہو جاتے ہیں جن کو شاگردوں کے دماغ سے زیادہ اپنے پیٹ بھر لینے کا خیال ہوتا ہے۔"

"نصاب تعلیم ان تمام مضامین سے عاری تھا جو اپنے گرد و پیش سے باخبر کرتے ہیں، مثل جغرافیہ کا تصور عام طور پر تھا ہی نہیں، تاریخ نصاب میں شامل نہ تھی .... اس قسم کی غیر عضوبند تعلیم کا پھل سوائے اس کے اور کیا ہوتا کہ جو پڑھے لکھے بھی ہوتے تھے وہ عملی طور پر نکمے اپنے ماحول سے بیشتر بے خبر، وتاع جولانی اور جدت سے خالی اور ان کے نفوس کیرکٹر کی ان خصوصیتوں سے مبرا ہوتے تھے، جو مسائل زندگی پر سخت غور و فکر کرنے اور دریائے عمل میں سرد و گرم واقعات کے تھپیڑے کھانے سے پختگی اور رسوخ ہوتی ہیں۔"

اس تاریخ دانی اور انصاف پرستی کی داد کن الفاظ میں دی جائے! ایک شخص جس کی تاریخی معلومات کا سرچشمہ صرف متعصب مغربی مورخین کے بازاری افسانے ہوں، اس کے قلم سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے مسلمانوں کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے روشن اور شاندار کارناموں پر فخر کرنا نہیں جانتے، اکسفورڈ کا تعلیم یافتہ نوجوان ملٹن اور شکسپیر کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کا دماغ فخر ومسرت سے وجد کرنے لگتا ہے، لیکن ہمارے نوجوانوں کی بزم ادب میں غالب اور انیس کا نام تک نہیں آتا بلکہ افسوس کیا جاتا ہے کہ اردو شاعری نے اب تک ورڈس ورتھ اور بائرن ایسے شعرا نہیں پیدا کئے۔ کیا انھیں تقلید پرست نوجوانوں سے اردو ادب کو آئندہ توسیع و ترقی کی توقع رکھنی چاہیے؟

اردو شعراء کے ابتذال اور پست خیالی کی جو خاص وجہ عظمت صاحب نے اوپر بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا عہد حکومت عام نظام تعلیم سے خالی تھا، تاریخ و جغرافیہ نصاب میں داخل نہ تھے، محض متفرق طور پر مکاتب قائم تھے اس لئے لوگ عام طور پر "نکمے" پیدا ہوتے تھے جن کا دماغ جدت سے خالی ہوتا تھا بے شبہ مسلمانوں کے دور حکومت میں کلکتہ اور پنجاب کی سی نام نہاد یونیورسٹیاں نہ تھیں، طلبہ کے لئے میز اور کرسی کا کوئی انتظام نہ تھا، ان کی قیام گاہیں برقی روشنی سے معمور نہ تھیں معلمین عموماً بوریانشین تھے، لیکن کیا یہ چیزیں حصول تعلیم کے لئے سدراہ ہیں؟ کیا علم محض بلند اور شاندار عمارتوں تک محدود ہے کیا بغیر موجودہ نظام تعلیم کے اخلاق کی اصلاح و تربیت نہیں ہو سکتی؟ کیا قدیم علما حیات انسانی کے حقائق سے بالکل بے خبر ہوتے تھے؟ کیا اسلامی مکاتب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کی صلاحیت نہ تھی؟ کیا ان کا دماغ "جولانی اور جدت" سے صرف اس لئے خالی تھا کہ وہ ٹاٹ اور چٹائی پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے تھے؟ کیا قدیم معلمین شاگردوں کے دماغ کی صحیح طور پر تربیت صرف اس لئے نہیں کر سکتے تھے کہ بجائے فلک بوس محلوں کے وہ جھونپڑوں میں بیٹھ کر درس دیتے تھے؟ سرسید، حالی، شبلی، آزاد، نذیر احمد یہ لوگ ان ہی مکتبوں کے فیض یافتہ تھے جن کے نظام تعلیم پر آج ہمارے لائق دوست اظہار ملامت کر رہے ہیں لیکن کیا ان بزرگوں کی حقیقت سنجی، جدت طرازی اور وسیع النظری سے عظمت صاحب انکار کر سکتے ہیں؟ کیا جدید نظام تعلیم آج تک ایک شبلی، ایک حالی بھی دنیا کے سامنے پیش کر سکا؟ کیا مسلمانوں کے عہد اقبال میں حکومت کی طرف سے مکاتب و مدارس کے لئے بیش قرار وظائف مقرر نہ تھے؟ علوم و فنون کی سرپرستی اور قدردانی میں سلاطین مغلیہ نے جو حوصلہ مندانہ فیاضیاں کیں، کیا موجودہ حکومت اس کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟ لیکن جو نگاہیں یورپ کے طلسم مادی کی فریب خوردہ ہوں، ان کو حقیقت کی تجلی کیوں کر نظر آسکتی ہے۔

فاضل دوست کا اعتراض ہو کہ چونکہ حکومت کی طرف سے کوئی باقاعدہ نظام تعلیم قائم نہ تھا اس لئے قدیم تعلیم ناقص ہوتی تھی اور بجائے اس کے کہ درس و تدریس کا ایک مستقل مرکز ہو" ہر گھر اپنی قسم کا ایک مکتب ہوتا تھا" لیکن میرا خیال ہے کہ ہندوستان کا موجودہ نصاب تعلیم حقیقی علمی اور دماغی ترقی کے لئے سخت مضر ہے، ہر شخص کو تمام علوم و فنون سے یکساں دلچسپی نہیں ہوسکتی، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، سائنس، ادب وغیرہ ان تمام فنون کا ایک دماغ ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا، لیکن موجودہ طلبہ کو جبراً مختلف قسم کے علوم و فنون پڑھنے پڑتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ من حیث الفن کسی فن میں کمال حاصل نہیں کر سکتے اور نہ ان کے مطمع نظر میں کوئی وسعت اور بلندی پیدا ہوسکتی ہے، ہمارے دوست کی رائے ہے کہ ملک کے ہر گوشہ میں یکساں تعلیم رائج ہونی چاہئے یعنی ایک مستقل نصاب تعلیم ہو جس میں مختلف فنون داخل ہوں، اور ان کی تعلیم تمام طلبہ کے لئے ضروری قرار دیدی جائے، خواہ ان کے فطری میلان طبع کے لئے کسی قدر گراں اور ناگوار ثابت ہو، اس قسم کی تعلیم حقیقت میں فطرت کے خلاف جنگ ہے جس کا نتیجہ بجز دماغی بربادی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا ایک شخص جو نظرتاً صنعت و حرفت سے مناسبت رکھتا ہو، اگر اس کو فن ادب کی تعلیم دی جائے تو کیا وہ اس کی ارتقائے دماغی میں معین ہوسکتا ہے؟ لیکن قدیم زمانہ میں یہ حالت نہ تھی، طلبہ کے ساتھ اس قسم کا دماغی جبر و ظلم نہیں کیا جاتا تھا ان کا دل و دماغ حکومت کے قید و بند سے آزاد تھا ہر مکتب ایک مستقل فن کی درسگاہ تھا اس لئے ہر شخص اپنے فطری مذاق کے مطابق تعلیم حاصل کرتا تھا اور یگانہ فن بن کر نکلتا تھا اس طرز تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ ملک اور قوم میں ہر فن میں صاحب کمال پیدا ہوتے تھے لیکن آج باوجود اس قدر شاندار نظام تعلیم کے ایک صاحب فن بھی ہندوستان میں تلاش کرنا چاہیں تو مشکل سے مل سکتا ہے البتہ عظمت صاحب ایسے تقلید پرست مجددین سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں مل سکتے ہیں، جن کے دماغوں کی اگر تحلیل کیمیاوی کی جاوے، تو بجز رطب و یابس کے کوئی قابل قدر عنصر نظر نہ آئے گا۔

مسلمانوں کے سیاسی اور تمدنی تنزل کا تذکرہ فرماتے ہوئے عظمت صاحب رقم طراز ہیں،

> " اردو بولنے والی آبادی کی رہی سہی سماجی عضو بندی کے انجر پنجر ڈھیلے ہوچکے تھے معاشیاتی جراثیم دیمک کی طرح لگ چکے تھے اور ایسے آب و ہوا میں اس کی اردو ادب کی کل پونجی شاعری روگ بھری، اصلیت سے ہٹی، جدت سے خالی، فطری جکڑبندیوں اور فارسی کے بھونڈے نمونوں اور سانچوں میں ڈھلنے لگی"۔

عظمت صاحب کا یہ خیال بے شبہ صحیح ہے کہ جب کسی سیاسی تنزل کا آغاز ہوتا تو اس کے

جذبات میں کسی قدر پستی ضرور آجاتی ہے اردو نے جب آنکھیں کھولیں، تو سلطانوں کے سیاسی اقتدار و عظمت کی بربادی کا دور شروع ہو چکا تھا تاہم اس پراگندہ ماحول میں پرورش پاکر غریب اردو شعرا نے شاعری میں جو کچھ جدتیں پیدا کیں وہ نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہیں اُردو زبان کو وجود میں آئے ہوئے ابھی بہت زیادہ زمانہ نہیں گذرا تاہم اس قلیل مدت میں اس نے غالب، انیس ایسے عالی دماغ سخن گو پیدا کئے جن کی نظر سے اردو کی موجودہ بزم ادب بھی خالی ہے زمانہ روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ انداز خیال طرز معاشرت، طریق زندگی، غرض ہر چیز میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے یہ انقلاب و تغیر قدرت کا ازلی قانون ہے جس کے اثر سے کائنات کا کوئی ذرہ محفوظ نہیں رہ سکتا اس لئے موجودہ معیار مذاق کی رو سے گذشتہ اردو شاعری میں کوئی نقص پایا بھی ہو تو اس کی بنا پر اردو شعرا قابل ملامت قرار نہیں دیئے جا سکتے اس نقص کی اصلاح موجودہ مذاق کرنا چاہے تو کر سکتا ہے لیکن اردو شاعری کو حقیقی ترقی کی کیا امید ہو سکتی ہے، جب عظمت صاحب ایسے برخود غلط حضرات اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں؟

فاضل نقاد کو نہ معلوم ایشیائی لٹریچر سے اس قدر بدگمانی کیوں ہے؟ فارسی کے متعلق بھی غالباً اُن کی وہی رائے معلوم ہوتی ہے جو اُردو شاعری کے متعلق ہے۔ چنانچہ لائق نقاد کے نزدیک اُردو شاعری کے ابتذال کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ وہ "فارسی کے بھونڈے نمونوں اور سانچوں میں ڈھلنے لگی" جیسا کہ اوپر لکھا ہے عظمت صاحب کی لطافت طبع کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ اُن کو فارسی کی شیرینی اور نزاکت میں بھونڈا پن محسوس ہوتا ہے، اولاً فارسی کی تقلید اُردو کے لئے لازمی تھی، اسلامی حکومت کی زبان فارسی تھی درباروں میں فارسی شعرا کا ہجوم رہتا تھا گھر گھر فارسی کی تعلیم کا چرچا تھا، ایرانی اساتذۂ فن کا کلام ہر شخص کے پیش نظر تھا۔ چنانچہ اردو نے جب آنکھیں کھولیں تو ملک کا ہر گوشہ ایرانی نغموں سے گونج رہا تھا، غرض اُردو شعرا کے سامنے بجز فارسی کے اور کوئی نمونہ نہ تھا جس کی وہ تقلید کرتے، ایسی حالت میں اردو شعرا فارسی کی تقلید پر مجبور تھے لیکن کیا یہ تقلید اردو شاعری کے لئے مضر تھی؟ کیا تنوع، لطافت، شیرینی، وسعت خیال، نزاکت انداز کے لحاظ سے دنیا کی کوئی شاعری فارسی کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ ہمارے دوست کو یورپ خصوصاً انگلستان کی شاعری پر بہت زیادہ ناز ہے، کیا فردوسی کا شاہنامہ بلحاظ تسلسل اور واقعہ نگاری کے ہومر کی رزمیہ نظموں سے ہمسری کا دعوی نہیں کر سکتا؟ منوچہری، قاآنی نے جس تنوع اور نزاکت کے ساتھ مناظر قدرت کی تصویر کھینچی، کیا ورڈس ورتھ کا تخیل اس کی داد دے سکتا ہے؟ کیا مثنوی مولانا روم کی سی ایک نظم بھی انگریزی شاعری پیش کر سکتی جس میں بظاہر افسانے ہوں لیکن

درحقیقت اسرارقدس کا آئینہ ہو ؟ کیا جذبات نگاری کے لحاظ سے شکسپیر نظامی کے دوش بدوش کھڑے ہونے کی جرأت کرسکتا ہے ۔ عشق ومحبت کے رنگ میں حافظ نے فطرت انسانی کے جن لطیف اور دقیق نکتوں کو بے نقاب کیا ہے کیا ان کی جھلک بائرن ، شیلے ، کیٹس کے کلام میں نظر آسکتی ہیں ؟ جام ارغوانی کے آئینے میں عمر خیام کو جو فلسفیانہ حقائق نظر آتے ہیں ، کیا خمخانۂ مغرب کے بادہ خوار دل کی نگاہیں بھی ان پرکیف جلووں سے لذت اندوز ہوسکتی ہیں ؟ سعدی ، حافظ ، ابن یمین ، سنائی ، عرفی نے جن فضائل اخلاق کی تعلیم دی ہو کیا ایک زرپرست قوم سے بھی اس کی توقع کی جاسکتی ہے !

کس قدر عبرت اور افسوس کی بات ہو کہ یورپ کا حلقۂ ادبی تو حافظ اور عمر خیام کے ایک ایک حرف کو آنکھوں سے لگائے اور عظمت صاحب ایسے تعلیم یافتہ مسلمان اُن کے کارناموں کو شاعری کے نشو ونما کے لئے مضر سمجھیں ! میرا خیال ہو کہ اگر اردو شعرا نے صحیح طور پر ایران کی تقلید کی ہوتی تو آج اُردو شاعری کا دائرۂ خیال کہیں زیادہ وسیع نظر آتا ، تاہم اُردو شاعری میں جو کچھ رنگینی ، دلاویزی رقص اور نزاکت موجود ہے وہ سب اسی " رندلم یزل " کا پرتو فیض ہے ۔ عظمت صاحب ایرانی شاعری پر جو چاہیں اعتراض کریں ، ہمارے پاس اس بیدار مغزی کا کوئی جواب نہیں ہے لیکن اتنا عرض کرنے کی جرأت کریں گے ؎

حریف کاوش مژگان خونریزش نۂ زاہد
بدست آور رگ جانے ونشتر را تماشا کن

عظمت صاحب مغربی انداز خیال کے خاص طور پر دلدادہ ہیں اس لئے مشرقی شاعری اُن کو بالکل بے کیف نظر آتی ہے اُردو شاعری کا صحیفۂ کہن تو ہمارے لائق دوست کے نزدیک سرتاپا ایک بے معنی دفتر ہے لیکن دور جدید بھی باوجود مولانا حالی ، اکبر ، اقبال کی نکتہ سنجیوں کے ابھی انگریزی شاعری کی ہمسری کا ادعا نہیں کرسکتا ، ان بزرگوں نے اُردو شاعری کے پیکر کہن میں حقیقت کی جو جدید روح پھونکی ہے ، اگرچہ عظمت صاحب اس کو قدر وعزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ، لیکن جوش کا اثر کہاں جاسکتا ہے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں :

" مولانا حالی کے بابرکت ہاتھوں نے شاعری کو اصلیت سے پھر روشناس کرایا اور شاعری میں اس طرح جان ڈالی کہ خود شاعری کو قومی اصلاح کا آلہ گردانا ..... نئی تعلیم یافتہ پود نے اس سبق کو سیکھا اس پر عمل شروع کیا ، اکبر اور اقبال کی شاعری صلیت سے رچ گئی یہ سب کچھ ہوا مگر اب بھی اُردو شاعری انگریزی سے لگّا نہیں کھاسکتی ایسی

شاعری سے جو اصلیت سے ڈوبی ہوئی ہے جس کے شعرا فطرت انسانی کی گہرائیوں پر عبور رکھتے ہیں جن کے گانے والے اپنی انوکھی آزادیوں سے الفاظ میں سے نیا نیا ترنم پیدا کرتے ہیں جس شاعری اور علمی دنیا میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا جو علوم اور خیال کی ترقی کا صحیح صحیح آئینہ ہے۔"

اگر کوئی بحث و استدلال کسی فلسفیانہ اصول پر مبنی ہو، تو بے شبہ وہ اس قابل ہو کہ اس پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ لیکن اگر تقلید و عقیدت کا محض ایک عامیانہ جوش ہو، تو اس کا جواب بجز سکوت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا لائق دوست نے محض جوش عقیدت کی بنا پر یہ فرض کر لیا ہے کہ انگریزی شاعری دنیا کی بہترین شاعری ہے اس کا ایک ایک حرف اسرار و حقائق کا آئینہ ہے، اس کی نگاہیں اسرار حیات کی محرم خاص ہیں اس کے جام خیال کا ہر جرعہ ترنم سحری سے کہیں زیادہ نشاط آفریں اور روح پرور ہی غرض خوبی اور لطافت کا وہ ایک ایسا مرقع ہے جس کا ہر نقش و نگار عظمت صاحب ایسے ارباب نظر کے لئے حسن معنوی کا لطیف ترین مظہر ہے، ہم کو فاضل نقاد کی اس عبرت انگیز سادہ لوحی پر کوئی اعتراض نہیں، مشہور ہے کہ لیلیٰ محض سیاہ فام تھی، لیکن یہی گہوارۂ ظلمت مجنوں کی نگاہ ناز کے لئے یوسف کدہ تھا یہ فقط اپنے اپنے ذوق نظر کا حوصلہ ہی لیکن سمجھ میں نہیں آتا، کہ انگریزی شعرائے عالم کائنات کے وہ کون سے راز ہائے سربستہ بے نقاب کئے ہیں جن سے ابھی اردو شاعری ناآشنا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے جس فلسفۂ حیات کی تعلیم دی ہے کیا یورپ اس سے زیادہ صحیح، اس سے زیادہ نازک، اس سے زیادہ شاندار کوئی معیار عمل دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے؟ کیا "پیام مشرق" کا ایک ایک حرف حقیقت کی روشنی سے معمور نہیں ہے؟ مولانا حالی کی پر گداز جنبش قلم نے قومی زندگی کے جن خوابیدہ معانی کو بیدار کیا ہو کیا انگریزی شعرا کی نگاہیں ان سے زیادہ لطیف نکتوں تک پہونچ سکتی ہیں؟ کیا "مسدس" قوموں کے عروج و زوال کا مکمل فلسفہ نہیں ہو؟ اکبر کا نکتہ رس دماغ جس خوبی کے ساتھ ظرافت کے پیرائے میں قومی اصلاح کے فرض سے عہدہ برآ ہوا ہے کیا انگریزی شعرا سے اس کی توقع ہو سکتی ہو؟ کیا علامہ شبلی کی تاریخی اور سیاسی نظمیں قدر و ستایش کی مستحق نہیں ہیں؟

اس سے میرا یہ مقصود نہیں ہے کہ میں انگریزی شاعری کو بالکل لغو اور مہمل سمجھتا ہوں لیکن مجھ کو یورپ سے اس قدر عقیدت مندی بھی نہیں ہے کہ مشرقی تخیل کی لطافت آفرینیوں کو نظر انداز کر کے عظمت صاحب کی طرح انگریزوں کے خشک اور بے کیف خیالات پر خواہ مخواہ وجد کروں اور اردو شعرا کو ان کی تقلید کی دعوت دوں، تاکہ ان کی شاعری میں جو کچھ روحانی کیف اور تاثر موجود ہے

وہ بھی بالکل فنا ہو جائے۔ عظمت صاحب کو میری اس بدمذاقی اور تنگ نظری پر ہنسی آتی ہو گی، لیکن ع

نازم بہ کفر خود کہ با یماں برابر ست

ناظرین سے استدعا ہے کہ خیالات کی ندرت کے ساتھ ساتھ لائق مضمون نگار کے طرز تحریر کی طرف بھی ملاحظہ کرتے چلیں، جو خالص انگریزی فقروں کا ترجمہ ہے۔ آخر میں ہم اس جدت پر بھی تنقید کریں گے ابھی صرف نفس مضمون پیش نظر ہے۔ اسلامی حکومت کے سیاسی تنزل اور تمدنی انتشار کا تذکرہ فرماتے ہوئے عظمت صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"اس سماج کے داعوں کو سیاسی، معاشی، یا سماجی یا کسی قسم کی عضو بندی اور تسلسل کا تجربہ نہ تھا، ان کی شاعری میں فطرتاً کسی قسم کے تسلسل اور تنظیم کا ہونا ممکن نہ تھا، ان شعرا کی اصلی زندگی ایک خواب پریشاں تھی ۔۔ ۔۔ ۔۔۔ لہذا ہمارے اس زمانہ کے شعرا نے اپنے آپ ایسی صنف سخن کو چنا اور اس میں اپنی ساری قوت صرف کی جو دیکھنے میں تو ردیف اور قافیہ کی یکسانی رکھتی تھی لیکن معنوی تسلسل سے عاری تھی یہ صنفِ سخن غزل ہے اور اردو شعرا کے دیوانوں کی کل کائنات یہی ہے، غزل ریزۂ خیالی اور پریشان گوئی کا ایک ویسا ہی ڈراؤنا خواب ہے، جیسا ہمارے شعراء کے لئے ان کی سماجی زندگی بن گئی تھے، اصلیت سے منہ چھپانے کا ایک اور اثر بھی ہے وہ یہ کہ خیالات کے بہاؤ اور ذہنی زندگی میں ٹھہراؤ ہو جاتا ہے اور اردو شاعری اس اثر سے کیوں کر بچ سکتی تھی، چنانچہ عشق، تصوف، اخلاق اور فلسفہ وغیرہ کے مضامین اردو شاعری کے لئے معین ہو گئے، جدت خیال کا خیال بھی باقی نہیں رہا ۔۔۔۔ اس طرح اگر شعرا کے دیوانوں پر نظر ڈالی جائے تو بلحاظ جدت مضامین چند اشعار کے سوا باقی دیوانوں کا دیوان ایسے اشعار سے لبریز نظر آئے گا جن میں متقدمین ہی کے مضامین کو نئے الفاظ اور اسلوب میں ادا کر دیا گیا ہے، غرض اردو شاعری محض غزل گوئی ہو گئی اور غزل نری قافیہ پیمائی اور لفظوں کا کھیل رہ گئی"

حق گوئی کی یہ انتہا ہے! کیا قدیم اردو شعرا بجز غزل کے اور کچھ نہیں لکھ سکتے تھے؟ مثنوی قصیدہ، مخمس، مستزاد، قطعہ، رباعی وغیرہ کیا ان اصناف سخن کا ایک معتدبہ ذخیرہ اردو شاعری میں موجود نہیں ہے؟ کیا اردو شاعری متنوع خیال کے عنصر سے بالکل خالی تھی؟ کیا ہمارے شعرا کی نگاہیں بجز حسن لب بام کے اور کسی جلوے کی لذت شناس نہ تھیں؟ کیا وہ گرد و پیش کے حالات و

واقعات سے بالکل غیر متاثر تھے ؟ کیا سودا کا مخمس شہر آشوب اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ قدیم شعرا کبھی کبھی حوادث عالم کی طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھ لیا کرتے تھے، غرض اگر غور سے دیکھا جائے، تو قدیم شاعری میں اکثر ایسی مثالیں ملیں گی، جن سے ہمارے شعرا کی جدت خیال کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ قدیم شعرا نے بہ نسبت اور اصناف شاعری کے غزل سے زیادہ تر کام لیا لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان کا دماغ حقیقت شناسی کی صلاحیت سے عاری تھا بلکہ یہ صرف ہندوستان کی آب و ہوا کا اثر تھا، عشق و محبت سرزمین ہند کا ازلی خاصہ ہے، مناظر قدرت کی دل فریبی، قامت حسین کی موزونی، آب وہوا کی نشاط انگیزی، دولت کی بہتات یہ وہ چیزیں ہیں، جو جذبات محبت کو مشتعل کئے بغیر نہیں رہ سکتیں، ہندوستان کا دامن مقصود ان متاع ہائے گراں ارز سے ہمیشہ مالا مال تھا اس لئے ناممکن تھا کہ نکتہ سنج طبیعتیں ایسی لطافت آفریں ماحول میں پرورش پاکر اس کیف سے بے نیاز رہتیں، اس بنا پر غزل یعنی عشقیہ شاعری کا وجود میں آنا لازمی تھا، ایران نے غزل گوئی کے میدان میں جو کمال حاصل کیا وہ آج تک کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا، لیکن کیا اس کی وجہ یہی تھی، کہ ایرانی شعرا حقیقت سے روشناس نہ تھے ؟ سعدی غزل کا امام فن تھا، لیکن فطرت انسانی کے جو دقیق اور نازک نکتے اس نے عریاں کئے ہیں، کیا شیکسپیر کا دماغ اس سے زیادہ حقیقت طرازی اور نکتہ رسی کا ثبوت دے سکتا ہے؟ مولانائے روم، خواجہ فریدالدین عطار وغیرہ یہ لوگ بھی غزل کے ذوق شناس تھے، لیکن کیا ان سرفروشان محبت کی نگاہیں اسرار کائنات کی محرم نہ تھیں؟ امیر خسرو ہمہ تن تغزل تھے، لیکن کیا ان کے قصائد و مثنویات واقعہ نگاری اور تسلسل خیال کی روشن مثالیں نہیں ہیں ؟ غرض فاضل دوست کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ غزل دماغی انتشار اور حقیقت سے چشم پوشی کا نتیجہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عشق و محبت انسان کا اصلی خمیر ہے، جہاں انسان ہیں وہاں یہ جذبہ موجود ہے، لیکن مشرقی قوموں کی طبعی خمیر میں قدرت نے یہ لطیف مادہ خاص طور پر ودیعت کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مشرقی شاعری میں تغزل کا رنگ بہت زیادہ نمایاں ہے البتہ انگریزی شاعری اس کیف سے بالکل ناآشنا ہے، ایک قوم جو صرف مادہ کو اپنا معبود سمجھتی ہو جس کی سعی وعمل اور جد و جہد کا اصلی محور دنیاوی جاہ و طمع ہو، جو اخلاق و مذہب کو انسانی ترقی کے لئے سد راہ خیال کرتی ہو، جس کی حکومت کا مقصود صرف اپنے مادی ذرائع کی توسیع و ترقی ہو اس سے عشق و محبت کی کڑیاں نہیں جھیلی جا سکتیں اور نہ اس کے لٹریچر کے آئینہ میں اس جلوۂ روح پرور کی جھلک نظر آسکتی ہے۔

یہ بھی مغربی انداز خیال کی تقلید کا اثر ہے کہ عظمت صاحب غزل کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُردو شاعری کو اس لطیف اور پرکیف صنف سخن سے محروم کرکے انگریزی شاعری کی طرح خشک اور بدمزہ خیالات کا مجموعہ بنانا چاہتے ہیں لیکن عظمت صاحب کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک انسان کے پہلو میں دل ہے اور اس دل میں درد کا احساس ہے، اس وقت تک سازِ محبت کبھی خاموش نہیں ہوسکتا، ممکن ہے کہ مادہ پرست یورپ کے نزدیک عشق و محبت، خلوص و ہمدردی کا جذبہ بزدلی اور حماقت کا نشان ہو، لیکن مشرقی شاعر کی نگاہ میں تو وہ ایک ایسی اکسیر ہے جو کفر کو ایمان بنادیتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ عظمت صاحب جو صرف یورپ کے طلسم مادّی کی سیر کو ذوق نظر کی معراج سمجھ رہے ہیں اس نکتہ کی لطافت کو غالباً محسوس بھی نہیں کرسکتے۔

غرض تغزل فطرت انسانی کا لطیف ترین جذبہ ہے، بشرطیکہ اس کا دامن ابتذال اور بازاریت کی آلودگی سے پاک رہے، بوس و کنار، بغض و ہوس، نزع و میت وغیرہ کے عامیانہ مضامین سے الگ ہوکر اگر غزل میں عشق و محبت کے لطیف اور بلند جذبات کی مصوری کی جائے تو بے شبہ وہ ایک ایسا سحر ہے جو مردہ سے مردہ قلوب کو ابھار کر آتش فشاں بنا سکتا ہے، اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہمارے شعرا رندی و سرمستی کے جوش میں کبھی کبھی سنجیدگی اور متانت کے حدود سے متجاوز ہوجاتے ہیں لیکن لائق دوست کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ قدیم غزل گوئی "نری قافیہ پیمائی اور لفظوں کا کھیل تھی" کیا میر، غالب، مومن، حسن وغیرہ کا کلام محض لفظوں کا کھیل ہے ؟ کیا ان کا کلام جذبات عالیہ کے عنصر سے بالکل خالی ہے ؟ البتہ حضرات لکھنؤ اس الزام کے ضرور مستحق ہیں کہ انھوں نے رعایت لفظی اور ضلع جگت سے اس قدر کام لیا کہ شاعری محض بازیچۂ الفاظ بن کر رہ گئی، لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی شاعری نہیں، لیکن ع

بدنام کنندۂ نکونامے چند

ان حضرات کی بدولت اہل دلی کی شاعری بھی بدنام ہوگئی اور ایک عام خیال پیدا ہوگیا کہ اُردو غزل میں بجز ذلف و کمر، خط و خال، حرص و ہوس کے اور کچھ نہیں، غالباً عظمت صاحب بھی اسی عامیانہ غلط فہمی میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کو کسی قوم کی شاعری پر تنقید کرتے وقت بہترین شعرا کا کلام پیش نظر رکھنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان کے چیدہ اور منتخب اشعار میں عناصر شاعری کس حد تک موجود ہیں، عظمت صاحب اگر اپنی تنقید میں اس اصول سے کام لیتے تو ان کو چند اشعار نہیں، بلکہ سیکڑوں ایسے اشعار ملتے جن میں قلب انسانی کے ان حسیات مخفیہ کی مصوری

کی گئی ہے۔ جہاں تک انگریزی شعرا کی مادّی نگاہیں بھی پہنچ نہیں سکتیں۔

مجھکو عظمت صاحب کے اس خیال سے بالکل اتفاق ہے کہ ہمارے شعرانے غزل میں تسلسل خیال کی طرف مطلق توجہ نہیں کی درحقیقت غزل کا یہ بڑا نقص ہے کہ کسی خاص واقعہ یا کیفیت کا مسلسل بیان نہیں ہوتا، بلکہ ہر شعر بجائے خود ایک مستقل خیال ہوتا ہے، اس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ تسلسل خیال کے لئے متعدد اور اصناف سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، مسدس، مستزاد وغیرہ موجود تھے، اس لئے ہمارے شعرانے غزل کو صرف ایسے خیالات کے اظہار کے لئے مخصوص کردیا جو متفرق طور پر شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں شاعر کا دماغ ایک محشرستان خیال ہے جہاں اس کو مختلف کیفیات کے جلوے نظر آتے ہیں، کبھی اس کا دل ذوق وصل سے مخمور ہوجاتا ہے، کبھی درد فراق میں تڑپنے لگتا ہے، کبھی نالہ مسلسل کی تصویر بن جاتا ہے، کبھی مجسم سکون نظر آتا ہے، کبھی حوادث عالم کی شکوہ سنجی کرتا ہے، کبھی کائنات کا ہر ذرہ اس کے لئے پیام سروش لے کر آتا ہے، کبھی اس کے ایک ہاتھ میں "جام شریعت" اور ایک ہاتھ میں "سندان عشق" نظر آتا ہے، کبھی رند ہے، کبھی ولی ہے، کبھی مجسم جوش غرور ہے، کبھی سراپا عجز و نیاز ہے، کبھی شبستان عیش سے لطف اندوز ہوتا ہے، کبھی دشت جنوں کی خاک چھانتا ہے، کبھی فلسفیانہ حقائق کی گرہ کشائی کرتا ہے، کبھی اخلاق کی تعلیم دیتا ہے کبھی عالم مادّی کی سیر کرتا ہے، کبھی حریم قدس اس کی نگاہوں کا گہوارۂ رقص بن جاتا ہے۔ غرض یہ گوناگوں کیفیتیں شاعر کے قلب پر طاری ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر کیفیت ایک مستقل شعر کی صورت اختیار کرتی ہے، اس لئے ایک رشتۂ زرّیں کی ضرورت تھی، جس میں یہ بکھرے ہوئے موتی باہم منسلک کردیئے جائیں۔ تاکہ ضائع نہ ہوں، اس رشتہ کا کام ہمارے شعرانے غزل سے لیا۔ جو درحقیقت شاعر کے قلب کی مختلف کیفیتوں کا ایک نظر فروز گلدستہ ہے، جس سے ہر نگاہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق کیف اندوز ہوسکتی ہے، غزل میں اگرچہ خیالات کے لحاظ سے کوئی خاص تنظیم یا تسلسل نہیں ہے، لیکن کیا بکھرے ہوئے موتی قدر و عزت کے قابل نہیں ہیں، کیا ان مختلف رنگ کے پھولوں میں جو حسن انتشار کے ساتھ دامن کہسار میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، اہل نظر کے لئے کوئی دلآویزی نہیں ہے؟ کیا کواکب منثور کا انتشار کیفیت سے بالکل معرا ہے؟ تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ غزل میں اگر ہمارے شعرا تسلسل خیال سے کام لیں تو وہ سحر سے اعجاز بن سکتی ہے۔

علاوہ عدم تسلسل کے غزل پر فاضل نقادنے دوسرا الزام یہ عائد کیا ہے کہ اس نے اردو شاعری کے دائرۂ خیال کو محدود کردیا، یعنی "عشق، تصوف، اخلاق، فلسفہ وغیرہ کے مضامین اردو

شاعری کے معین ہوگئے، جدت خیال کا خیال بھی باقی نہیں رہا، بے شبہ غزل کے بھی مہمات مضامین ہیں جو برابر ادا ہوتے چلے آرہے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ غزل بلکہ شاعری کے لئے اس سے زیادہ اور کیا وسیع دائرہ خیال ہو سکتا تھا؟ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں سے ہر چیز شاعری کی ایک مستقل دنیا ہے، جو غیر محدود جدت طرازیوں سے معمور ہے، اس لئے اگر شاعر کا قلب ان حقائق لامتناہی کا نکتہ شناس ہے تو وہ حقیقت میں کل کائنات شاعری کا حکمراں ہے، اس کو جدت خیال کی نقش آرائیوں کے لئے کسی اور دنیا کی ضرورت نہیں، لیکن افسوس ہے کہ عظمت صاحب کی مادی نگاہیں ان جلوؤں کی روحانی لطافت کو محسوس نہیں کرسکتیں، یورپ روحانیت سے قطعاً ناآشنا ہے، عشق و تصوف اس کے مذہب میں جرم ہے، مادیت نے اس کے اخلاق کے آئینہ کو بالکل زنگ آلود کردیا ہے، اس لئے بجز عالم مادی کے اور کوئی عالم اس کو نظر نہیں آسکتا، یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری روحانی تاثر سے تقریباً خالی ہے، اس بنا پر جو لوگ ہمارے فاضل دوست کی طرح محض یورپ کے مادی جذبات و خیالات کے دلدادہ ہوتے ہیں، وہ جب عشق و تصوف کے حریم قدس میں قدم رکھتے ہیں تو ان کو حیرت ہوتی ہے کہ یہ کونسا عالم ہے جس کا ہر ذرہ روحانی لطافت کا سرچشمہ ہے، جس کا ہر گوشہ اسرار و معانی کا مخزن ہے، جس کا ہر منظر حسن معنوی کا آئینہ ہے، اس حیرت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہیں خیرہ ہوجاتی ہیں اور وہ اس صحیفۂ آسمانی کو ایک بے معنی دفتر سمجھنے لگتے ہیں، لیکن عظمت صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یورپ کے اس عالم مادی سے بالاتر ایک اور عالم ہے، جو سرتاپا روحانی تاثر سے لبریز ہے، جس کی خاک ملائکہ قدسی کی سجدہ گاہ ہے، جس کا دامن طلب انوار الٰہی کا گہوارہ ہے، جس کی فضا برق ایمن کی شرر باریوں سے منور ہے، جس کا چراغ راہ صرف قلب سوزاں کی روشنی ہے، جس کا نظارۂ جمال صرف ذوق شہادت سے وابستہ ہے، ایثار و قربانی جس کے مکتب درس کا سبق اولین ہے، تسلیم و رضا جس کے صحیفۂ تعلیم کا سرنامہ ہے، نغمۂ منصوری جس کی بزم نشاط کا ترانہ ہے، جامۂ عریانی جس کے قامت حسن کی آرائش ہے، قید محبت جس کے طائران چمن کا نشیمن ہے، دار و رسن جس کی منزل کا پہلا زینہ ہے، غرض جہاں بجز ایک غیر محسوس لطافت، ایک غیر فانی تاثر، ایک ابدی لذت ایک لازوال کیف، ایک روح نواز ترنم، ایک برق پاش حسن، ایک دل گداز ذوق، ایک شرر ریز رقص، ایک آتش فشاں وجد کے سوا اور کوئی سماں نظر نہیں آسکتا یہی وہ عالم ہے جو فیوض ربانی کا سب سے بڑا مظہر، انسانی آرزو کی آخری معراج اور ارباب درد کا حقیقی قبلۂ مقصود ہے، یہی وہ عالم ہے، جس کی غیر مرئی کیفیات کی مصوری دراصل شاعری کے تاج کمال کا طرہ ہے۔

یورپ کا تخیل محسوسات کے دائرے سے باہر نہیں جاسکتا، وہ ہمہ تن مادیت ہے، اس لئے اس کی

نگاہیں صرف مادّی مناظر کی جلوہ شناس ہوسکتی ہیں، نغمۂ آبشار اس کے دل و دماغ میں ایک نشاط انگیز ولولہ پیدا کرسکتا ہے، لیکن نوائے منصوری کا روحانی ترنم اس کے لئے صدائے بے کیف ہے، اس کی چشم تماشا رقاصۂ بہار کے حسن عریاں سے لطف اندوز ہوسکتی ہے، لیکن سرمد کی لطافت ریز عریانی کا ناز نہیں اٹھا سکتی، گلہائے چمن کا شرر ریز تبسم اس کے تخیل پر بجلیاں گرا سکتا ہے، لیکن اس کا سینہ وادی ایمن کی شرر باریوں کا متحمل نہیں ہوسکتا، گلگونۂ شفق اس کے سامنے خیالات کا ایک جام رنگین پیش کرسکتا ہے، لیکن داغ جگر کی رنگینی میں اس کو گلشن قدس کے جلوے نظر نہیں آسکتے، طائران خوش نوا کی زمزمہ سنجیاں اس کے نغمۂ خیال میں ایک راحت آفریں تموج پیدا کرسکتی ہے، لیکن قلب شکستہ کی صدا اس کو شعلہ فشاں نہیں بنا سکتی، ماہ و خورشید کی جلوہ گری اس کے ذوق نگاہ کو نور انبساط سے معمور کرسکتی ہے، لیکن یوسفستان محبت کی گداز آموز فضا اس کے لئے بالکل تاریک ہے، نسیم سحر کے دلآویز جھونکے اس کے خیابان آرزو کو گہوارۂ بہار بنا سکتے ہیں، لیکن کوثر و تسنیم کی موجیں اس کو نشاط معنوی سے سیراب نہیں کرسکتیں، قوس قزح کی بوقلمونیاں اس کے ملک سخن کو نقش ہائے گوناگوں سے آراستہ کرسکتی ہیں، لیکن خونابۂ دل کی تراوش اس کو اسرار رنگین کی نورانی مشعل نہیں بنا سکتی، اس کا دست طلب مادیت کے پردۂ زرنگار کو الٹ سکتا ہے، لیکن دار و رسن کی طرف بے باکانہ نہیں بڑھ سکتا۔ فضائے آسمانی کا نغمۂ سکوت اس کے گوش نیاز کو طرب کدہ بنا سکتا ہے، لیکن نوائے بے صدا اس کو پیام سروش کی بشارت نہیں دے سکتی، غرض اس کی قوت متخیلہ صرف جلوہ گاہ عنصری کی ادا شناس ہے وہ کسی ایسی شے کا ادراک نہیں کرسکتی جو جسم اور مادہ کے حدود سے ماورا ہو۔

قدرت کے یہ ظاہری دل فریب مناظر بے شبہ ایک وسیع النظر شاعر کی نگاہ التفات کے مستحق ہیں، ان کی رنگینی اور دلآویزی شاعری کے لئے بہت بڑا سرمایۂ خیال ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ شاعر کا اصلی جوہر اسی وقت نمایاں ہوتا ہے جب وہ قلب انسانی کے ان لطیف اور نازک کیفیات کی مصوری کرتا ہے، جن کو ظاہر بیں نگاہیں محسوس نہیں کرسکیں، اگر شاعری کا مقصد صرف چشم و نگاہ کی تفریح ہے تو بے شبہ یہ مادّی جلوے بہت زیادہ کام دے سکتے ہیں اور انگریزی شعرا اپنی طلسم آفرینیوں پر بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں، لیکن وہ شاعری جو روح انسانی کے حسیات مخفیہ کو بیدار کرتی ہے جو دل و دماغ کو مادیت کی آلودگی سے پاک کرکے اسرار و معارف کا آئینہ بنا دیتی ہے، جو حقائق کائنات کی پردہ دری کرتی ہے جو انسان کے بلند اور شریفانہ جذبات کو ابھارتی ہے جو اخلاق کی اصلاح و تربیت کرتی، جو نفس کو مجسم نور بنا دیتی ہے، اس کے لئے صرف اسی آستانۂ قدس کی خاک بوسی کی ضرورت ہے جہاں

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

عشق و تصوف محض ایک ذوقی چیز ہے جس کی لطافت کا احساس صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کو قدرت کی طرف سے ذوق صحیح اور وجدان سلیم عطا ہوا ہو، اس لئے اگر عظمت صاحب اس کو محض بے معنی سمجھتے ہیں تو کچھ محل تعجب نہیں ہے ؎

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھکر اخلاق کی مصلح اور نفس کی مزکی کوئی چیز نہیں اور نہ بغیر اس کے شاعری میں وہ روحانی تاثر پیدا ہو سکتا ہے جو در اصل شعریت کی جان ہے، چنانچہ خیالات کا ترفع، جذبات کی پاکیزگی، احساس کی لطافت، یہ چیزیں صرف انھیں شعرا کا حصہ ہوتی ہیں جو اس ذوق کے لذت شناس ہوتے ہیں اور حقیقت میں یہی وہ نفاس پاک ہیں جن کے پر تو خیال سے قوموں کے اخلاق کا آئینہ دفعۃً چمک اٹھتا ہے، کہا جاتا ہے کہ شیکسپیر فطرت انسانی کا بہت بڑا نکتہ شناس تھا، لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس کے ڈراموں نے انگلستان کے اخلاق و عادات کی کس حد تک اصلاح و تربیت کی، تو غالباً اس کا جواب دینا محض ایک سعی لاحاصل ہوگا، بخلاف اس کے سعدی کی نکتہ سنجیوں نے ایران کی اخلاقی سطح کو جس حد تک بلند کیا وہ اظہر من الشمس ہے، مثنوی مولانا روم پڑھکر روح میں جو تازگی اور لطافت محسوس ہوتی ہے، کیا ملٹن کا "گم شدہ شدہ فردوس" وہ اثر پیدا کر سکتا ہے، غرض شیکسپیر کی جدت طرازیاں عظمت صاحب کے نزدیک کسی قدر قابل ستائش ہوں لیکن دنیا کو شیکسپیر سے زیادہ ضرورت سعدی کی ہے، اس لئے اگر اردو شعرائے ایران کی تقلید میں عشق و تصوف کے خیالات ادا کئے تو کیا جرم کیا؟ البتہ وہ اس گناہ کے ضرور مرتکب ہیں کہ انھوں نے پہاڑ دریا، جنگل وغیرہ کی طرف بہت کم توجہ کی، لیکن یہ ایسا شدید جرم نہیں کہ عظمت صاحب ان کے تمام کارناموں کو خاک کے برابر کر دیں۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم فاضل دوست کی اس رائے سے ہرگز متفق نہیں ہیں کہ غزل کا وجود اردو شاعری کی نشو و نما کے لئے سد راہ ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ غزل میں بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے، یعنی اس میں عشق و محبت کے نازک اور لطیف جذبات کی مصوری کی جگہ گریہ و بکا، رشک و حسد، نزع و میت، زلف و کمر، ناز و انداز وغیرہ کے بیہودہ اور عامیانہ مضامین سے جو حضرات لکھنؤ کی بدولت اردو شاعری میں بہت زیادہ سرایت کر گئے ہیں، غزل کا دامن

بالکل پاک کر دینا چاہیئے، دوسرے ہمارے شعرا کو حسنِ لب بام کی کرشمہ سنجیوں سے گزر کر صحیفۂ کائنات کی طرف بھی نگاہ محبت سے دیکھنا چاہیئے، جس کا ہر ذرہ خوبی اور لطافت سے معمور ہے، عشق ایک ہمہ گیر جذبہ ہے جس کا تعلق کائنات کے ہر ذرّے سے ہے اس لئے اس کو صرف کسی محبوب خیالی تک محدود کر دینا ذوقِ سلیم پر بہت بڑا ظلم ہے، علاوہ اس کے تسلسل خیال کا لحاظ بھی ضروری ہے یعنی کسی خاص کیفیت یا منظر کی نقاشی ہو یہ سب باتیں مل کر واقعی غزل کو معجزہ بنا سکتی ہیں۔

لیکن عظمت صاحب کے نزدیک یہ سب لغو اور بے کار ہے وہ غزل میں کسی قسم کی اصلاح نہیں چاہتے بلکہ سرے سے اس کے وجود ہی کو اُردو شاعری کے لئے سم قاتل سمجھتے ہیں اس لئے ان کے نزدیک اس کا خاتمہ ہر نوع ضروری ہے چنانچہ ان کی تقریر کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

"سب سے بڑا عیب جو ہماری شاعری کی رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے وہ ریزہ خیالی ہے مسلسل نظم کا لکھنا ایک ایسی بات ہے جو ہمارے شعرا کے لئے ایک سخت کٹھن کام ہے آپ اردو کی مثنویات اٹھائیے اور وہاں بھی ہر بیت جداگانہ اور مستقل سے نظر آئے گی ان میں خیال کے تانا بانا نہیں، بلکہ علیحدہ علیحدہ ٹکڑے ہیں خیالات کے، جن کو ایک دوسرے سے بھڑا کر ایک اینٹوں کا گھر بنا دیا گیا ہے ...... یہ تو مثنوی اور مسدس کا حال ہے

اس خرابی کی اصل وجہ قافیہ کی پابندی ہے اس لئے

"سب سے پہلے یہ اصلاح ہونی چاہئے کہ شاعری کو قافیہ کے استبداد سے نجات دلوا دیجئے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ غزل کی گردن بے تکلف اور بے تکان مار دی جائے"

لیکن اسی کے ساتھ عظمت صاحب یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:

"قافیہ یوں تو شاعری اور خصوصاً اُردو شاعری کے لئے ایک فطری شے ہے۔ ترنم کے پیدا کرنے کے خیال کو ڈھالنے کے لئے قافیہ بہت کارآمد ہو سکتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قافیہ شاعری کی سرزمین میں کوس لمن الملک بن جائے"

عظمت صاحب کا یہ خیال کوئی جدید خیال نہیں ہے، بلکہ اس کا اظہار سب سے پہلے مولانا حالی نے اپنے دیوان کے مشہور مقدمہ شعر و شاعری میں کیا ہے، جہاں انھوں نے یہ بحث کی ہے کہ وزن اور قافیہ شاعری کے ضروری عناصر نہیں ہیں اور قافیہ کی وجہ سے تسلسل خیال میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے لیکن یہ خالص فلسفیانہ بحث ہے، چنانچہ مولانا حالی کی ایک نظم بھی ایسی ہماری نظر سے نہیں گزری جو قافیہ کے بندش سے آزاد ہو، بخلاف اس کے ان کی متعدد نظمیں موجود ہیں جو باوجود قافیہ بندی کے تسلسل خیال کا

آئینہ ہیں، کیا ان کی مشہور مسدس کے تسلسل کلام سے ہمارے لائق دوست انکار کر سکتے ہیں؟ اگر قافیہ کا وجود آزادی خیال کے لئے سدراہ ہے تو یہی الزام ایک حد تک وزن پر بھی عائد ہو سکتا ہے، جس طرح مناسب قافیہ نہ ملنے کی وجہ سے شاعر کو ایک خیال ترک کر کے دوسرا خیال باندھنا پڑتا ہے، اسی طرح وزن کے لحاظ سے اکثر اس کو فصیح اور پُر معنی الفاظ چھوڑ کر کم درجہ الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں جن سے شعر کی تاثیر میں محسوس فرق آجاتا ہے، کیونکہ خیال کو موثر بنانے کے لئے موزوں الفاظ کا انتخاب بھی ضروری ہے، اس بنا پر عظمت صاحب جس تسلسل خیال کا خواب دیکھ رہے ہیں، اس کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کو قافیہ اور وزن دونوں کے استبداد سے نجات دلوائی جائے، لیکن تعجب ہے کہ اقلیم سخن کے فرمان روا نے وزن کے لئے گردن زدنی کا حکم کیوں نہیں صادر فرمایا!

ہم فاضل مضمون نگار کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اپنے دعوے کی تردید خود اپنی زبان سے کردی ہے، ان کو یہ تسلیم ہے کہ قافیہ شاعری کے لئے ایک فطری شے ہے اور ترنم آفریں بھی ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ شاعری کے نشو ونما کے لئے کیوں کر حارج ہو سکتا ہے؟ قافیہ جب شاعری کا ایک فطری جزو ہے تو پھر قافیہ کا "استبداد" ایک بے معنی لفظ ہے، استبداد کے معنی تو یہ ہیں کہ کوئی خارجی اثر کسی چیز پر بجبر حاوی ہو جائے جو اس کے فطری نشو ونما کے لئے مضر ہو، لیکن قافیہ کو فطری چیز تسلیم کر لینے کے بعد اس کے استبداد کا سوال خود بخود اٹھ جاتا ہے، علاوہ اس کے یہ مسلم ہے کہ موسیقیت شاعری کا ایک ضروری جزو ہے یعنی شعر کے اجزا کو باہم اس طرح ترتیب دیا جائے کہ پڑھنے میں ایک خاص ترنم محسوس ہو بغیر اس کے لطافت شعری کا وجود ممکن نہیں ہے، لیکن یہ ترنم بغیر قافیہ کے پیدا نہیں ہو سکتا، بے قافیہ کا شعر محض ایک نغمۂ بے آہنگ ہے، اس بنا پر بھی قافیہ کا وجود خود عظمت صاحب ہی کے قول کے مطابق شاعری کے لئے ضروری ہے، عظمت صاحب محض انگریزی شاعری کی تقلید میں قافیہ کے قیود سے اُردو کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن تعجب اور سخت تعجب ہے کہ انگریزی شعرا بھی عام طور پر قافیہ کا لحاظ رکھتے ہیں، چنانچہ ورڈسورتھ، شیلے، کیٹس، ٹے نی سن وغیرہ کی نظموں میں زیادہ تر قافیہ پایا جاتا ہے، لیکن تسلسل خیال میں کوئی فرق نہیں آتا، لائق دوست کو یہ تسلیم ہے کہ انگریزی شعرا کی نظمیں حقیقت سنجی اور تسلسل خیال کا آئینہ ہوتی ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ان میں قافیہ کا عنصر بھی شامل ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ قافیہ تسلسل خیال میں کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتا، جب انگریزی شعرا باوجود قافیہ کی پابندی کے خیالات میں تسلسل قائم رکھ سکتے ہیں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ عظمت صاحب اس کو اُردو شاعری کے لئے کیوں سم قاتل سمجھتے ہیں، ممکن ہے کہ سمندر کے کنارے رہنے والی قوموں کے دماغ کی ساخت کچھ ایسی ہوتی ہو

کہ اس پر قافیہ کی سمیت کا اثر نہ ہوتا ہو، یا مشرقی آب و ہوا میں اس قسم کی صلاحیت نہ ہو کہ وہ اس سمیت کو دفع کر سکتی ہو۔

البتہ اگر شعر محض قافیہ کی خاطر سے کہا جائے، تو بے شبہ اس سے آزادی خیال کو صدمہ پہنچتا ہے اور شاعری محض لفاظی بن جاتی ہے، لیکن فاضل نقاد کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اردو شعرا محض قافیہ پیمائی کی غرض سے شعر کہتے تھے، میر انیس نے سیکڑوں بند کے مرثیے لکھے ہیں، لیکن روانی اور تسلسل کا یہ عالم ہے کہ کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ فلاں شعر محض قافیہ کی خاطر سے لکھدیا گیا ہے، ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی، غالب کی غزلوں کو پڑھو، کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ محض قافیہ پیمائی کی گئی ہے، البتہ ارباب لکھنؤ نے لفظی طلسم کاریوں سے اس قدر کام لیا کہ غزل سے شعریت کی روح بالکل فنا ہو گئی اور غزل کو لوگ محض قافیہ پیمائی سمجھنے لگے، چنانچہ امیر وغیرہ کے دواوین اٹھا کر دیکھئے تو ایک ہی ردیف اور قافیہ میں اکثر دو غزلے، سہ غزلے تک ملیں گے، لیکن غور کیجئے تو بجز لفاظی کے اندر کچھ نہیں، اس قسم کی شاعری بے شبہ دائرہ خیال کو بالکل محدود کر دیتی ہے۔ عظمت صاحب کا روئے سخن اگر انھیں حضرات کی طرف ہے تو مجھکو ان کی رائے سے ضرور اتفاق ہے، کہ ان لوگوں کی غزل گوئی صرف لفظوں کا کھیل ہے اور جہاں تک ممکن ہو، اس عیب سے غزل کو پاک کرنا چاہئیے، لیکن ان کو اتنا بے رحم نہ ہونا چاہیئے کہ وہ اور شعرا کے کارناموں کو جو حقیقت میں قابل قدر ہیں، بالکل نظرانداز کر دیں، اگر چند یاوہ گویوں نے قافیہ پیمائی کو شاعری سمجھ لیا ہے تو اس میں غریب قافیہ کا کیا قصور ہے؟ کوئی چیز فی نفسہ بری یا بھلی نہیں، محض محل استعمال اس کو برا یا بھلا بنا دیتا ہے، رات آرام کے لئے ہے، لیکن اگر کوئی شوریدہ سر رات بھر بلا کسی وجہ کے جاگے اور بیمار پڑ جائے تو عظمت صاحب کس کو مجرم ٹھیرائیں گے، اس شخص کے دماغ کو، یا رات کو؟ ہمارے دوست کے اصول کے مطابق تو بجائے اس کے کہ اس کے دماغ کی اصلاح کی جائے رات ہی کو مٹا دینا چاہیئے۔ کیونکہ جب رات نہ رہے گی تو شب بیداری کہاں رہ سکتی ہے، اور وہ بیمار کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اسی طرح چونکہ قافیہ کے غلط استعمال سے شاعری کو صدمہ پہنچا، اس لئے عظمت صاحب یہ چاہتے ہیں کہ بجائے شعرا کے مذاق کی اصلاح کے قافیہ ہی کو سرے سے اڑا دیا جائے اس منطق کی لطافت کو کم از کم میرا دماغ محسوس کرنے سے قاصر ہے!!۔

عظمت صاحب نے اوپر کہیں یہ تسلیم کیا ہے کہ مولانا حالی، ڈاکٹر اقبال، اکبر کی شاعری اصلیت سے معمور ہے، لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ان بزرگوں نے کہیں قافیہ سے کنارہ کشی اختیار کی ہے؟ بلکہ اکبر نے تو توافی کے چمن کھلا دیئے ہیں، اگر ایسا نہیں ہے اور بے شبہ نہیں ہے تو پھر ان کے کلام میں

تسلسل اور اصلیت کا عنصر کیوں کر آیا؟ علاوہ قومی نظموں کے ان لوگوں کی اکثر غزلوں میں بھی واقعیت اور تسلسل کی جھلک نظر آتی ہے، اُردو کے قدیم اساتذہ کی غزلوں میں بھی کہیں کہیں کسی خاص واقعہ یا کیفیت کی مسلسل مصوری محسوس ہوتی ہے۔ مولانا روم، حافظ، امیر خسرو کی مسلسل غزلیں باوجود قافیہ بندی کے موجود ہیں کیا اس کی کوئی وجہ عظمت صاحب بتلا سکتے ہیں؟

غرض ان تصریحات سے صاف طور پر ثابت ہے کہ قافیہ تسلسل خیال کے لئے مانع نہیں ہے اور نہ غزل کا وجود شاعری کے نشو ونما کے لئے مضر ہے، بلکہ قافیے سے خیالات کی روانی میں ایک خاص شاعرانہ لطافت اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے، جو بلینک ورس کو نصیب نہیں ہو سکتی جیسا کہ عظمت صاحب خود تسلیم کرتے ہیں:

"قافیہ نظم میں آبشار کا کام دیتا ہے، خیال کا تسلسل اور الفاظ کا ترنم قافیہ کی چٹان سے ٹکرا کر ابھرتا اور بلند ہوتا ہے"

فاضل دوست کی ستم ظریفی دیکھو! یہ سب تسلیم کرتے ہوئے پھر بھی ان کا اصرار ہے کہ قافیہ خیال کے گلے کا پھندا ہے جس کو بالکل توڑ دینا چاہیئے، بجز طفلانہ ضد کے اور اس کو کیا کہا جائے!!

آغاز مضمون میں "ادب عالی" کی خصوصیات میں سے عظمت صاحب نے اس کی ایک خصوصیت یہ بتائی ہے کہ:

"حافظ اس قدر لذت اندوز ہو کہ اپنے آپ بلا تکلف ایسی چیزیں اس پر نقش ہو جائیں"

شاعری ملک اور قوم کے اخلاق اور جذبات کو متاثر کرنے کا ایک زبردست آلہ ہے اس لئے اس میں ایسی دلاویزی ہونی ضروری ہے کہ وہ قبول عام کا شرف حاصل کر سکے اور سامع کا دماغ اس کے جواہر پاروں کو محفوظ رکھ سکے، کیونکہ ایسی شاعری سے کوئی نتیجہ نہیں، جس کا اثر سننے کے بعد دماغ سے محو ہو جائے، ہمارے خیال میں قوت حافظہ کو قافیے سے بہترین اشعار کے یاد رکھنے میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز میں کوئی خاص لطف ہوتا ہے، اس کا عکس خود بخود اس کے دماغ کے آئینے میں اتر آتا ہے، اس لئے وہی اشعار دماغ میں بآسانی محفوظ رہ سکتے ہیں، جن میں ترنم اور لطافت ہوتی ہے اور یہ کیفیت بغیر قافیہ کے پیدا نہیں ہو سکتی، قافیہ سے ذہن فوراً خیال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور شعر آسانی سے یاد ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے بے قافیہ اشعار کو دماغ مشکل سے محفوظ کر سکتا ہے کیونکہ قافیہ نہ ہونے سے شعر میں خوش نوائی اور خوش آہنگی نہیں پیدا ہوتی اور

نہ اس میں کوئی خاص ایسی بات ہوتی جس کے ذریعے سے دماغ فوراً اس خیال کی طرف منتقل ہو جائے جو اس شعر میں باندھا گیا ہے، دیوانِ حافظ پورا بآسانی حفظ ہو سکتا ہے، لیکن شیکسپیر کے ڈراموں کا ایک ورق بھی مشکل سے یاد ہو سکتا ہے اور وہ بھی باقاعدہ رٹنے کے بعد اس بنا پر قافیہ ترک کر دینے سے شعر محض ایک نغمۂ بے آہنگ ہو جاتا ہے، جس سے حافظہ کبھی لذت اندوز نہیں ہو سکتا اس لئے عظمت صاحب کے قول کے مطابق ادب عالی کی ایک بڑی خصوصیت جاتی رہتی ہے۔

ترک قافیہ کے علاوہ دوسری اصلاح جس کی طرف فاضل مضمون نگار توجہ دلاتے ہیں وہ عروض کے متعلق ہے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

"اُردو شاعری کے مروجہ اوزان اور بحریں مسلسل گوئی کے لئے رکاوٹ ہیں"

"ہماری عروض عربی عروض ہے اور اس میں سے بھی فارسی میں جو چھٹ چھٹا کر چند بحریں رہ گئی ہیں ان پر ہماری شاعری کے ترنم کا انحصار ہے ...... اس عروض پر ایک بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اس کی بحریں ہندوستان کی آب وہوا اُردو کی ہندوستانی اور اربائی بوباس کے مطابق نہیں، ہندی عروض سے جو اُردو کے فطری ترنم کے مطابق ہے، بُری طرح چشم پوشی کی گئی ہے"

لیکن عظمت صاحب نے کوئی وجہ نہیں بتلائی کہ اُردو کی بحریں تسلسل خیال کے لئے کیوں مانع ہیں؟ اور ہندوستان کی آب وہوا ان کے ناموافق کیوں ہے؟ کیا موجودہ بحریں ترنم آفریں نہیں ہیں؟ کیا ان کا دامن اس قدر وسیع نہیں ہے کہ ہر قسم کا خیال ادا کیا جا سکے؟ کیا فارسی اور اُردو شعرا نے انھیں بحروں میں خیالات کے دریا نہیں بہا دیئے ہیں؟ کیا انھیں بحروں میں حالی، شبلی، اکبر، اقبال نے مسلسل نظمیں نہیں لکھی ہیں؟ کیا ہندی عروض فارسی عروض سے زیادہ شیریں اور ترنم آفریں ہے؟ کیا بھجن اور دادرا کی بحریں فارسی ترکیبوں کی نزاکت کا تحمل کر سکتی ہیں؟ اگر اُردو سے فارسی اور عربی کے ترنم ریز الفاظ نکال کر ان کی بجائے سکھنتا، جیتی و کا چھا یا وغیرہ ایسے وحشت انگیز الفاظ استعمال کئے جائیں تو بے شبہ ہندی اوزان کچھ لطف پیدا کر سکتے ہیں، لیکن ہم اُردو کو ہندی بنانا نہیں چاہتے اور نہ ہم کو ٹھمری اور بھجن میں وہ خوش آہنگی محسوس ہو سکتی ہے جو قاآنی اور حافظ کی نغمہ سنجیوں میں محسوس ہوتی ہے، حامیانِ ہندی کو خوش ہونا چاہیئے

کہ خود اُردو ہی کے ارباب حل وعقد اس کے رشتۂ حیات کو کاٹنے کے لئے تیار ہیں، افسوس!!
عبرت!! ع

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد

عربی کی قیود سے تو عظمت صاحب اُردو کو آزاد کرانا چاہتے ہیں، لیکن دوسری طرف یورپ کی تقلید کی دعوت بھی دے رہے ہیں، چنانچہ اس جدید عروض کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"انگریزی عروض کے ایسے اصول جو آزادی کی جان ہیں اور اس کی وسعت رکھتے ہیں کہ ہر زبان کے لئے کام دے سکیں، اس پر اس نئی عروض کی آزادی کا سنگِ بنیاد رکھا جائے۔"

کیا ایک کی تقلید چھوڑ کر دوسرے کی تقلید کرنا اسی کا نام آزادی ہے! لیکن چونکہ فاضل دوست نے اس مسئلہ کو آئندہ بحث کے لئے اٹھا رکھا ہے، اس لئے اس وقت کوئی تفصیلی تنقید بے موقع ہے، ہم بھی ان اصولوں کے سننے کے منتظر ہیں، جن کی تقلید کے بغیر اُردو کا دائرۂ خیال وسیع نہیں ہوسکتا۔

غرض عظمت صاحب کے اس خیال سے مجھے ایک حد تک ضرور اتفاق ہے کہ اُردو شاعری میں مسلسل نظموں کی کمی ہے، چنانچہ اب ہمارے موجودہ شعرا کو خاص طور پر اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اتنا وسیع النظر نہیں ہوں کہ قافیہ یا غزل کو شاعری کی نشو ونما کے لئے مضر سمجھوں اور چند ہرزہ سرایوں کی بد مذاقی کی پاداش میں ان کی گردن زدنی کا حکم صادر کردوں، یہ ظلم ممکن ہے کہ عظمت صاحب کی شانِ بے نیازی کے لئے روا ہو، لیکن میں شاعری کو نغمۂ بے آہنگ بنانا نہیں چاہتا، بلینک ورس کا ترنم ہمارے دوست ہی کو مبارک ہو، ذوقِ صحیح کی قدر ان ہی مواقع پر معلوم ہوتی ہے!

اگرچہ یہ مضمون توقع سے زیادہ پھیل کر طویل ہوگیا ہے، لیکن ہم آخر میں لائق مضمون نگار کے انداز تحریر کے متعلق بھی کچھ مختصراً عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور سچ پوچھئے، تو ہم کو نفس مضمون سے زیادہ انشا پردازی ہی میں لطف محسوس ہوتا ہے، مضمون کے جو اقتباسات ہم نے اوپر درج کئے ہیں، ان کو ناظرین اس موقع پر دوبارہ انشا پردازانہ نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیں تو اُن سے ایک حد تک اندازہ ہوسکے گا کہ ہمارے دوست نے کیا عجیب وغریب طرز عبارت ایجاد فرمایا ہے۔

میں نے مضمون پڑھا، تو مجھکو دیر تک حیرت رہی، کہ آخر یہ کون سی زبان ہی، اُردو ہے یا اُردو نما انگریزی؟ بے شبہ ہمارے دوست کا یہ کمال تو ضرور داد کے قابل ہی کہ اُنھوں نے خیالات کے علاوہ عبارت میں بھی انگریزی کی تقلید کا لحاظ رکھا ہی، بلکہ اکثر انگریزی محاوروں اور فقروں کا لفظی ترجمہ بعینہٖ کر دیا ہی، قطع نظر اس سے کہ اس قسم کی عبارت سے انشا پردازی کو کیا صدمہ پہنچا ہی، چنانچہ چند مثالیں مع انگریزی فقروں کے نمونتہً درج ذیل ہیں۔

(۱) شکر لپٹے سُر — Sugar coated tune

(۲) ابھی مستقبل کے رحم میں ہی — In the womb of future

(۳) غیر عضو بند — Unsystematic

(۴) ناموافق گردش پر سوار ہونا — To ride over etc

اس قسم کی اور بھی مثالیں ہیں، ناظرین ملاحظہ کریں، کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہی کہ یہ اُردو ہی! کیا اس قسم کے بے معنی ترجموں سے اُردو انشا پردازی کا دامن وسیع ہو سکتا ہی؟

علاوہ اس کے الفاظ کی بندش، فقروں کی در و لبست کی روانی اور سلاست کا یہ عالم ہی کہ ہر قدم پر زبان ٹھوکر کھاتی چلتی ہی اور بار بار پڑھنے کے بعد ہی مفہوم کا مشکل سے اندازہ ہوتا ہی اور لطف یہ ہی کہ یہ خصوصیت شروع سے آخر تک قائم رہتی ہی، چنانچہ ناظرین مذکورۂ بالا اقتباسات سے اس کا ایک حد تک اندازہ کر سکتے ہیں، لیکن اس موقع پر ہم ان کی تفریح خاطر کے لئے ایک خاص ٹکڑا درج ذیل کرتے ہیں:

"بازاری جا جا کے گالیاں دیتے ہیں، پڑھے لکھے بھلے مانس چبا چبا اور بن بن کے منہ سے بات نکالتے ہیں، تقریر کرنے والے دھواں دھار الفاظ برساتے ہیں، شاعر چُن چُن اور تول تول کر گاتا ہی اور نثر نگار جملوں کو کانٹ چھانٹ اور ڈھال ڈھول کر لکھتا ہی، یہ سب اچھی یا بُری غلط سلط بھکی بہکی، جچی تلی حسن میں ڈوبی یا جادو بھری شاہانی یا قلمی باتیں ادب کا جز ہوتی ہیں"

عظمت صاحب نے شاید انشا پردازی اسی کو سمجھ رکھا ہی کہ مفہوم کسی طرح ادا کر دیا جائے

خواہ الفاظ کسی قدر بھونڈے عامیانہ اور ثقیل ہوں، لیکن اگر آزاد، سر سید، شبلی وغیرہ کی تصانیف کے مطالعہ کی زحمت گوارا فرمائیں تو ان کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اُردو کس کو کہتے ہیں؟ اور انشا پردازی کس کا نام ہے؟

افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے ہم اس موضوع پر عظمت صاحب کی خدمت میں زیادہ عرض نہیں کر سکتے، لیکن یہ ضروری ہے کہ اُردو شاعری کی اصلاح سے قبل ہمارے فاضل دوست کو اپنی طرز تحریر کی اصلاح کرنی چاہیئے، لیکن عظمت صاحب سے زیادہ مجھکو موجودہ رسائل کے ادبی پستی پر افسوس معلوم ہوتا ہے جو اس قسم کے مضامین بغیر کسی تنقید کے شائع کر دیا کرتے ہیں حالانکہ ملک کی عام بد مذاقی کی اصلاح کے لئے اس قسم کی تنقید نہایت ضروری ہے۔

مرزا احسان احمد بی اے ال ال بی (علیگ)

غزل

اے تو کہ بگزری ز قریب مزار من — منتِ کشِ قدومِ تو مشتِ غبارِ من
عریاں شدے حقیقتِ عشقِ نگارِ من — گشتی ہوائے گل نہ اگر پردہ دارِ من
بیمارِ ہجر را غمِ تیمار دار نیست — آہ و فغان و نالہ ہمہ غمگسارِ من
تا گفتنی ست قصۂ رنجوریِ فراق — آمد قضا و حیف نیامد نگارِ من
ماند نہ ہیچ جورِ فلک باز در جہاں — بندد میان اگر نفسِ شعلہ بارِ من
من ذرۂ حقیر تو ئی آفتابِ حسن — محتاجِ یک نگاہِ کرم حالِ زارِ من
سوزِ تپِ فراق عیان ست بعد مرگ — جاں را رگیست رشتۂ شمعِ مزارِ من
با من ادا و غمزۂ سحر آفریں چہ کرد؟ — از چشمِ خود بپرس کہ آں بود دارِ من

انور! ہلاکِ نرگسِ مخمورِ ساقیم
از نفخِ صور دور نگردد خمارِ من

انور

لمعاتِ صفی

تار ہیں سازِ شکستہ کے، وہ دمساز نہیں ہمنشیں ہو کے جو احباب ہم آواز نہیں

کس طرح یہ نہیں معلوم، مگر کٹ گئی عمر داستاں کا مرے انجام ہے آغاز نہیں

نام روشن کیا پروانۂ دل سوختہ نے اب تو اتنا بھی کوئی عاشقِ جانباز نہیں

باندھ صیادِ جفا کار نہ للہ انھیں جن تھکے بازوؤں میں طاقتِ پرواز نہیں

جامۂ حسن یہ جس رنگ کا چاہے پہنے گل میں وہ طرزِ ادا وہ روشِ ناز نہیں

جنبشِ ابروِ صیاد پہ رہتی ہے نظر شغل جز حسرتِ بال و پرِ پرواز نہیں

کافرِ عشق سب اس کا کلمہ پڑھتے ہیں حسن میں کیا ہے اگر قوتِ اعجاز نہیں

اب رہائی کی خوشی ہے نہ اسیری کا ملال جانتا ہوں کہ مجھے طاقتِ پرواز نہیں

ترکِ دنیا پئے عقبیٰ جو ہے اک حسنِ طلب
بے نیازی یہ صفی اپنی ہمیں ناز نہیں

حضرت صفی لکھنوی

عالمگیر بہترین بادشاہِ ہند تھا

وسعتِ دائرۂ حکومت کے لحاظ سے عالمگیر بہت بڑا بادشاہ تھا۔ محمد تغلق مسلمانوں میں اول اول شہنشاہِ ہندوستان ہوا۔ بدؤ خلقت سے غالباً ایسا کوئی شہنشاہ ہندوستان میں نہیں ہوا تھا۔ مسلمانو کا کیا ذکر ہی ہندوؤں کے عہدِ حکومت میں بھی سلطنت ہند کی وسعت کسی راجہ کے عہد میں اتنی نہوئی تھی جتنی کہ محمدؒ تغلق کے زمانے میں ہوئی۔ ممکن ہے کہ کوئی ہندو راجہ محمدؒ تغلق سے بڑا گزرا ہو لیکن تاریخ کے صحیح تفصیلی حالات پیش نظر ہونے سے یہ کہنا کہ محمدؒ تغلق ہندوستان میں سب سے بڑا بادشاہ ہوا تھا کسی مورخ کے لئے بیجا نہیں ہے۔ محمدؒ تغلق کی شہنشاہی کے بعد جو طوائف الملوکی ہوئی اُس کا استیصال اکبر اور جہانگیر سے کیا شاہجہاں صاحب قِران سے بھی نہ ہوا۔ عالمگیر نے گول کنڈہ (حیدر آباد) اور بیجاپور کی سلطنتوں کو اور اُن کے غاصب معین یا حلیف مرہٹوں کی سلطنت کو پورے طور سے پامال کرکے محمدؒ تغلق کی شہنشاہی ازسرِنو زندہ کی اور آسام اور تبت کا کچھ حصہ اس پر اضافہ کرکے محمدؒ تغلق سے بھی زیادہ سلطنت ہند کو وسعت دی اور اگرچہ چاٹگام محمدؒ تغلق کے زیرِ نگین نہ تھا تو اُس کا ممالک محروسہ میں داخل کرنا بھی عالمگیر کے کارناموں میں داخل ہے۔ افغانستان کے مغربی سرحد سے چاٹگام اور آسام کے مشرقی کناروں تک اور ہمالیہ پہاڑ اور خیبر و تبت سے مالابار تک عالمگیر کے زمانے میں سلطنت ہند کے حدودِ ارضی تھے۔ سالانہ آمدنی کا تخمینہ ۴ کروڑ پاؤنڈ یعنی ۶۰ کروڑ روپیہ انگریزی مورخوں نے پہلے کیا تھا۔ لیکن سونے کی قیمت بڑھ جانے سے وہ ایک ارب کے قریب ہوتی ہے اور اجناس کی گرانی پر خیال کیا جائے تو اس زمانہ کے حساب سے کئی ارب روپیہ عالمگیر کے خزانہ میں سالانہ آتا تھا یعنی اکبر کے زمانے سے قریب قریب دوچند آمدنی عالمگیر کے عہد میں تھی اس وقت انڈین گورنمنٹ کا رقبہ اراضی سب سے زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ افغانستان نکل گیا۔ برما اور سیلون کو بھی خارج کریں اور ہندوستان کی خودمختار ریاستوں کو بھی خارج سمجھیں تو موجودہ گورنمنٹ ہند سے زائد تر عالمگیر کے ممالک محروسہ کا رقبہ تھا۔

عالمگیر کے عہد میں نہایت ہی امن تھا نہ صرف اس لئے کہ وہ بڑا مدبر اور بیدار مغز تھا بلکہ

اس لئے بھی کہ طوائف الملوکی کا مٹنا بجائے خود امن کا ضامن ہوتا ہے۔ مرہٹوں کی وجہ سے ملک میں کسی قدر بدامنی تھی جس کا آغاز شاہجہان کے وقت سے تھا اور شباب اس کا عالمگیر کے عہد میں تھا لیکن عالمگیر نے اس کا استیصال بخوبی کر دیا تھا۔ مرہٹوں کی لوٹ مار جو کچھ کچھ جاری تھی اگر اس کا نام بدامنی ہو تو سرحدی جرگوں کی لوٹ مار کی وجہ سے موجودہ گورنمنٹ ہند کا عہد بھی باامن نہ کہا جائے گا۔ حالانکہ ہندوستان کا ہر فرد بشر کیا دیگر ممالک کے لوگ بھی قائل ہیں کہ موجودہ گورنمنٹ امن وامان قائم رکھنے میں آپ اپنی نظیر ہے۔

رشوت کا دروازہ کسی زمانہ میں اور کسی ملک میں نہ بند ہو سکا اور نہ اب بند ہے۔ مجبوراً یہ دستور قائم ہو گیا تھا کہ جب کوئی بڑا عہدہ دار مرتا تو اس کا مال ضبط ہو کر سرکاری خزانہ میں داخل کر لیا جاتا تھا بلکہ جیتے جی بھی اعلیٰ عہدہ داروں کو شاہی جشن سالگرہ میں اتنی رقمیں بطور نذر دینا پڑتی تھیں جو قریب قریب ان کے سالانہ جائز آمدنی کے برابر ہوتی تھیں۔ خلعت اور انعام کی مد میں گو وہ بہت کچھ واپس بھی پا جاتے تھے۔ لیکن کہاں تک عالمگیر نے اس ضبطی اور نذر کی رسمیں مٹا کر رشوت ستانی کا سدباب کرنا چاہا اور بہت کچھ وہ کامیاب ہوا۔ ملک کی بہبودی کے لئے ایک بہت بڑی رقم کا سالانہ آمدنی کے مد سے خارج کرنا عالمگیر ہی کا کام تھا۔ عالمگیر نے انتظام اور کفایت شعاری سے ملک کی آمدنی بہت بڑھا دی تھی۔ سخت گیری سے نہیں بلکہ حسن تدبیر سے اور اس پر لطف یہ ہے کہ بیسیوں جائز ٹیکس اور محاصل کے مدیں جو مختلف ناموں سے قائم تھیں یک قلم آمدنی کی فہرست سے خارج کر دی گئیں۔

اکبر کے زمانے میں جو مال گزاری اور خراج کا دستور العمل بنا تھا اس کی تصحیح اور ترمیم میں عالمگیر نے رعایا کے فوائد مدنظر رکھے۔

عالمگیر کے پہلے سلطنت کے مقابلہ میں کوئی دعویٰ مسموع نہ ہوتا تھا۔ عالمگیر نے اول اول سلطنت کے خلاف دعویٰ رجوع ہونے کی مثال قائم کی اور ہر ضلع میں وکیل مقرر کئے کہ بوقت ضرورت وہ بادشاہ کے قائم مقام بن کر جواب دہی کریں اور لوگوں کے مطالبات جو سلطنت پر عاید ہوں ادا کریں۔ عالمگیر نے پرچہ نویس اور واقعہ نگار مقرر کر کے حضرت عمر فاروق اور ہارون رشید کی مثال قائم کی تھی اور ان پرچہ نویسوں اور واقعہ نگاروں کی تقرری میں جو ایک طور پر خفیہ پولس بھی تھے بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ عالمگیر کے رقعجات پڑھنے سے پتا لگتا ہے کہ اس خصوص میں وہ کیسا مدبر تھا اور اپنے عاملوں پر وہ کس کس طرح سے نکتہ چینیاں کرتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلیات اور جزئیات پر یکساں نظر رکھتا تھا۔

عالمگیر اپنے عدل و انصاف میں مشہور ہے۔ انصاف کے وقت دوست دشمن امیر غریب اپنے پرائے
سب اس کے نزدیک برابر تھے۔ ایک مرتبہ اس کے بیٹے کام بخش کا رضاعی بھائی جرم قتل میں ماخوذ
ہوا۔ کام بخش اس رضاعی بھائی کے ساتھ ساتھ تفتیش جرم میں رہتا تھا کہ اس پر اس طرح سے کچھ رعایت
ہوگی۔ عالمگیر نے ملزم کے ساتھ کام بخش کو بھی قید میں بھجوادیا اور محبت پدری نے سفارش نہ کی
مختلف اضلاع میں وہ حکایات عدل گستری مختلف پیرائے سے زبان زد خلائق ہیں جس میں عالمگیر
نے خود موقع پر پہنچکر اپنے عمال کی زیادتیوں کا فیصلہ ہندو مستغیثوں کے موافق کیا ہے۔

عالمگیر بڑا محنتی اور جفاکش تھا۔ اخیر عمر تک وہ مجمع عام میں کھڑا ہوکر دادخواہوں کی عرضیوں
پر حکم لکھتا تھا اور اس کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ ادائے فرض منصبی میں وہ بہت مسرور ہے۔ وہ دن
میں کئی بار دربار عام کرتا تھا جس میں امیر و غریب سب جمع ہوسکتے تھے۔

ہندوستان میں راجاؤں کی پرستش ہوتی تھی۔ اکبر نے اسے روا رکھا تو ہنود دربار میں
اکبر کو سجدہ کرنے لگے۔ شاہجہاں نے سجدہ بند کیا زمین بوسی قائم رکھی۔ اکبر اور جہانگیر صبح کے وقت
جھروکے میں بیٹھتے تھے تا ہنود بطور شگون نیک بادشاہ کا درشن کریں تو وہ دن ان کے لئے بخیر و
خوبی گزرے۔ بعض لوگ بغیر شاہی درشن کئے ہوئے کھانا پینا حرام جانتے تھے۔ عالمگیر نے زمین
بوسی بند کرادی اور صبح کو جھروکے میں بیٹھنا بھی روا نہ رکھا۔ جھروکے میں نہ بیٹھنا یہ احتمال پیدا کرتا
تھا کہ لوگوں کو عرض حال کا جو موقع حاصل تھا وہ جاتا رہے گا۔ اس لئے اس نے یہ انتظام کیا کہ
جسے عرض حال کرنا ہو وہ عرضی میں تحریر کرکے بہ آسانی پیش کرسکے۔ سجدہ اور درشن کا بند کرنا گو حکمت
عملی کے خلاف تھا لیکن اصول مساوات کے بالکل موافق تھا۔ عالمگیر نے اس رسم کو مٹا کر گوتم بدھ
کی طرح مساوات کا سبق رعایا کو پڑھایا لیکن جو عالمگیر کی قدر نہیں کرتے وہ عالمگیر کے اس فعل کو محض
تعصب مذہبی پر محمول کرتے ہیں۔

بادشاہ امین سلطنت ہوتا ہے اس کا مسرفانہ خرچ خیانت مجرمانہ ہے۔ عالمگیر نے نہ صرف تکلفات
سلطنت کم کئے اور اپنے مدح خوانوں (شاعروں) کے عہدہ کی تخفیف کی بلکہ اپنے جیب خاص کے
مصارف بھی کم کردئے اور مشہور ہے کہ عالمگیر فرصت کے وقت کلاہیں بنایا کرتا تھا اور اپنے ہاتھ
کی محنت سے اپنی خوراک مہیا کرتا تھا۔

عالمگیر نے صیغۂ تعلیم کو بڑی رونق دی۔ ہر شہر اور قصبہ میں علماء اور طلباء کے وظائف مقرر
کئے اور علم کو بڑی ترقی دی۔ اسی کا نتیجہ فتاویٰ عالمگیری کی تالیف ہے۔ جو عالمگیر کے عہد ہی میں

تمام بلادِ اسلام میں فتاویٰ ہند کے نام سے فقہ کی ایک مستند کتاب کی حیثیت سے مشہور ہوئی۔

اکبر نے سنہ قمری کی جگہ سنہ شمسی قائم کیا تھا۔ عالمگیر نے پھر سنہ قمری رائج کیا۔ شمسی سال میں عیب نہیں تھا لیکن مہینہ قمری اور سال شمسی اور اس پر لوند مہینہ کے حساب کا جھگڑا۔ اس میں بڑی دردسری تھی۔ اکبر کی اصلاح کو قابل قدر نہ جان کر عالمگیر کا پچھلی حالت پر رجوع کرنا محض سلفِ صالحین کی یادگار کا قائم رکھنا نہ تھا بلکہ اُسے عوام کی آسانی کا بھی خیال تھا کہ ہر ایک اپنی طور پر محاسب ہو کسی کو دوسرے کی مدد کی ضرورت نہ رہے۔

بجائے السلام علیکم کے کورنشات، آداب، بندگی وغیرہ وغیرہ کا رواج عہد اکبر میں قائم تھا۔ السلام علیکم کو لوگ خلاف تہذیب اور بُرا سمجھتے تھے۔ السلام علیکم میں قومی زندگی کی جھلک اور مساوات کی شان ہے۔ اس لئے عالمگیر نے السلام علیکم کو ازسرِنو ہندوستان میں زندہ کیا۔

گانا بجانا مردانیوں کے عہد میں جاری اور خلفاء عباسیہ کے عہد میں تو ارکین دولت کے لئے لازم ہو گیا تھا۔ سلاطین مابعد کے زمانہ میں تو مذہبی رنگ اس نے اختیار کر لیا تھا۔ جائز اور ناجائز کی بحث چھوڑ کر محمد شاہ رنگیلے اور اَودھ کے آخری بادشاہ کے خانگی معاملات پڑھنے اور نتائج بد پر نظر کرنے سے اس کی بُرائی روز روشن کی طرح نمایاں ہے۔ دربارِ شاہی سے عالمگیر نے اُسے نکلوایا۔ آج تمام یورپ میں یہ فن نہایت شریف سمجھا جاتا ہے عبادت خانوں میں بھی اس کا دخل ہے لیکن دربار شاہی میں وہ عام ہو یا خاص اس کو دخل نہیں ہے۔

سزادہی کا محکمہ قاضیوں کا محکمہ ہے۔ اس کا کام ہے محض سزا دینا۔ اس کے علاوہ ایک محکمہ احتساب ہے جس کا کام ہے ارتکاب جرائم سے روکنا۔ محکمہ احتساب کا قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ ابتدائے اسلام میں اس کا رواج تھا لیکن رفتہ رفتہ مٹ گیا۔ یہاں تک کہ اس مہذب زمانہ میں بھی کہیں اس کا وجود نہیں ہے یورپ میں جتنی ہی تہذیب میں ترقی ہے اُتنی ہی جرائم میں اختراعیں بھی ہوتی ہیں۔ کاش محکمہ احتساب یورپ میں قائم ہو جائے تو وہاں کے انسان فرشتہ خصلت ہو جائیں۔ عالمگیر نے جہاں سب کچھ اصلاح کی وہاں محکمہ احتساب بھی قائم کیا اور اس کے عہد حکومت میں اس محکمہ احتساب کی بدولت اخلاقی و تمدنی حالات رعایا کی بہت اچھی تھی۔

یہاں تک جتنی باتیں مذکور ہوئیں اُنھیں صرف رعایا کی فلاح و بہبودی سے تعلق ہے۔ مذہب کو کوئی دخل نہیں ہے۔ مذہب کے متعلق عالمگیر کا صرف ایک عمل ہے کہ اُس نے تمام مسجدوں میں امام موذن، خطیب، خزانہ سرکاری سے مقرر کئے۔ تنخواہیں انھیں انتظام مسجد یا تولیت مسجد کے

صلے میں ملتی تھیں۔ آج کل اس روشن زمانے میں بھی باوجود اس کے کہ برٹش گورنمنٹ پر بے تعصبی کا خاتمہ ہے لیکن گورنمنٹ ہند سے تمام پروٹسٹنٹ گرجاؤں کو ایک خاص تعلق ہے۔

شجاعت اور بہادری بھی انسان کا ایک جوہر ہے۔ انسان میں تمام صفات ہوں اور شجاعت اور بہادری نہ ہو تو انسانیت نامکمل ہے۔ شجاعت میں بابر اور اس کی نسل ممتاز تھی اور تیمور تو گویا فرد روزگار تھا۔ اکبر کے بعد خاندان تیموریہ میں ہندی خون کی آمیزش شروع ہوئی۔ اس اعتبار سے عالمگیر میں خاندانی جوہر شجاعت کو بہت کم ہونا چاہیئے تھا لیکن واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر میں یہ جوہر بابر کے برابر تھا یا نہ تھا لیکن بابر کی تمام نسل میں عالمگیر کو سب سے بڑا حصہ ملا تھا۔ بہادری کے معنی ہیں نڈر ہونا۔ اور شجاعت کے معنی ہیں مصیبت میں سراسیمہ نہ ہونا۔ بابر کے بعد سب سے زیادہ یہ صفت عالمگیر میں پائی جاتی ہے۔ اگر یہ صفت اس میں نہ ہوتی تو جان نثاران دارا شکوہ اور افواج صاحب قرانی کے مقابلہ میں اسے فتح نصیب نہ ہوتی اور نہ سخت ترین مخالفتوں کے ہوتے ہوئے اتنی بڑی سلطنت ہندوستان میں وہ قائم کر سکتا جس کی نظیر مدو خلقت سے ہندوستان میں پائی نہیں جاتی۔

یہ تمام صفتیں مخالفین عالمگیر یعنی ہندو، شیعہ، عیسائی اور طرفداران دارا شکوہ بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ عالمگیر کو متعصب کہتے ہیں۔ حالانکہ عالمگیر میں تعصب نہ تھا۔ بعض سنّی جوشیلے مسلمان جو عالمگیر کو فرط محبت سے متعصب کہتے ہیں وہ گویا عالمگیر کی ہجو کرتے ہیں۔ مذہب میں راسخ العقیدہ ہونا تعصب نہیں ہے بلکہ تعصب مذہبی کے معنی اصطلاحی ہیں "محض اختلاف مذہب کی وجہ سے کسی کے درپئے آزار ہونا" اور اس معنی میں عالمگیر ہرگز ہرگز متعصب نہ تھا۔ واقعات سے قطع نظر کرکے اتنا جاننا کافی ہے کہ عالمگیر کیا دنیا میں کوئی کامیاب بادشاہ ان معنوں میں متعصب نہیں ہوا ہے۔ میرا خیال راسخ ہی ہے لیکن واقعات بھی شاہد ہیں کہ عالمگیر میں تعصب مذہبی نہ تھا۔ الاسلام اور تاریخ الاسلام میں کچھ عالمگیر کی بے تعصبی میں نے درج کی ہے لیکن وہ بہت مختصر ہے اور حصول مدعا کے لئے کافی نہیں ہے۔ "عالمگیر غیر متعصب تھا" کے عنوان سے ممکن ہے کہ ایک مستقل مضمون واضح تر انشاءاللہ تعالیٰ کسی پرچہ میں شائع ہو۔ لیکن سردست مفصلہ ذیل سطروں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

عالمگیر کو میں بہترین بادشاہ ہند اس لئے کہتا ہوں کہ وہ ہر اعتبار سے بہتر تھا۔ لیکن دیگر مورخین اس پر متفق نہیں ہیں۔ اس پر مفصل بحث کرنا طول عمل ہے۔ مگر مختصر طور پر کچھ لکھ دینا تکمیل مضمون اور ثبوت مدعا کے لئے ضروری ہے۔

سپید کپڑوں پر داغ جلد نمایاں ہو جاتے ہیں۔ عالمگیر بہترین بادشاہ تھا۔ اس لئے اس کے

عیوب کی طرف لوگوں کو زائد توجہ رہی۔ بہادر شاہ اس کا جانشین لائق نہ تھا اور عالمگیر کی سلطنت
اس سے سنبھل نہ سکی۔ خیال پیدا ہوا کہ بنیاد سلطنت عالمگیر ہی خراب کر چکا تھا۔ حیدر آباد کی ریاست کا
مالک شیعہ مذہب رکھتا تھا۔ عالمگیر نے اس کو تباہ کیا۔ شیعوں کو یہ پسند نہ آیا۔ عہد عالمگیری کے مورخ
شیعہ تھے اور قلم انھیں مورخوں کے ہاتھوں میں تھا۔ واقعات تو انھوں نے غلط نہیں لکھے لیکن رائیں
خلاف کیں اور انگریزی مورخوں نے انھیں رایوں پر تاریخ نویسی کا مدار رکھا۔ علاوہ شیعوں کے
سنی طبقے کے لوگ جو داراشکوہ کے ہم خیال تھے یا شعر شاعری اور راگ نے بجانے کے دلدادہ تھے
وہ بھی عالمگیر کے اعتقادات مذہبی اور غیر مسرفانہ رویہ سے ناخوش تھے۔ ہندوؤں اور عیسائیوں
نے عالمگیر کے خیالات جہانداری کو بھی جو ملک کے فائدہ کے لئے تھے۔ تعصب مذہبی پر محمول کیا۔
انھیں وجوہ سے سکول کی کتابوں میں عالمگیر کے حالات اس خوبی سے مندرج نہیں ہوئے جس کا
وہ مستحق ہے۔

عالمگیر کے بعد سلطنت اس طرح برباد ہوئی جیسے نمک کا ڈلا پانی میں گر کر گھل جائے۔ عالمگیر
کے بعد صرف ۵ برس بہادر شاہ تخت نشین رہا اس کے بعد ۷ برس میں تین بادشاہ پے در پے
تخت نشین کئے گئے۔ پھر محمد شاہ تخت پر بیٹھا اور اس کے عہد میں دلی کو نادر شاہ نے تباہ کیا۔
۱۷۰۷ء میں عالمگیر مرا اور ۱۷۲۳ء میں نظام حیدر آباد نے خود مختاری کا اعلان کیا اور دیگر صوبہ داروں
نے بھی اس کی تبعیت کی۔ ان صوبہ داروں نے بھی با امن حکومت قائم نہ رکھی۔ سکھوں اور مرہٹوں
نے انھیں بھی پریشان کر دیا۔ غرض کہ عالمگیر کے مرنے سے پانچ برس کے اندر شہنشاہی ہند پر زوال
آیا اور ۱۶ سال کے اندر اس کا نشان باقی نہ رہا۔ لوگ سمجھتے رہے کہ اخیر بادشاہ خاندان مغلیہ کا
بہادر شاہ تھا جو ۱۸۵۷ء میں قید کیا گیا اور لال قلعہ کی حکومت اس وقت اس کے اختیار میں تھی
میں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا۔ یہ انگریزوں کی دانشمندی تھی کہ خاندان مغلیہ کا احترام انھوں نے
بظاہر قائم رکھا تھا۔ ایک مرتبہ ایک تجویز اپیل صدر دیوانی عدالت آگرہ کی میں نے دیکھی تو معلوم
ہوا کہ کاغذات میں بہادر شاہ آنریری سب جج تھے اور لال قلعہ دہلی کے حدود ارضی تک ان کے
اختیارات محدود تھے۔ واقعات تو یہی کہتے ہیں کہ عالمگیر کے وفات کے ۱۶ برس کے اندر مغلوں کی
شہنشاہی کا نام و نشان نہ رہا البتہ انگریزوں نے عرصہ تک کاغذات میں اسے قائم رکھا اور
یہ انگریزوں کا احسان مسلمانوں پر ہے۔ اگر مرہٹوں اور سکھوں کے مقابلہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کھڑی
نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ اس انقلاب میں مسلمانان ہند کی وہی حالت ہوتی جو مسلمانان اندلس کی ہوئی

تھی یہ کہا جاتا ہے کہ عالمگیر نے سکھوں کو اتنا تنگ کیا تھا کہ وہ جنگ جو قوم ہو کر سلطنت مغلیہ کی تباہی کے باعث ہوئے۔ قوم کا بننا بگڑنا کارخانۂ قدرت کے متعلق ہے، عالمگیر نے سکھوں کو جنگ جو نہیں بنایا بلکہ فطرت نے بنایا! عالمگیر نے ان کے تیور دیکھکر اُن کو دبایا اور وہ ہمالیہ پہاڑ کی طرف بھاگ گئے اور عالمگیر کے عہد میں سلطنت مغلیہ کو کچھ گزند ان سے نہیں پہونچا۔ سلاطین مابعد سے اُن کی روک تھام نہیں ہوئی تو عالمگیر کا کیا قصور ہے؟ عالمگیر اگر نرمی کا برتاؤ کرتا تو جیتے جی وہ خود وہ دن دیکھتا جو اس کے جانشینانِ مابعد نے دیکھا۔

کہا جاتا ہے کہ مرہٹوں کو عالمگیر نے ناحق بہت پریشان کیا تو انھوں نے بھی مجبور ہو کر عالمگیر کو پریشان رکھا اور بالآخر سلطنت مغلیہ کو تباہ کر دیا۔ پچھلی بات ضرور صحیح ہے لیکن عالمگیر نے مرہٹوں کو ناحق پریشان کیا درست نہیں ہے اور نہ یہ درست ہے کہ مرہٹوں نے عالمگیر کو پریشان رکھا۔ امورِ سلطنت میں کسی بادشاہ کا منہمک رہنا پریشانی نہیں ہے۔ اسی پریشانی کا نام سلطنت ہے۔ جب تک یہ قائم ہے سلطنت قائم ہے جب یہ نہ رہی سلطنت نہ رہی۔ مختصر حال مرہٹوں کا یہ ہے کہ ساہو جی نام ایک چھتری تھا جو مغلیہ سلطنت میں بھی ملازم رہ چکا تھا۔ اور بیجاپور کی ریاست میں بھی ملازم تھا۔ اور اور بیجاپور کی نیم ٹھیکہ دار سے غاصب اجزاء ریاست ہو گیا تھا۔ کبھی مغلیہ سلطنت کا حامی اور کبھی بیجاپور کا طرفدار رہتا تھا۔ جہانگیر کے حکم سے شاہجہاں نے جب نظام شاہ کی فوج پر حملہ کیا تو ساہو جی شاہجہاں کے فوج میں تھا۔ اس کا بیٹا سیواجی باپ سے بڑھکر تھا۔ بیجاپور اور سلطنت مغلیہ دونوں سے مثل باپ کے کبھی دوستانہ اور کبھی معاندانہ تعلق رکھتا تھا اور اس پر غارت گری کا بھی عادی تھا۔ پہلے سیواجی نے سلطنت بیجاپور کا مقابلہ کیا اور پھر اس کے سپہ سالار افضل خاں کو صلح کرنے کے حیلے سے بلا کر قتل کیا۔ اس کے بعد عالمگیر کے مقبوضات پر یہ سمجھکر کہ عالمگیر خانہ جنگیوں میں مصروف ہے حملہ کرنا شروع کیا۔ عالمگیر کی فوج سے جنگ ہوئی بالآخر بے شکستہ سپہ سالار کے پاس بلاشرط سیواجی حاضر آیا اور عالمگیر کے دربار میں حاضر کیا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ عالمگیر نے اس کا احترام کم کیا اور میں یہ پوچھتا ہوں کہ وہی سلوک سیواجی کے ساتھ کیوں نہوا جو افضل خاں کے ساتھ سیواجی نے کیا تھا؟ سیواجی دربار عالمگیری سے بھاگ کر اپنے ملک میں پہونچا لیکن شاہی لشکر سے بھاگتا اور چھپتا پھرتا تھا۔ اور لوٹ مار سے اپنا خرچ چلاتا تھا۔ پہاڑوں کی وجہ سے مرہٹوں کو مثل سرحدی جرگوں کے زندگی بسر کرنا آسان تھا۔ سیواجی اسی حالت سراسیمگی میں مرا۔ اس کا بیٹا سنبھاجی اس کا جانشین ہوا۔ مغلوں سے وہ لڑتا رہا اور بالآخر گرفتار ہوا۔

اور قتل کیا گیا لیکن اس کا نابالغ بیٹا ساہو نہایت عزت واحترام سے دربار عالمگیری میں رکھا گیا۔ سیواجی کے بھائیوں نے اپنے ملک میں پیشۂ آبائی قائم رکھنا چاہا لیکن وہ گرفتار اور مقتول ہوئے اور اس طرح عالمگیر کے مرنے سے دو برس قبل مرہٹوں کی لوٹ مار سے دکن نے نجات پائی تھی۔ بعد عالمگیر کے کھوں کی طرح مرہٹوں نے بھی از سرنو زندگی پائی تو اس میں عالمگیر کا کوئی قصور نہ تھا بلکہ اس کے جانشینان مابعد کی غفلت تھی۔

عالمگیر پر یہ الزام ہے کہ اس نے باپ کو قید کیا اور بھائیوں کو قتل کروایا لیکن جہانگیر اور شاہجہاں نے اس خصوص میں جو کچھ کیا تھا وہ عالمگیر سے بھی بدتر تھا اور عالمگیر اپنے جانشینان سابق سے بہرحال بہتر تھا۔ اور اگر یوں دیکھا جائے کہ بادشاہ امین کی حیثیت رکھتا ہے۔ عالمگیر شاہجہاں کو بہتر امین نہ سمجھا اور جو کچھ اس نے کیا قوم کے فائدہ کے لئے کیا تو اخلاقی جرم بھی اس پر عائد نہیں ہوتا اور اگر عائد ہوتا بھی ہو تو جرم بہت خفیف ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ معزول باپ سے وہ نہایت ادب سے پیش آیا تھا۔ باپ کے صلاح ومشورہ سے سلطنت کا کام کرتا تھا۔ بھائیوں کے قتل کرنے میں اس نے خودرائی سے کام نہیں لیا بلکہ جو کچھ کیا شاہی عدالتوں کے ججوں سے استصواب کرکے کیا۔

ہندوؤں پر اس نے جزیہ قائم کیا اگر یہ امر ناراضی رعایا کا باعث کہا جائے تو واقعہ کے خلاف ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ہندو سپہ سالار برابر اس کی جاں نثاری پر پھر بھی قائم رہے۔ جزیہ کا رواج ابتدائے اسلام میں بھی تھا اور پھر بھی اسلام کی ترقی آپ اپنی نظیر تھی۔ غیر مذہب والے مذہب جزیہ دینے سے فوجی خدمت جبریہ سے بچے ہوئے تھے۔ اس لئے جزیہ دینا غیر مذہب والوں پر جبر نہ تھا۔ جزیہ لینے سے سلطنت عالمگیری میں ضعف نہیں آیا بلکہ عالمگیر کے بعد جزیہ کا بند ہونا ایک طور پر ضعف سلطنت کا باعث ہوا۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ نادرشاہ کے حملے نے مغلیہ سلطنت کی پورے طور پر بیخ کنی کی اور شہنشاہی کے بعد شاہی کی حیثیت جو قائم تھی وہ بھی نہ رہی نادرشاہ نے اپنے حملے کے وجوہ میں اپنے سپاہیوں کے سامنے ہند میں احکام اسلامی کے عدم پیروی بیان کی تھی اور بطور مثال کے یہ کہا تھا کہ محمد شاہ نے جزیہ بند کرکے احکام اسلام کی توہین کی ہے۔ اگر جزیہ بند کرکے محمد شاہ نے ہندوؤں کو خوش کیا تھا تو ہندوؤں نے نادرشاہ سے محمد شاہ کو کیوں نہ بچایا؟ جزیہ کا جاری کرنا عالمگیر پر فرض تھا یا نہ تھا یہ ایک جداگانہ بحث ہے لیکن یہ کہنا کہ جزیہ جاری کرکے عالمگیر نے ہندوؤں کو ناخوش کیا اور ہندوؤں کی ناخوشی سے سلطنت مغلیہ ضعیف ہوئی۔ ایک بے سروپا امر ہے۔

یہ بھی غلط ہے کہ راجپوتوں کو عالمگیر نے مخالف بنایا اُس وقت سب سے قوی تر جسونت سنگھ تھا اس دارا شکوہ کے اشارے سے عالمگیر سے مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ عالمگیر نے تخت پر بیٹھکر اُس کا قصور معاف کیا اور اپنی فوج کا سپہ سالار اُسے مقرر کیا۔ سپہ سالاری کے زمانہ میں عین حالتِ جنگ میں یہ عالمگیری فوج سے علٰحدہ ہوکر شجاع سے جا ملا۔ میدان عالمگیر کے ہاتھ آیا اور عالمگیر نے اس کی خطا پھر معاف کردی۔ پھر سیواجی کے مقابلہ میں بھیجا گیا تو سیواجی ایسے دشمن سلطنت مغلیہ سے رسم دوستی قائم کی۔ اس کے بعد عالمگیر نے کابل کی مہم میں اسی جسونت سنگھ کو سپہ سالار مقرر کیا پھر اس کے مرنے پر اس کے دو نابالغ بیٹوں کو دربار شاہی میں بلاکر عالمگیر نے مطابق دستور خاندان مغلیہ منصب اور ریاست اور خطاب عطا کئے۔ باوجود ان مراعات کے راجپوت ان لڑکوں کو دربار شاہی سے خفیہ طور سے نکال لے گئے اور علم بغاوت بلند کیا۔ ان واقعات کے ہوتے ہوئے عالمگیر پر کوئی منصف مزاج کیوں کر اعتراض کرسکتا ہے؟

۲۵ سنہ جلوس کے بعد عالمگیر برابر دکن میں رہا اور اس کی فوج میں مثل مسلمانوں کے چھتری بھی تھے اور بڑے بڑے عہدوں پر آخیر تک رہے۔ عالمگیر کے ہندو افسروں کی فہرست دیکھئے تو آخیر تک اس میں مرہٹے اور راجپوت نمایاں عہدوں پر نظر آتے ہیں۔ یہ کہنا کہ ہندوؤں کو عالمگیر نے ناخوش کردیا تو ہندوؤں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا واقعات سے چشم پوشی کرنا ہے۔

ایک الزام عالمگیر پر ہندوؤں کی عبادت گاہوں کا گرانا بھی ہے۔ یہ الزام فی الواقع شاہجہان پر عائد ہونا چاہیئے تھا لیکن تعجب ہے کہ شاہجہان نیک نام ہے اور عالمگیر بدنام ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے شاہجہان کی بے جرمی بیان کی جائے۔ عالمگیر کی برأت بھی اسی کے طفیل میں ہوجائیگی اصل امر کے بیان کرنے کے قبل اُس زمانہ کا نقشہ کھینچنا چاہیئے جب یہ واقعات ہوئے اُس وقت کے ہندوؤں کے خیالات اس زمانہ کے ہندوؤں کے خیالات سے بالکل جدا تھے۔ ہندوؤں نے جب مسلمانوں کو لڑکیاں دیں اور وہ اپنے مذہب پر قائم رہ کر ولی عہدِ سلطنت جنیں تو یہ خیال کرنا کہ مسلمانوں کی عورتیں مسلمان رہ کر ہندوؤں کی منکوحہ بی بیاں نہ بنی تھیں خلاف قیاس ہے۔ واقعات شاہد ہیں کہ شاہجہان کے وقت میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ ناجائز طریقۂ مناکحت جاری تھا۔ مسلمان عورتیں ہندوؤں کی بی بیاں بن کر بوجہ اپنی تہذیب کے شوہروں کے دلوں پر قبضہ پا تی جاتی تھیں اور نتیجہ لازمی یہ تھا کہ جہاں عورتوں کا قبضہ مردوں کے دلوں پر تھا وہاں ان کی عبادت گاہوں پر بھی تھا یہ تو مشہور ہے کہ جہان گیر کے اخیر عہد تک مسجدیں ویران تھیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بت کدے

آبادتھے۔ نہ وہ آباد تھیں نہ یہ آباد تھے۔ دونوں فریق اس بارے میں آزاد تھے اور مذہبی خیال دل تو سے جاتا رہا تھا۔ مدرسوں کی یہ کیفیت تھی کہ دارا شکوہ کی تقلید مسلمانوں میں جاری تھی دور دور سے مسلمان ہندوؤں کے معبدوں میں سنسکرت پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ اسے نہ صرف با اثر مسلمان ناپسند کرتے تھے بلکہ ذی فہم ہندو بھی برا سمجھتے تھے۔ آج اگر انگریزی سکولوں اور کالجوں کو چھوڑ کر ہندوؤں کے لڑکے پنڈتوں کی درس گاہیں آباد کریں تو ملک میں واویلا مچ جائے۔ بہت سے جدید مندر شاہی زمینوں پر ملک میں بن گئے تھے۔ ان مندروں میں عبادت الٰہی کا اتنا چرچہ نہ تھا جتنا کہ پولیٹیکل مباحث کا تھا۔ مذہب کے خیالات کم تھے اس لئے پولیٹیکل مباحث کے یہ مقامات تھے۔ شاہجہاں نے ان مسجدوں کی از سر نو تعمیر ہونے کا حکم دیا جو مسمار ہو کر بت خانے یا خانگی مکانات میں شامل ہو گئی تھیں اور ان مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضہ سے نکالنے کا حکم دیا جن کے خاوند مسلمان ہوجانا پسند نہ کرتے تھے اور ان مندروں کے گرانے کا حکم دیا جو جدید تعمیر ہوئے تھے۔ ان احکام کی وجہ سے ایک انقلاب عظیم ہوا۔ صوبہ دارالہ آباد کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷۸ مندر تو صرف بنارس میں گرائے گئے لیکن یہ سب مندر جدید تھے۔ اور ان کے گرانے سے ذرا ہندو ناخوش نہ ہوئے اور نہ شاہجہاں متعصب مسلمان مشہور ہوا۔ عالمگیر نے صرف دو مندر گروائے ایک مندر قدیم بنارس کا اور دوسرا مندر جدید جو ابو الفضل کے مغرورقہ دولت سے ایک ہندو راجہ نے بمقام متھرا جہانگیر کے حکم سے بنوایا تھا۔ عالمگیر نے یہ ابتدائے سلطنت میں کیا تھا جب دارا شکوہ کے ساتھیوں کا زور تھا اور غالباً ان مقامات میں دارا شکوہ کے (ہندو اور مسلمان) خیر خواہوں کے جمع ہونے اور عالمگیر کے خلاف ان کے سازش کرنے کا احتمال تھا۔ اگر یہ مصلحت نہ تھی تو عالمگیر دیوانہ نہ تھا کہ احکام مذہب اسلام کے خلاف ذمیوں کی عبادت گاہوں پر مداخلت بے جا کر کے گنہگار ہوتا اور اصول جہانداری کے بھی خلاف کرتا۔ عالمگیر نے ہندوؤں کے مندروں میں مسلمان بچوں کا پڑھنا بند کروا دیا۔ اس لئے کہ وہ مسلمانوں کو دارا شکوہ کی سی تعلیم دینا پسند نہیں کرتا تھا اور ان میلوں کو جو برائیوں کے سرچشمہ تھے وہ سلطنت کے روپیہ سے بارونق بنانا نہیں چاہتا تھا۔ ان میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے میلے شامل تھے۔ ملکی اصلاح سے اسے تعلق تھا مذہب کو اس میں دخل نہیں تھا۔

عالمگیر کے عہد میں جو لڑائیاں ہوئیں وہ ملک گیری کے لئے نہ تھیں محض ضرورت ملکی کے لئے تھیں۔ جس طرح عالمگیر راجپوتوں اور مرہٹوں سے لڑا بیجاپور اور حیدرآباد کے بادشاہوں سے بھی لڑا۔ بیجاپور اور حیدرآباد کی ریاستیں عالمگیر کا زور توڑنے کے لئے مرہٹوں کو برابر مدد دیتی تھیں

مرہٹوں کا برباد کرنا جس طرح عامۂ خلائق کے فائدے کے لئے ضروری تھا اُسی طرح بیجاپور اور حیدرآباد کی سلطنتوں سے لڑنا بھی ضروری تھا۔

ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی

حشرِ جذبات

ناواقفِ حقیقت محشر طراز ہوجا — بے راز اس قدر بن دنیائے راز ہوجا
محوِ جمال ہوکر صرفِ گداز ہوجا — یعنی کہ آپ اپنی تو شرحِ راز ہوجا
حسرت کدے میں دل کے سامانِ صد تپش ہے — او محوِ خوابِ غفلت! صرفِ گداز ہوجا
یا سر سے لے کے پا تک خود شوق و آرزو بن — یا شوق و آرزو سے تو بے نیاز ہوجا
وجہ سکوں ہے تو ہی دلہائے خوں شدہ کی — ہاں شانِ بے نیازی مصروفِ ناز ہوجا
چشمِ جہاں میں گھر کر لے سعی امتیازی — یعنی کہ گردِ راہِ راہِ حجاز ہوجا
ہے تجھ سے بود عالم اے ناشناسِ معنی — درماندگی کا اپنی خود چارہ ساز ہوجا
فطرت کا ذرہ ذرہ تیرا ہی منتظر ہے — بزمِ جمود سے اُٹھ ہنگامہ ساز ہوجا

ثاقب پڑا ہے تجھ بن مدہوش اہلِ دل ہیں
ہاں جلوۂ حقیقت ہنگامہ ساز ہوجا

مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری

جذباتِ حسرت

حال کیا اُن سے بار بار کہیں — نہ سُنیں گے وہ، ہم ہزار کہیں

دل کے زخموں کا جب حساب نہ ہو — کیا کہیں گر نہ بے شمار کہیں

مر مٹے ہیں اسی لئے کہ ہمیں — شاید اپنا وہ جاں نثار کہیں

مایۂ عیش بھی ہے غم کی خلش — اب اسے گل کہیں کہ خار کہیں

شاہِ خوباں کہ دزدِ رہزنِ دل — کیا تجھے اے نقاب دار کہیں

تا کجا یادِ یار سے شبِ غم — قصۂ دردِ انتظار کہیں

روئے جاناں کے عاشقوں کو نہ کیوں — لوگ دیوانۂ بہار کہیں

اُن کی آنکھیں اگر کہیں تو غضب — دل کا افسانۂ شکار کہیں

نامرادی مراد ہے حسرت
جب تمھیں خود وہ خامکار کہیں

مرسلہ
بیگم حسرت موہانی از کانپور

جیریمی بنتہم کا فلسفۂ اخلاق

یا

افادیت

—— گزشتہ سے پیوستہ ——

محرکات بذات خود نیک و بد نہیں

تکالیف اربعہ کے ضمن میں ہم نے ان قوائے موثرہ کا ذکر کیا تھا جو انسان کو خاص طرح سے عمل کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس امر کا تو ہمیشہ کے لئے تصفیہ کر دیا گیا کہ انسان کا ہر فعل کسی نہ کسی لذت یا الم کا نتیجہ ہے وہ یا تو حصول لذت کے لئے عمل کرتا ہے یا دفع الم کے لئے۔ لذت و الم ہی عمل کرنے کی تحریص و ترغیب دیتے ہیں اور اس سے باز رکھتے ہیں یعنی ہمارے محرکاتِ عمل صرف لذت و الم ہی ہیں، ہر ایک عمل صرف اس لئے ظہور میں آتا ہے کہ وہ کسی لذت یا مسرت کی تزئید و بقا کا باعث ہے یا کسی الم کے دفع یا خفا کا سبب، غرض لذت و الم ہی مختلف شئون و احوال میں ہمارے محرکاتِ عمل بنتے ہیں؟

اب لذت بذاتِ خود "خیر" یا اچھی ہے، صرف اتنا ہی نہیں اگر لذت الم کی آمیزش سے پاک ہو تو یہ "خیر واحد" ہے۔ اس کے سوا کوئی اور چیز "خیر" کہلانے کی مستحق نہیں۔ الم بذات خود "بد" ہے اور درحقیقت صرف یہی ایک "شر" ہے نیک و بد یا خیر و شر کے سوا اس کے کوئی اور معنی نہیں ہو سکتے

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ لذت و الم ہی صرف ہمارے محرکاتِ عمل ہیں۔ اب ہم اگر صرف لذت ہی کو واحد محرک عمل قرار دیں تو کوئی خلاف بیانی نہیں ہوگی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر عمل محض دفع الم کے لئے کیا جاتا ہے، ہم اپنا ہر ایک کام آلام سے بچنے کی خاطر کرتے ہیں۔ لہٰذا ہر فعل کی علتِ محرکہ صرف لذت ہی کا تصور ہے یہی تصور ہر عمل و فعل کی تحت پایا جاتا ہے اب اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ لذات بذات خود بنفسہا خیر محض ہے لہٰذا ناگزیر و نا مدفوع طور پر نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی محرک بذات خود بد نہیں۔ فتدبر۔

اگر محرکات کو نیک و بد کہا جاسکتا ہے تو صرف ان کے نتائج و عواقب کی بنا پر، اگر وہ تزئید مسرت و لذت و ادفاع الم و کربت کا میلان رکھتے ہوں تو ہم انھیں "نیک" یا "خیر" کہیں گے ورنہ "بد"
اس مقدمہ کی توضیح و تفصیل کے لئے کہ کوئی محرک بذات خود بد نہیں، صرف نتائج و عواقب پر اس کی نیکی و بدی کا انحصار ہے۔ مندرجۂ ذیل مثالوں پر غور کرو۔

ایک طالب علم تفریح خاطر کے لئے کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا محرک عمل ظاہر ہے کہ نیک کہلایا جائیگا یا کم از کم بُرا تو نہیں، پھر یہی لڑکا اسی خاطر اپنی ٹوپی گھمانے لگتا ہے، یہاں پر بھی اس کا محرک "بد" نہیں کہلایا جائے گا۔ پھر وہ اسی محرک کے زیر اثر ایک وحشی اور ضرر رساں جانور کو مجمع عام میں چھوڑ دیتا ہے اب اس کا محرکِ عمل قابل نفرین قرار دیا جائے گا، مگر ذرا غور تو کرو کہ کیا ان تینوں حالتوں میں اس کا محرک ایک نہیں؟ اور کیا وہ تفریح طبع نہیں؟

کسب زر کی خاطر تم ایک مالدار کے جانی دشمن کو قتل کر دیتے ہو اور اس طرح اس کی نار حقد کو بجھاکر طلبِ زر میں کامیاب ہوتے ہو، اسی محرک کے زیر اثر تم کسی امیر کسان کے کھیت کی حفاظت کرتے ہو اور اس طرح اس کو خوش کر کے اپنا مقصد حاصل کرتے ہو، دونوں حالتوں میں تمھارا محرک ایک اور وہی ہے یعنی "کسب زر" مگر حالتِ اولیٰ میں تمھارے محرک کو تباہ کن طمع کہا جائے گا اور حالت ثانیہ میں اس کو محنت اور جفاکشی قرار دیا جائے گا اور وہ لائق تحسین کہلائے گا، مگر ذرا غور تو کرو کہ کیا دونوں حالتوں میں تمھارا محرک ایک نہیں؟ اور کیا وہ کسب زر نہیں؟

تمھاری شادی ہونے کے پہلے تم اپنے محبوب کو خوش کرنے کے لئے جو کچھ تمھارے امکان میں ہوتا ہے اور تمھارے فرائض کے خلاف نہیں ہوتا کر گزرتے ہو۔ اس حالت میں تمھارا محرک قابل تعریف کہلایا جاتا ہے۔ بالکل اسی خاطر تم ایک بے گناہ کو زہر دیتے ہو تاکہ تمھارے "منظور نظر" کے بدخواہ سے صفحۂ گیتی خالی ہوجائے۔ اس حالت میں تمھارا محرک حقارت اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے۔ کسی امیر کی نظر عنایت کو طلب کرنے کے لئے تم اپنی تمام خواہشات کو اس کے لذات پر قربان کر دیتے ہو فرض کرو کہ اس کی یہ لذات جائز لذات ہیں تاہم لوگ تمھاری اس رویہ کو چاپلوسی اور خوشامد کے سوا اور کچھ نہ کہیں گے مگر ذرا غور تو کرو کہ کیا ان تینوں حالتوں میں تمھارا محرکِ عمل ایک نہیں؟ اور کیا وہ "طلب عنایت" کی کوشش نہیں؟

تم کسی مالدار کے مکان پر ڈاکہ ڈالتے ہو وہ تم کو گرفتار کر کے مقدمہ چلاتا ہے اور قید کی سزائے سخت دلواتا ہے۔ تم قید سے رہا ہو کر اس پر وحشیانہ حملہ کرتے ہو اور قتل کر دیتے ہو، اس حالت میں تمھارا محرک

عام طور پر بالکلیہ نہایت بد کہلائے گا اور ظلم عدالت، بزدلی کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ ایک شخص تمہارے یہاں سے کچھ روپیہ چرا تا ہے، تم جذبہ انتقام سے مغلوب ہو کر اس پر عدالتی مقدمہ دائر کرتے ہو اور سزائے سخت دلواتے ہو۔ تمہارے محرک کو بعض تو قابل تعریف کہیں گے اور بعض قابل توبیخ تمہارے دوست اس کو "پبلک سپرٹ" کہہ کر لائق تحسین بتلائیں گے اور تمہارے دشمن ظلم و تشدد کہہ کر قابل نفرت قرار دیں گے۔ ایک شخص تمہارے باپ کو قتل کر دیتا ہے تم اس کو قانوناً قابل قتل قرار دیتے ہو۔ چنانچہ اس شخص کو پھانسی دیدی جاتی ہے۔ اس حالت میں تمہارا محرک کا یہ طور پر قابل داد و ستائش قرار دیا جاتا ہے، مگر ذرا غور کرو کہ کیا ان تینوں حالتوں میں تمہارا محرک ایک اور وہی نہیں؟ اور کیا وہ بدخواہی (malevolence) نہیں؟

امثلہ مذکورۂ صدر ہمارے دعوے کے اثبات کے لئے کافی ہیں کہ کوئی محرک بذاتہ بد و نیک نہیں۔ جب وہ اپنے نتائج و عواقب کی طرف مودی ہوتا ہے جو ضرر رساں اور مولم ہوتے ہیں تو وہ "بد" کہلاتا ہے اور جب لذت بخش اور فائدہ دہ نتائج کی طرف موصل ہوتا ہے تو "نیک"!

محرکات میں اہمیت کے لحاظ سے ترتیب محرکات میں اہمیت کے لحاظ سے ترتیب قائم کرنا زیادہ ضروری امر ہے ان تمام بے شمار محرکات عمل میں جس محرک واحد کے احکام اصول افادیت کے سب سے زیادہ موافق و مطابق ہیں وہ ارادہ خیر یا خیر خواہی کا محرک ہے۔ کیونکہ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ افادیت کا حکم ناطق تمام تر خیر خواہی بنی نوع پر منحصر ہوتا ہے اس کی غایت قصوی نوع انسان کا افادہ ہے جس کی تحقیق کا بہترین ذریعہ "خیر خواہی" کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ دوسرے محرکات کے احکام ممکن ہے کہ اصول افادیت کے موافق ہوں یا مخالف مگر "ارادہ خیر" یا "خیر خواہی" کا محرک اکثر و بیشتر حالات میں افادیت کی طرف مودی ہوتا ہے مگر یہاں پر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہماری خیر خواہی کا دائرہ اس قدر تنگ یا محدود نہیں کہ وہ زیادہ وسیع تر خیر خواہی سے ٹکرا جائے۔ ہم ایک بڑی جماعت کے ساتھ خیر خواہی کر سکتے ہیں اور ایک چھوٹی جماعت کے ساتھ بھی، جب ہم فتنۂ قلیلہ کی بہبودی کو فتنۂ کثیرہ پر ترجیح دیں تو ہمارا محرک عمل خیر خواہی کہلائے جانے کا مستحق نہیں رہے گا بلکہ وہ کسی اور نام سے پکارا جائے گا مثلاً "پارٹی فیلنگ"۔

خیر خواہی کے بعد جس محرک کے احکام اصول افادیت کے زیادہ موافق ہوتے ہیں وہ شہرت پسندی ہے، حب شہرت ہم سے بہت سے افعال ایسے کرواتی ہے جو افادۂ عام کی طرف مودی

ہوتے ہیں۔ شہرت پسندی کا محرک بسا اوقات عظیم الشان ایثار اور قربانی نفس کا باعث ہوتا ہے۔ زمانہ حال کے اکثر زعیم اور "سرابنوہ" کا طرز عمل ہمارے بیان کا بین ثبوت ہے۔ ہم نے شہرت پسندی کے محرک کو خیر خواہی کے محرک سے اس لئے ادنیٰ و کمتر قرار دیا ہے کہ اول الذکر کا تسلط ہمارے افعال مخفیہ پر نہیں ہوتا یہ ان ہی افعال پر اثر ڈالتا ہے جو دیدۂ عوام کے روبرو آتے ہیں۔ ایسے افعال محرک شہرت پسندی کی وجہ سے اصول افادیت کے مطابق ہوتے ہیں مگر باطنی اور پوشیدہ افعال پر تو صرف "خیر خواہی" کا محرک ہی اثر ڈال سکتا ہے۔ لیکن یہ امر کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ شہرت پسندی کا محرک بھی بسا اوقات ہم میں جذبۂ خیر خواہی کو پیدا کر دیتا ہے جب ہم سے ایک عرصہ دراز تک اسی محرک کے زیر عمل فائدہ بخش افعال سرزد ہوتے رہتے ہیں تو ہم میں عادت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ہمارے ظاہر و مخفی افعال ہر دو اصول افادیت کے موافق ہونے لگتے ہیں۔

اہمیت کے لحاظ سے تیسرا محرک دوستی یا محبت ہے۔ ظاہر ہے کہ افادہ بخش افعال کا ایک زبردست سبب باہمی محبت یا دوستی ہے یہ ایک لحاظ سے تو شہرت پسندی کے محرک سے بھی زیادہ موثر ہے مگر شہرت پسندی کی وجہ سے خود افعال سرزد ہوتے ہیں ان کا فائدہ بڑی تعداد کو پہنچتا ہے، برخلاف اس کے دوستی کے محرک سے محدود تعداد کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مگر جوں جوں ہمارے احباب کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اور ہماری خواہش خلّت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے، اسی مناسبت سے افادہ کا اثر بھی عام اور وسیع ہوتا جاتا ہے۔ دوستی کے محرکات کو حب شہرت کے محرکات پر ایک اور تفوق حاصل ہے اور وہ یہ کہ ان کا اثر انسان پر مدۃ العمر رہتا ہے۔ برخلاف اس کے ثانی الذکر محرکات انسان کی زندگی کے ایک حصے میں بے اثر ہو جاتے ہیں جب کہ وہ اغراض ذاتیہ کے نہ ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد کی فائدہ رسانی کے خیال سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

ان محرکات ثلثہ کے بعد مہتم "احکام مذہب" کو رکھتا ہے جو اپنے تنوع اور کثرت کے باعث بالاستحصار ناقابل بیان ہیں اور احکام مذہبی کے محرکات کی صحیح حیثیت اور مرتبت سے بھی واقف ہونا ایک مشکل امر ہے بہرحال اگر وہ ہستی مطلق جو مذہب کی معبود مانی جاتی ہے کلیہ طور پر اسی قدر فیاض مانی جاتی جس قدر کہ وہ قدیر اور حکیم سمجھی جاتی ہے تو پھر مذہب کے احکام پوری طرح افادیت کے مطابق اور موافق ہوتے۔ یقیناً اصول افادیت اور احکام مذہبی میں کسی قسم کا تخالف و تضاد نہ پایا جاتا اگر اس ہستی برتر کے خیر خواہی اور فیاضی کے متعلق ہمارے تعقلات اسی قدر صحیح اور درست ہوتے جس قدر کہ اس کی حکمت اور قدرت کے متعلق ہیں مگر سیہ بختی سے یہ حالت نہیں وہ عام طور پر ہمہ توان اور قادر مطلق تو مانی جاتی

ہے، کیونکہ کون ایسا ہے جو خدا کو مدبر ہمہ امور، ہمہ داں اور علام الغیوب نہ مانتا ہو، مگر شیدایانِ مذہب میں بہت ہی کم ایسے نظر آتے ہیں جو خدا کی فیاضی اور کرم کے سچے اور حقیقی طور پر قائل ہوں وہ زبان سے تو اس کو فیاضِ ازلی اور کریم مطلق کہتے ہیں مگر درحقیقت وہ اس کے قائل نہیں ہوتے، کیونکہ یہ ایک حقیقت مبرہنہ ہے کہ اگر وہ خدا کو فیاض یا خیر خواہ بنی نوع انسان یا کریم مان لیں تو وہ بلاشک اور بلا پس و پیش اس امر کو تسلیم کر لیں گے کہ مذہب کے احکام و ہدایات سے ذرہ برابر بھی مخالف نہیں ہو سکتے، مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ ہزار دفعہ اصول افادیت کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ یہ ہر جگہ دیکھا جاتا ہے کہ مذہب کے احکام میں بعض ایسے اصول بھی موجود ہوتے ہیں جو افادیت کے سراسر خلاف ہیں۔ یہ ایسے احکام ہیں جو یا تو خود نفس انسانی کی تصدیع کا باعث ہوتے ہیں یا افرادِ جماعت کے ضرر و فساد کا سبب، بالفاظ دیگر بعض وقت مذہب ہم سے ایسے افعال و احکام کی تعمیل کی جو فرد اور جماعت ہر دو کے لئے ضرر رساں اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے سنیاسی اور قرونِ وسطیٰ کے قسیس اور راہب اپنے طرزِ عمل سے ہمارے بیان کی تائید کرتے ہیں، وہ اپنے جسم کو صریح آزار پہنچاتے تھے اور پہنچاتے ہیں اور یہ محض مذہب کی خاطر! مذہبی جنگ کتنا تو فساد برپا کرتے ہیں اور مذہبی سزاؤں پر غور کرنا ہو تو اٹلی کے محکمہ احتساب (انکیوزیشن) پر نظر ڈالئے، ان ہی محرکات مذہبی سے مظلوم دنیا نے وہ وہ مظالم شنیعہ برداشت کئے ہیں کہ مذہب کا معبود ہی خوب جانتا ہے!

محرکاتِ مذہبی کو محرکاتِ شہرت پسندی پر ایک طرح وہی تفوق اور برتری حاصل ہے جو محرکاتِ خیر خواہی و نیک اندیشی کو میسر ہے، ان کا اثر مخفی و باطنی افعال و اعمال پر بہ نسبت محرکات حب شہرت کے بہت زیادہ قوی ہے۔

خوش قسمتی سے احکام مذہبی رفتہ رفتہ اصول افادیت کے مطابق ہوتے جا رہے ہیں بدترین مذاہب کے افراد بھی ماحول سے متاثر ہو کر غیر شعوری طور پر اپنے افعال و اقوال میں اصول افادیت کے موافق تغیر و تبدیل کو راہ دے رہے ہیں، تاویل و تسویل ہی سے کام لے کر وہ اپنے خزینۂ مذہب کو افادیت کے جواہر درخشاں سے مزین کر رہے ہیں۔ اگر ان کے مذہبی احکام اور افادۂ خلائق میں بین اور واضح تضاد واقع ہوتا ہے تو وہ اپنے مذہبی احکامات میں تاویل کر کے ایسے پہلو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ ظاہری تضاد و تناقض غائب ہو جائے اور احکام دین احکام افادیت میں شامل ہو جائیں!

تنازع محرکات

محرکات میں اہمیت کی لحاظ سے ترتیب بتلانے کے بعد بنتھم ان کے تنازع اور پیکار کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جب انسان کسی فعل کے ارتکاب کا ارادہ کرتا ہے تو

بسا اوقات مختلف و متعدد محرکات اس پر اپنا اثر ڈالتے ہیں، ایک محرک تو اس کو اپنے جانب کھینچتا ہے اور دوسرا اس کو کسی اور جانب راغب کرتا ہے، بعض تو اس ارتکاب عمل پر آمادہ کرتے ہیں اور بعض اس سے باز رہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ غرض انسان کے سینہ میں محرکات کی پیکار رہتی ہے، جہاں کسی فعل کے ایک سے زیادہ محرکات ہوئے کہ ان میں یہ تنازع اور تعارض شروع ہو جاتا ہے۔ ہر اس محرک کو جس کا اثر انسان کو ارتکاب فعل پر آمادہ کرتا ہے "محرک محرص" کہہ سکتے ہیں اور جو ارتکاب عمل سے باز رکھتا ہے وہ "محرک مجنب" کہلایا جا سکتا ہے۔

ہم ایک مثال کے ذریعے سے ان متعدد و متنوع محرکات کے تنازع و تعارض کو واضح کر سکتے ہیں، اس زمانہ میں جب کہ کیتھولک فرقہ کے نزدیک پروٹسٹنٹ گروہ کو نسیاً منسیاً کر دینا ایک کار خیر سمجھا جاتا تھا، فرانس کے حکمران چارلس نہم نے کرین کو جو کیتھولک تھا اور جری تھا حکم دیا کہ کالگنی کو جو ایک پرجوش پروٹسٹنٹ تھا غفلت میں قتل کر ڈالے۔ کرین نے مودبانہ طریقہ پر جواب دیا کہ وہ اس بزدلانہ طریقہ سے تو اس کو قتل نہیں کر سکتا مگر دلیرانہ طور پر کھلے میدان میں اس سے مقابلہ کرنے کو تیار ہے۔ یہاں پر غور کرنے سے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ مذکورۂ بالا تکالیف ثلاثہ مع تکلیف سیاسی کے اس شخص پر اپنا پورا پورا اثر ڈال رہے تھے اور اس کے سینہ میں ایک عجیب و غریب پیکار جاری تھی۔ تکلیف سیاسی یعنی چارلس کا حکم اس کو مجبور کر رہا تھا کہ غفلت کے وقت کالگنی کو قتل کر دے۔ تکلیف مذہبی کا یہ حکم تھا کہ کسی طرح سے اور کسی نوعیت سے بھی اس کو فنا کر دے، تکلیف اخلاقی اور حب شہرت کا یہ مشورہ تھا کہ حریف سے برابر کا مقابلہ کیا جائے اور حیلہ مکر و فریب و خدع سے پرہیز کیا جائے، خیر خواہی عامہ کا بھی محرک سرگرم عمل تھا اور اس کو اس امر کی تحریص و ترغیب دے رہا تھا کہ اس کی جان ہی کسی طرح سے نہ لی جائے۔ غرض کہ تنوع اور متلون محرکات کے تنازع نے کرین کو کچھ عجیب مخمصہ میں الجھا رکھا تھا اور بقول ایک شاعر کے کہ ؎

دو گونہ رنج و عذاب ست جان مجنون را

اس کی جان کچھ عجیب عذاب میں گرفتار تھی، بہرحال واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کرین نے عزت یا حب شہرت کو ترجیح دی اور محرکات خیر خواہی پر کاربند ہوا۔ کیونکہ اس نے اول الذکر محرکات پر کاربند ہوتے ہوئے کالگنی کو نبرد آزمائی کے لئے دعوت دی، مگر جب یہ قبول نہ کی گئی تو محرکات پر عمل کرتے ہوئے اس نے دامن امن میں پناہ لی اور ارادۂ قتل سے باز آیا۔

اخلاقیات خانگی اور فن قانون سازی اخلاقیات خانگی (پرائیویٹ ایتھکس) اور فن قانون سازی

(آرٹ آف پبلیچر) کا مختصر ذکر بنتھم کے نظریۂ اخلاق کو کامل کردے گا۔
وسیع طور پر اخلاقیات کی اس طرح تعریف کی گئی ہے کہ یہ وہ فن ہے جو افعال واعمال انسانی کو ان افراد کی بڑی سے بڑی ممکنہ مقدار مسرت کے حصول کی طرف رہبری و ہدایت کرتا ہے جن کی مسرت ہیں مطلوب ومقصود ہوتی ہے۔ اب یہ افعال یا تو خود فاعل کے ہونگے یا دوسروں کے۔ جب اخلاقیات خود فاعل کے افعال واعمال کی اس غایت کے حصول کے لئے رہبری کرتی ہے تو وہ اخلاقیات خانگی کہلاتی ہے۔ دوسروں کے افعال سے مراد حیوانات اور دیگر بنی نوع آدم کے افعال ہیں۔ حیوانات کی مسرت اور آرام دہی کا خیال نہایت اہم اور قابل لحاظ ہے اور اس پر ہمہ تن رحم بنتھم نہایت زور دیتا ہے۔ نہایت درد بھرے دل سے وہ کہتا ہے کہ یہ ایک نہایت شرمناک عادت ہے کہ انسان نے حیوانات کو اب تک محض بے جان اور غیر ذی روح اشیاء کی طرح استعمال کیا ہے۔ مقننین نے کوئی ایسے قوانین وضع نہیں کئے جن میں ان کے رفع آزار اور آرام رسانی کا ذرّہ برابر بھی خیال پایا جاتا ہو۔ بے شک حیوانات میں "قوتِ نطق" نہیں۔ وہ قوت حجت و برہان نہیں رکھتے، مگر کیا ان میں قوت احساس بھی نہیں، کیا ان میں "حسیت" بھی مفقود ہے؟ ایک طفل شیر خوار میں نہ قوت نطق بالفعل ہے نہ قوت عقل! پھر ہم کس لئے اس کی مسرت اور آرام دہی کا خیال رکھتے ہیں؟

بنتھم حیوانات کا سچا اور حقیقی ہمدرد تھا، اسی کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انگلستان میں حیوانات کے متعلق بہت سے قوانین موضوع ہوئے اور وحشیانہ ظلم اور ناذی کو روا کیا گیا!

انسان کی مسرت کا انحصار اولاً خود اس کے کردار اور رویہ کے اس حصے پر ہوتا ہے جس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود ہے اور ثانیاً اس حصہ پر جو دوسروں کی مسرت پر اثر ڈالتا ہے۔ جہاں تک انسان کی مسرت خود اس کے رویہ پر منحصر اور مبنی ہوتی ہے اُس پر اس کی اپنی ذات کا ایک فرض یا حق عاید سمجھا جاتا ہے اور جس قوت یا صفت یا ملکہ راسخہ کا انسان اس فرض یا وجوب کے ادائی کے لئے استعمال کرتا ہے وہ دور بینی یا انجام اندیشی کہلاتی ہے اور جہاں تک اس کی مسرت کا دارومدار اس کے کردار کے اس حصے پر ہوتا ہے جو دوسروں کی مسرت پر اثر ڈالتا ہے وہ ایک اہم فرض کے زیر بار ہوتا ہے جس کو ہم اپنی اصطلاح میں حق العباد یا حق الجیران کہہ سکتے ہیں۔ اب ہم اپنے ہمسایہ کی مسرت کے تزئید و اضافہ کا خیال دو طریقوں سے رکھ سکتے ہیں: ایک تو طریقہ منفیہ کہلایا جاسکتا ہے اور دوسرا طریقہ مثبتہ! اول الذکر طریقہ کی رو سے ہم اس کی مسرت لذت و آرام کی کاہش کمی اور نقصان سے احتراز و اجتناب کرتے ہیں، ثانی الذکر کی رو سے ہم اس کی مسرت میں زیادتی اور اضافہ کی کوشش

اور سعی کرتے ہیں اس حق ہمسایہ کی طریقہ اول کے ادائی کا نام تدین "Probity" ہے اور طریقہ ثانیہ کے ادائی کا نام فیاضی "Beneficence" ہے!

یہاں پر ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر انسان صرف اخلاقیات خانگی ہی کی روسے اپنے افعال و اعمال کو حصول غایت قصوی کی طرف رجوع کرے تو پھر مسرت غیر کا خیال کن محرکات کی وجہ سے پیدا ہوگا؟ بالفاظ دیگر وہ کون سے قوائے موثرہ ہیں جو انسان کو تدین اور فیاضی کے احکام کی پیروی کے لئے مجبور کرتے ہیں، بظاہر کوئی ایسا موزوں و مناسب محرک تو دکھائی نہیں دیتا جو انسان کو اپنے اغراض و مسرت ذاتیہ کو دوسروں کے لذات و اغراض کے لئے ترک کرنے پر مجبور کرتا ہے؟ ہر شخص اپنی اپنی مسرت و لذت کا جویا ہوتا ہے اور یہ بالکل فطری امر ہے، مگر ذرا نظر امعان سے دیکھو تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ انسان کی ذات میں ایسے بھی محرکات ہیں جو اس کو اوروں کی مسرت طلبی کے لئے آمادہ کرتے ہیں مثلاً ہمدردی مواساۃ اور خیرخواہی کے محرکات اس میں ضرور پائے جاتے ہیں اور یہی اس کو بنی نوع کے فلاح و بہبود کی طرف راجع کرتے ہیں، ذرا اور عمیق النظری سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حب شہرت اور دوستی کے محرکات بھی ہر فرد بشر کو اپنے ہم جلیسوں کا خیرخواہ بنانے میں کافی ہیں۔ غرض غور کرنے سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ذات انسانی میں ایسے ہی محرکات بہت سے موجود ہیں جو نہ صرف اس کو خیرخواہ قوم بنا دیتے ہیں بلکہ اس امر پر بھی آمادہ کر دیتے ہیں کہ اپنے محبوب اغراض کو اوروں کے مسرت و لذات کی خاطر ترک کر دے۔ چنانچہ دوستی اور حب جاہ و شہرت ہی کے محرکات سے بہت سے ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جو اصول افادیت کے بالکل مطابق و موافق ہوتے ہیں۔

لیکن یہاں پر بنتہم یہ نہیں بتلاتا کہ آیا محرک مواساۃ و ہمدردی کا انحصار اس لذت و مسرت پر ہے جو اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے یا وہ اس لذت سے تعلق نہیں رکھتا۔ مگر اور مقامات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صورت آدمی ہی کی طرف مائل ہے اور ہمارے خیال میں اس کو اسی طرف مائل ہونا بھی چاہیے تاکہ وہ اپنے اصلی نظریہ سے متوافق رہ سکے۔

یہ تو معلوم ہو چکا کہ "اخلاقیات خانگی" اور "فن قانون سازی" ہر دو کی غایت قصوی مسرت ہے، ہر دو کا مقصد و منشاء افراد جماعت کی لذت کا حصول ہے۔ حتی کہ وہ اعمال و افعال بھی جن سے یہ ہر دو سروکار رکھتے ہیں بڑی حد تک ایک ہیں گو بالکلیہ ایک نہیں، کیونکہ ہر حالت میں فرد اپنے افعال کو یا تو اپنی ذاتی مسرت کی طرف راجع کرتا ہے یا بنی نوع کی مسرت کے حصول کی جانب، مگر برخلاف اس کے بہت سی ایسی حالتیں پائی جاتی ہیں کہ جن میں مقنن کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ ہر فرد کو

اس قسم کے افعال کی بجاآوری پر براہ راست یا بذریعہ سزا مجبور کرے، ہر فرد کو چاہئیے کہ وہ ہر اس فعل کو بجا لائے جو جماعت کے لئے اور خود اس کی ذات کے لئے افادہ بخش ہو، مگر مقنن اس کو اس امر پر مجبور تو نہیں کر سکتا کہ وہ اس قسم کے افعال کا ہر حالت میں ضرور ہی مرتکب ہو، اسی طرح ہر فرد کو چاہئیے کہ ہر اس فعل سے جو جماعت کے لئے آزار بخش اور مضرت رساں ہو اجتناب واحتراز کرے مگر مقنن اس کو ہر ایسے فعل کے ارتکاب سے روک نہیں سکتا۔ کما ہو ظاہر!

بات یہ ہو کہ قانون کا عمل درآمد صرف سزا ہی پر موقوف ہو، یہ اپنی غایت صرف سزا ہی کے ہی ذریعے سے حاصل کرتا ہی۔ مگر ہم بہت سی حالتیں ایسی بھی پاتے ہیں جہاں تکلیف سیاسی کا استعمال قطعاً ناممکن ہوتا ہی۔ لہذا یہاں پر قانون کی مداخلت ممنوع ہوتی ہی اور صرف اخلاقیات خانگی ہی اپنی سزائیں استعمال میں لاسکتی ہی۔ اس امر کے ذہن نشین کر لینے کے بعد ہم "اخلاقیات خانگی" اور "فن قانون سازی" کی وسعت اور دائرہ عمل کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ہم دقت نظر کے ساتھ ان حالات کا استقصا کریں جہاں قانون کا دخل ممنوع ہوتا ہی اور اخلاقیات ہی کا عمل درآمد ہوتا ہی تو ہمیں ایسی چار حالتیں نظر آئیں گی، اولاً جہاں سزا دہی بے بنیاد ہوتی ہی۔ ثانیاً جہاں وہ غیر موثر ہوتی ہی، ثالثاً جہاں وہ بے فائدہ ہوتی ہی۔ رابعاً جہاں وہ بے ضرورت ہوتی ہی۔

ان حالات میں جہاں سزا دہی بے بنیاد ہو ظاہر ہی کہ اخلاقیات کی مداخلت ہی ایک حد تک بے جا ہوگی جس طرح کہ قانون کی دست اندازی بے کار ہی، لہذا ان حالات میں نہ اخلاقیات کو دخل دینا چاہئیے نہ قانون کو۔

سزا ان حالات میں بالکل بے اثر ثابت ہوگی جہاں ارادہ کو منصہ ظہور پر آنے سے روکا نہیں جا سکتا مثلاً عالم جنون و دیوانگی میں یا حالت سکر میں جو قابل سزا و تعذیب اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ قانون کی گرفت سے باہر ہوتے ہیں۔ مجنون اور مرفوع القلم پر کون حد جاری کر سکتا ہی۔ مست اور بے شعور پر کون حکم اخلاقی لگا سکتا ہی۔ لہذا یہاں پر نہ قانون کی مداخلت ہو سکتی ہی اور نہ اخلاقیات ہی کا حکم چل سکتا ہی۔

ان حالات میں جہاں قانونی سزائیں بے فائدہ ثابت ہوتی ہیں اخلاقیات کی سب سے زیادہ ضرورت پیش آتی ہی اور اس کا عمل نہایت فائدہ بخش ثابت ہوتا ہی۔ پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئیے کہ قانونی تعذیب کن حالات میں غیر مفید ہوتی ہی؟ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہی کہ کم از کم دو حالتوں میں قانونی سزا کا استعمال صریحاً غیر مفید ہوتا ہی اولاً جب کہ گرفت وانکشاف جرم کی امید موہوم ہوتی ہی اور اس کے اثبات میں بہت زیادہ سختی سے کام لینا پڑتا ہی اور باایں ہمہ مجرم کی اصلاح ناممکن ہوتی ہی اسی وجہ سے

زنا اور حرام کاری قانون کے آہنی پنجہ سے ہمیشہ بچ جاتے ہیں، کیونکہ پہلے تو اس جرم سیاہ کی گرفت مشکل ہے اگر بفرض محال گرفت ہو بھی جائے تو اس کو پایہ ثبوت تک پہنچانا اور بھی مشکل! ثانیاً جہاں مجرم اور خاطی کے ساتھ غیر مجرم اور معصوم شخص کی گرفتاری اور ایذا دہی کا اندیشہ ہوتا ہے، اس قسم کے نازک حالات قانونی تعذیرات کے مفید کار ہونے میں سخت مخل ہوتے ہیں۔ اس اندیشہ کے پیدا ہونے کا اصلی سبب فعل مجرمانہ کے تصور کے تعین کا اشکال ہے۔ پر اس اشکال کے بھی دو وجوہ قرار دیئے جاسکتے ہیں، ایک تو مستقل جو خود افعال کی نوعیت اور ماہیت ہے، دوسری اتفاقی جو مقننین کی صفات و کیفیات کہلائے جاسکتے ہیں۔ اس اندیشہ کے دوسرے سبب کا انحصار مقنن اور حکم (جج) کے استعمال زبان پر ہوتا ہے، یعنی اگر یہ نوعیت جرم کو واضح مبرہن معین اور صاف وصریح الفاظ میں ادا کرسکیں تو یہ خوف اور اندیشہ بڑی حد تک دور کیا جاسکتا ہے۔ اسی اشکال کی وجہ سے اکثر مقننین نے بداخلاقی، بے وفائی، ناسپاسی اور دغابازی جیسے افعال کی قانوناً سزادہی سے اجتناب کیا ہے۔ اس طرح کے مبہم اور غیر واضح نوعیت والے افعال کو قانون کے تحت لانا یا تو اس امر کا ثبوت ہوگا کہ سوسائٹی ابھی اس ابتدائی حالت میں ہے کہ جب ان مشکلات کا بخوبی و بامعان نظر مشاہدہ نہیں کیا گیا ہے جو ان کے ساتھ پائے جاتے ہیں یا اس امر کی بین شہادت ہوگی کہ وہ ترقی اور کمال کے اس انتہائی زینہ پر پہنچ گئی ہے جہاں کہ ان تمام تعسرات و اشکالات کا دفعیہ ممکن ہوگیا ہے۔

"اخلاقیات خانگی" اور "فن قانون سازی" کے حدود، دوائر عمل اور تعلقات مابینی کو اور واضح اور صاف طور پر سمجھنے کے لئے بیان بالا پر "اخلاقیات عامہ" کی روشنی میں نظر ڈالنی چاہیئے۔ اڈمعرہم نے فرائض اخلاقیہ کے تین شعبے قرار دیئے ہیں، دُور اندیشی، تدین (پروبٹی) فیاضی (بی نی فی سنس) اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تینوں واجبات و فرائض قانون کی استعانت و مدد کے کہاں تک محتاج ہیں؟

فریضۂ اخلاق کے قواعد میں سے جو قواعد وضوابط کہ قوانین کی استمداد کے سب سے زیادہ کم محتاج ہیں وہ دُور بینی کے قواعد ہیں، ظاہر ہے کہ انسان اپنی ذات کے فرائض کی ادائیگی میں قوانین کے اجبار و اکراہ کا محتاج نہیں ہوتا، وہ اپنے نفس کو عمداً یا قصداً ضرر نہیں پہنچاتا اگر احیاناً وہ اپنے مضرت و نقصان کا آپ باعث ہوتا ہے تو یہ صرف حالات مودی الی المسرت کی غلط فہمی کی وجہ سے ہوتا ہے، بہت ممکن ہے انسان کو اپنی ذات کا کماحقہٗ علم نہ ہو مگر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مقنن کو دوسروں کی ذات کا ان سے زیادہ صحیح علم ہوتا ہے؟ اور خصوصاً ان امور کے متعلق تو جن کا انحصار ہر فرد کے خاص خاص حالات

پر ہوتا ہے۔ مقنن کو کسی طرح کا قابلِ وثوق علم ہو ہی نہیں سکتا۔ لہذا وہ دُور بینی کے قواعد کی ادائگی میں
تکلیف سیاسی کی رو سے کسی قسم کی مدد نہیں کر سکتا۔ بنتھم کہتا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ زنا و مے نوشی وغیرہ کو
قانونی اور عدالتی سزاؤں کے ذریعے سے متاصل نہیں کر سکتے۔ مگر افسوس و اندوہ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے
کہ عام طور پر مقننین نے اس معاملہ میں مصلحت و احتیاط کے علی الرغم بہت زیادہ مداخلت کی ہے اور خصوصاً
مذہبی معاملات میں تو اس "مداخلت بے جا" کا اثر نہایت قابلِ تاسف و ملامت رہا ہے۔ مقننین نے اپنے طرزِ عمل
کو اس قسم کے برہان سے حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان تیقنات و اذعانات کے متعلق عام طور
پر غلطی کے ارتکاب کا میلان رکھتا ہے اور ان ہی غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ وہ آیندہ زندگی میں عذاب الٰہی میں مبتلا
ہوتا ہے، مگر چونکہ مقنن "شوریٰ فی الامر" سے کام لیتا ہے اور اس کے مشیر بھی اعلیٰ دماغ ہستیاں ہوتی ہیں
عامۃ الناس کی طرح اغلاط فاحشہ کا شکار نہیں ہوتا اور صداقت کے ڈھونڈھ نکالنے میں ان کی طرح ناکام
نہیں ہوتا۔ جب یہ حالت ہو تو ظاہر ہے کہ جب راعی اپنی رعایا کو جادۂ ضلالت کا رہرو پاتا ہے تو وہ ان کی
رہبری و ہدایت کئے بغیر رہ نہیں سکتا اور خود "سبکسارانِ ساحل" ہو کر غریقِ بحر کی مدد سے دست کشی
نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قسم کے محرکات کی وجہ سے لوئی چہاردہم نے زنادقہ کے تبدیل مذہب میں
وہ مولم اور جہنمی طریقہ عذاب استعمال کئے جن سے شیطان بھی شرماتا ہے! اس معاملہ میں بنیاد تو ہمدردی
محض اور مواساۃ مطلق ہے مگر عمارت وہ آلام مجیعہ و مصائب شنیعہ ہے کہ بدترین بدخواہِ خلق بھی ان کا
موجب و مرتکب نہیں ہو سکتا! فیا للعجب!

تدین (پروبی ٹی) کے قواعد قانون اور مقنن کے سب سے زیادہ محتاج ہیں اور درحقیقت یہیں پر
مقنن کی سب سے زیادہ مداخلت ہوتی بھی ہے۔ ایسے حالات پر تو ہماری نظر شاذ و نادر ہی جا پڑتی
جب کہ سزا دہی اس وجہ سے ضروری ہوتی ہے کہ کسی شخص نے اپنی ذات کو مضرت پہنچائی ہے مگر ایسے
واقعات تو ہماری نظر سے ہر روز ہی گزرتے ہیں جب کہ اوروں کی ذات کو نقصان پہنچانے کے باعث
سزا واجب ہو جاتی ہے۔ ان جرائم کے متعلق تو جو حقِ ملکیت کے خلاف فرا ز ظہور پر آتے رہتے ہیں ہم بلا خوف
تردید کہہ سکتے ہیں کہ اخلاقیات کلیہ طور پر قانون پر مبنی و منحصر ہے۔ کیونکہ قبل اس کے کہ اخلاقیات کے اصول
اصول عمومیہ سرگرم کار ہوں قانون کو اس امر کا تعین لازمی ہے کہ کون کون سی چیزیں ملکیت کہلائے
جانے کی مستحق ہیں۔ جب قانون ملکیت کا تعین کر دیتا ہے تو اخلاقیات اپنے اصول و قواعد کو جاری کرتی ہے۔

فیاضی (بی نی فی سنس) کے افعال و اعمال کا تعلق بڑی حد تک صرف اخلاقیات ہی ہو سکتا ہے
قانون کا یہاں پر کچھ زیادہ دخل نہیں۔ افعال میں فیاضی اور کرم کا پایا جانا فاعل کی طبیعت پر انحصار

رکھتا ہی۔ جب اس کے محرکاتِ عمل محبت، ہمدردی و مواساۃ ہوتے ہیں اور شائبہ خودغرضی نہیں پایا جاتا تو اعمال میں فیض و احسان کی صفت پائی جاتی ہی اور افعال اسی وقت ”فیاضانہ“ کہلائے جاسکتے ہیں جب ارادی اور آزاد ہوں اور قانون کے جبر سے نہ کئے گئے ہوں۔ کیونکہ ظاہر ہی کہ اگر قانون کے خوف سے کوئی ہمدردی کا فعل کیا جائے تو ہم اس کو مدح و ستائش کے قابل نہیں کہہ سکتے۔ تاہم اس دائرہ میں بھی ہم قانون کو کسی حد تک داخل کر سکتے ہیں، مثلاً ایک مظلوم عورت کے کپڑوں میں ناگہانی طور پر آگ لگ جاتی ہی، ایک شخص اس حالت کا ناظر ہوتا ہی اور باوجود پانی موجود ہونے کے وہ بجھانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ شیطانی قہقہے لگاتا ہی یا فرض کیجئے کہ کسی کمرے میں کچھ بارود بچھی ہوئی ہی اور ایک لاعلم شخص جلتی ہوئی شمع لے کر اس میں داخل ہوتا ہی، دوسرا شخص جانتا ہی کہ بارود بچھی ہوئی اور پھر بھی اس کو آگاہ نہیں کرتا۔ یہاں پر قانونی سزا عاید کی جاسکتی ہی کیونکہ یہ ہر دو بلا اپنے ذاتی اور جانی نقصانات کے دست امداد دراز کر سکنے سے تھیں۔ کما ہو ظاہر

خاتمہ میں ہم مختصر الفاظ میں اخلاقیات اور اصول قانون سازی (جس میں علم یا فن قانون سازی شامل ہی) میں اس طرح فرق ادا کر سکتے ہیں کہ :-

”اخلاقیات خانگی“ یہ سکھلاتی ہی کہ کس طرح انسان ان محرکات کے ذریعے سے جو خود اس کے نفس سے پیدا ہوتے ہیں اس طریقۂ عمل کی پیروی کرتا ہی جو اس کی مسرت ذاتیہ کی طرف مودی ہوتا ہی اور ”فن قانون سازی“ (جو اصول قانون کی ایک شاخ قرار دیا جاسکتا ہی) یہ بتلاتا ہی کہ کس طرح ایک جماعت انسانی ان محرکات کے ذریعے سے جن کو مقنن عاید کرتا ہی اس طریقۂ عمل کی پیروی کر سکتی ہی جو بحیثیت مجموعی تمام جماعت کی مسرت کی طرف ہدایت کرتا ہی“

میر ولی الدین (منشی فاضل)

افکارِ بیخود

نیرنگیٔ حقیقتِ حُسنِ مجاز دیکھ
آئینۂ نیاز میں تصویرِ ناز دیکھ

پڑ جائے نقشِ پا کی طرح کاسۂ جبیں
اُٹھے نہ سر کبھی ہوسِ سجدہ ساز دیکھ

پھر جوش پر ہے گریۂ طوفانِ اضطراب
اے ضبط ڈوب جائے نہ کشتیٔ راز دیکھ

"نازک بہت ہے" گرمیٔ چشمِ عتاب سے
"دل" ٹوٹ جائے گا بُتِ آئینہ ساز دیکھ

اے دل! تجھے بھی چشمِ فسوں ساز کی قسم
پروانہ بن کے، شمع کا سوز و گداز دیکھ

تیرے لئے ہم ایک خدائی کو چھوڑ دیں
تو بھی کسی کا ہے بُتِ بندہ نواز دیکھ

دو لفظ ہاں نہیں۔ کا عدم اور وجود ہے
کچھ بھی نہیں ہے پردۂ ہستی کا راز دیکھ

مر جائے وہ کہیں نہ ترے انتظار میں
ہو جائے یہ کہیں نہ تغافل نواز دیکھ

بیخود قصور وار بھی شامل ہے بے خطا
اس شور و شر میں محشرِ ہنگامہ ساز دیکھ!

بیخود (علیگ)

طلسمِ خواب

ازاشک مپرسید کہ در دل چہ خروش ست
ایں قطرہ ز دریا چہ خبر داشتہ باشد

خواب کے معنی نیند میں کچھ دیکھنے کے ہیں مگر ہم اس مضمون میں طبی اعتبارات سے یہ بحث نہیں کرینگے کہ نیند کس طرح آتی ہے اور اُس کے اسباب کیا کیا ہیں بلکہ یہ دکھائیں گے کہ انسان عالم خواب میں جو کچھ دیکھتا ہے یا سنتا ہے اُس کی حقیقت کیا ہے۔ جاندار مخلوق دو حالتیں یا دو کیفیتیں رکھتی ہیں۔

(۱) عالم بیداری

(۲) عالم خواب

ان دو حالتوں سے عموماً کوئی فرد جاندار خالی نہیں ہے ہاں یہ جدا ہے کہ ان دونوں حالتوں کی مقدار اور انداز میں گونہ فرق ہے۔

طفلِ نوزائیدہ سے لے کر پیرِ فرتوت تک سب کی ذات میں یہ دو حالتیں پائی جاتی ہیں اور اس قدر لازم پڑی ہیں کہ عموماً جاندار مخلوق کا بجز اُن کے گزارہ مشکل ہے گویا یہ ان کی حیات کی جزوِ اعظم ہیں۔[1] انسان کی نسبت تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس کا عالم بیداری اور حالت خواب اس انداز اور اس طریق کی ہے لیکن سوائے انسان کے اور مخلوق کی حالت کی نسبت ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب اُنھیں نیند آتی ہے تو وہ اُس میں کیا دیکھتے ہیں یا اُن پر کیا گزرتی ہے۔ گو ہم صحیح کیفیت نہیں بتلاسکتے مگر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی عالم خواب میں کچھ نہ کچھ دیکھتے ہیں۔ بعض دفعہ کتے، بکریاں گھوڑے وغیرہ نیند میں کچھ ایسے حرکات کرتے دیکھے گئے ہیں جن سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عالم خواب میں کوئی ایسی چیز یا تماشا دیکھ رہے

---

[1] بعض حکمانے نباتات اور جمادات میں بھی جان یا زندگی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اُن کے خیال میں نباتات میں بالخصوص عالم بیداری اور حالتِ خواب موجود ہے گو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ نباتات کی بیداری اور خواب کی کیا کیفیت ہوتی ہے لیکن بعض کے خیال میں بیداری کا عالم اور خواب (یعنی نیند) کی حالت نباتات میں بھی پائی جاتی ہے۔

ہیں جو انھیں حسرت اور پریشانی میں ڈالے ہوئے ہیں[1]۔ اگر انسان گھریلو جانوروں کو بحالت خواب غور سے
دیکھا کرے تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ بھی اُس حالت میں کوئی نیا نظارہ ضرور کرتے ہیں اور ہم علمی طور
پر بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ جب انسان کی طرح عالم بیداری میں انھیں ایک قوت احساس حاصل ہے
تو کیا وجہ ہے کہ عالم خواب میں بھی اُس کا کچھ نہ کچھ اثر باقی نہ رہے ہاں یہ بات اور ہے کہ ہم اُسے کسی خاص مفہوم
یا معنی میں تعبیر نہ کر سکیں۔

عالم بیداری میں انسان دس قوتوں (ظاہری و باطنی) سے کام لیتا ہے۔

حواس ظاہری ۔ باصرہ ، سامعہ ، شامہ ، ذائقہ ، لامسہ

حواس باطنی ۔ حس مشترک ، خیال ، واہمہ ، حافظہ ، متصرفہ

جس وقت انسان عالم بیداری میں ہوتا ہے اُس وقت یہ سب قوتیں اُس انداز و مقدار سے جس پر
انھیں قدرت نے رکھا ہے لگاتار کام کرتی ہیں زرا سا فرق آنے سے نظام بیداری میں گونہ فرق آ جاتا
ہے اور انسان ایک تکلیف اور دکھ محسوس کرتا ہے۔

دونوں قسم کے حواسوں میں ایک طرح کا تعلق اور مشارکت ہے گو قوت متخیلہ اور قوت واہمہ بجائے خود
ہی فاعل اور کارکن ہے مگر جب انسان کی قوت باصرہ اور سامعہ میں فرق آ جائے تو حواس باطنی کے
تصرفات میں بھی کسی قدر فرق آ جائے گا اگرچہ وہ بالکل عاری نہ ہو جائیں گے باوجود اس کے کہ حواس باطنی
کا حواس ظاہری سے اس قدر واسطہ اور قرب ہے مگر پھر بھی دونوں قسم کے حواس جداگانہ کام کرتے رہتے
ہیں۔ اگر کسی وقت قوت باصرہ اپنے فرائض سے عاری ہو جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کے ساتھ
قوت واہمہ یا خیال بھی معطل ہو جائے یا قوت واہمہ اور متصرفہ کے قاصر ہونے سے قوت باصرہ بھی
عاری ہو جائے۔

گو دونوں قسم کی قوتیں کبھی کبھی بالاشتراک بھی کام کرتی ہیں لیکن سوائے اُس وقت کے جب کہ
اُن کی حالت میں طبعی یا اخلاقی اعتبارات سے کوئی فرق یا نقص آ جائے ہمیشہ بالانفراد عمل کرتی رہتی ہیں[2]۔

---

[1] جانوروں یا دیگر حیوانات کی قوت متخیلہ یا قوت فاعلی اور احساس مختلف فیہ ہے۔ بعض جانور مثل طوطے اور مینا کے بہت ہی
زود فہم اور ذکی ہوتے ہیں اور بعض کند ذہن۔ جس طرح طوطے اور مینائیں پڑھائی جا سکتی ہیں۔ بعض حکیموں نے خیال کیا ہے کہ
کوشش کرنے سے اور جانور بھی اس طرح پڑھائے یا سکھائے جا سکتے ہیں چنانچہ بعض لوگوں نے زاغ پر کچھ محنت بھی کی ہے!!

[2] جیسے طبعی اعتبارات کی حیثیت سے ظاہری حواس مکدر یا ابتر ہو کر کام سے رہ جاتے ہیں اور اُن میں وہ فطرتی تیزی اور
سرعت و عمدگی باقی نہیں رہتی جو اُن میں موجود تھی۔ اسی طرح اخلاقی نقص کی وجہ سے بھی حواس باطنی کی رفتار اور تصرف میں
بھی فرق آ جاتا ہے اور اُن کی حالت وہ نہیں رہتی جو اقتضائے فطرت کے مطابق ہونی چاہیے۔

اور کسی حالت میں ادائے فرض اور کام کرنے سے معطل یا عاری نہیں رہتی ہیں

عالم خواب کے تسلسل کی نسبت ہم بعد میں بحث کریں گے پہلے یہ بتلا دینا چاہتے ہیں کہ عالم بیداری میں انسان دونوں قسم کی صورتوں سے عموماً مندرجہ ذیل طریقوں سے کام لیتا ہے۔

(ا) بذریعہ مشاہدہ محض (ب) مشاہدۂ مع القیاس (ج) تفکر بالمشاہدہ والقیاس[1] (د) تخیل طبعی (ہ) تخیل اضافی (و) وہم طبعی (ز) وہم اضافی۔

مشاہدے میں بذریعہ حواس ظاہری ہر قسم کا احساس شامل ہے مشاہدہ صرف قوت باصرہ ہی سے متعلق یا مخصوص نہیں ہے۔ گو عرف عام میں مشاہدے سے وہی حالت مراد لیں گے کہ جب کوئی شے یا کیفیت ہمارے مشاہدے (یعنی دیکھنے) میں آوے لیکن علمی اعتبار سے جن چیزوں اور جن کیفیتوں کو انسان محسوس کرتا ہے خواہ کسی حواس کے ذریعے سے ہو۔ اُس کو بھی مشاہدہ کہتے ہیں جب ہم کسی شے یا کسی کیفیت کا علم بذریعہ قوتِ ذائقہ یا لامسہ حاصل کرتے ہیں اور اُس سے کوئی نتیجہ نکالتے ہیں تو ایک طرح سے وہ بھی ایک مشاہدۂ اضافی ہے کبھی مشاہدہ محض ہوتا ہے خواہ کسی قسم سے ہو۔ مثلاً ہم نے کوئی کیفیت دیکھی یا سُنی یا چیز کا لمس کیا اور اُسے اُسی حالت میں چھوڑ دیا اور اُس پر کوئی مزید غور نہیں کیا تو یہ ایک محض یا بلا قیاس مشاہدہ ہوگا۔ اس مشاہدے سے ہم وہی نتیجہ نکال سکتے ہیں جو بالکل بدیہی ہے۔

جب ہم کسی شے یا کیفیت مشہودہ کی نسبت مزید غور کرتے ہیں اور سوچتے ہیں اور اُن نتائج یا آثار پر پہنچتے ہیں جو بدیہی نہیں ہوتے یا جن میں کسی قدر اغلاق ہوتا ہے تو وہ ایک قیاس یا محل قیاس ہے۔

انسان میں ایک ایسی قوت بھی پائی جاتی ہے جو واقعات پیش آمدہ اور صورتِ مشہودہ پر عمیق غور کرنے کی عادی ہوتی ہے۔ اُس قوت کا نام قیاس ہے اور قیاس کی دو حالتیں ہیں۔

قیاس استدلالی۔

قیاس استقرائی۔

قیاس استدلالی میں صرف ایک مشہودہ یا پیش آمدہ صورت اور کیفیت کی دلائل بالمقابل سے اثبات

---

[1] قیاس اور تفکر میں فرق ہے قیاس مشاہدہ سے شروع ہوتا ہے اور اُسی پر ختم ہو جاتا ہے تفکر مشاہدہ اور وجدانیت دونوں کو شامل ہے۔ جو امور مشاہدہ سے ثابت ہوتے ہیں اُن کی نسبت بھی قوت متفکرہ کام کرتی ہے اور وجدانیت میں بھی کام دیتی ہے بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ قوتِ متفکرہ زیادہ تر وجدانیت ہی سے متعلق ہے ۱۲

یا تردید کی جاتی ہے اور قیاس استقرائی میں ایک جدید کیفیت یا حقیقت مستقر ثابت کی جاتی ہے اور جزئیات سے کلیات کا استدلال ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے قیاسات مشق سے ایک ایسی منور اور جامع حالت یا کیفیت پیدا کر لیتے ہیں جس سے بڑے بڑے علمی نکات اور دقائق حل ہونے لگتے ہیں۔ فرقۂ حکما میں بمقابلہ اہل اللہ کے تزکیۂ قیاس ہی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور تزکیۂ قیاس[1] ہی سے حکمتیں کھلتی اور منکشف ہوتی ہیں بعض حکیموں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ تزکیۂ قیاس ہی سے کرامات اور خرق عادات ظہور پزیر ہوتے ہیں یا یہ کہ تزکیۂ قیاس ہی کا نام کرامت ہے۔

عالم بیداری میں تخیل اور تفکر کی بھی دو حالتیں ہیں یہ صورت یا تو اُن امور اور آثار سے پیدا ہوتی ہے جو بذریعہ حواس ظاہری پیش آتے ہیں اور یا اُن کیفیات سے جو وجدانی طور پر حادث ہوتی ہیں یہ ایک بحث چلی آتی ہے کہ :-

بلا مشاہدہ یا تخیل تابع ظواہر کے وجدانی طور پر بھی انسان کوئی خیال یا فکر کر سکتا ہے یا نہیں اس میں دو گروہ ہیں ایک کا خیال ہے کہ :-

(الف) جو چیزیں اور جو کیفیات ہم ظاہر میں دیکھتے ہیں انھیں کی نسبت ہم خیال یا فکر بھی کر سکتے ہیں جو وجود اور جو کیفیات ہمارے احاطہ مشاہدے سے باہر ہیں اُن کی نسبت کوئی فکر یا کوئی خیال ہو ہی نہیں سکتا۔

(ب) ہماری قوتِ متفکرہ یا متفرقہ محض شواہد یا ظواہر کی پابند نہیں ہے وہ ظواہر یا شواہد کے ماسوا بھی خیالات یا افکار متخیلہ یا متفکرہ پیدا کرتی رہتی ہے۔

میں یہاں پر ایک فریق سے متفق الرائے ہوں۔ یہ درست اور صحیح ہے کہ جس شخص نے کبھی ریل اور تار نہیں دیکھا اُس کے دل میں ریل اور تار کا خیال کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن مجھے یہ سوچنا ہے کہ جو شخص ریل اور تار کا موجد تھا اُس نے ایجاد سے پہلے کبھی ریل یا تار دیکھا تھا؟ اب سوال یہ ہے کہ اُس کے دل میں (۱) ریل اور تار کے ایجاد کا خیال کیوں کر پیدا ہوا؟ (۲) اور کس چیز اور طاقت نے اُس میں ایسی تحریک پیدا کی؟

اگر ہم زیادہ سے زیادہ تاویل کریں گے تو یہ کہ ریل اور تار کے موجد کے دل میں پہلی سواریوں

---

[1] قیاس اور قیافے میں فرق ہے۔ قیاس معاملات مشہودہ اور واقعاتِ پیش آمدہ پر بلا کسی اصول مسلمہ یا تجربی شواہد کے غور کرتا ہے اور قیافے میں بعض شواہد مسلمہ اور راستا و تجربی پر مدار ہوتا ہے۔

اور ذرائع خبر رسانی کی تکلیفوں اور دقتوں نے یہ تحریک کی کہ کوئی سواری یا ذریعہ ایسا بھی ہونا چاہیئے جو موجودہ تکلیفات اور مشکلات سے بچائے۔ اسٹیم یا برقی طاقتوں نے اس خیال کی اور بھی تائید کی اور یہ خیال موجد کے دل میں اُس حالت میں پیدا نہ ہوتا اگر وہ پہلی سواریوں اور ذرائع خبر رسانی سے کچھ واقفیت نہ رکھتا۔ اس پر ہم یہ دریافت کریں گے کہ جو پہلے ذرائع تھے وہ کس طرح اور کس نظر سے ایجاد ہوئے۔ جب اس سلسلے پر پہونچوگے تو بھی کہنا پڑے گا کہ اُن کے موجدوں کے دلوں میں اُن ایجادوں کا خیال ناگہاں پیدا ہوا۔ پس جس حالت کا نام ناگہاں ہے اُسی حالت سے مُراد وہ حالت ہے جو اکثر اوقات انسان میں بلا پابندی شواہد اور ظواہر کے کام کرتی ہے اور جس کے متعلق یہ بحث ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ انسان کے خیالات اور مقولوں میں ظواہر اور شواہد سے زیادہ تر سلسلہ جنبانی یا تحریک ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ بلا پابندی ان شواہد اور ظواہر کے بھی خیالات اور تفکرات نشو و نما پاتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس قسم کے خیالات اور مقولے بھی دائرۂ موجودات سے باہر نہیں ہوتے لیکن مقابلہ ایک خاص شخص کے نفس کے جدید اور خارج از دائرہ ہوتے ہیں[1]۔ فہو المراد۔

تخیل اور تفکر انسان کی ایک عام حالت ہے۔ خاص حالت میں بعض اوقات کسی کسی طبیعت میں کچھ کچھ وہم بھی پایا جاتا ہے۔ تخیل اور تفکر کی طرح وہم بھی یا تو شواہد اور ظواہر کے تابع ہوتا ہے یا اُن سے آزاد۔ وہم اور فکر میں فرق ہے۔ وہم میں انسان بلا ارادہ اور بلا قصد کوئی کیفیت یک لخت اپنے دل میں پاتا ہے خواہ معتدبہ شواہد ہو اور خواہ بلا تقید شواہد۔ تفکر میں تقدم ارادہ و موجبات ارادہ شرط ہے۔ جو فکر یا تخیل اور وہم معتدبہ شواہد ہوتا ہے اُسے تخیل یا فکر یا وہم اضافی کہتے ہیں اور جو بلا تقید ہوتا ہے وہ غیر اضافی یا طبعی ہے۔

عالم بیداری میں انسان پر چند حالتیں طاری ہوتی ہیں اور ہر حالت دوسری حالت سے بلحاظ اپنے عمل اور فعل کے جدا ہے یعنی

(ا) تخیل یا تفکر اور توہم بحالت تکدر یا تعطل حواس۔
(ب) تخیل یا تفکر یا توہم بالعمل

---

[1] یہ بحث بجائے خود ایک طویل بحث ہے اس کے واسطے ایک جدا مضمون چاہیئے اس لئے اس مضمون میں صرف اس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(ج) اتفاقی یا گہانی معقولات

(د) معقولات متواردہ

مشاہدہ اور تجربہ اس بات کی تائید میں ہی کہ جب کبھی انسان کے حواس میں بوجہ افکار نازلہ یا مصائب عائدہ اور لحوق امراض کدورت آجاتی ہی یا کچھ دیر کے لئے حواس ظاہری بالکل معطل ہو جاتے ہیں تو ان حالتوں میں انسان کی باطنی قوتیں کام کرنے سے نہیں رکتی ہیں گو بظاہر انسان حواس باختہ معلوم ہوتا ہی لیکن اُس کی باطنی قوتیں کچھ نہ کچھ کام کرتی رہتی ہیں اور اکثر اوقات ایسے ہوش گم کردہ لوگوں سے ایسے ٹھکانے کی باتیں ظاہر ہوئی ہیں کہ باہوش بھی حیران رہ گئے ہیں۔ گو یہ سلسلہ لگاتار نہ جاری رہتا ہو لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ان حالتوں میں باطنی قوتیں اپنا کام کئے ہی جاتی ہیں۔

پاگل خانوں میں کبھی کبھی مدتوں کے پاگل بھی وہ ٹھکانے کی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ العظمت للہ گو وہ برسوں سے محبوس ہوتے ہیں اور اُن کے دماغوں میں نام کو بھی سلامت روی باقی نہیں رہتی مگر پھر بھی پرانی سے پرانی باتیں اور تاریخی واقعات ہذیان اور بڑ میں اُن کی زبان سے نکل جایا کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہی کہ تکدر اور تعطل حواس کی صورت میں عموماً وقوف بالکل جاتا رہتا ہے لیکن بعض وقت پاگلوں نے بھی وقوف سے ایسا برمحل کام لیا ہی کہ تعجب ہوتا ہی۔ ایک پاگل خانے میں ایک پاگل جو پہلے کسی رسالے میں کمشنڈ عہدہ دار تھا مدتوں سے قید تھا اور اس کی حالت بالکل خراب اور ابتر ہو چکی تھی ایک روز اسی رسالہ کا عہدہ دار پاگل خانے میں چلا گیا تو اُس پاگل نے اُسے فوراً پہچان لیا اور یہ کہہ کر چپ ہوگیا کہ میں جانتا ہوں کہ تو میرے داہنے بازو تھا اور میرا جوڑی دار اب میرا بلا اُتارنے آیا ہی۔ عہدہ دار نے مشکل سے پاگل کو پہچانا اور تصدیق کی واقعی یہ میرے ساتھ رسالہ میں بھرتی ہوا تھا اور وہ بجائے خود متعجب تھا کہ ایک مسلوب الحواس نے اُسے اتنے عرصہ کے بعد دیکھتے ہی پہچان لیا اور میں صحیح الحواس شناخت نہ کرسکا۔

عمل مقناطیسی میں عامل معمول کو ایک ایسی حالت میں لاکر سوالات کرتا ہی جس میں معمول ظاہری حواس سے قریباً اجنبی ہوجاتا ہی۔ معمول پر عامل ایک عالم خواب طاری کردیتا ہی اور ظاہری مدرکات سے اُسے بہت دور لے جاتا ہی۔ ایسی حالت میں یہی کہا جائے گا کہ معمول کے حواس ظاہری مکدر یا معطل ہو جاتے ہیں اور مظاہر سے اُسے کوئی خبر نہیں رہتی۔ نوم طبعی اور نوم مقناطیسی میں صرف یہ فرق ہوتا ہی کہ نوم طبعی میں قائم اور اثر جس طرح نوم متاذی اور متصدع نہیں ہوتا اور نوم مقناطیسی میں اُس کے دل میں اور جسم پر ایک خاص تکلیف عائد ہوتی ہی۔ عمل مقناطیس سے ثابت ہوتا ہی کہ

حواسِ باطنی کا عمل نومِ غیر طبعی میں بھی باطل نہیں ہوتا۔ معمول ایسے ایسے سوالات کا جواب دیتا ہے کہ اگر وہی سوال اُس سے حالتِ بیداری میں پوچھے جائیں تو وہ جواب نہیں دے سکتا۔

بعض اوقات انسان بغیر کسی خاص خیال اور ارادہ کے اپنے دل میں ناگہاں ایک خیال پاتا ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی اور وہ پورا ہو جاتا ہے ایسے خیالات کی نسبت یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ اتفاقاً پورے ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ اتفاقی معقولات سے تعبیر کئے جاتے ہیں۔ کبھی ناگہاں یہ خیال آتا ہے کہ اگر ریلوے اسٹیشن پر فلاں دوست مل جائے تو کیا اچھا ہو آج فلاں شخص کا خط آجائے تو کیا خوب ہو۔ آج صاحب بہادر خود بخود بلاکر دریافت کریں تو زہے نصیب۔ ایسے معقولات کسی دلیل یا کسی شبہ دلیل کے تابع نہیں ہوتے بلکہ محض فرضی یا ناگہانی متوسے ہوتے ہیں لیکن اکثر دفعہ ہو بہو پورے اترتے ہیں اُس وقت انسان کہا کرتا ہے کہ کاش میں کوئی اور بات بھی خیال کرتا آخر پوری تو ہوئی جاتی بعض ایسے معقولات کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اچھے وقت ایسا خیال آیا تھا۔

ہر انسان کی زندگی میں ایسے ایسے واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں شاید ہی کوئی انسان ان طبعی تصرفات یا معقولاتِ ناگہانی سے خالی ہو۔

نثر میں کم نظم میں زیادہ معقولات قیاسی۔ توافی میں بھی ایک ہی مضمون کی بابت دو یا دو سے زیادہ انسانوں کا توارد مضمون ہو جاتا ہے۔ ایسے معقولاتِ متواردہ کی نسبت لوگ کہا کرتے ہیں کہ بوجہ تناسب طبائع پیدا ہو جاتے ہیں یا جن مضامین کی نسبت توارد ہوا ہے اُن کے موجبات مختلف طبائع پر یکساں موثر ہوتے ہیں۔

نظم میں تو کبھی کبھی یہاں تک توارد ہو جاتا ہے کہ دو شاعروں کے کسی شعر کا مصرع بعینہٖ ایک ہی حالت میں بالفاظ والمعانی ترتیب پا جاتا ہے حالانکہ ایک شاعر مغرب میں ہوتا ہے اور دوسرا مشرق میں۔

بعض علمی مضامین یا اخلاقی مقاصد میں توارد کا ہو جانا چنداں تعجب خیز نہیں ہے کیونکہ اُن مضامین علمی میں جن کی بنیاد خاص موجبات اور شواہد پر ہے استدلال اور استشہاد کے وقت عموماً توارد ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک مہندس طاقت اعدادی اور قیمت صفر عموماً انھیں دلائل سے ثابت کرتا ہے جن کو دوسرا مہندس بھی جانتا ہے برخلاف اس کے دو شاعر ایک مضمون مختلف تشبیہات اور استعارات سے باندھ سکتے ہیں۔ اُن کے ایک مصرع میں توارد ہو جانا بہ نسبت ایک مہندس کے توارد کے زیادہ تر قابلِ غور اور دلچسپ ہے۔

فخر الدین احمد قادری

نقشِ ثانی

نقشِ ثانی کے عنوان سے مولانا سلیم کی ایک غزل مرسل ہے جس سے نقشِ اول کا جواب مراد نہیں ہے بلکہ یہ مقصود ہے کہ جس میدان میں فضائے سخن نے جولانی دکھلائی ہے اس میں مولانا کہاں تک چل سکتے ہیں۔ بقول شبلی مکمل شعر میں تین خوبیوں کا وجود لازمی ہے یعنی سادگی جوش اور اصلیت۔ لیکن مرزا کے کلام میں اول الذکر صفت جو شعر کے افسوں کو دوبالا کرنے والی ہے کم پائی جاتی ہے اور مولانا کے کلام میں یہ خوبی علاوہ دوسری دونوں خوبیوں کے بدرجۂ اتم موجود ہے۔ آپ نے جیسا کہ اس غزل سے ظاہر ہوتا ہے اردو شاعری میں نئے باب کھول دیئے ہیں۔ جدید مضامین، ندرتِ خیال اور علو جذبات کے ساتھ نت نئے اسالیب بیان میں بلند ترین خیالات کا اظہار، یہ ہیں وہ جواہر ریزے جو آپ کے تقریباً ہر شعر میں جگمگا رہے ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہوں اشعار نمبر (۴) (۵)، (۷)، (۸)، (۱۰)، (۱۴)، (۱۶) جو تعریف سے مستغنی ہیں۔ ناظرین خود ان کے ذائقہ سے حظ اندوز ہو سکتے ہیں۔ (عزیز)

پیہم آتی ہے نظر جلووں کی طغیانی مجھے
خاک میں دے گا ملا یہ موجزن پانی مجھے

میری دھن سن کر کبھی دھنتے تھے سر اہلِ بہشت
کیا لبھائیگی پرندوں کی خوش الحانی مجھے

عقل کے شہباز رہ جائیں جہاں پر تول کر
اس فضا میں ہے دکھانی اپنی جولانی مجھے

حسن ہے واں جلوہ گر جس جا ہے حسنِ انتظام
لے گئی اس پار تاروں کی پریشانی مجھے

بس انھیں سے دل مرا کرتا ہے کسبِ زندگی
ہستیاں جن کی نظر آتی ہیں نورانی مجھے

میں کہ بالِ سعی سے اڑتا تھا اوجِ عرش پر
لے گیا زیرِ زمیں ذوقِ تن آسانی مجھے

مجھکو پائیگی وہاں آ لٹے گا وہ آنچل جہاں
کھول کر آنکھیں اگر دیکھیگی حیرانی مجھے

کر کے دانائی کا دعویٰ میں کہاں جاتا رہا
ڈھونڈتی پھرتی ہے یارب میری نادانی مجھے

بن کے خوشبو میں نکل جاؤنگا قیدِ رنگ سے
رکھتا ہے بے چین ہر دم ذوقِ عریانی مجھے

جو سما سکتا نہیں آنکھوں کی بزمِ رنگ میں
دل میں اس بے رنگ کی کرنی ہے مہمانی مجھے

اب شرر بن کر چھپے شاید وہ قلبِ سنگ میں
کر کے خاکستر چلا ہے سوزِ پنہانی مجھے

لامکاں میں اب پڑا کرتا ہوں میں اٹکھیلیاں
لے اڑا آخر مکاں سے ذوقِ ویرانی مجھے

ایک دن بزمِ ملائک میں ہوا میرا گزر
صورتیں آئیں نظر سب جانی پہچانی مجھے

زحمتوں ہی میں خدا کی رحمتیں ہیں جلوہ گر
مشکلوں ہی میں نظر آتی ہے آسانی مجھے

لن ترانی کا نہ موسیٰ کو سکھا دیں یہ جواب
کرنی پڑتی ہے امنگوں کی نگہبانی مجھے

جن کی خاطر بیچ چکا تھا دین و دنیا کو جواب
ان تمناؤں کی اب کرنی ہے قربانی مجھے

سجدے میں کرتا رہا غیروں کے در پر اے سلیم
تھی جھکانی آستانِ دل پہ پیشانی مجھے

طوفانِ نوح (علیہ السلام)

موجودہ زمانہ کو اگر دَورِ مادّیت سے موسوم کیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا کیونکہ ایک طرف گو علم و فضل کو ترقی ہو رہی ہے اور یورپ کے سائنٹفک انکشافات نے چشمانِ عالم کو خیرہ و محوِ حیرت بنا دیا ہے مگر دوسری طرف روحانیت کا انحطاط اُس کے فقدان کی حد تک پہنچ گیا ہے اور مغرب کی مادّیت کا یہاں تک قلوب پر اثر ہوا کہ روشن خیال جماعت کے لئے اعتزال باعثِ فخر و نشانِ امتیاز تصور کیا جاتا ہے۔

قدیم عقاید و روایات کی قبولیت کے لئے یا تو گوشِ شنوا ہی نہیں رہے یا اگر کچھ اگلے زمانہ کی یادگار بھی ہیں تو وہ اس نئی روشنی کے عصر میں ہدفِ طنز و ملامت ہیں اور میرے نزدیک یہ نتیجہ ہے قدیم علم کلام کا کیونکہ موجودہ علم کلام کا انداز و طریق ہی بالکل بدلا ہوا ہے اور جب تک اسی موخرالذکر اسلوب میں کوئی امرِ واقعہ نہ بیان کیا جائے کبھی مقبولِ خاص و عام نہیں ہوتا۔

بعثت انبیا علیہم السلام، معجزات اور وجودِ ملائکہ وغیرہ بکثرت ایسے مسائل ہیں جن کے سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے مگر ہم اس وقت ان باتوں سے قطع نظر کر کے طوفانِ نوحؑ کا تذکرہ کرتے ہیں گو یہ کہانی اس قدر فرسودہ و کہنہ ہو گئی ہے کہ شاید اس کے عنوان پر بھی نظر کرنے میں تامل ہوگا لیکن ہم اسی سلسلہ میں کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں ممکن ہے کہ قارئین کرام کو شئے کہنہ کا لطف آ جائے۔

قرآن مجید میں بھی طوفان نوح کا کئی جگہ تذکرہ پایا جاتا ہے توریت میں بالتفصیل ہے اور اُسی سے مفسرین نے اخذ کر کے تفاسیر اور مورخین نے تواریخ امم قدیمہ میں بیان کیا ہے اور جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

> دو ہزار تین سو اڑتالیس سال قبل حضرت عیسیٰؑ بہ سبب نافرمانی آلِ قابیل کے طوفانِ نوحؑ نازل ہوا۔ تاریخ ۱۰ رجب مطابق ماہ آب فارسی و موافق ماہ اگست انگریزی سے طوفان کا آغاز ہوا اور کشتی نوحؑ ۱۵۰ یوم پانی پر پھرتی رہی کشتی سوق ثمانین کے جزیرہ پر ٹھیری ...... اب دنیا میں جس قدر آبادی ہے وہ سام و حام و یافث کی نسل سے ہے اور طوفان کے فرو ہونے پر حضرت نوحؑ نے خشکی کی خبر لانے کے لئے پہلے زاغ کو بھیجا اور جب وہ واپس نہ آیا تو کبوتر کو روانہ کیا وہ تھوڑی خاک منقار میں لایا۔ نوحؑ نے کوہ جودی کے نیچے ایک قریہ آباد

کیا جو سوق الثمانین کے نام سے مشہور ہوا۔

مگر یہاں تنہا عقیدت کا سوال نہیں بلکہ اس واقعہ کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنا اور اس کی اصلیت وقیمت کو دیکھتے ہوئے کچھ اہم نتائج مترتب کرنا ہے۔

مغربی محققین نے کمال تحقیقات کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ یورپ کے اکثر ممالک میں آرین اور عرب میں سامی النسل اور مصر و توران وغیرہ میں حامی النسل باشندے ہیں۔ حام۔ سام کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے مورث ایک ہیں مگر آریہ نسل کا سلسلہ ان سے بالکل علٰحدہ ہے ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ تہذیب و تمدن اور زبان کے اعتبار سے بھی آرین اور سامی النسل کی قومی روایات میں بھی کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی۔

مگر اس وقت ایک واقعہ مشترک پیش کیا جاتا ہے جس کا پتا ہر ملک کی قومی تاریخ میں کم و بیش ملتا ہے۔ تاریخ بابل میں گلگمیش اور پیر نپشتیم کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:-

"پیر نپشتیم نے گلگمیش کے کہنے سے ایک کشتی تیار کی اس کے بعد وہ مع اپنے اہل و عیال اور مویشیوں کے کشتی پر سوار ہوا، وقت مقررہ پر طوفانِ عظیم آیا اور تمام ملک کو تہ آب اور ہر چیز کو برباد کر دیا۔ طغیانی کی یہ کیفیت ہوئی کہ جس طرف نظر جاتی بجز پانی کے اور کچھ نہ دکھائی دیتا۔ الغرض اسی حالت میں چھ شبانہ روز گزر جاتے ہیں۔ اس کے بعد طغیانی اور بارانی میں کمی ہوتی اور زمین نکلتی ہے۔ اہل کشتی فاختہ کو خبر رسانی کی غرض سے بھیجتے ہیں وہ واپس آتی ہے۔ پھر کوا بھیجا جاتا ہے وہ واپس نہیں آتا۔"

اس واقعہ کو اگر توریت میں تلاش کیا جائے تو وہاں بھی بالفاظ دیگر پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کی روایات قدیم میں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے چنانچہ منوجی کو دیوتاؤں کی طرف سے بشارت دی جاتی ہے کہ:-

"زمین کی بربادی کا وقت آگیا اس لئے تجھے خبردار کیا جاتا ہے کہ تو ایک کشتی تیار کر اور ایک دراز رسی اس میں باندھ لے اور مع سات رشیوں کے سوار ہو جا اور منتظر رہ میں ایک شاخ دار حیوان کی طرح نمودار ہونگا کیونکہ بغیر میری اعانت کے تو آپنے آپ کو طوفان عظیم سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔"

منوجی نے ایسا ہی کیا۔ وقت مقررہ پر طوفان آیا اور کشتی پانی پر روانہ ہوگئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک بڑی مچھلی نمودار ہوئی جس پر منوجی نے ایک جزیرہ کا گمان کیا۔ منوجی نے اس کے سینگ سے اپنی رسی کو باندھ دیا کشتی بلا خیز طوفان پر مثل ایک متوالے کے چلی جاتی تھی۔ جس طرف نظر اٹھتی بجز

سیلاب عظیم کے کچھ نہ دکھائی دیتا۔ آخر ایک عرصہ دراز کے بعد کشتی ایک پہاڑ کی چوٹی پر جو ہمادت کے نام سے موسوم ہی ٹھیری مچھلی نے کہا کہ میں ترمہ یعنی مالک کل مخلوق ہوں اور میں نے ہی تجھکو اس مصیبت سے رستگاری دی ہی اب نسل انسانی کا آغاز تجھ سے از سر نو ہوگا۔

ان تمام واقعات پر ایک گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہی کہ طوفانِ نوح کا واقعہ بے سروپا قصہ اور کہانی نہیں ہی، اگر ایسا ہوتا تو اس کا وجود دنیا کے مختلف ممالک و اقوام کی تاریخ قدیم میں نہ ہوتا بلکہ دراصل یہ طوفانِ نوح کی صحت و واقعیت کی دلیل ہی کہ اس کا تذکرہ ہر جگہ موجود ہی۔

ماہرینِ طبقات الارض کی یہ رائے ہی کہ دنیا میں آج ہم جس جگہ خشکی دیکھتے ہیں کسی وقت اس جگہ بحر اعظم موجزن تھا اور اسی طرح سمندر کی جگہ بر اعظم کے قطعات تھے اور اس کی تائید میں یہ بیان کیا جاتا ہی کہ سطح آب میں اُن جانوروں کی ہڈیاں برآمد ہوتی ہیں جو عام طور سے زمین پر پائے جاتے ہیں اور طبقات ارض سے اُن حیوانات کی ہڈیاں برآمد ہوتی ہیں جو پانی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر ہم اس کی تعبیر بہترین طریق پر یوں کر سکتے ہیں کہ یہ علامت و نشانی دراصل طوفانِ نوحؑ کی ہی جب کہ خشکی و تری کی ایک حالت ہوگئی تھی اور کرۂ ارضی پر بجز پانی کے کچھ بھی نہ رہا تھا تو آسانی بحری جانور ہر جگہ پہنچ گئے اور اسی طرح سیلاب خشکی کے جانوروں کو نشیب کی جانب بہالے گیا اور یہی سبب ہی کہ بحر و بر میں اُن حیوانات کی استخوان ملتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور یہ ایک زبردست دلیل اس امر کی ہی کہ اہل دنیا پر ایسا وقت ضرور آیا تھا جب ایک سیلاب عظیم نے ساکنانِ ارضی کو تہ آب کر دیا تھا۔

طوفانِ نوحؑ سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ انسانی آبادی جملہ ممالک کی ضرور ایک ہی مورث کی نسل سے ہی۔ جب عالمگیر سیلاب سے انسانی آبادی برباد ہوگئی اور بجز منو یا نوحؑ کے کچھ باقی نہ رہا تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دنیا کی آبادی کا سبب مگر نوحؑ یا (منو) کی ذات گرامی ہوئی۔ یہ بہت ممکن ہی کہ نوحؑ کی اولاد دنیا کے جس حصے میں گئی ہو اپنے آبا و اجداد کی روایات طوفانِ نوحؑ کو بھی ساتھ لے گئی ہو اور اسی لئے یہ واقعہ ہر ایک ملکی تاریخ کی روایاتِ قدیم میں کسی نہ کسی طرح ضرور پایا جاتا ہی۔

اس پر ممکن ہی کہ یہ اعتراض کیا جائے کہ دنیا کے مختلف ممالک کے قدیم باشندوں کی جو کھوپڑیاں برآمد ہوئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ ہرگز ایک مورث کی نسل سے نہیں ہیں مگر ہمارے نزدیک ایسے روشن زمانہ میں جب کہ نظریہ ارتقا نے حشرات الارض سے نوع انسانی کا پیدا ہونا ممکن قرار دیدیا ہی اس قسم کا اعتراض صحیح نہیں ہی۔

یہ مسلمہ ہی کہ ہر جاندار کی جسمانی ساخت پر آب و ہوا کا اثر جزو لازمی ہی سرد ممالک کے جانور عام

طور پر برخلاف گرم ممالک کے ممنون رہوتے ہیں۔ چینیوں کے منہ پر ریش و برودت کی قلت بھی آب و ہوا کا نتیجہ ہی اور جس طرح اس کا اثر جسم کی بیرونی حالت پر ہوتا ہی اسی طرح اندرونی ساخت بھی اسی اصول کے ماتحت ہی۔ جنگلی مرغیوں کا جسم اصل اس قدر سبک ہوتا ہی کہ وہ بآسانی پرواز کرسکتی ہیں۔ پالتو مرغیوں کے بازو اور ٹانگیں پیدائشی طور پر وزنی ہوتی ہیں جس کے سبب سے وہ قوت پرواز تقریباً کھو بیٹھتی ہیں یعنی طریق معاشرت سے بھی جسمانی ساخت متاثر ہوتی ہی۔ پھر اگر آج ہندوستان کے قدیم باشندوں کی کھوپڑی فراعین مصر کی کھوپڑی سے مماثلت نہیں رکھتی تو اس کا سبب یہ نہیں ہی کہ دو ممالک کے باشندے مختلف النسل تھے بلکہ باعث اختلاف آب و ہوا اور معاشرت ہی۔ محققین یورپ کی یہ رائے کہ آرین قومیں نوح کی اولاد سے نہیں ہیں بوجوہ بالا بالکل غلط ہی۔

ہماری اس تحریر پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاسکتا ہی کہ نوحؑ کو چھ سات ہزار سال سے زیادہ نہیں گزرے اور قدیم کھوپڑیوں میں جو فرق و امتیاز ہی وہ دو ہزار سال یا اُس سے کچھ زیادہ مدت میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ مگر ہمارے نزدیک مورخین اسلام نے نوحؑ کا زمانہ شمار کرنے میں غلطی کی ہی۔ یہ امر مسلمہ ہی کہ ہندوستان کی علم ہندسہ میں تمام دنیا نے خوشہ چینی کی ہی اس لحاظ سے اگر ہم کسی حسابی مسئلہ میں ہندوستان کی قدیمی تاریخ ہی کی جانب مائل ہوں تو وہ زیادہ مناسب ہوگا چنانچہ کتب ہنود میں منو ابتدائے نوع انسانی کا باعث بیان کیا گیا ہی جس کو چند کرور سے زیادہ سال ہوتے ہیں۔

تاریخ فرشتہ میں ایک موقع پر تحریر ہی کہ :۔

"شخصے از صاحب سلونی ما دون العرش و فوق الفرش پرسید کہ یا امیرالمومنین! پیش از آدم بسہ ہزار سال کہ بود آں حضرت جواب دادند کہ آدم چوں ایں معنی سہ مرتبہ تکرار یافت آں شخص ساکت شدہ سر در پیش افکند۔ شاہ ولایت پناہ بر زبان مبارک آوردند کہ اگر سی ہزار بار می پرسیدی کہ پیش از آدم کہ بود۔ می گفتم آدم۔"

اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہی کہ طوفان نوحؑ کے شمار کرنے میں غلطی کی گئی ہی۔ اس کے علاوہ آرین نسلیں جب ہندوستان آئی ہیں تو ان کو ایک سیاہ فام قوم سے سابقہ پڑا۔ پنجاب اور صوبہ سرحدی کی آب وہوا میں یہ تاثیر نہیں ہی کہ سیاہ فام انسان پیدا کرے بہت ممکن ہی کہ یہ سیاہ فام نسل کسی گرم ملک سے آکر آباد ہوئی ہو اور ایسا ملک ہندوستان کے شمال مغربی جانب بجز عرب کے کوئی نہیں ہی جہاں کے باشندے سیاہ فام ہوں۔ مورخین اسلام نے ہند ابن سام کا ہندوستان آنا بیان کیا ہی اور توریت

میں بھی نوح ابن سام کا جنوب کی طرف آنا تحریر ہے۔ چینی سیاحوں نے بھی ہندوستان کا نام ہندیا اندیا نہ جس سے انڈیا اخذ کیا گیا ہے بیان کیا ہے۔
انسانی عظم کا اختلاف بھی اسی امر کا مقتضی ہے کہ ایک مورث کی اولاد کے اقطاع عالم میں پھیلنے کے لئے اسی قدر زمانۂ دراز کی ضرورت ہے۔

محمد حسین آزاد۔ اٹاوہ

خیالات عزیز

کھل گیا پردہ جب میرے دل کا — اُٹھ گیا پردہ تیری محفل کا
کبھی دیکھا نہیں نظر بھر کر — جانتا ہے وہ مدعا دل کا
جانے رک رک کے کیوں نکلتا تھا — آخری سانس تیرے بسمل کا
ہم جو کھوئے گئے تو کیا غم ہے — مل گیا ہے نشان منزل کا
جلوہ گر اس جگہ اسے دیکھا — پردہ اُٹھا جو دل کی محمل کا
کشتی اب رحم پر ہے موجوں کی — آسرا اُٹھ گیا ہے ساحل کا
پردہ اپنی نظر کا حائل ہے — مل ہی جاتا نشان منزل کا
حسن اور اس پہ سادگی کی بہار — اڑ گیا رنگ ماہِ کامل کا

رنگ اک دن ضرور لائے گا
یہ تڑپنا عزیز کے دل کا

ارشاداتِ عزیز

کیا کہوں اسرارِ خاموشی کسی دمساز سے
لوگ اُسے پہچان لیتے ہیں مری آواز سے

دل شکستہ ہو کے جا بیٹھا قریبِ آستاں
جب صدائے دور باش آئی حریم ناز سے

سازِ برق آہنگ لبریزِ نوائے درد ہوں
یعنی اے ٹوٹے ہوئے دل تیری اس آواز سے

نفس آگاہِ ریاکاری ہوا واحسرتا
سابقہ جب سے پڑا احباب دنیا ساز سے

عمر رفتہ کو ذرا آواز دے اے زندگی
سننے بیٹھے ہیں وہ میری داستاں آغاز سے

چشم بینا چاہیئے نامحرموں کے واسطے
چھن رہی ہے اک تجلّی پردہ ہائے راز سے

بے نیازی کی بھی حد ہے کوئی اے جانِ عزیز
یہ ادائے بے رخی اک بندۂ جاں باز سے
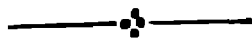
ریب اور اُس کے احباب

چونتیس سال کا عرصہ گزرا کہ میں اور ریب اپنے مدرسے سے آتے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اور سرسے سر ملائے (صرف اہلِ عشق اور بچے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیوں اور کس طرح ہوتا ہے) القرمی سڑک سے گزر رہی تھی کہ سڑک کے سرے پر شمال کی جانب ترآن گرجا گھر کے نزدیک ہم نے ایک ہجوم دیکھا۔ "ابا! کتے لڑ رہے ہیں"۔ ریب چلایا اور تیر کی طرح اس سمت دوڑ پڑا، میں بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگا مگر ہم دونوں کی دلی دعا یہ تھی کہ خدا کرے ہمارے پہنچنے تک یہ لڑائی ختم نہ ہو!"

کیا ایسی دعا مانگنا بچوں کی فطرت میں داخل نہیں؟ کیا یہ بشری فطرت نہیں؟ ہے اور ضرور ہے! کیا ہم سب کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ کسی آتش زدہ مکان کی آگ اس وقت تک فرو نہ ہو جب تک کہ ہم وہ منظر نہ دیکھ لیں؟ اسی طرح کتوں کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ وہ آپس میں جنگ و جدل کریں، بلکہ آئزک کا قول ہے کہ انھیں اس میں "مزہ آتا ہے" اور آنا بھی چاہیئے۔ بہرحال، اگر کم سن بچوں کو ایسی لڑائیاں دیکھنے کا شوق ہو تو وہ بے رحم نہیں کہے جا سکتے کیونکہ وہ اس قسم کے معرکوں میں کتوں یا انسانوں کی تین خاص صفات ہمت، استطاعت اور مہارت۔ کو معرکہ آرا پاتے ہیں اور یہ بات اس سے بہت مختلف ہے کہ کتوں کو خواہ مخواہ لڑا دیا جائے یا ان کو برانگیختہ کیا جائے یا اس جنگ و جدل سے روحانی مسرت یا مالی فائدہ حاصل کیا جائے۔ ایک لڑکا، خواہ وہ لڑائی کا تماشا دیکھنے کا کتنا ہی شوقین کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر وہ نیک چلن ہے تو اُسے ان تمام حرکتوں سے نفرت ہوگی مگر باایں ہمہ کتوں کی لڑائی دیکھنے کے لئے اُسے تیز سے تیز دوڑنے میں بھی تامل نہ ہوگا۔ غرض کہ تمام لڑکوں اور مردوں کو انتہائی قوت و طاقت کو کارفرما دیکھنے سے خاص دلچسپی اور دلی لگاؤ ہے۔

خیال ہوتا ہے کہ محض ایک سرسری نظر میں ریب کو کتوں کے لڑنے کا خیال کیونکر پیدا ہو گیا درآں حالیکہ اس نے نہ تو انھیں لڑتے دیکھا تھا اور نہ دیکھ ہی سکتا تھا۔ بات یہ ہے کہ یہ نتیجہ اس کے سلسلۂ خیالات کا لابدی اور فوری ماحصل و مآل کار تھا، کیونکہ مصروف پیکار کتوں کے گرد زیادہ تر مردانہ ہجوم ہوتا ہے اور اکثر اوقات کوئی چست و چالاک رحمدل عورت اس مجمع کے گرداگرد انتہائی وحشت و سراسیمگی میں رواں دواں رہتی ہے اور اپنی زبان اور ہاتھوں کو مردوں پر بلا پس و پیش استعمال کرتی رہتی ہے

علی العموم یہ مجمع گھتا ہوا (مصروف) حلقہ زن، متحرک اور نقطۂ مرکز کی طرف راغب ہوتا ہے کیونکہ اُس میں سے ہر فردِ واحد کی آنکھیں اور سر نیچے کی طرف جھکا ہوا ہوتا ہے۔

ہم دونوں جب موقعِ واردات پر پہنچے تو لڑائی ختم نہ ہوئی تھی، ایک چھوٹا اصیل کتا ایک بڑے بنجاری کتے کا جو اس قسم کی جنگ سے قطعی ناواقف تھا اور جس سے معترض ہونا مذاق نہ تھا گلا گھونٹ رہا ؛ چھوٹا کتا اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا اور اُس کا شبانی ہمسر بہت بے ترتیبی، مگر انتہائی جرأت وہمت سے مقابلہ کر رہا تھا ! آخر کار مہارتِ فن واصابت نسبی نے فتح پائی اصیل شکاری کتے نے غریب یارو کا گلا کچھ اس طرح دبایا کہ موخر الذکر بالکل بے دم ہو کر گر پڑا، اس کا مالک ایک گندم گوں، طویل القامت، خوش رُو، طاقت ور نوجوان تھا جو اُس ہجوم میں ہر ایک کو پاسانی زیر کر سکتا تھا مگر چھوٹے کتے کو لات مارنا بھی فضول تھا کیونکہ اس طرح وہ اپنے مدِ مقابل کی گردن اور بھی زیادہ زور سے پکڑ لیتا اور پھر دونوں کو الگ کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا : اس جنگ کو ختم کرنے کے بہت سے طریقے بتائے گئے۔ لیکن سب بے سود ثابت ہوئے ! کسی نے کہا "پانی لاؤ پانی" مگر پانی کون لاتا اور کہاں سے لاتا، کوئی بولا "اس کتے کی دم کو دانتوں سے کاٹو" اور ہر ایک اجنبی رحم دل ادھیڑ عمر شخص نے ایسا کیا بھی، لیکن یہ بات یارو کا مالک (آقا) جو غصہ اور فکر کے سبب پسینہ میں تر بتر تھا، برداشت نہ کر سکا۔ اور اُس نے اُس ضعیف کے ایسا مکہ رسید کیا کہ بیچارہ بڈھا زمین پر چاروں شانے چت گرا ! ایک بولا "ہلاس سنگھاؤ ہلاس" اور بہت سی نئی اور پرانی ڈبیاں کھول کر پیش کی گئیں، ایک کم سخن، خوش پوشاک، بانکے جوان نے ایک چٹکی ہلاس کی اُس چھوٹے کتے کو سنگھائی جس کا اثر یہ ہوا کہ اُسے فوراً ہی ایک چھینک آئی اور غریب وعاجز یارو کو گلو خلاصی حاصل ہوئی اور وہ نوعمر، قوی ہیکل گڈریا اپنے کتے یارو کو بغل میں دے کر اُسے تسلی دلاسا دیتا ہوا اپنی راہ چل دیا۔

لیکن اب اُس شکاری کتے کا خون جوش میں آچکا تھا اور اُس کی طبیعت ابھی جدال وقتال سے سیر نہ ہوئی تھی ! آگے بڑھتے اُس نے پہلے کتے کی گردن دبائی مگر یہ دیکھ کر کہ وہ کتا نہ تھا کتیا تھی اُس نے مختصر "عذر معذرت" کر کے آگے کا رخ کیا۔ تمام لڑکوں نے میرے اور بوب کے ہمراہ اُس کا تعاقب کیا اور ہم سب ہانپتے کانپتے بڑی سڑک پر سے ہو کر گنڈو گیٹ پہنچے، یہاں، جنوبی پل کی اکہری کمان کے نیچے ایک فیل ہیکل کتا، انسانوں کی طرح گویا اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے یکساں طمانیت وسکون بانہہ کے وسط میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ یہ کتا، عمر رسیدہ، بھورا، ابلق اور

پہاڑی کتوں کی طرح دراز قامت تھا اور اپنے کنپھڑے (گوشت کا وہ زائد حصہ جو اکثر جانوروں کی گردن میں نیچے لٹکتا رہتا ہی) ہلاتا چلا جا رہا تھا۔

شکاری کتے نے سیدھا اس کی طرف رخ کیا اور اس کی گردن جا دبائی، ہمیں یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ اس دیو ہیکل کتے نے کچھ بھی نہ کیا بلکہ اپنی جگہ تن کر کھڑا ہو گیا اور لمبی خشگیں اور شکایت آمیز آواز سے چیخنے لگا۔ وجہ کیا؟ وجہ یہ تھی کہ اس کا منہ بندھا ہوا تھا کیونکہ ابھی زمانہ میں میونسپلٹی نے کتوں کی دہن بندی کا حکم دیدیا تھا، چنانچہ اس کتے کے آقا نے، مضبوطی اور کفایت شعاری کو مدنظر رکھکر کتے کے بدہیئت چہرہ کو ایک خانہ ساز دہانہ میں جو برآنے جوتے کے چمڑہ کو کاٹ کر بنایا گیا تھا، جکڑ دیا تھا کتے کا منہ جس قدر ممکن تھا باہر نکلا ہوا تھا، اس کے ہونٹھ کثرت غم و وفور غضب سے خوفناک کھسیانہ پن ظاہر کرتے ہوئے سکڑ گئے تھے" اس کے دانت، تاریکیِ دہن کے خلاف چمک رہے تھے، اس کے منہ پر جو تسمہ بندھا ہوا تھا تن کر کمان کے چلّہ کی طرح کھنچ گیا تھا۔ اس کا سارا جسم کثرتِ تحیر و استعجاب سے تن گیا تھا اور اس کی آہ و بکا گویا ہم سے مستفسر تھی کہ "آیا ہم نے بھی کبھی ایسی بے بسی کا عالم دیکھا ہی؟" وہ حیرت و طیش کا مجسم بت معلوم ہوتا تھا کہ جس کو ایبرڈینی پتھر سے تراشا گیا ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں ہمارے قریب خاصا مجمع ہو گیا مگر اس شکاری کتے نے اپنے مدمقابل کو کسی طرح نہ چھوڑا، بوب نے کسی سے چاقو مستعار لے کر دہانہ کا تسمہ کاٹ ڈالا، منہ کے گرد خاک سی اڑتی نظر آئی۔ کوئی غل شور نہ ہوا اور وہ چھوٹا کتا بےجان مردہ کی مانند گر پڑا۔ میں نے آلٹ پلٹ کر دیکھا تو وہ جان دے چکا تھا! غالباً قوی ہیکل کتے نے اس کی گدّی پکڑ کر اس کی کمر توڑ ڈالی تھی جس کے سبب وہ جاں بر نہ ہو سکا۔

اس نے اپنے مقتول کی لاش پر تعجب و ندامت کی نظر ڈالی، لاش کو خوب سونگھا اور کچھ خیال آتے ہی منہ پھیر کر چل دیا۔ بوب نے مقتول کتے کو اٹھا لیا اور ہم دونوں قاتل کے تعاقب میں روانہ ہوئے، کتے نے جھپٹ کر کوگیٹ کا رخ کیا، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ کوئی کام کرنا بھول گیا ہی پھر وہ شمع سازوں کے محلہ کی طرف مڑا اور رہیروان پر جا کر رکا! ایک لدّو ٹھیلہ روانہ ہونے کو تیار کھڑا تھا اور ایک مستعد، پھرتیلا، سیہ شمائل پستہ قد آدمی اپنی بھوری گھوڑی کے سر پر ہاتھ رکھے چاروں طرف تک رہا تھا گویا کسی چیز کی تلاش میں ہی۔ "ریب! اے خبیث!" وہ بولا اور اس نے کتے کی طرف لات اٹھائی لیکن ریب نے پھرتی مگر عجز و انکسار سے، اپنے آپ کو فعل دارجوئی کی زد سے محفوظ کیا اور اپنے آقا کے چہرہ پر نظر جمائے ہوئے ٹھیلے کے نیچے چھپ گیا، اس کے کان بھی بسبب خوف و عجز جھک گئے اور اس کی دم بھی نیچے ہو گئی! میں نے اور بوب نے ساری سرگزشت کہ سنائی

جس کو سن کر ٹھیلہ بان نے محبت سے کتے کو آواز دی، ریب کی ننھی سی دم اوپر اٹھ گئی، اس کے کان کھڑے ہو گئے، اس کی آنکھیں نشۂ تسکین سے مست و مخمور ہو گئیں اور دونوں دوستوں میں میل ملاپ ہو گیا۔

میں نے اور بوب نے اس مقتول کتے کو انتہائی سکوت و متانت سے ۲۱ میلویل سٹریٹ کے پائیں باغ میں دفن کیا اور چونکہ ہم اس وقت ایلیڈ پڑھ رہے تھے اور دوسرے بچوں کی طرح اپنے کو طراجن سمجھتے تھے اس لئے ہم نے مقتول کا نام ہکٹر قرار دیا۔

چھ سال بعد، جب میں طبابت پڑھتا تھا اور بوب لڑائی پر جا چکا تھا، اکتوبر میں ایک دن ہسپتال سے واپس جا رہا تھا کہ میں نے صدر دروازہ کھلتے اور ریب کو ہیبت ناک مستانہ چال سے اندر آتے دیکھا۔ وہ چاروں طرف اس طرح دیکھ رہا تھا گویا مکان کا جائزہ لے رہا ہو یا جس طرح کسی مفتوحہ شہر میں ڈیوک ولنگٹن نشۂ فتح و ظفر سے سرشار داخل ہوتے ہونگے۔ ریب کے پیچھے پیچھے جیس (گھوڑی) گاڑی لئے ہوئے اندر آئی؛ گاڑی میں ایک مسن عورت خوب اوڑھے لپیٹے بیٹھی تھی، گاڑی بان نے جو وقتاً فوقتاً پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا تھا، جب مجھے دیکھا تو نہایت ادب مگر مضحکہ خیز طریقہ سے سلام کیا اور کہنے لگا۔ "مسٹر جان! یہ ہماری گھر والی ہے، اس کا سینہ دُکھ رہا ہے (دکھ رہا ہے)۔ میں جانوں اندر کوئی مرج (مرض) ہو گیا ہے"

اب میں نے اس عورت کا چہرہ بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک ٹھیلے پر بیٹھی تھی اپنے شوہر کا لبادہ اُس کے گرد لپٹا ہوا تھا اور اُس کا بڑا کوٹ (جس میں دھات کے سفید بڑے بڑے بٹن ٹنکے ہوئے تھے) اُس کے پاؤں پر پڑا تھا۔

میں نے ایسا ناقابلِ فراموش چہرہ - زرد و رنجیدہ، متین، بے مونسںؔ[1] و ہمدم، نرم و شیریں چہرہ - کبھی نہیں دیکھا۔ اس عورت کی عمر قریب ساٹھ سال کے تھی، وہ ایک سفید، سیاہ فیتہ دار، ٹوپی اوڑھے تھی، اُس کے سفید چمکدار بال اُس کی سیاہی مائل بھوری آنکھوں کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہے تھے اُس کی آنکھیں اُس قسم کی تھیں جو زندگی بھر میں دو یا تین مرتبہ ہی دیکھنے میں آتی ہیں یعنی کہ اُن میں

---

[1] اس نگاہ کو ایک لفظ میں بیان کرنا آسان کام نہیں کیونکہ اُس کی نظر سے مترشح تھا کہ وہ مدت العمر بے مونس بے امینِ دلبر یکہ و تنہا رہی ہے۔

داستانِ شرحِ غم اور مصیبتوں پر قابو پا لینے کا افسانہ بہ قلم جلی مرقوم تھا۔ اُس کی بھوویں سیاہ اور ہلکی[1] تھیں۔ اُس کا وجدانہ صبر، قناعت اور استقلال ظاہر کرتا تھا اور ایسے دہانے بہت کم نظر آتے ہیں۔

میں کہہ چکا ہوں کہ میں نے کبھی ایسا خوبصورت چہرہ یا ایسی صورت جس پر ضبط و سکوت متصرف و قابض ہو نہیں دیکھا تھا، جیمس نے کہا: "ایلی! یہ مسٹر جان، یہاں کے ڈاکٹر ہیں، ربّ کے دوست ہیں، جانتی ہو نا؟" وہ عورت مسکرائی اور کچھ ادھر اُدھر ہلی مگر خاموش رہی، پھر وہ اپنا لبادہ ایک طرف ہٹا کر اُٹھی اور نیچے اُترنے کو تیار ہو گئی۔ اگر نپولین بونا پارٹ بھی باوجود تمامی عظمت و جبروت ملکہ جوزیفائن کو اپنے محل کے دروازہ پر اُتارتا تو اس نفاست محبت اور انسانیت سے نہ اُتار سکتا جس سے کہ ہاؤ گیٹ کے ٹھیلہ بان جیمس نے اپنی زوجہ ایلی کو ٹھیلہ سے نیچے اُتارا۔ جیمس کے چھوٹے، سیاہ، کار آزمودہ مستعد اور دنیا دار بشرہ کے مقابلہ میں اُس کی بیوی کا زرد، صابر اور خوبصورت چہرہ بہت بھلا ہوتا تھا ربّ نہایت صبر و تحمل مگر انتہائی تشویش و تردد سے، چاروں طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہ ہر قسم کے لئے تیار تھا خواہ وہ کام نرس یا دربان کا خود میرا گلا ہی گھونٹنا کیوں نہ ہو! بظاہر ربّ اور ایلی میں بہت دوستی تھی۔

"میں نے کہا نا، ڈانگدر صاحب! اس کے سینہ میں تکلیف ہے؛ آپ دیکھو گے کیا؟" ہم چاروں مشورہ کے کمرے میں گئے۔ ایلی بیٹھ گئی اور اُس نے اپنا گاؤن کھول کر اپنی گردن میں سے کرخی رومال نکال لیا اور بلا حیل و حجت مجھے اپنا داہنا سینہ دکھایا۔ میں نے خوب غور سے دیکھا، جیمس اور ایلی مجھے دیکھ رہے تھے اور ربّ ہم تینوں کو دیکھ رہا تھا، بلاشبہ، وہ سفید، مدوّر اور خوب صورت حصۂ جسم پتھر سے زیادہ سخت اور بے انتہا درد و تکلیف کا مسکن و مشتق ہو گیا تھا اور اُس زرد رو، روشن، سمجھدار اور بھوری آنکھ والی اور اُس عزیز، مستقل مزاج عورت کی قوت صبر و ضبط کو بُری طرح آزما رہا تھا۔

میں نے اُس شکیلہ کو بستر پر لٹا دیا۔ "کیا میں اور ربّ یہاں رہیں؟" جیمس نے پوچھا "ہاں" میں نے کہا، "تم ٹھہر سکتے ہو اور ربّ بھی، اگر تہذیب سے رہے، ٹھہر سکتا ہے" "ڈانگدر جی میں سچ کہوں ہوں وہ کسی کو دِک (دق) نہ کرے گا" اور وہ وفادار جانور ایک کونہ میں ہو بیٹھا۔

---

[1] لوگ کہتے ہیں کہ بعض عورتوں پر کالی بھویں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن اس طرح کہ وہاں زیادہ گھنے بال نہ ہوں بلکہ ہلکے ہلکے بال، جس طرح کہ قلم سے ایک نصف دائرہ یا آدھا چاند بنا دیا جائے، آنکھوں کو حلقہ کئے ہوں۔

آہ ! اب ایسے کتے کہیں نہیں ملتے ! وہ بھورے رنگ کا تھا اور اس کے چھوٹے چھوٹے مگر گھنے بال شیر
کی مانند تھے ، اس کا جسم بچہ گاؤ کی طرح ٹھوس اور سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا اور وہ ایک مجسم مگر مختصر ہرقل
کتا تھا ۔ اس کا سر بہت بڑا تھا ، اس کا دہانہ شب یلدا کی طرح سیاہ تھا اور اس کا منہ شب دیجور سے
بھی زیادہ تاریک وسیاہ اور اس کے ایک یا دو دانت اس کے سیاہ جبڑہ میں سے روز روشن کی طرح
تابان و درخشاں تھے ۔ اس کے سر پر پرانے زخموں کے نشان پڑے تھے گویا کہ اس کا سر معرکہ آرائیوں
کا روزنامچہ تھا ۔ اس کی ایک آنکھ جا چکی تھی اور دوسری میں دو آنکھوں کی طاقت تھی ، اس کا ایک کان
کٹا ہوا تھا جو صحیح وسالم آنکھ سے ذرا اوپر ایک مضغۂ لحم کی طرح ، اس طرح اِدھر اُدھر ہلتا تھا گویا کوئی
پرانا جھنڈا ہوا میں لہرا رہا ہو ۔ اس کی مختصر سی دم تقریباً انچ بھر موٹی تھی اور اس کی بسرعت نقل و
حرکت بہت تعجب خیز و مضحکہ انگیز تھی ۔ دم کا ہلنا اور مڑنا تڑنا اور کتے کی آنکھ ، کان اور اس کی دم
میں باہمی ربط و ارتباط بہت نادر اور عجیب چیز تھا ۔

دوسرے دن میرے استادِ مکرم جناب سرجن صاحب نے ایلی کا معائنہ کیا ، اس میں شک نہ رہا
کہ یہ تکلیف جو رفع ہو سکتی تھی اور شاید دوبارہ عود نہ کر سکتی ، ایلی کو بہت جلد فنا کر دے گی ، ایلی کو فوری
آرام مل سکتا تھا اور اُسے لازم تھا کہ بہت جلد اپنی مشکل آسان کرالے ۔ ایلی نے ادب سے جھک کر سلام
کیا ، جیمس کی طرف دیکھا اور سرجن سے پوچھا ، " کب ؟ " رحمدل سرجن نے جو بہت کم سخن تھا ،
جواب دیا " کل ! " جیمس ، ایلی ، میں اور ریب واپس ہوئے ! میں نے دیکھا کہ شوہر و زوجہ
آپس میں بہت کم گفتگو کرتے تھے مگر بایں ہمہ وہ دونوں ایک دوسرے کے مطلب و معانی اور ہر ایک
بات و حرکت کو بخوبی سمجھتے تھے ۔ تیسرے دن دوپہر کو ڈاکٹری کے طلبا جلد جلد سیڑھیوں پر چڑھنے لگے
پہلی منزل میں ایک چھوٹے نوٹس بورڈ پر ایک چھوٹا سا کاغذ چسپاں تھا ، جس پر مذکورۂ ذیل الفاظ
تحریر تھے :-

" آج آپریشن ہوگا (دستخط) جے بی محرر "

نوجوان لڑکے اچھی جگہ بیٹھنے کے شوق میں دوڑ دوڑ کر سیڑھیوں سے گزرنے لگے اور کمرہ
میں ہجوم کر آئے ۔ وہ بہت منہمک تھے اور باتوں میں مشغول " کیا مرض ہے ؟ کس طرف کو ہے ؟ کیا ہے ؟
وغیرہ "

ان لڑکوں کو بے رحم نہ سمجھو ، وہ مجھ سے یا تم سے بہتر یا بدتر نہیں ، ان کے دلوں سے اس پیشہ
کی تمام دہشت دور ہو جاتی ہے اور وہ اپنے کام میں دلچسپی لینے لگتے ہیں اور ان کے قلوب سے جذبۂ رحم و

تلطف بحیثیت ایک احساس و جذبہ کے مفقود یا کم از کم چند آنسوؤں اور ٹھنڈے سانسوں کی صورت میں منتقل ہوجاتا ہے اور ایسی صورت اختیار کرلیتا ہے جو دفع اذیت بشری کی طرف رغبت و رجحان پیدا کرے موخرالذکر صورتِ حال رفتہ رفتہ ان طلباء کے دل پر سکہ جماتی رہتی ہے اور بنی نوع انسان کے لئے بہتر بھی یہی ہے کہ ایسا ہی ہو بھی۔

آپریشن کا کمرہ بھرگیا اور ہنسی مذاق، باتوں، غرض ہر قسم کی طفلانہ حرکات وہاں دیکھنے اور سننے میں آئیں۔ سرجن اپنے عملے کو لئے ہوئے اندر آیا، ایلی کی ایک ہی نظر میں لڑکوں کا سارا جوش و خروش فرو ہوگیا کیونکہ وہ طلبا کے جذبۂ شوق و سرگرمی سے بالاتر ہستی رکھتی تھی، لڑکے خاموش ہوکر بیٹھ گئے اور ایلی کو بنظر غور دیکھنے لگے، ایلی بہت پھرتی مگر با وضع عجلت سے، گلے میں رومال ڈالے، ٹوپی اوڑھے، سفید دوسوتی کا چھوٹا گاؤن پہنے، کالا تسری لہنگا زیب بدن کئے، اپنی سفید بنی ہوئی جرابیں اور فرشی پاپوش دکھاتی ہوئی آگے بڑھی، جیمس بھی ریب کو ساتھ لئے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آیا اور ریب کا سر اپنے گھٹنوں میں دبا کر ایک طرف کونے میں ہو بیٹھا، ریب بہت ناراض اور نہایت حیران ہوتا تھا کیونکہ وہ برابر اپنے دونو کان اوپر نیچے کررہا تھا۔

سرجن کے اشارہ کرنے پر ایلی نے اپنا لباس درست کیا اور گدّے پر قدم رکھکر میز پر لیٹ گئی، اُس نے جیمس پر سرسری نظر ڈالی، آنکھیں بند کیں اور میرا سہارا لے کر اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ آپریشن فوراً شروع کردیا گیا لیکن آہستگی اور طمانیت سے کیونکہ کلوروفارم۔ جو مریض بندوں کے لئے خدائے تعالٰی کی بہترین نعمت ہے۔ اس وقت تک ایجاد نہ ہوا تھا، سرجن اپنا کام کرتا رہا، اس زرد فام چہرہ پر تکلیف و درد کے آثار ہویدا ہوئے لیکن ایلی ساکت و سامت پڑی رہی۔ ریب اپنے دل میں ہی پیچ و تاب کھا رہا تھا کیونکہ اُس کی مالکہ کے جسم سے خون بہ رہا تھا اور وہ سخت درد و کرب میں مبتلا تھی، چنانچہ کتّے کا نیم بریدہ کان اوپر اٹھا اور شدتِ غیظ و غضب سے بہت دیر تک اوپر رہا، وہ غرانے لگا اور بھونکا بھی، اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُس سرجن کے ساتھ بہت بُری طرح پیش آئے مگر جیمس نے اُسے مضبوط پکڑ رکھا تھا اور وقتاً فوقتاً اُسے دھتکارتا بھی رہتا تھا، کبھی کبھی جیمس نے کتّے کو لات مارنے کا بھی ارادہ کیا اور اس طرح اُسے قطعاً بے قابو اور معذور کردیا، اس میں ایک فائدہ اور بھی مضمر تھا اور وہ یہ کہ ان مشاغل کے سبب جیمس تھوڑی دیر کے لئے ایلی کی طرف سے بے توجہ ہوگیا۔

آپریشن ختم ہوگیا، ایلی کے پٹی باندھی گئی اور وہ باہستگی مگر شائستگی سے میز سے نیچے اُتر کر جیمس کو ڈھونڈھنے لگی، پھر اُس نے سرجن اور تمام طلبا کو جھک کر سلام کیا اور کہا کہ اگر مجھسے کوئی بُری بات

ہوگئی تو معاف کرنا، یہ سنتے ہی تمام لڑکے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، سرجن نے اُسے اچھی طرح بینا اوڑھا دیا اور وہ میرا اور جمیس کا سہارا لے کر اپنے کمرہ میں گئی، ہم دونوں نے اُسے بستر پر لٹا دیا۔ جمیس نے اپنی نعل دار جوتیاں اُتاریں اور میز کے نیچے حفاظت سے رکھ کر بولا:۔ "مسٹر جان! میں اپنی ایلی کے لئے نرس پھرس ناہیں بلاؤں، میں آپوں ہی اُس کی کھذمت (خدمت) کرلوں گا" چنانچہ اُس نے ایسا ہی کر دکھایا۔ وہ سخت ہاتھوں والا، مستقل مزاج، پستہ قد آدمی عورتوں کی مانند تیز و طرار، پھرتیلا اور ہوشیار و با نزاکت ثابت ہوا، جو جو اشیاء یا دوائیں ایلی کے لئے تجویز کی جاتی تھیں جمیس برابر کھلاتا پلاتا رہتا تھا وہ بہت کم سویا کرتا تھا اور میں نے بسا اوقات اُس کی خواب آلود نگاہیں ایلی کے چہرے پر جمی ہوئی دیکھیں۔

ریپ نے بڑی تمیز سے کام لیا، وہ بالکل نہیں ہلا جلا اور اُس نے ہمیں بتا دیا کہ وہ کس قدر شریف خوش خلق ہو سکتا تھا اور کبھی کبھی وہ نیند میں ایسی حرکتیں کرتا تھا گویا کسی دشمن کو زیر کر رہا ہے وہ روزانہ میرے ساتھ چہل قدمی کو جایا کرتا تھا مگر بہت خاموش خاموش اور رنجیدہ رنجیدہ، لڑنے بھڑنے سے وہ گریز کرنے لگا تھا بلکہ بعض مناسب موقعوں پر تو اُس نے اپنی تذلیل و تحقیر بھی گوارا کی، وہ سیر سے واپسی کے وقت بہت خوش ہوتا تھا اور نہایت تیزی سے دوڑتا اور سبک رفتاری سے سیڑھیاں طے کر کے سیدھا کمرہ کے دروازہ پر پہنچتا تھا۔ گھوڑی اور موسم زدہ گاڑی، ہاڈگیٹ واپس بھیجی جا چکی تھی اور غالباً وہاں اصطبل میں گھوڑی اپنے متوحش خیالات میں غرق رہتی اور ریپ اور اپنے آقا کی بلا وجہ غیر حاضری اور خود اپنے سڑک اور ٹھیلے سے محفوظ و مصئون رہنے پر تعجب کیا کرتی تھی۔

کچھ دن تک ایلی کی حالت بہتر رہی، زخم نہایت سرعت سے مندمل ہونے لگا کیونکہ جمیس کہتا تھا "ہماری ایلی کا سینہ ایسو سایہ (صاف) ہے کہ پیپ ناہیں نکل سکتا ہے"۔ لڑکے بہت متفکر و خاموش خاموش آتے اور ایلی کی چاروں طرف کھڑے ہو جاتے، وہ کہا کرتی تھی کہ "مجھے ان کمسن لڑکوں کے چڑچڑاں و معصوم چہرے بہت بھلے لگتے ہیں"۔ سرجن اُس کی مرہم پٹی کیا کرتا تھا اور اپنی عادت کے موافق آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی ہمدردی کا اظہار کرتا اور بہت کم گفتگو کیا کرتا تھا، ریپ اب ان باتوں سے واقف ہو گیا تھا اور دوستی کا برتاؤ کرنے لگا تھا، اُس نے غالباً یہ طے کر لیا تھا کہ کسی کو چھیڑنے دق کرنے کی ابھی کوئی ضرورت نہیں لیکن خیال رہے کہ وہ ہمیشہ اس کام کے لئے مستعد و ہوشیار رہتا تھا

آپریشن کے چار دن بعد یکایک مریضہ کی حالت بگڑ گئی اور اُسے کپکپی لگ آئی، میں نے فوراً معائنہ کیا اور دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو گئی ہے! اُس کے رخسارے تمتما اُٹھے ہیں، اُسے بہت کرب و بے چینی لاحق ہے جس کے سبب وہ بہت منفعل اور نادم ہے، توازنِ طبعی اُس کا مفقود ہو چکا تھا اور بگاڑ شروع، زخم کو بہ نظرِ غور دیکھنے پر ایک سُرخ خونیں نشان نے اپنی ساری داستان کہہ سنائی، ایلی کی نبض زیادہ تیزی سے چلنے لگی تھی، اُس کا سانس اکھڑا اکھڑا اور متفکرانہ اور وہ قطعی اپنے ہوش میں نہ تھی، ہم سے جو کچھ ممکن ہو سکا ہم نے اُس کی تیمارداری کی مگر درحقیقت جیمس نے سب سے زیادہ خدمت کی، وہ ہر جگہ اور ہر کام میں موجود رہتا، نہ کسی کام میں بے جا مداخلت کرتا اور نہ کسی کام سے ناواجبی گریز و احتراز (ایک اندھیرے میں میز کے نیچے گھس بیٹھا اور اُس کا تمام جسم سوائے اُس کی آنکھوں کے (جو ہر چیز اور ہر شخص کو دیکھتی رہتی تھیں) بالکل بے حس و حرکت ہو گیا، رفتہ رفتہ ایلی کی حالت اور بھی نازک ہو گئی، اُس کا توازن دماغی جاتا رہا! وہ جیمس سے اپنی محبت زیادہ واضح طور پر ظاہر کرنے لگی۔ سوال و جواب بہت تیزی سے کرتی اور اکثر درشتی سے کام لیتی، جیمس پریشان ہو کر بولا "اس کی ایسی حالت تو کبھی نہ ہوئی تھی!" کچھ عرصہ تک وہ عزیز عورت اسی خیال میں رہی کہ اُس کا دماغ چل گیا ہے اور وہ اپنی حرکتوں کی معافی مانگتی رہی لیکن آخر کار اُسے ہذیان لاحق ہوا اور اُس کا دماغ قطعاً بے قابو ہو گیا! اُس نے بہت پُرانے گیت اور گانے گانا شروع کئے، کبھی وہ کچھ کہتے کہتے رک جاتی اور کبھی حضرتِ داؤد کے عارفانہ کلام اور حضرتِ عیسیٰ کے قدسی سرود کو زباں زدِ عام گیتوں اور گانوں سے خلط ملط کر دیتی!

الغرض میں نے اس سے زیادہ عجیب و عبرت ناک سماں کبھی نہ دیکھا تھا، ایلی کی ترساں و لرزاں تیز، محبت آمیز اور پُرجوش آواز، اُس کا مختل و متوحش دماغ، اُس کے مبہم الفاظ اور اُس کی چمک دار خوف ناک آنکھیں، اُس کے محبت بھرے الفاظ، اُس کی پُرشوق التجائیں اور ملتمسانہ سوالات۔ غرض میں بہت سی باتوں کو بالکل نہ سمجھ سکا کہ کیا اور کیوں ہیں؟ جیمس بہت مایوس و غمزدہ مگر بہ کمال ہوش و حواس بسرعت ہر طرف دوڑتا پھرتا تھا، کبھی وہ کوئی نظم یا نثر پڑھ کر سناتا کبھی اپنے درشت و کرخت لہجہ میں کوئی گیت گاتا، غرض وہ ہر طرح اپنی "پیاری ایلی" پر دل و جان سے نثار ہوتا اور مَردوں کی طرح تمام مصائب و آلام کو برداشت کر رہا تھا۔ لیکن اب اختتام قریب آ پہنچا تھا، وہ کاسۂ طلائی شکست ہو رہا تھا، نقرئی سلاسل شکست ہو رہی تھیں۔ وہ عزیز و شیریں تر ہمدم و دمساز یعنی روح، عنقریب پرواز کرنے والی تھی، جسم و جان جو ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ تک ہم آہنگ و ہم مشرب رہ چکے تھے، اب جدا ہو رہے تھے اور ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے تھے۔ ایلی، یکہ و تنہا، اُس پرخار و سایہ دار وادی میں پا بجولاں تھی، جس میں ایک دن ہم

سب کو گزرنا ہوگا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایلی تنہا نہ تھی کیونکہ فضل ایزدی اُس کے شاملِ حال اور اُس کا رہبر و رہنما تھا۔

ایک رات وہ خاموش لیٹی ہوئی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ وہ سو رہی ہے کیونکہ اس کی آنکھیں بالکل بند تھیں۔ چنانچہ ہم نے روشنی گل کر دی اور اُس کی خبرگیری کرنے لگے، لیکن دفعتاً وہ بستر پر سے اُٹھ بیٹھی اور ایک گاؤن اُٹھا کر اُس نے اپنے داہنی جانب سینہ سے لگا لیا۔ ہم اُس کی منور آنکھوں کو، جو وفورِ شوق و الفت سے کپڑوں کے اس ڈھیر کو جھک کر دیکھ رہی تھیں، غور سے دیکھ رہے تھے؛ وہ گاؤن کو کچھ اس طرح سینہ سے لگائے ہوئے تھی جس طرح ایک ماں اپنے شیرخوار بچے کو چھاتی سے لگائے وہ لاڈ پیار کے وہ جملے کہہ رہی تھی جو ایک ماں اپنے بچے کو کہا کرتی ہے۔ ہمیں اُس کی خراب و خستہ حالت اور نیم مردنی کیفیت، بلکہ اُس کی اس محبت کو دیکھ دیکھ کر اُس پر بڑا ترس آتا تھا۔

"مجھے بچاؤ"! جیمس نے بےبسی سے گڑگڑا کر کہا۔ اور پھر ایلی آگے پیچھے کی طرف ہلنے لگی گویا وہ بچے کو لوری دیتی اور تھپکتی ہے اور اُس پر اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے۔

"آہ، ڈاکٹر صاحب! میں جانوں وہ اُسے چھوری سمجھت ہے"

"کون سی چھوری؟"

"صاحب ہمری اکلوتی چھوری جسے مرے ہوئے چالیس برس ہوگئے"

بے شک یہ بات ٹھیک تھی، سینہ کی تکلیف جو ایک مدہوش و ناکارہ دماغ کو ایک نئی داستان سنا رہی تھی، بالکل غلط سمجھی اور دیکھی گئی تھی۔

یہ تتمہ تھا؛ ایلی کی حالت بد سے بدتر ہوگئی، ہذیان جاتا رہا مگر غالباً یہ آخری دوامی تاریکی سے پیشتر کی چمک برق تھی، کچھ دیر آنکھیں بند کئے پڑے رہنے کے بعد اُس نے جیمس کو پکارا اور نظر اُٹھا کر اُس کی طرف بغور دیکھا، پھر اُس نے اپنی توجہ میری طرف مبذول کی اور پھر ربّ کی جانب! آخرش وہ دوبارہ اپنے شوہر کے منہ کو تکنے لگی گویا وہ اس نظارہ سے تمام عمر نہ تھکے گی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں، وہ کچھ دیر جلد جلد سانس لیتی رہی اور پھر اس قدر جلد چل بسی کہ جب ہمیں اس کے مرنے کا خیال آیا تو جیمس نے جھٹ کر آئینہ اُس کے منہ کے سامنے کر دیا، بہت دیر بعد ایک موہوم سی تنفس بھی سانس کی راہ باہر نکل گئی اور وہ واپس نہ پلٹی اور اس موہوم تنفس نے تاریکی بدن کو اور بھی زیادہ تاریک و اسود چھوڑ دیا۔

آہ! ہماری زندگی بھی کیا چیز ہے؟ ایک دھواں ہے جو تھوڑی دیر نظروں کے سامنے رہتا

اور بعدہٗ یک لخت غائب ہوجاتا ہے۔

ربیب جاگ رہا تھا مگر خاموش بیٹھا تھا، وہ آگے بڑھا اور ایلی کا ہاتھ، جو نیچے لٹک رہا تھا اور جسے جیمس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور اپنے آنسوؤں سے تر کردیا تھا، چاٹنے لگا، پھر اپنی نگاہ پر نظر غائر ڈال کر اپنی سابق نشست گاہ، پرمیز کے نیچے جاکر بیٹھ گیا۔

جیمس اور ہیں نہ معلوم کب تک، غالباً کچھ دیر، اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے کہ یکایک جیمس اٹھا اور کھڑ بڑ کرتا ہوا میز کے قریب پہنچا، اس نے اپنی دونوں انگلیوں سے پکڑ کر جوتا باہر نکالا اور پہننے لگا۔ جوتا پہنتے وقت اس کا چرمی تسمہ ٹوٹ گیا جس پر وہ غصے سے بڑبڑا کر کہنے لگا: "میں نے ایسا تو کبھو نا کیا تھا!"

شاید اس نے پہلے کبھی نہ کیا ہو اور بعد ہی میں۔ "ربیب!" جیمس نے درشتی سے کہا اور پلنگ کے نیچے کی طرف اشارہ کیا۔ ربیب جھپٹ کر پلنگ کے نیچے لطافت جا بیٹھا اور مرحومہ کے سر اور آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"مسٹر جان! تم میری بات دیکھنا" اور یہ کہکر جیمس دھڑ دھڑ کرتا ہوا اندھیرے میں سیڑھیوں سے نیچے اتر کر غائب ہوگیا۔ میں لپک کر کھڑکی کے قریب پہنچا، جیمس ہسپتال کے سرے پر پہنچ چکا تھا اور صدر دروازہ کے باہر سایہ کی طرح ڈھل رہا تھا۔

مجھے جیمس کی طرف سے فکر تھا بھی اور نہیں بھی تھا! بہرحال میں ربیب کے قریب جا بیٹھا اور تکان کے باعث مجھے نیند آگئی۔ یکایک باہر کچھ غل شور کے سبب میری نیند اچٹ گئی۔ نومبر کا مہینہ شروع ہوچکا تھا اور باہر بہت برف پڑ رہی تھی، ربیب حسب سابق طریقے سے بیٹھا ہوا تھا۔ کھڑبڑ اس نے بھی سنی تھی اور وہ اس کی وجہ موجبہ سے بخوبی واقف تھا مگر وہ اپنی جگہ سے ہرگز نہ سرکا! میں نے باہر نظر دوڑائی اور صبح کی تاریکی میں (کیونکہ ابھی سورج طلوع نہ ہوا تھا) جیمس کو (گھوڑی) گاڑی سمیت دروازہ میں گھستے دیکھا! میں جیمس کو نہ دیکھ سکا کیونکہ وہ پہلے ہی سیڑھیاں طے کرکے کمرے کے دروازے پر پہنچ چکا تھا، اسے ہسپتال سے گئے ہوئے مشکل سے تین گھنٹے ہوئے ہونگے اور نہ معلوم کس طرح اس نے ہاؤ گیٹ تک نو میل کی مسافت (غالباً دوڑ دوڑ کر طے بھی کی، گھوڑی کو جوتا بھی اور اسے مبہوت و ششدر شہر میں کھینچ بھی لایا! وہ اپنی بغل میں بہت کمبل لئے ہوئے تھا اور پسینہ میں شرابور ہورہا تھا، اس نے مجھے اشارہ کیا اور دو جوڑی کمبل، جن کے سروں پر "لے۔جی ۹۴، ۱" موٹے موٹے حروف میں سرخ تاگے سے سوزن کاری کیا ہوا تھا، فرش پر بچھا دیئے۔ یہ حروف ایلین گریم کے چھوٹے دستخط تھے اور جیمس نے اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ جب کہ وہ خود

موا زیادہ نہ تھا گو نظروں سے اوجھل تھا اور جب کہ وہ پہاڑیوں میں میلوں کی مسافت طے کرکے تربتر اور اور بہت تھکا ہوا" گھر واپس آیا ہوگا۔ کہ "سارا جگ سو رہا ہے" اور ایلی آگ کے قریب بیٹھی ہوئی، اپنے پیارے جیمس کے لئے، کمبلوں پر اپنا نام کاڑھ رہی ہے۔

اُس نے ربیب کو علیحدہ ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور اپنی زوجہ کو گود میں لے کر کمبلوں پر لٹایا اور اُس کا مُنہ کھلا چھوڑ کر اُسے اچھی طرح احتیاط سے اوڑھا دیا، اُس نے پھر اُسے اٹھالیا اور مجھے پھر اشارہ کرکے عزم بالجزم مگر انتہائی مایوسی کے ساتھ راستہ طے کیا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ ربیب اُس کے پیچھے پیچھے گیا اور میں بھی روشنی ہاتھ میں لئے (اگرچہ اُسے روشنی کی ضرورت نہ تھی) باہر آیا۔ میں سرد ہوا میں موم بتی ہاتھ میں لئے ہوئے احمقوں کی طرح باہر پہنچا اور ہم بہت جلد دروازہ پر پہنچ گئے، میں جیمس کا ہاتھ بٹا سکتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ اُسے چھیڑنا مصلحت نہ تھا اور وہ طاقتور ہونے کے سبب میری امداد کی ضرورت نہ رکھتا تھا۔ اُس نے ایلی کو پھر اُسی قدر احتیاط اور خبرداری سے ٹھیلے میں لٹا دیا جس طرح کہ دس دن پہلے اُس نے ٹھیلے سے نیچے اتارا تھا، اُس نے ایلی کا لباس درست کیا، اُس کا خوب صورت ساکت چہرہ کھلا رہنے دیا گھوڑے کی گردن پکڑ کر روانہ ہوگیا۔ نہ اُس نے ہی میری طرف دھیان لیا اور نہ ربیب نے ہی، جو ٹھیلے کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، میری طرف توجہ کی۔

جب تک وہ لوگ کالج کے بلے سائے سے نکل کر نکلس روڈ کی طرف نہ مڑے، میں کھڑا دیکھا کیا۔ میں نے اس اکیلے ٹھیلے کی گڑگڑاہٹ گلیوں میں گونجتی اور ناپید ہوتی سُنی اور میں نے عالم تصور میں ان لوگوں کو لیبرٹن برے، روسلن مور، پینیلینڈز، آخنڈنی، وڈ ہاؤسلی مین سے گزرتے ہوئے دیکھا اور خیال کیا کہ جب سورج کی پہلی کرنیں لیمرمور پر پڑکر جیمس کے دروازہ پر ضوفگن ہونگی، اُس وقت ٹھیلہ سرائے پر رُکے گا اور جیمس کنجی سے کر ایلی کو گود میں اُٹھائے گا اور اُسے اُس کے بستر پر لٹا دے اور گھوڑے کو اصطبل میں باندھ کر ربیب کو ساتھ لئے ہوئے گھر میں داخل ہوگا اور کواڑ بند کرے گا۔

برف پڑ رہی تھی اور اُس بے داغ سفید نرم گدّے کے خلاف قعر لحد کی تنگی و تاریکی ہولناک سماں پیدا کر رہی تھی، جیمس نے، اپنے مغموم پڑوسیوں کی معیت میں، اپنی زوجہ کو پیوند خاک کیا اور ربیب نے دُور سے تمام رسومات کو غور سے دیکھا؛ جیمس نے ہر ایک کام خود ہی کیا مگر یکایک بیمار پڑا اور صاحب فراش ہوگیا جس وقت ڈاکٹر آیا وہ بے ہوش تھا اور چند دن بعد عالم بقا کو سدھار گیا۔ گاؤں میں ان دنوں بخار پھیلا ہوا تھا اور یہ تپ متواتر جا گئے، اپنی مصیبت اور اپنی تکان کے سبب وہ بخار کا اثر قبول کرنے کے قابل ہوگیا تھا

دوسرے قبر کھودنا کوئی مشکل کام نہ تھا، برف نے پھر ہر چیز کو چھپا اور سفید کر دیا تھا۔ ریب نے پھر وہی تماشا دیکھا اور دبے پاؤں گھر واپس آیا۔

اور ریب کا کیا حشر ہوا؟ سنئے! ایک ہفتہ بعد میں سرائے میں جا کر ریب کی خیریت پوچھنے لگا پہلے پہلے تو اس نئے ٹھیلے والے نے جسے جیس کا کام سپرد ہوا تھا، مجھے ٹالنا چاہا، لیکن جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے کہا کہ

"صاب وہ تو مرگیا"

"ہائیں کیسے؟"

"صاب وہ اصطبل میں گھس بیٹھا تھا، میں نے بہت نکالو، گوس بھی دکھایو، پن اس نے کھاک (خاک) نہ کھایو اور نہ مجھے جانور کو کھلانے دیو، بلکن ہمیں مجھ پر بھونکا کرے تھا اور میری ٹانگ پکڑے تھا، سو صاحب! میں کہا (کیا) کرتا، میں نے بھی اسے ایسی لاٹھی دی کہ ..... مرہی تو گیا"

مجھے یقین آ گیا، واقعی ریب کے لئے یہ موت نہایت موزوں اور بہت مناسب تھی، اس کے دانت تو جھڑ ہی چکے تھے اور اس کے دوست بھی فوت ہو چکے تھے، پھر اسے کیا ضرورت تھی کہ تمیز و آشتی سے بسر کرتا؟

اسے نالے کے قریب دفن کیا گیا اور گاؤں کے لڑکوں نے (جو اس کے ہجولی تھے اور جب وہ دھوپ میں اپنے مکان کے دروازہ پر نیم خوابیدہ لیٹا ہوتا تھا وہ اس کے ساتھ کھیلتے اور اس کے ضخیم پیٹ پر بیٹھ جاتے تھے) دور سے کھڑے ہو کر کفن دفن کا تماشا دیکھا۔

مترجم

محمد سلیم الحق احقر دھلوی (علیگ)

"ریب اور اس کے احباب"
از ڈاکٹر جان براؤن

افکار اصغر

پاتا نہیں جو لذتِ آہِ سحر کو میں
پھر کیا کروں گا لیکے الٰہی اثر کو میں

آشوب گاہِ حشر مجھے کیوں عجیب ہو
جب آج دیکھتا ہوں تری رہ گزر کو میں

آہوں نے میری خرمنِ ہستی جلا دیا
کیا مُنہ دکھاؤں گا تیری برق نظر کو میں

محوِ مدام شعبدۂ زلف و روئے یار
کیا جانوں فتنہ کاریِ شام و سحر کو میں

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا
اس رخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں

اے پردہ دار! یہ ترے جلوے کی شوخیاں
پردہ کو دیکھتا ہوں کبھی پردہ در کو میں

چرچے ہیں ہر طرف ترے تیرِ نگاہ کے
لیکن چھپائے بیٹھا ہوں زخمِ جگر کو میں

جینا بھی آگیا مجھے مرنا بھی آگیا
پہچاننے لگا ہوں تمھاری نظر کو میں

باقی نہیں وہ لذتِ بیداریِ فنا
اب کیا کروں گا زندگیِ بے اثر کو میں

نیرنگیِ جمال کے قربان جائیے
حیراں ہوں دیکھ دیکھ کے اپنی نظر کو میں

اصغر مجھے جنوں نہیں لیکن یہ کیا ہے آج
گھبرا رہا ہوں دیکھ کے دیوار و در کو میں

شکستہ دل

اُن لوگوں کے لئے جنھوں نے اپنے ابتدائی خیالات کی حسِ نازک کو محسوس ہی نہ کیا ہو یا جن کی زندگی عیاشانہ شہدپن و بے مہری کے زیرِ اثر تربیت پزیر ہوئی ہو۔ یہ ایک معمولی بات ہے کہ وہ تمام حکایاتِ محبت کو مضحکہ خیز۔ .. اور مجنونانہ داستاں ہائے عشق کو محض فسانہ نگار یا شاعر کی فرضی و دماغی پیداوار خیال کرتے ہیں۔ ... مگر انسانی طبائع کی معلومات نے میرے دل میں مختلف خیالات پیدا کر دیئے ہیں ... میں قائل ہوں کہ دنیوی تفکرات طبعِ انسانی کی سطح کو کتنا ہی پرشکن و منجمد کیوں نہ بنا دے یا اُن کے قلوب میں دل کش آدابِ مجلس کی کتنی ہی تبسم زا کاشت کیوں نہ کی جائے۔ بایں ہمہ اُن سرد سینوں کی گہرائی میں ایک ایسی دائمی چنگاری سلگتی رہتی ہے کہ اگر اُسے ذرا سی بھی ہوا دیدی جائے تو وہ نہایت تیزی سے مشتعل ہو جاتی ہے اور لبا اوقات نہایت تباہ کن نتائج پیدا کر دیتی ہے۔ میں نا دیدہ الوہیت اور اُس کے قانونِ قدرت کا سچا ماننے والا ہوں۔ میں ایماناً معترف ہوں کہ مجھے شکستہ دلی کا کامل یقین ہے اور میرے نزدیک ناکام محبت کا جان سے گزر جانا ممکنات سے ہے۔ پھر بھی میں اس جاں فرسا اثر کو اپنے ہم جنس کے لئے بہت زیادہ مہلک نہیں سمجھتا۔ لیکن اتنا بوثوق کہہ سکتا ہوں کہ یہ بہت سی حوروش خواتین کو قبل از وقت آغوشِ لحد سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

انسان خودغرضی و تمناؤں کا مجسمہ ہے۔ اُس کا نفس اُسے دنیوی جد و جہد و کشمکش کی طرف رغبت دلاتا ہے۔ محبت کیا ہے۔ صرف اُس کے اوائل خیالات کی مجلّی روشنی یا مشاغل سے پُر زندگی کے پرامن لمحوں کا نغمۂ دل فریب۔ کبھی تو وہ شہرت کا خواہاں کبھی دولت کا طالب۔ کبھی دنیا کے دل میں جگہ کرنے کا متلاشی اور کبھی اپنے ہی ہم جنس پر حکومت کرنے کا متمنی نظر آتا ہے۔ مگر برخلاف اس کے عورت کی سلدی زندگی صرف ایک فسانۂ محبت ہے۔ اُن کا دل ہی اُس کی دنیا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں اُن کی تمنائیں حصولِ سلطنت کی کوشش کرتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ لالچ کے ساتھ مخفی خزانوں کو تلاش کرتی ہے۔ وہ کسی اہم واقعہ پر اظہارِ ہمدردی کرتی ہے۔ وہ بحرِ محبت میں ہمہ تن لنگر انداز ہونا چاہتی ہے اور اگر کہیں اُس کی یہ کشتیِ محبت درمیان ہی میں شکست و تباہ ہو جائے تو وہ مٹ جاتی ہے۔ برباد ہو جاتی ہے اسی واسطے کہ یہ دل کے دیوالیہ ہونے کا سوال ہوتا ہے۔

مردوں کے لئے ناکامی محبت کسی قدر اذیت دہ درد کی صورت رکھتی ہے۔ احساسات لطیف کو زخمی بنا دیتی ہے۔ امید مسرت کا خون کر دیتی ہے مگر اُس کی ہستی ایک مشغول ہستی ہے۔ وہ مختلف النوع کاموں میں اپنا دل بہلا کر امواج مسرت میں غرق ہو سکتا ہے یا اگر مناظر ناکامی کچھ ایسی ہی اذیت دہ یادگاروں سے مملو ہوں تو وہ حسب مرضی نقل مکان کر سکتا ہے اور سپیدۂ سحری کی طرح پھیلنے والی سرعت کے ساتھ دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک جہاں فراج چاہے قیام کر کے اپنی زندگی بعافیت گزار سکتا ہے۔

مگر عورت کی زندگی ایک غیر متحرک علیحدگی پسند اور تصورات سے پُر زندگی ہے۔ وہ اپنے ہی احساسات و خیالات کی دمساز ہوتی ہے اب اگر یہی مائل بہ رنج ہوں تو وہ حصول تسکین کہاں تلاش کر سکتی ہے اُس کی سرشت میں ہے کہ اُس کی ناز برداری کر کے دل کو فتح کیا جائے اب اگر اُسے اپنی محبت میں مایوسی ہو تو اُس کا دل بعینہ اُس قلعہ کے مانند سمجھنا چاہیئے جو مفتوح ہو کر لوٹ و غارت گری کے بعد ویرانہ کی صورت میں تباہ حال چھوڑ دیا جائے۔

اُف کتنی سیاہ و چمکیلی آنکھیں آب دیدہ ہو جاتی ہیں۔ کتنے گلابی رخسار زرد پڑ جاتے ہیں کتنی نازک و حسین ہستیاں پژمردہ ہو کر سپرد خاک ہو جاتی ہیں مگر افسوس یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس شان دل فریبی کو خاک میں ملانے کا اصلی سبب کیا ہے۔

جس طرح ایک زخمی طائر اپنے بازؤں میں چبھے ہوئے تیر کو پروں کی آڑ میں چھپا لیتا ہے۔ اسی طرح عورت اپنی ناکامی محبت کے اذیت دہ احساس کو دنیا سے چھپانے کی عادی ہوتی ہے۔ جنس لطیف کی محبت ہمیشہ شرم و خاموشی میں مضمر ہوتی ہے۔ اب اگر وہ خوش قسمتی سے اپنی محبت میں کامیاب ہو تو وہ اسے سانس کے ذریعے سے بھی نکلنے نہیں دیتی لیکن در صورت دیگر ... وہ اُسے اپنے دل کی گہرائی میں چھپا کر اپنے تباہ شدہ امن و سکون کے درمیان جگہ دیتی ہے یہاں تک کہ تمام خواہشاتِ دلی مردہ ہو جاتی ہیں ... سارا مقصد ہستی فوت ہو جاتا ہے ... وہ زندگی کو خوشگوار بنانے والی تمام باتوں سے دست کش ہو جاتی ہے ... اُس کا رشتۂ زندگی ظاہری صحت کے ساتھ ساتھ رگوں سے نکل کر ختم ہو جاتا ہے ... بس ... اُس کا سکون شکست ہو چکا ... اُس کی خوشگوار نیند خواب ہائے پریشان کی سمیت سے آلودہ ہو چکی .... نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جاں لیوا حسرت اُس کا خون خشک کرنے لگتی ہے ..... اور آخرش اُس کا کمزور جسم خفیف ترین بیرونی صدمہ سے زمین بوس ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ بعد آپ دیکھتے ہیں ... کہ دوستوں کی آنکھیں اُس کی قبل از وقت موت پر آنسو بہا رہی ہیں۔ اور حیرت میں ہیں ... کہ خدایا ... وہ ہستی جو ابھی ابھی حسن و صحت کی آب و تاب سے مزین تھی ... آج تہ زمین تاریکی میں حشرات الارض کی خوراک بنی ہوئی ہے ... آپ سے کہا جائے گا .... کہ جاڑوں کی

سردی یا کوئی اتفاقی بیماری اس موت کا باعث ہوئی۔ مگر افسوس یہ کوئی کیا جانے کہ دل کی بیماری اور شکستہ دلی نے اولاً اُس غریب کی جسمانی طاقت کو زائل کیا اور اس قدر جلد تباہی کا شکار بنا دیا۔

عورت کی مثال ایک ایسے نازک درخت کی طرح ہے جو باغ کا حسن و سرمایہ ناز ہو۔ جس کی شکل دل فریب اور برگ و بر نمایاں ہو۔ مگر جڑ میں کیڑا لگا ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر ایسا درخت یکایک ایسے وقت میں خشک ہو جاتا ہے جب کہ اُس کو ہر لحاظ سے تر و تازہ اور خوش گوار ہونا چاہیئے تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی شاخیں زمین بوس ہو کر ایک ایک پتہ گرا دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تباہ و برباد ہو کر صحرا کی خموشی میں ناپید ہو جاتا ہے اب جس وقت ہم اس حسن بربادی کا خیال کرتے ہیں تو ہماری ساری کوششیں اُس برباد کن ہوا کے جھونکے یا بجلی ٹوٹنے کی نوعیت دریافت کرنے میں جو اس بربادی حسن کا موجب ہوئی۔ بالکل فضول ثابت ہوتی ہیں۔

میں نے بہت سی خواتین کی زندگی کو اپنی ہستی سے بے خبر قعرِ بربادی میں گر کر بتدریج اس صفحۂ ہستی سے مٹتے دیکھا ہے۔ میں نے بار بار کوشش کی کہ اسباب موت کو میں کس تپ محرقہ، نمونیا، نقاہت امراض صفراوی، زیادتی فکر وغیرہ کی تہ لگا کر دریافت کر سکوں۔ مگر نتیجہ میں مجھے ہمیشہ ناکامی محبت کے ہی آثار نظر آئے۔ ہاں حال ہی میں اس قسم کی ایک مثال مجھ سے بیان کی گئی۔ اس کے واقعات اُس حصہ ملک میں جہاں یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ اظہر من الشمس ہیں۔ میں بھی اُن کو ظاہری صورت برقرار رکھتے ہوئے اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

ہر شخص کو آئرلینڈ کے رکن نوجوان ... کی رنجدہ حکایت کا علم ہوگا جو اس درجہ پُر اثر ہے کہ اس کا بھول جانا آسان نہیں .. آئرلینڈ کے زمانہ شورش میں اُس پر مقدمہ چلایا گیا اور جرم بغاوت کی پاداش میں سزا دلا کر اُسے پھانسی دی گئی۔ عوام کی ہمدردی پر اس واقعہ کا بہت ہی گہرا اثر ہوا۔ وہ ایسا ہونہار، ہوشیار نوجوان، اس قدر فیاض، ایسا شجاع اور ہمہ صفت تھا کہ اتنی صفات ایک نوعمر کے لئے کافی سے زیادہ تھیں دوران مقدمہ میں اُس کی علو ہمتی اور مردانگی قابلِ داد تھی۔ اُس کا امیرانہ خشمگین انداز جس سے کام لے کر اُس نے اپنے ملک کے خلاف جرم بغاوت کی تردید کی۔ اپنی فیصلہ کن بلاغت اور سزا پانے کے بعد قید زندان سے انتہائی موثر استدعا وہ باتیں تھیں جو ہر فیاض سینہ میں گھر کر گئیں۔ یہاں تک کہ دشمنوں کو بھی اُس سخت گیر حکمت عملی کا افسوس ہوا جس کے زیر اثر اُس کی ہلاکت عمل میں آئی۔

مگر ان سب سے قطع نظر ایک دل ایسا بھی تھا جس کی بیکلی کو الفاظ میں ظاہر کرنا ناممکن ہے زمانہ مساعدت و ایام مسرت میں اُسے ایک ماہ وش حسین لڑکی کی محبت حاصل ہو چکی تھی جو ایک مشہور گوشہ نشین بیرسٹر کی دختر تھی اس ماہ وش کو اس کے ساتھ وہی محبت تھی جو دوشیزہ کی ابتدائی یا پہلی محبت کے نام سے

بکاری جاتی ہی۔ جس وقت ہر ایک دنیوی اثر اس شخص کے خلاف ہوگیا۔ ہر طرف ادبار کی گھٹائیں چھا گئیں۔ ذلت وخطرے نے اُس کے نام کو تاریک کردیا۔ تو یہ تمام باتیں خاتون کے ازدیادِ محبت کا باعث بن گئیں۔ اُف! خیال تو کیجئے کہ جب اس شخص کے زوال نے دشمنوں تک کے دل میں احساسِ ہمدردی پیدا کردیا تو بھلا اس غریب کے دل کی اذیت کا کیا عالم ہوگا جس کی روح میں ہمہ تن اُسی کی تصویر ساری تھی۔ اس کا اندازہ کچھ اُنھیں سے پوچھئے جنھوں نے اپنے اور اُس ہستی کے درمیان جس کو وہ دنیا میں عزیز ترین سمجھتے تھے۔ قبر کے دروازوں کو یکدم بند ہوتے دیکھا ہو یا جو ایسی دہلیز پر دھونی رمائے بیٹھے ہیں جس کا باب ایک ایسی بے حس و تنہا دنیا کا پردہ ہو۔ جس کے دوسری طرف اُن کی عزیز ترین و قابلِ پرستش ہستی روپوش ہوگئی ہو۔

آہ! ایسی گورِ غریباں کے جاں ستاں اثرات کس درجہ الم ناک وجاں گداز ہیں نہ تو یاد تازہ رکھنے کا کوئی نشان۔ جس سے جدائی کے قلق کو تسکین دی جاسکے، نہ ایسے لطیف و پرحسرت واقعات جو الوداعی نظارہ کو زیادہ قابلِ الفت بنادیں اور نہ غم کو اُن مبارک آنسوؤں میں بدلنے والی کوئی یاد۔ جو پر اضطراب الوداعی ساعت میں دلوں میں روح پھونک کر ایک ذری دیر کے لئے شبنم کی طرح تازگی بخش ثابت ہوتی ہو۔ اپنی اس سوگوار حالت کو بد سے بدتر بنانے کے لئے۔ اُسے اپنی ناکامی محبت کا دوسرا ثمرہ یہ ملا کہ اُس کا باپ ناراض ہوگیا اور وہ مکان سے نکال دی گئی۔ اب اگر اس مہیب والمناک واقعہ پر شناسا اصحاب کی ہمدردی و عنایت بدرجۂ اتم منتقل نہ ہوگئی ہوتی تو شاید یہ غریب ہر قسم کی تسلی وتشفی سے مستغنی ہوجاتی۔ مگر یہ امر مسلمہ ہو کہ آئرلینڈ کے باشندے بے حد ذکی الحس و فیاض طبیعت کے ہوتے ہیں۔ ممتاز باثر اور متمول خاندانوں نے اُس غریب سے انتہائی شفقت سے کام لیا۔ اُنھوں نے اُسے سوسائٹی میں روشناس کرایا اور ہر قسم کی تفریحات مسرت سے اُس کے دلی رنج وغم کو مٹانے کی کوشش کی تاکہ اس غمناک فسانۂ محبت کی ناکامی کا اثر دل سے دُور ہوجائے۔ مگر آہ! یہ سب بے سود ثابت ہوا۔ مصائب وآلام کی بعض ضربیں ایسی کاری ہوتی ہیں جو روح وقلب کو مجروح و داغ دار کردیتی ہیں۔ جو خوشی کی انتہائی گہرائی تک پہنچکر احساسِ مسرت کو ہمیشہ کے لئے ایسا فنا کردیتی ہیں کہ کبھی اس خزاں رسیدہ برگ سے کوئی غنچہ پیدا ہی نہ ہوسکے۔ اُس نے ان مجالسِ تفریح اور جلسہ ہائے مسرت میں شریک ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ مگر وہ یہاں بھی اپنے کو اُسی قدر تنہا سمجھتی تھی۔ جتنا عالمِ تنہائی میں۔ وہ چلتی پھرتی تھی مگر اپنے خیالاتِ پریشان میں اس قدر غرق کہ اُسے دنیا سے کوئی واسطہ وتعلق ہی نہ ہو اُس کی دل کی گہرائی میں وہ رنج پنہاں تھا۔ جسے احباب کی نازبرداری بھی دُور نہ کرسکتی تھی ؎

سنبھالا ہوش دل وجان کردیئے قرباں ۔۔۔ ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

جس شخص نے مجھ سے یہ حکایت بیان کی اُس نے اس خاتون کو ایک نغمانی جلسۂ رقص میں دیکھا تھا سچ تو یہ ہے کہ کسی گزرے ہوئے غم جاں گداز کو اس صورت میں مشاہدہ کرنے سے زیادہ موثر و المناک نظارہ دوسرا نہیں ہو سکتا جہاں ہر طرف رنگ رلیاں اور مسرت کا دور دورہ ہو۔ وہاں کسی ہستی کا آسیب کی طرح تنہا۔ خوشی سے عاری چلنا پھرنا۔ خوشی کے عارضی دھاگوں میں ملبوس ہو کر چہرہ کا زرد اور اظہار الم کا شاہد ہونا۔ اس امر کا ثبوت تھا کہ اُس نے اپنے ستم رسیدہ غریب دل کو عارضی طور پر اس رنج و غم کو بھلا دینے کا دھوکہ دینا چاہا تھا۔۔۔ شاندار آراستہ و پیراستہ کمروں۔۔اور مسرور مجمع کے درمیان ادھر اُدھر گھومنے پھرنے کے بعد وہ بیتابانہ ایک محراب کے قدمچہ پر بیٹھ گئی۔۔ اور ہر طرف دیوانہ وار نظریں ڈال کر اس موقعہ کی اہمیت اور مجمع کی موجودگی سے بے خبر ہو کر۔ اپنے بیمار دل کو تھام کر اُس نے گانا شروع کر دیا۔۔ اس کی خوش گلوئی قابل تعریف تھی۔ لیکن اس موقعہ پر اُس کی سادگی و انداز اس درجہ سوز و گداز سے پُر تھا کہ ہر نفس سے انتہائی رنج و غم، فسردہ دلی ٹپکی پڑتی تھی۔ لوگ حیران و ششدر۔ جوق جوق اُس کے گرد جمع ہو گئے اور مجمع میں کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جس کے آنسو نہ بہ رہے ہوں۔۔۔۔

یہ سچا اور نازک جذبہ ایسا نہ تھا جو ایسے ملک میں جہاں کا جذبہ فطرت مشہور رہو۔ کوئی خاص اثر پیدا نہ کرتا۔ اس نغمۂ جاں گداز نے ایک دلیر فوجی افسر کا دل تڑپا دیا اور اُس نے اپنی التجائے مناکحت کو اس خاتون کے سامنے پیش کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ ایسی ہستی جو ایک مردہ شخص کے لئے اس درجہ وفادار رہی ایک زندہ کے لئے ضرور قابل الفت ثابت ہوگی۔ لیکن اس خاتون نے اس کی استدعا کو رد کر دیا اور کہا "میرے سارے جسم و جان میں اُسی مرحوم کی یاد طاری و ساری ہے" مگر اس دلیر افسر نے اس کا کچھ خیال نہ کر کے اپنی استدعا پر اصرار جاری رکھا کسی خواہش نفس کے زیر اثر نہیں بلکہ محض جذبۂ تعظیم تھا کہ اُس نے اس خاتون کی محبت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے اپنی صحیح قدر و منزلت کا حال بیان کر کے اُس پر واضح کیا کہ یہ عالم تنہائی اور دوسروں کا محتاج بن کر زندگی بسر کرنا ایک غیور دل کے لئے زیبا نہیں۔ مختصر یہ کہ کچھ اپنی کوشش سے۔ اور کچھ دوسرے لوگوں کے سمجھانے و اثر ڈالنے سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ خاتون نے حتمی طور پر یہ کہکر کہ اُس کا دل ہمیشہ کے لئے کسی دوسرے کی یاد میں منہمک ہو چکا ہے۔ اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ محض اس امید پر کہ تبدیل مقام سے شاید ان غموں کی یاد دل سے فراموش ہو جائے۔ وہ اُسے ساتھ لے کر جزیرۂ سسلی، چلا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ خاتون نے ایک قابل فخر اور قابل تقلید بیوی ہونے کا ثبوت دیا اور اپنے غم پنہاں کو حتی المقدور دور کرنے کی کوشش کی مگر وہ گہرا زخم جس کا پھیلاؤ روح و دل پر حاوی ہو چکا تھا اپنے پُر الم و خاموش اثر

جاں گدازی سے باز نہ آیا۔ وہ حالت یاس میں بتدریج گھلتی گئی اور آخرش شکستہ دلی کا شکار ہو کر آغوش لحد میں سو گئی..... افسوس!

اسی خاتون کے وفات پر آئرلینڈ کے مشہور شاعر مور کا ایک قابل قدر قصیدہ ہے

مترجم

شمیم بلہوری

شمع طریقت

زیست ہی مقصد اگر تو رشتۂ باہم کو توڑ
جیت لے میدان ربطِ غیر مستحکم کو توڑ

راہِ حق کا خود بخود آئینہ تو بن جائے گا
صاف باطن کر طلسم غیر نا محرم کو توڑ

اپنی ہستی کو مٹا کر تو نئی دنیا بنا
سیکڑوں تصویریں نکلیں گی گلِ آدم کو توڑ

اپنے پیمانہ سے پی۔ تو حرص کا بندہ نہ بن
اپنی بینائی کی وسعت دیکھ۔ جامِ جم کو توڑ

تیلیوں ہی سے قفس کی دیکھ گلشن کی بہار
بلبلِ شیریں نوا! دیوارِ عہدِ غم کو توڑ

عمر بھر راحت ملے تو دو گھڑی کا رنج خوب
بند کر طوفان نہ دل میں۔ دیدۂ پرنم کو توڑ

وقت پر ہوگی شفا۔ تو بندۂ احساں نہ بن
زخم خود بھر آئے گا۔ تو پردۂ مرہم کو توڑ

دیکھ آلوس! باز آ۔ یہ کیسی توبہ روز روز
تو بھلا چاہے تو اب بھی لغزشِ پیہم کو توڑ

سید ابرار نور۔ متعلم بی اے کلاس مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کلام یاس

قفس میں بوئے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر
نوید ناگہاں پہنچی ہے مرگِ منتظر ہو کر

نگاہِ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے
مبادا رنگ و بو اُڑ جائے پامالِ نظر ہو کر

جواب آیا تو کیا آیا صدائے بازگشت آئی
دہن سے آہ نکلی مبتدائے بے خبر ہو کر

کہاں پرنا رسائی کی ہے پروانوں کی قسمت نے
پڑے ہیں منزلِ فانوس پر بے بال و پر ہو کر

فلک کو دیکھتا ہوں اور زمیں کو آزماتا ہوں
مسافر در وطن خانہ بدوشِ رہگزر ہو کر

عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو
لہو کا گھونٹ اُتر جاتا ہے جب شیر و شکر ہو کر

خود اپنے خاک و خوں میں لوٹ کر آلودۂ دنیا
پڑا ہے اب گڑھے میں گو رکے آلودہ تر ہو کر

خدا معلوم اس آغاز کا انجام کیا ہوگا
چھڑا ہے سازِ ہستی مبتدائے بے خبر ہو کر

عجب کیا وعدۂ فردائیں فردا پہ ٹل جائے
کوئی شام اور آ جائے نہ شامِ بے سحر ہو کر

مبارک نام آزادی سلامت دامِ آزادی
دعائیں دوں کسے یارب اسیرِ بال و پر ہو کر

رہائی کا خیالِ خام ہے یا کان بجتے ہیں
اسیرو! بیٹھے کیا ہو گوش بر آواز در ہو کر

نگاہِ یاس کا عالم جو آگے تھا سو اب بھی ہے
ہزاروں گل کھلے بازیچۂ شام و سحر ہو کر

ابو المعانی مرزا یاس عظیم آبادی

یہود عرب

مدینہ منورہ کے اطراف میں مدت دراز سے یہود لوگ آباد تھے ان کی مشہور قبائل بنو قینقاع ، بنو نضیر، بنو قریظہ تھے۔ عربوں کی طرح یہ لوگ بھی جنگ جو اور بہادر تھے آس پاس ان کا بڑا اثر تھا متعدد قلعے بھی ان لوگوں نے بنا رکھے تھے۔ باہمی خانہ جنگی جب عربوں میں پیش آتی تو یہ لوگ بھی ایک فریق کے ساتھ ہو کر میدان کارزار میں اُتر آتے تھے اس مقام پر ہم کو ان کی شجاعت یا اخلاق و عادات سے بحث منظور نہیں ہے بلکہ یہ تحقیق کرنا ہے کہ آیا یہ لوگ اصل عرب تھے بنو اسمٰعیل سے ان کا نسبی تعلق تھا یا خاندانی سلسلہ قحطان سے وابستہ تھا یا یہ لوگ عرب نژاد نہیں تھے بلکہ بیرونی ممالک سے آکر عرب میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔

عام مورخین اور علماء کی رائے ہے کہ یہ یہود لوگ عرب نژاد نہیں تھے یہ لوگ نہ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں تھے اور نہ یمنی الاصل۔ غرض اصل عربی خاندانوں سے ان کا کوئی نسبی تعلق نہیں ہے یہ لوگ اصل میں شام کے باشندے اور بنو اسرائیل تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں جہاد کی غرض سے عرب میں داخل ہوئے اور خیبر اور اطراف مدینہ میں آباد ہو گئے اور اپنی سکونت اختیار کرلی۔ رفتہ رفتہ انھیں اطراف میں اپنی محافظت کے لئے قلعے بنا لئے۔

اس عام اور مشہور قول سے مورخ یعقوبی نے اختلاف کیا ہے اُس کی رائے ہے کہ یہ لوگ نسلاً یہود نہیں تھے بلکہ یہ لوگ عربی نژاد تھے مگر یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ یعقوبی نے لکھا ہے۔
" ثم كانت وقعة بني النضير وهم فخذ من جذام الا انهم تهودوا .... وكذلك قريظة۔ پھر بنو نضیر کا واقعہ ہوا یہ قبیلہ جذام کی ایک شاخ تھے لیکن یہودی ہو گئے تھے اور اسی طرح قریظہ بھی"۔ مورخ مسعودی نے بھی اسی کے موافق ایک روایت نقل کی ہے۔ مولانا شبلی مرحوم نے سیرۃ نبویؐ میں ثانی قول کو ترجیح دی ہے اور آن کی رائے میں اطراف مدینہ کے یہود عربی الاصل تھے جیسا عام مورخین کا خیال ہے اسرائیلی نہیں تھے۔ مولانا نے ثبوت میں دو باتیں پیش کی ہیں اول یہ کہ اسرائیلی لوگ دنیا کے اکثر حصوں میں پھیلے اور بود و باش اختیار کی مگر نام ہمیشہ اسرائیلی رہا اس کے خلاف مدینہ منورہ کے اطراف میں جو یہود آباد تھے آن کے نام خالص عربی تھے مثلاً مرحب ، حارث وغیرہ

دوسری دلیل یہ ہے کہ یہود عموماً بزدل اور دنی الطبع ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے مدینہ کے یہود نہایت دلیر شجاع اور بہادر تھے۔ غرض اخلاق اور عادات میں وہ عربوں سے ملتے جلتے ہیں نہ اسرائیلیوں سے یہ عقلی قرائن ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نسلاً عرب تھے۔

مولانا مرحوم کی اس رائے سے ہم کو اتفاق نہیں ہے ہمارے خیال میں عام مورخین کی جو رائے ہے وہ صحیح ہے۔ علماء عرب نے نہایت بسط کے ساتھ ان یہود کے بود و باش اور سکونت کے متعلق واقعات درج کئے ہیں جن کا اعادہ یہاں ہمارے خیال میں ضروری نہیں۔ ہم یہاں پر صرف دو باتیں مختصراً ذکر کرتے ہیں۔ اولاً ہمارے سامنے قرآن کریم کی شہادت ہے۔ رسول اللہ صلعم مکہ کے قیام کے زمانہ میں کفار کو خطاب کرتے رہے قرآن شریف میں بھی عموماً وہی لوگ مخاطب ہیں۔ مگر ہجرت کے بعد یہود مدینہ سے بھی سابقہ پڑا۔ قرآن شریف نے توحید اور حق کی دعوت ان یہود کو بھی دی۔ ابتدا میں رسول اللہ صلعم نے ان سے مصالحت کرلی تھی مگر رفتہ رفتہ یہود شرائط صلح کو توڑتے گئے جس کا لازمی نتیجہ باہمی کشمکش تھا۔ یہود کی دغا اور فریب اور اخلاقی کمزوریوں کا پردہ قرآن شریف نے فاش کرنا شروع کیا۔ ان مقامات پر اللہ تعالیٰ نے یہود کو یا بنی اسرائیل کہہ کر خطاب کیا ہے اور متعدد جگہ ایسے الفاظ آئے ہیں۔ آیات کے پڑھنے سے فوراً معلوم ہوجاتا ہے کہ ان آیات میں یہود مدینہ وغیرہ سے جو حاضر تھے خطاب کیا گیا ہے۔ تمام مفسرین کا بھی اسی پر اتفاق ہے اگر یہ یہود اسرائیلی نہ ہوتے تو قرآن مجید کا یہ خطاب بے موقع ہوتا اور عرب جیسے نسب دان کے سامنے قرآن کریم یہ کلمات استعمال کرنے سے صاف نہ نکل جاتا۔ یقیناً ان خطابات کو مشرکین عرب اور یہود نے سنا اور خاموش ہورہے یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسرائیلی سمجھتے تھے اور تمام عرب قوم کی بھی یہی رائے تھی۔

ثانیاً اس قول کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے حضرت صفیہ حیی بن اخطب یہودی کی بیٹی تھیں جب بنو نضیر جلا وطن ہوئے تو حیی خیبر میں جاکر آباد ہوا مگر شامت اعمال سے بنو قریظہ کا ہم نوا ہوگیا جب مسلمانوں نے اس قبیلہ پر حملہ کیا تو مارا گیا۔ حضرت صفیہ کا شوہر بھی بنو نضیر کا سربرآوردہ اور سردار تھا۔ جنگ خیبر میں یہودیوں کے ساتھ ہوکر لڑا اور مسلمانوں کی تلوار کا شکار ہوگیا۔ عام تاراج میں حضرت صفیہؓ بھی گرفتار ہوئیں بعد کو رسول اللہ صلعم نے ان کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ ایک روز حضرت صفیہ کو حضرت حفصہؓ نے جو حضرت عمرؓ کی صاحبزادی اور رسول اللہ صلعم کی زوجہ تھیں یہود زادی کہدیا۔

"حضرت انسؓ کی روایت ہے بلغ صفیۃ ان حفصۃ قالت بنت یھودی فبکت فدخل علیھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھی تبکی فقال ما یبکیک فقالت قالت لی

حفصۃ انی ابنۃ یہودی فقال النبی صلے اللہ علیہ وسلم انک لابنۃ نبی وان عمک لنبی
وانک لتحت نبی ففیم تفخر علیک ثم قال اتقی اللہ یا حفصۃ۔ حضرت صفیہ کو خبر معلوم ہوئی
کہ حفصہ نے یہودزادی کہا ہے اس پر وہ رونے لگیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے جب وہ
رو رہی تھیں پوچھا کیوں رو رہی ہو جواب دیا کہ حفصہ نے میرے متعلق کہا ہے کہ میں یہودزادی ہوں
اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو ایک نبی کی بیٹی ہے اور تیرا چچا نبی تھا اور تو ایک نبی کے
بیاہی ہے کیوں کر وہ فخر کرسکتی ہے پھر آپ نے فرمایا اے حفصہ اللہ سے ڈر۔

اس حدیث میں یہ الفاظ قابل غور ہیں انک لابنۃ نبی وان عمک نبی۔ تو ایک نبی کی بیٹی
ہے اور تیرا چچا نبی تھا یعنی تو نسلاً حضرت ہارونؑ کی اولاد میں ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس اصل
اعتبار سے چچا ہوتے ہیں۔ اس حدیث میں اس امر کی صراحت ہے کہ بنو نضیر کا رئیس حیی بن اخطب عربی الاصل
نہیں تھا بلکہ اسرائیلی تھا۔ علماء انساب جو فن انساب کے ناقد اور ماہر ہیں ان کا بھی یہی قول ہے۔ اگر
رسول اللہ صلعم کے اس مقولہ میں نسبی غلطی ہوتی تو قطعاً اس عہد کے نساب علماء تغلیط کرتے اور اعتراضات
کے طوفان برپا کرتے۔

ہمارے کہنے کا یہ منشا نہیں ہے کہ ان قبائل میں عربی عنصر کا شامل ہونا غیر ممکن تھا یا عربوں کا یہودی
ہونا محال ہے۔ ممکن ہے ان اسرائیلی النسل قبائل میں کچھ وہ لوگ بھی داخل ہوگئے ہوں جو مذہباً یہودی تھے
اور نسلاً اسرائیلی مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ قبائل جیسا عام علما اور مورخین کی رائے ہے عربی نژاد
نہیں تھے۔ یہ بیرونی لوگ جلا وطن اور اشاعت مذہب کی غرض سے عرب میں داخل ہوئے ہونگے اور کسی
وجہ سے وہیں سکونت اور قیام اختیار کرلیا ہوگا۔ ہم اس کے قائل نہیں ہیں کہ عموماً اسرائیلی لوگ اسرائیلی
نام رکھتے تھے۔ یہود مدینہ منورہ عرصہ تک عرب میں رہے اور اس قیام میں ان پر عربی رنگ چڑھ گیا۔
حتی کہ اوضاع اور اطوار بھی عربی قوم کے قالب میں ڈھل گئے۔ فرض کیا کہ عرب کے اسرائیلی ذکی الطبع
اور بزدل نہیں تھے مگر جب ساری قوم بگڑ گئی ان کے اخلاق فاسد ہوگئے تو چند نفوس کی نجابت قوم سے
ذلت کا داغ اور دناءت کا عیب اٹھانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ ہماری رائے میں مورخ یعقوبی کا
فیصلہ حق پر مبنی نہیں ہے اور نہ اس کے پاس اس ثبوت کے لئے کافی دلائل ہیں۔

اس مضمون کا ایک دوسرا پہلو ہے اس مدعا کے اثبات کے لئے ایام جاہلیت کے اشعار بھی
پیش کئے جاسکتے ہیں۔ مگر ہم نے قصداً اس مقام پر ان سے گریز کیا ہے علماء ادب نے کافی لبسط کے ساتھ
اس پر شواہد نقل کئے ہیں۔

عبدالباقی اعظمی بی اے (علیگ)

بنتِ عم

"نقاد" سنہ ۱۹۱۴ء میں، ایم۔ مہدی حسن مرحوم نے، اس عنوان سے نثر میں، ایک دلچسپ مضمون لکھا تھا، یہ گویا تائید تھی اُس تحریک کی جو "بنتِ عم" کی تاریخی حیثیت کے انکشاف کے ساتھ، مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر نے پہلے پہل فرمائی تھی۔ مہدی مرحوم کو اس پر افسوس تھا کہ ایسے دلچسپ اور شاعرانہ عنوان کی جانب شعرائے عصر نے توجہ نہ کی، اور مجبوراً اُن کو قلم اُٹھانا پڑا۔ لیکن جیسا کہ خود ان کو احساس تھا، ہمارے ملک میں ایسی آزادیاں کہاں ممکن ہیں؟ اور ایک نظم نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کو پیشِ نظر رکھے۔ تاہم عالمِ خیال کی وسیع فضا، زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے اور "بنتِ عم" کی معنوی حیثیت سے قطع نظر کرنے کے بعد، اگر اہلِ عرب کی طرح سلسلۂ خیال کو وسعت دی جائے، تو اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

(اختر)

اے حسن! روحِ انبساطِ ہستی ناشاد ہو — میری نظر میں ڈوب جا، دل میں مرے آباد ہو
اِک لہر دوڑا دے، نئی رگ رگ میں لے "روحِ حیات" — پھر آتشِ خاموشِ دل، اک شعلۂ آزاد ہو
تیرے تبسم سے رہے، تازہ، ہر اک دل کی خراش — لذت فزائے زخم بن، تیرا فگنِ بیداد ہو
یہ صبح کی شور افگنی، یہ رات کی خاموشیاں — دو رُخ ہوں، تیرے مختلف، طوفانِ برق و باد ہو
یہ موجِ دریا کی تڑپ، کرنوں کا یہ رقصِ حسیں — تیرے تبسم کی، جھلک اے رونقِ ایجاد ہو
یہ جلوۂ روئے شفق، یہ خندۂ صبحِ بہار — اِک اک ترا منت پذیرِ جنبشِ آزاد ہو
یہ انجمِ رخشندہ جو بکھرے ہوئے ہیں چرخ پر — حلقہ ہوں تیرے دام کے سب اور تو صیاد ہو
ہو پھول کی ہر پنکھڑی، تیری ضیا سے نور پاش — اے نوبہارِ ناز، زیبِ گلشنِ ایجاد ہو
ذرّوں کے دل میں ڈوب جا، بیتابیوں کی روح بن — اے مطربِ رنگیں نوا، تاروں میں تو آباد ہو

روشن طلوعِ صبح سے جس وقت ہو جائے فضا — رنگینیوں سے دہر، صورت خانۂ بہزاد ہو
ہر ذرۂ روئے زمیں، جس وقت ہو لبریزِ نور — ہر گوشۂ سطحِ فلک، تاروں سے، جب آباد ہو

جب قطرۂ شبنم بنے، تابش فزائے روئے گل
محوِ تبسم جس گھڑی، ہر غنچۂ ناشاد ہو

لرزش ہو، سیاروں میں جب، ہو زرد چہرہ ماہ کا
جب شب کی ظلمت صبح کے انوار سے برباد ہو

جس وقت پو پھٹنے کو ہو اور نور و ظلمت ہوں بہم
حیرت فزا، نظارۂ یکجائی اضداد ہو

جس وقت ہو گرمِ عمل "ہنگامہ زارِ کائنات"
ذرّوں کی صورت منتشر مجموعۂ "افراد" ہو

مشرق کی جانب ہو عیاں، جس دم سنہرا اک طبق
جس کی نمودِ زرفشاں، سرمایۂ ایجاد ہو

پتّوں سے چھن چھن کر ہوں جب کرنیں زمیں پر جلوہ ریز
موجوں میں جب رقص آفریں، اک جنبشِ آزاد ہو

جس وقت ہو پہلی کرن، زینت فزائے بام و در
دھندلا سا گویا نقش اِک یہ عالمِ آباد ہو

سینہ کو بھر دے سوز سے آنکھوں کو کر لبریزِ اشک
تو آتشِ دل کے لئے، دامانِ موجِ باد ہو

عذرا، مری عذرا۔ ہو جب مصروفِ گلگشتِ چمن
نغموں کے پردے میں نہاں شورِ مبارک باد ہو

بھر دے کشش کی قوتوں میں برق کی جولانیاں
جلووں کو دے آزادیاں اک موجۂ آزاد ہو

تو اُس کے رخساروں سے چھن، اُس کی جبیں سے ہو طلوع
زلفوں کو دے شانوں پہ بل، ہمرنگِ موجِ باد ہو

کسبِ ضیاء نور سے دے، اپنی ہستی کو فروغ
وہ شمعِ بزمِ ناز، تو پروانۂ برباد ہو

اے "بنتِ عم" اے زہرۂ رخشندۂ حسن و جمال
پُر گل ہے تیری یاد سے ہر گوشۂ بزمِ خیال

میری فضائے دل تری تنویر سے لبریز ہے
اس دشت میں موجِ ہوا مدت سے عنبر بیز ہے

دیتے ہیں پیغامِ جنوں، مجھکو تری زلفوں کے بَل
اُس شعلۂ رخ کی لپک سینہ میں آتش ریز ہے

میرے "تخیل" کے لئے ترے "تصور" کی کھٹک
رخشِ سبک رفتار کو، اک جنبشِ مہمیز ہے

رگ رگ میں، خونِ گرم، میری گرچہ ہوتا ہے رواں
لیکن تڑپ کی یہ ادا کتنی نشاط انگیز ہے

یادش بخیر! اے "بنتِ عم" آغازِ الفت کے مزے
بیتابیوں میں، جلوہ گر سامانِ راحت کے مزے

میری طبیعت جب مآلِ کار سے بیگانہ تھی
تھا گرچہ شوقِ "ابتدا" انجام کی پروا نہ تھی

جب تک نہالِ آرزو سے کونپلیں پھوٹی نہ تھیں
یعنی حیاتِ شوق محوِ شوخیِ طفلانہ تھی

پنہاں مرے انداز میں تھا اک سرورِ بے خودی
پیدا مری رفتار سے کیفیتِ مستانہ تھی

خطرے کا موقع ہی سہی میرے لئے اک کھیل تھا
ہر شوق بیباکانہ تھا جو دھن تھی آزادانہ تھی

ہوتا نہ تھا کم ایک پل، دل میں امنگوں کا ہجوم
میری فضائے آرزو، منت کشِ فردا نہ تھی

ہوا ریاں جس پر فدا، تھا وہ مرا خوابِ گراں
خاموشیِ شب میں یہاں کب صبح شور افزا نہ تھی

ہنستا تھا پیروں میں بڑے بوڑھوں کی ہر تقریر پر
ہر چند وانش آفریں میرے لئے افسانہ تھی

ملتا تھا جب کوئی حسیں رکتی نہ تھی میری نظر
یعنی مری طرزِ نگہ اک جوششِ بے باکانہ تھی

نظارۂ دریا سے میں لیتا تھا درسِ اضطراب
بیتابیوں کی روح تھی یہ سیلِ موج افزا نہ تھی

غنچے چٹکتے تھے جہاں ہوتی تھی میری روحِ مست
موجِ ہوا میرے لئے رفتارِ سرشارانہ تھی

سبزہ کی لہریں دیکھ کر اکثر تڑپ جاتا تھا میں
"نظارۂ خاموش" سے میری نظر بیگانہ تھی

سوئے ہوئے جذبات کو کرتے تھے نغمے ہوشیار
پروازِ مرغانِ ہوا، اک جنبشِ مستانہ تھی

اک شعلۂ رقصاں، مری رگ رگ میں تھا ڈوبا ہوا
میری نگاہوں کے لئے کیا چیز ذوق افزا نہ تھی

ایسی نہ تھی اس دور میں نوخیز دوشیزہ کوئی
میری نشاطِ زندگی کچھ جس سے وابستہ نہ تھی

لیکن وہ تو تھی، صرف تو اے زہرہ وش اے نیتا عم
جس کے چراغِ حسن کی ہستی مری پروانہ تھی

نظارۂ فطرت سے بھی کھلتی نہ تھی دل کی کلی
تیرے لئے بیتاب میری روح مشتاقانہ تھی

ہے یاد مجھکو ایک دن تقریب کو جانا ترا
جب تک، مئے الفت کی اس لذت سے تو بیگانہ تھی

بے تاب ہوکر دفعتاً میرا پہنچ جانا وہاں
گرمِ خرامِ ناز تو جس سمت آزادانہ تھی

جھرمٹ میں اپنی ہم سنوں کے دیکھنا مجھکو ترا
تو "شوقِ مضطر" سے مرے ہر چند بے پروانہ تھی

لیکن سمجھ کر کچھ ترا مجھ سے چرا جانا نظر
تجھکو مری موجودگی کی کچھ خبر گویا نہ تھی

ہم جولیوں سے پھر ہنسی، وہ شوخیاں اور وہ چہل
تھی سب سے گرمِ گفتگو تو اور آزادانہ تھی

ہنس ہنس کے تیرا دیکھنا وہ اس طرف اور اس طرف
شوخی فدائے جلوۂ اندازِ بیباکانہ تھی

اس اضطرارِ فعل سے مقصود تھا اخفا مگر
تو صرف، مصروفِ خیالِ زحمتِ افشا نہ تھی

تو جانتی تھی حسن کی ہر قوتِ پنہاں کا راز
تیرے تجاہل کی ادا اک فعلِ محسوسانہ تھی

تھی گو دکھانے کے لئے تو مائلِ بیگانگی
تیری تبسم سرخی ترے چہرے کی پوشیدا نہ تھی

ہے یاد مجھکو آج تک نظریں بچا کر دیکھنا
اس اک نظر میں کیفیت میں کیا کہوں کیا کیا نہ تھی

کافی تھی، تیری، اک ادا یہ جان دینے کے لئے
اس وقت میری بیخودی اے بنتِ عم بیجا نہ تھی

میری فضائے شوق تھی اک محشرستانِ جنوں
دل میں تحمل کے لئے ہر چند کوئی جا نہ تھی

لیکن تری رسوائیوں کے ڈر سے رکنا ہی پڑا
تاہم وہ میرے قلب کی حالت کہ مایوسانہ تھی

مجھکو، ہجومِ شوق نے بڑھکر کہاں کھینچا دیا ‏ ‏ تُو ورنہ اک آئینۂ جذباتِ معصومانہ تھی

کچھ اس سے بڑھکر تھی قیامت وہ ادائے دلنشیں
میں یاد جس کی آج تک اے بنتِ عم بھولا نہیں

یعنی مری بیتابیوں میں پھر اثر پیدا ہوا ‏ ‏ ذوقِ نہاں، تیرے لئے بھی نشۂ صہبا ہوا

کرنے نہ دیتی تھی، حیا گو تجھکو اظہارِ خیال ‏ ‏ میں جانتا ہوں درد تھا دل میں ترے ڈوبا ہوا

بدلی ہوئی رہتی تھی "تو"، بگڑی ہوئی رہتی تھی "تو" ‏ ‏ تھا اک، خمارِ آرزو، سرتا قدم چھایا ہوا

ملتی تھی جب مجھسے کبھی اُٹھتی نہ تھی تیری نظر ‏ ‏ احساسِ الفت اور بھی تجھکو حجاب افزا ہوا

تھی باوجود ضبط بھی تیری ادا سرشارِ شوق ‏ ‏ تھا باہمہ انداز بھی، چہرہ ترا اُترا ہوا

رہتی تھی میری منتظر، گو سامنے آتی نہ تھی ‏ ‏ تو اور چھپ جاتی تھی، مجھکو دیکھکر آتا ہوا

چہرہ کی سرخی کو لئے اظہار الفت کا جواب ‏ ‏ آتا تو تھا، تری زباں پر کچھ مگر رُکتا ہوا

پنہاں تھا سوزِ عشق، میرے دل میں لیکن اس طرح ‏ ‏ تو اور اُکساتی تھی، یہ شعلہ اگر دھیما ہوا

حد سے گزرنے کے لئے بڑھتی تھی میری آرزو ‏ ‏ لیکن سمجھ لیتی تھی، ہر انداز تو، بدلا ہوا

کچھ اور تری گفتگو یا اُٹھکے چل دینا ترا ‏ ‏ میں اس طرف، اک انفعالِ شوق میں ڈوبا ہوا

بخشا تری خود داریوں نے مجھکو عزمِ مستقل ‏ ‏ تھا ورنہ میں طوفانِ محسوسات میں ڈوبا ہوا

یہ سیل لے جاتی خدا جانے کہاں اب تک مجھے ‏ ‏ کیا چیز ہے، گر برق رو دھارے پہ اک تنکا ہوا

توڑا تری پاکیزگی نے نفسِ خود بیں کا غرور ‏ ‏ یوں تمکنت افگن دل میں تیرا جلوۂ زیبا ہوا

اے بنتِ عم اے حاصلِ سرمایۂ عیشِ حیات
حاصل مجھے تیرے سبب کیا کیا کہوں کیا کیا ہوا

اک مرتبہ میرا نہ جانا تیرے گھر دو چار دن ‏ ‏ تھا جب کہ میں کچھ ناگزیر افکار میں اُلجھا ہوا

پہلے تجھے کچھ فکر پھر ہوتا یکایک بدگماں ‏ ‏ تھا پیچ و تابِ دل کا چہرے پر اثر چھایا ہوا

چھپتی نہ تھی کوشش پہ بھی تری بناوٹ کی ہنسی ‏ ‏ مٹتا نہ تھا ہرگز تری ابرو پہ بل آیا ہوا

ہمجولیوں سے بھی تجھے باقی نہ تھا کچھ ارتباط ‏ ‏ تو دل میں کڑھتی تھی، کسی کو دیکھکر آتا ہوا

پہروں رہا کرتی تھی تنہائی میں تو محوِ خیال ‏ ‏ رہتا تھا ضبطِ فکر سے ہر وقت دل بیٹھا ہوا

اکثر گمانِ بد سے ہوتا تھا تجھے اپنے ملال ‏ ‏ اکثر یقیں کا رنگ تھا دل پر ترے چھایا ہوا

آخر ہوئی جیسے ہی آزادی ذرا حاصل مجھے
پہنچا میں ترے پاس جوشِ شوق میں ڈوبا ہوا

پرشوق میری گفتگو انداز بے پروا ترے
محوِ تبسم میں، ترے تیور پہ بل آیا ہوا

میرے لئے ساماں طرازِ مدعا موجِ طرب
شکووں کا اک دریا ترے دل میں ادھر اُمڈا ہوا

آخر بہ استعجاب، میری عاجزانہ التجا
تیرا جوابِ تلخ "تم یہ آپ سمجھو کیا ہوا"

سنتی رہی تو غور سے کرتا رہا میں عرضِ حال
یوں رفتہ رفتہ جب ترا غصہ ذرا دھیما ہوا

آیا نہ گو تیری زباں تک، میں سمجھتا ہوں کہ تھا
تیری اداؤں میں اک "عذرِ منفعل" ڈوبا ہوا

ممکن ہی میں کہتا غلط، تجھکو یقیں آ ہی گیا
تو مجھسے اتنی صاف تھی، کچھ بھی نہیں گویا ہوا

اس سادگی پر تیرے مٹ جائے نہ کوئی کس طرح
تیری انھیں باتوں میں تو جادو ہی اک چلتا ہوا

کیا کیا کہوں، کب تک کہوں، تجھپر گراں ہو جائیگی
میری یہ عرضِ مدعا، اک داستاں ہو جائیگی

آ، اے نگارِ حور وش دل ہو مرا جنت تری
آخر رہے گی تابکے، صبر آزما فرقت تری

آ شعلۂ جاں سوز پر میرے چھڑک آبِ وصال
بھڑکا رہی ہے دم بدم دل میں جسے الفت تری

اک سحر تھی میرے لئے گویا تری پہلی نگاہ
پھرتی ہے اکثر آج تک آنکھوں میں "وہ صورت" تری

وہ ابتدائے سن، وہ معصومانہ، تیری شوخیاں
تھی گرچہ گرم کار جب بھی حسن کی طاقت تری

چہرہ وہ بھولا سا، وہ اک دوشیزۂ نازک بدن
گویا بلائیں لے رہا تھا، جلوۂ صورت تری

دیتی تھی لَو لے، "بنتِ عم" رخسارِ تاباں کی جھلک
تھی سربسر اک جلوۂ طاقت ربا طلعت تری

آنکھوں میں سحرِ دلبری، بکھرے ہوئے شانوں پہ بال
اُس پر قیامت آفریں، موزونیِ قامت تری

بننے سنورنے کا نہ تھا اُس وقت کچھ تجھکو خیال
تھی اے سراپا ناز، تیری سادگی زینت تری

پہروں تجھے دیکھا کیا ہوں میں وفورِ شوق میں
میری نگاہِ آرزو اور چاند سی صورت تری

مدت سے تھا دل میں لئے گو میں تری الفت کا درد
تھی مُہرِ لب میرے لئے خودداریِ عصمت تری

ہے یاد وہ پہلے پہل، تجھسے مرا اظہارِ عشق
رُخ پر حیا کی جھلکیاں، بدلی ہوئی رنگت تری

قطرے پسینے کے نمایاں تھے، جبینِ ناز پر
تھی اضطرابِ قلب کا آئینہ اک صورت تری

نیچی نگاہوں سے وہ "اقرارِ محبت" پھر ترا
گویا کہ حامی تھی نہ اس کی بھی، ابھی غیرت تری

جیتا ہوں میں جس کے سہارے آج تک "اے بنتِ عم"
بیتاب رکھے گی، مجھے کب تک مگر فرقت تری

شبنم کے قطرے دھو رہے ہیں صبحدم رخسارِ گل
ہے شمع سے پُرنور، شب بھر محفلِ عشرت تری

خطِ شعاعِ مہر میں ذرّے ہوئے جاتے ہیں جذب
رہتی ہے آئینہ میں عکس افگن سدا طلعت تری

بڑھ بڑھ کے تارے مہر کی ہستی میں ہوتے ہیں فنا
جن کو تبسم آفریں ہوتی ہے محویت تری

پھولوں کو دیتی ہے حیاتِ تازہ اک موجِ صبا
کرتی ہے وقتِ صبح عطر افشاں جسے نکہت تری

ہے ہر طرف برپا جہاں میں ایک حشرِ اتصال
رکھتی ہے لیکن دور تجھسے ہاے مجھے غفلت تری

فرقت کی تکلیفوں سے ہوں مجبورِ اظہارِ ملال
مجھ پر نمایاں ورنہ ہے بیتابیِ الفت تری

اے کاش وا ہوتا مرا، ہر عقدۂ ارمانِ دل
وابستۂ تدبیر ہو سکتی مری قسمت تری

کہتے ہیں ماضی کا نتیجہ حال ہوتا ہے مگر
اب تک "نشاطِ وصل" سے بدلی نہیں "حسرت" تری

کب تک رہوں میں منتظر تو ہی بتا اے برق وش
پروردۂ آغوش ہے آخر مری حسرت تری

آ اے سرورِ جانِ دل اب ضبط کی طاقت نہیں
میرے دلِ بیتاب کو دم بھر کہیں راحت نہیں

یہ آرزو ہے قلب آزادِ غمِ دنیا رہے
اک مختصر سا جھونپڑا، میرا لبِ دریا رہے

موجِ ہوا ہو، مطربِ رنگیں نوا، میرے لئے
لہروں کے پردہ میں سدا اک ارغنوں بجتا رہے

تاروں میں شب بھر رقص ہو میرے دکھانے کے لئے
ذرّوں پہ وجدِ ذوق کا دن بھر سماں چھایا رہے

جوشِ حیاتِ تازہ دے موجِ نسیمِ صبحدم
نظارۂ شامِ شفق آلود ذوق افزا رہے

پھولوں کی بوئے خوش سے ہو لبریز داماں فضا
غیرت دہِ صحنِ چمن، ہر گوشۂ صحرا رہے

کلیاں چٹک کر پھول ہوں اور پھول ہوں زیبِ چمن
رقصِ طیورِ خوش نوا، شام و سحر ہوتا رہے

میرے لئے ہو سبزۂ تر فرشِ مخمل سے سوا
بیٹھا رہوں اس پر، خمارِ آرزو بڑھتا رہے

مہتاب کی تنویر سے دل میں نئی موجیں اُٹھیں
اک جوششِ طوفاں تلاطم جذبات میں برپا رہے

لپٹی ہوئی پھولوں میں آئے موسمِ گرما کی شام
صبحِ بہارِ خندہ پرور، انبساط افزا رہے

سرما میں دودِ منتشر کی طرح جب چھائے کہر
سردی کی شدت سے وفورِ جنبشِ اعضا رہے

مجھکو ترے جلووں کی لَو، ہو گرمیِ دل کا سبب
رگ رگ میں خونِ گرم گردش ہر گھڑی کرتا رہے

برسات میں جب شدتِ بارش سے جل تھل ایک ہو
ابرِ سیہ ہردم محیطِ گنبدِ مینا رہے

طوفان پہ دریا ہو گرج سے رعد کی تھرائے دشت
بجلی کے چمکاروں میں لرزش خوف کی پیدا رہے

دنیا میں ہر ذی روح ہو، جس دم طلب گارِ پناہ
تاریک شب میں، ایک وحشت خیز سناٹا رہے

دوڑے مرے ہونٹوں کے اوپر خندۂ عشرت کی لہر
پنہاں مرے جذبات میں اک جنبش پیدا رہے

تیرے تبسم کی ضیا بن جائے بجلی کی چمک　　سایہ تری زلفوں کا ابرِ تیرگی افزا رہے

ہر صبح، صبحِ عید ہو، ہر شام ہو شامِ برات　　یہ غنچۂ خاطر مرا ہر فصل میں کھلتا رہے

اخترؔ ہو اور لے "سینۂ غم" تو ہم کو کوئی کھٹکا نہ ہو

سامانِ عشرت ہو مہیا اور غمِ دنیا نہ ہو

حیدرآباد (دکن)
۳۰ مہر ۱۳۳۳ ف

سید علی اختر

رباعی

پیغمبرِ ما کہ انبیا را ست امام　　جبریل آوردش از خداوند پیام

بودش بر حکم فطرت انجام آغاز　　در دائرۂ نبوت آغاز انجام

گرامی

عجائباتِ کالج

دنیا میں جس طرح انسان آپس میں دینوی خوش نصیبی کے اعتبار سے مختلف مدارج و مراتب رکھتے ہیں، اسی طرح دیار اور امصار عالم بھی دینوی طالع وری کے لحاظ سے آپس میں ایک دوسرے سے متفاوت و مختلف ہیں۔ بغداد، قرطبہ، روم، کارتھیج، ایتھنس، دھلی ان خوش نصیب سرزمینوں کے نام ہیں جن کی شان و شوکت کے شور و غل سے دنیا کا کرۂ ہوائی اب تک گونج رہا ہے، جن کے عظمت و کمال کا تلچھٹ آج دنیا کی تہذیب و ترقی کا خمیر ہے۔ جن کے کھنڈرات کے سینے تاریخ عالم کے دفینے ہیں۔ خود موجودہ ہندوستان میں بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس، کراچی، لاہور، آگرہ، لکھنؤ، ملتان، پشاور، بنارس، الہ آباد، حیدر آباد، علی گڑھ ایسے مقامات ہیں جن کو مذہبی تعلیمی، ملکی صنعتی، تجارتی، تاریخی اہمیت نے امتیازی رتبہ دیا ہے اور جن کو اگر ہندوستان کی بستیوں کے سکندر، قیصر، نپولین، نلسن، ڈیوک آف ولنگٹن، بدھ، اکبر، شاہجہاں، گوکھلے، سرسید کہیں تو بجا ہے۔ بعض لوگ چونکیں گے کہ دیار کبار کی فہرست میں علی گڑھ کا نام کیسا؟ یہ گمنام چھوٹا سا مقام سوائے علی گڑھ کالج کے اپنے اندر کوئی ایسی ندرت نہیں رکھتا جو اس کو ہندوستانی امراء مکانی کے زمرہ میں شامل کر سکے، علی گڑھ کے بعض حامی و ہمدرد اس کے جواب میں یہ کہنے کو تیار ہو جائیں گے کہ کیوں کیا مدرسۃ العلوم علی گڑھ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکلوتی درسگاہ نہیں ہے؟ کیا دنیا کے سات کروڑ باشندوں کا تعلیمی مرکز اپنے اندر کوئی اہمیت نہیں رکھتا؟ کیا یہ بات کسی سے پوشیدہ ہے کہ علی گڑھ نے مسلمانوں کی قوم کے لئے بہترین دل و دماغ مہیا کئے۔ کیا مسلمانانِ ہند کے قومی جسم مردہ میں نئی روح پھونکنا علی گڑھ کی مسیحائی کے سوا کسی اور چیز کا کام تھا؟ کیا اب اس بات سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کی گم شدہ حکومت اور عظمت کا عوض عادل حقیقی نے علی گڑھ کی صورت میں عطا کیا؟ اور کیا اب اس یقین کے قرائن موجود نہیں کہ یہ تبادلہ انشاء اللہ نعم البدل ثابت ہو کر رہے گا۔ کیونکہ تعلیم ترقی کی کنجی ہے اور علمی کارناموں سے ملکی اور سیاسی کارنامے بآسانی ممکن ہیں اسی لئے کسی قوم کا تعلیمی مرکز اس قوم کی ترقی کا اصلی مرکز ہے۔ اسی طرح کیا واقف حال لوگ اس بات سے انکار کریں گے کہ علی گڑھ میں مسلمانوں کے بچوں کے لئے روحانی، ذہنی، اخلاقی، جسمانی غرض ہر قسم کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام ہے؟ جہاں نہ صرف طلبہ کی دماغی، جسمانی اور اخلاقی تربیت ہوتی ہے بلکہ اُن کو زندگی کی کشمکش کے

لئے ہر طرح تیار کر دیا جاتا ہے۔ وہ صرف ڈگری یافتہ ہی نوجوان نہیں ہوتے بلکہ موجودہ تہذیب اور ترقی کے زمانے میں ہندوستان کی موجودہ ملکی و سیاسی، دوڑ میں مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں جو ضروریات زندگی پیش آسکتی ہیں ان کے لئے کما حقہ طلبا رو مسلح کر دیئے جاتے ہیں۔ علی گڑھ بوائے کیا ہے وہ ایک تعلیم و تہذیب یافتہ صاف ستھرا، کسا کسایا، چست و چالاک۔ باادب مگر خوددار نوجوان ہے جو ایک طرف منصبداری کی اونچ نیچ دفتری نشیب و فراز۔ مغربی طریقۂ کار سے بخوبی واقف اور دوسری طرف مغربی دل و دماغ مزاج و آداب سے پورا پورا آشنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف وہ حکام کا بہترین ماتحت اور شریک کار اور دوسری طرف ان کا دوست اور یار غار ہے۔ وہ ایک طرف مشرق کا جاننے والا۔ دوسری طرف مغرب کا پہچاننے والا ہے سیاسیات میں وہ ایک چشم نہیں بلکہ دونوں آنکھیں رکھتا ہے ایک طرف اپنی قوم کا خیر خواہ اور دوسری طرف حکام کا ہمدرد۔ ادھر قومی ضروریات کا احساس رکھتا ہے ادھر حکومت کی ذمہ داریوں اور دشواریوں کا ادراک۔

مذکورۂ بالا جوابات بڑی باتیں ہیں جن کی بڑے لوگوں سے توقع کی جاسکتی ہے۔ چھوٹے لوگوں کی نظریں چھوٹی باتوں پر پڑتی ہیں۔ چھوٹے لوگ بڑی باتوں میں بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور بسا اوقات اگر حقیقت سے زیادہ قریب نہیں ہوتے تو لطف مطالعہ تو ضرور زیادہ اٹھاتے ہیں۔ یوں تو دنیا خود ایک عجائب خانہ ہے لیکن اس کے اجزاء ترکیبی کو اگر غور کی عینک لگا کر مشاہدہ کریں تو ہر ذرہ ایک دنیاء عجائبات ہے جو اپنی ندرت سے عالم کو تصویر حیرت بنا سکتا ہے ایک چیز سطحی نظر سے معمولی جیسی نظر آتی ہے لیکن اگر اسی چیز کو گہری نظر سے دیکھیں تو طلسمات خانہ بن جاتی ہیں۔ علی گڑھ کی درسگاہ بادی النظر میں ظاہر بین آنکھوں کے لئے بجز چند سو کمروں کے مجموعہ اور ہزار بارہ سو لڑکوں کی جمعیت کے اور کچھ نہیں۔ لیکن اگر دل کی آنکھیں کھول کر تعمق کی عینک لگا کر دیکھیں تو یہی چند سو کمروں کا مجموعہ اور یہی ہزار بارہ سو لڑکوں کی جمعیت ایک طلسم خانہ بن جاتا ہے۔ جہاں سے باطنی ٹیلی فون، جذباتی تار برقیاں، ہندوستان کے دور دراز اطراف و جوانب میں بلکہ ایران عرب، ٹرکی، برما، جاپان وغیرہ دور دست ممالک دنیا تک دوڑائی ہوئی صاف نظر آتی ہیں۔ اس قدر کثیر جماعت یہاں اجتماع کون جانتا ہے کہ کس قدر دردناک جدائیوں کا نتیجہ ہے وہ جدائیاں جن کی روح فرسائی اور جگر کاہی سے صرف وہ ایک ذات واقف ہے جو ہر پردہ کے پیچھے سے دیکھنے والی ہے۔ جس کی نظروں کو کوئی چھت نہیں روک سکتی جس کی نگاہوں کے آگے کوئی چار دیواری حائل نہیں ہو سکتی۔ اس مجمع کا ہر فرد اپنے دل میں ایک تڑپ رکھتا ہے جس کے مشاہدہ کے لئے یہ پتلی دار پلکوں والی آنکھیں بالکل ناکارہ ہیں۔ دل کی آنکھیں کھولو تو مشاہدہ کرو گے کہ ماریسن کورٹ یا ظہور وارڈ کے کسی کمرے میں کسی خاص خیال سے متاثر ہو کر ایک چھوٹے سے دماغ میں خیالات کا تلاطم پیدا ہوتا ہے اور ایک چھوٹے سے سینے میں ایک چھوٹا سا دل

بے قرار ہونے لگتا ہے۔ اور چھوٹے سے تجمّل کی نگاہیں کالج سے نکل علی گڑھ اسٹیشن پر پہنچ ٹرین میں تین دن کا راستہ
آناً فاناً میں طے کر کے بمبئی ساحل ہندوستان پر جا پہنچتی ہیں اور وہاں سے سطح سمندر کی خیالی کشتیوں سے عبور کر
ساحل افریقہ پر اترتی ہیں پھر افریقہ کے کرۂ ہوائی میں دم لیتی ہوئی کسی چھوٹے سے قصبے میں کسی عجیب طرح کے
مکان میں داخل ہوجاتی ہے اور وہاں کچھ ایسا معاملہ پیش آتا ہے کہ وہ مورلین کورٹ یا ظہور وارڈ کے کمرے میں
اداس صورت اپنے چھوٹے سے سینے کو ٹھنڈے سانسوں کے تلاطم سے زیر و زبر پاتی ہے اور
وہ خیالات میں ڈوبی ہوئی آنکھیں آنسوؤں سے پُر نم ہونے لگتی ہیں۔

یا ایران کے کسی موضع میں کسی زنانخانے میں ایک مرصع مسند پر ایک محبت کی ماری ناز پروردہ ماں
کسی واقعہ کو سن کر یا کسی چیز کو دیکھ کر غوطہ میں جاتی ہے اور اس کے تصور کی آنکھیں ایک نامعلوم سمت میں ہندوستان
کی متلاشی ہونے لگتی ہیں اور ایک نامعلوم خیالی علی گڑھ کو چشم زدن میں ڈھونڈ نکالتی ہیں اور ایک خیالی عجیب و غریب
کالج میں ایک ایرانی وضع کے کمرے میں اپنے جگر گوشہ کو پالیتی ہیں۔ اس وقت وہ عورت بڑھ کر اپنے بچے کو گلے سے لگا کر
پیار کرتی ہے اور اپنی شیریں آواز سے اپنی شیریں زبان میں اپنے چھوٹے سے ایرانی کو اس طویل جدائی پر دلاسہ
دیتی ہے اور اپنی عجیب قسمت کی مجبوری پر ملال ظاہر کرتی ہے۔ لیکن وائے تصور کی بے بنیادی وہ مومنی عورت
جب اس خواب سے چونکتی ہے تو اس کا اثر اپنے رخساروں پر آنسوؤں کے چند قطروں کے سوا اور کچھ نہیں پاتی

یا پنجی بارک۔ پنجی بارک کے کسی کمرے میں ایک اور اداس عورت کھڑکی کے آگے کرسی پر نقش دیوار بنی
بیٹھی ہے جس کی زبان کی خاموشی اور دماغ کا استغراق اس بات کا پتا دیتا ہے کہ یہ پہل پہل۔ اوچھل کو درس و
تدریس میں وقت گزارنے والی ہستی اس وقت اپنی تمام طفلانہ شوخیوں اور طالب علمانہ مشاغل سے کنارہ کش
ہوگئی ہے اور کسی عجیب خیالی سمندر میں غوطہ زن ہے۔ اس کی سوانح عمری کے موجودہ باب کا مضمون اول سے
آخر تک ایک جملہ خاموشی ہے مگر خردبین نظریں مطالعہ کرسکتی ہیں کہ یہ ظاہری جملہ خاموشی عنوان ہے ان باطنی خیالات
و مضامین نادرہ کا جن کا بیان زبان گویا کے امکان سے باہر ہے اس کی آنکھیں آگرہ، شاہجہان پور، لکھنؤ
فتحپور، پٹنہ، الہ آباد، بریلی، جون پور کے کسی بازار کو اپنے سامنے پاتے ہیں اور کسی حویلی میں کسی خاص
کمرے یا دالان میں ایک مہ جبین کی صورت کو دیکھتی ہیں جو اپنی آغوش میں ایک مہ پارہ کو لٹائے پیار کر رہی
ہے مگر اس کے دل کا کھٹکا مشرق کی جانب ایک علی گڑھ نامی شہر کی طرف لگا ہوا ہے۔ کون ہے جو اس وقت اس
گوشہ نشین کے کرسی نشین گورکھ دھندے کو پورے طور پر پاجائے۔ وائے جذبات ذہنی اگر جسم کا ہرکارہ تمہارا
اندر دل میں ہو تو تم سب کچھ ہونے کے باوجود عین بے بنیادی کی تصویریں ہو۔ یہ کرسی نشین صورت گویا اپنے
لخت جگر کو دیکھ کر اور اپنی آرام جان کو پاکر بچے کو پیار کرتی اور اس مہ جبین سے کچھ رازدارانہ گفتگو کرکے

باغ باغ ہونا چاہتی ہی مگر اس کا اثر اُس پر یہ ہوتا ہی کہ اس کا سینہ سرد آہوں سے اُبلنے لگتا ہی اور اُس کے آنسوؤں کی سوتیں جاری ہوکر اُس کی آنکھوں کو جام لبریز بنانے لگتی ہیں۔

یا منٹو سرکل میں ایک مستغرق صورت کمرے کے آگے ورانڈے میں ٹہلتی ہی اور اُس کے دل کی آنکھیں راولپنڈی، پشاور، لاہور، امرتسر، جالندھر، کوہاٹ، کیمبل پور، لدھیانہ، شاہ پور کے کسی عالی شان مکان کے کسی آراستہ کمرے میں ایک ماہ رو کو پاتی ہیں جو اپنے رخ انور کو گھونگٹ میں چھپائے اپنے طالب علم سیاں کی تصویر خیالی آئینہ کی طرح سامنے رکھے بیٹھی ہی اور جس کے تمام عمر کی تمناؤں کا مدار عہد جوانی کے ارمانوں کا انحصار اس ایک انمول ہستی پر ہی جس کو قسمت نے اُس سے صدہا میل کے فاصلہ پرے جا کر ڈال دیا ہی اور یہ کمسن مورت سراپا امنگ ایک قطب نما بن کر رہ گئی ہی جس کے دل کی سوئی کا رخ رات دن علی گڑھ کی طرف رہتا ہی۔

یا دکن حیدر آباد کے کسی زرریز شہر کے کسی عالی شان محلسرا میں ایک کمسن بچی اپنی ماں سے پوچھتی ہی "اماں جان! بھائی جان کے آنے میں اب کے دن اور رہ گئے"، ماں ایک سرد آہ بھر کر جس میں خوشی و ملال دونوں شامل ہیں کہتی ہی بیٹیا! تمھارے بھائی جان اگلی پیر کو حیدر آباد میں ہونگے"۔ بنگال کے کسی مختصر سے قصبہ میں کسی آراستہ عالی شان بالاخانہ پر بعد مغرب دو میاں بیوی اپنے دو چار بچوں سے گھرے ہوئے آرام کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ بیوی اپنے پردیسی لخت جگر کا ذکر اپنے خاوند سے اس طرح کرتی ہی کہ میرا بچہ آج علی گڑھ پہنچ گیا ہوگا۔ خاوند جواب میں کہتا ہی کہ ہاں پرسوں اترسوں تک خط خیریت آجائے گا۔ یہ کہکر دونوں کے دل بے اختیار درد جدائی سے اندر ہی اندر کراہنے لگتے ہیں۔

ڈاک کے وہ تودے وہ خطوط کے انبار جن کی پیشانیاں علی گڑھ کے پتے سے مزین ہوتی ہیں ایک غیر متعلق شخص کے لئے مہمل عبارتوں سے زیادہ وزن اور ردی کے ڈھیر سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے مگر وہ منتظر صورتیں جو کمرہ کھولتے ہی پہلے پڑے ہوئے خطوط کو بھوکوں کی طرح اٹھاتی ہیں اُن کے جذبات کے خزانوں کے لئے یہ کاغذی نامہ بر کنجیوں کا کام کرتے ہیں اور اُن کی دنیا میں ایک ہلچل پیدا کر دیتے ہیں جو اثرات یہ خطوط اُن پر کرتے ہیں وہ اس قدر مختلف الانواع اور بیشمار ہیں کہ اُن کے اظہار کے واسطے خوشی اور رنج دو مہمل لفظ ہیں۔

اس جذباتی دریا کا منبع اور دہانہ اپنی ندرت کو انتہا تک پہنچا دیتا ہی یعنی طلبہ کا کالج میں آنا اور طلبہ کا کالج سے جانا یہ وہ ایسے مواقع ہیں جو جذبات کے خرد بینوں کے لئے بہترین نظارہ پیش کرتے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ تو ضرور ہی یہ آمد و رفت اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے

آغاز و انجام جذبات کی کچھ ایسی نوعیت اپنے ساتھ رکھتے ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ سولہ جولائی سے چھٹیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ مہینوں پہلے سے وعدے اور ارادے ہونے لگتے ہیں۔ ہفتوں پہلے سے دعوتوں کے خطوط فرمائشوں کے ملفوف علی گڑھ کا راستہ لیتے ہیں۔ مگر یکم جولائی سے فرحت روح افزا کے خطی نامہ بر خوشی کے پیغام اپنے سینوں میں چھپائے شادان اور فرحان ہندوستان کی رگوں میں دوڑنے لگتے ہیں۔ دن تاریخ اور وقت روانگی کا تعین ہو جاتا ہے اور ہندوستان کے ہر گوشہ سے انتظار و اشتیاق کی آنکھیں کالج کی طرف لگ جاتی ہیں۔ ادھر باشندگانِ کالج جو اس وقت تک کالج کو اپنا گھر سمجھ رہے تھے کالج کو سرائے کا پورا پورا نمونہ بنا دیتے ہیں۔ اکھڑے اکھڑے گھڑیاں گن گن کر یہ آخری ایام کاٹتے ہیں۔ کالج کی کوئی بات ان کو متوجہ نہیں کر سکتی۔ مطالعہ سے جی اچٹ جاتے ہیں۔ کلاسیں بھی کبھی رہ جاتی ہیں۔ حاضری کے رجسٹروں میں غیر حاضریوں کی تعداد حاضریوں سے کہیں بڑھ جاتی ہے۔ کئی کئی روز پہلے سے اسباب بندھنے لگتے ہیں۔ قصبات کے رہنے والے مختلف اشیا کی خریداری شروع کر دیتے ہیں۔ خصوصاً کالج کے لنگڑے آم کی جستجو ہر دماغ میں پائی جاتی ہے۔ آج پندرہ تاریخ ہے آخری کالج ہے۔ کل سے چھٹیاں شروع ہیں آج کی رات کالج میں قیامت کی رات ہوتی ہے۔ کچی بارک کے ڈاکہ زن سورما رات کے ایک ڈیڑھ بجے غول کے غول غل مچاتے سوتوں کو اٹھانے آتے ہیں۔ جس کو جاگتا ہوا اسلامی کے لئے پلنگ کے آگے دست بستہ کھڑا ہوا پایا۔ چھوڑ دیا جو پلنگ پر بے خبر سوتا ملا اس کی کمبختی آ گئی۔ پلنگ الٹ گیا غریب خوابیدہ کی آنکھ کھلی اور بجلی سی کوند گئی۔ اپنے آپ کو زمین پر پایا۔ جھاڑ پونچھ کر اٹھے۔ چہرہ پر کچھ کھسیانہ پن کچھ مسکراہٹ کے سے آثار نمایاں۔ اتنے میں یہ غول دبستانی آگے بڑھ گیا۔ جو کمرہ کھلا پایا گھڑے اٹھائے برآمدے میں کھڑے ہوئے اور یکایک وسیع فضائے کالج میں ایک آوازہ ہوا جس سے وسیع میدان کالج گونج اٹھا۔ غرض اس طرح یہ پہلوانانِ شب گھنٹہ دو گھنٹہ میں کچی بارک کا گشت لگا کر اپنے اپنے پلنگوں پر آن کر دراز ہو گئے۔ اگر کچی بارک کی رگِ انتقام پھڑکی تو اس کے بعد انھوں نے چھاپا مارا۔ اثنائے حملہ میں جب کہ ایک ونگ پر حملہ ہو رہا تھا۔ دوسرے ونگ کے دلاور فنونِ جنگ کی داد دیتے ہوئے اٹھے اور ان حملہ آور جاں بازوں کے بستر ان کے ڈھیلے پلنگوں پر سے اچکا لائے اور کہیں ایسے پتال کی تہ میں پہنچائے کہ تمام رات حملہ آور لالٹینیں لئے لئے کلاسوں وغیرہ میں ڈھونڈتے پھرے مگر پتا نہ پایا۔ بمشکل عین روانگی کے وقت یہ بستر ان کے کمروں پر پہنچائے گئے۔ غرض اس دوستانہ جنگ میں ڈفنس Defence اور افنس Offence کی کش مکش میں فتحیابی کا پتا لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ رات اس غل غپاڑہ میں گزری۔ صبح ہوئی۔ دس بجے تک کالج خالی ہو گیا بارکوں کے مکینوں سے اسٹیشن پٹ گیا۔ علی گڑھ اسٹیشن پر ترکیاں ہی ترکیاں نظر آنے لگیں۔ اسٹیشن کے کرہ ہوائی میں سیاہ پھندنے کالے سانپوں کی طرح لہرانے لگے۔ اس وقت ان ہستیوں کا ظاہر ان کے باطن کا پورا پورا

آئینہ ہے۔ ان مسافروں کی دل کی بشاشت اس وقت چمک دمک کی صورت میں اُن کے چہروں پر نمایاں ہو گئی ہے۔ گھر کے اشتیاق نے ان کی رفتار میں غیر معمولی پھرتی۔ گفتار میں غیر معمولی تیزی پیدا کر دی ہے ان کی بات بات ان کا تنفس۔ ان کی ہر ادا تیزی و شتابی سے لبریز زبانِ حال سے گویا ہے کہ کیا کریں۔ بس ہو تو پر لگا کر اُڑ جائیں ٹرین کے آتے ہی گاڑیوں پر افواج ترک ٹوٹی وہ ریل پیل ہوئی کہ الامان! الحفیظ!! گاڑیوں کے مسافر ششدر کہ یہ کیا قیامت ہے جنہوں نے کبھی علی گڑھ نہ دیکھا تھا اُن کو اس تماشے سے بغیر دریافت کئے معلوم ہو گیا کہ یہ علی گڑھ اسٹیشن ہے۔ الغرض دو تین دن کے اندر کالج کی عالی شان عمارتیں رفیع الشان بارکیں ویران اور ہندوستان کی آبادیاں آباد ہو گئیں۔ طلبہ کا گھر پہنچنا ماں باپ، بہن بھائی۔ عزیز و اقارب سے ملنا۔ دوستوں کی ملاقات سیر و شکار۔ یہ جذبات کی اُن ضخیم مجلدات کی سرخیاں ہیں جن کا بیان زبان کے امکان سے باہر ہے۔

تین مہینے گزرے اور اس تصویر کا دوسرا رُخ سامنے آ موجود ہوتا ہے۔ ہفتہ دو ہفتہ پہلے سے کالج آنے کے ساز و سامان ہونے لگتے ہیں۔ اسباب خریدے جاتے ہیں کپڑے وغیرہ بنتے ہیں جوں جوں کالج کھلنے کی تاریخ قریب آتی ہے کالج کے تصورات تازہ ہونے لگتے ہیں طلبہ پر غیر محسوس طریقے سے اُداسی چھاتی جاتی ہے۔ دنیا میں خوشی رنج لازم و ملزوم ہیں۔ عزیز و اقارب کو اُس خوشی کا عوض جو ان کو بچوں کے آنے کے وقت ہوئی تھی اب اُن کی روانگی کے وقت رنج و ملال کی صورت میں دینا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ گھڑی آ موجود ہوتی ہے کہ اب کسی گاڑی سے بچہ کالج روانہ ہو۔ اس وقت گھر والوں پر ایک عجیب عالم ہوتا ہے ہر متنفس اُداس۔ دل رنجیدہ ہے۔ ہائے وقت جدائی! آخر گاڑی کا وقت آن لگا۔ سواری آئی۔ اسباب رکھا گیا۔ اب ایک ایک سے رخصتی ملاقات ہوتی ہے۔ خدا حافظ، اللہ کے سپرد، اللہ کی امان۔ اللہ رکھوالی، فی امان اللہ، امان خدا یہ دردناک کلیجہ شق کرنے والے جملے ہر زبان پر جاری ہوتے ہیں آنسوؤں میں ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ ایک صورت دروازہ سے نکل باہر کا راستہ لیتی ہے اور اور چند صورتیں گھر میں آنسو بہاتی رہ جاتی ہیں بچے کا صدقہ سفر کی لے دے کی وجہ سے بہت کچھ بٹ جاتا ہے لیکن گھر والے بچہ کے باہر قدم رکھتے ہی جس عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں اُس کا بیان کرنا کلیجہ کو شق کرتا ہے۔

آہ مجھکو یاد ہے جب کہ میں پہلے ہی سال لمبی چھٹیوں کے بعد کالج روانہ ہوا گھر بار عزیز و اقارب سے جدائی کے خیال نے ہفتہ دو ہفتہ پہلے ہی سے دل کو اُداس کر دیا تھا ہر چیز بری معلوم ہوتی تھی کالج کے خیال سے دل میں گھونسہ سا لگتا تھا۔ گھر سے جدا ہونے کو دل نہ چاہتا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ کالج جانا نہ جانا سب کچھ میرے بس میں تھا مگر ہائے خود اختیاری کی لاچاری بالکل بے بس تھا۔ آخر وہ گھڑی آئی کہ سواری میں

میں اسباب لد چکا ہے میں آخری رخصتی سلام کرنے گھر کے اندر گیا۔ والد، والدہ تمام گھر والوں سے ملا ہر شخص
رنج میں ڈوبا ہوا تھا معلوم ہوتا تھا کہ بدقت آنسوؤں کو روکے ہوئے ہیں آخر جب میں رونکھی صورت کے
ساتھ سب سے مل چکا تو دیکھا کہ چھوٹی ہمشیرہ نظر نہیں پڑتی تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ کمرے کے اندر دونوں ہاتھ
سے منہ ڈھکے کھڑی ہے پاس گیا تو سسک سسک روتے ہوئے پایا۔ گلے سے لگایا ضبط نہ ہو سکا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا
اور رلایا۔ پھر تو گھر میں ہر متنفس نے آنسو بہائے آخر گاڑی والے نے آواز دی سرکار آئیے گاڑی کا
وقت نکلا جاتا ہے۔ یہ سن کر اس کو دلاسا دیتا ہوا اس کو روتا چھوڑ خود آنسو پونچھتا گاڑی میں سوار ہو گیا مگر
دل میں ایک طوفان تھا جو موجزن تھا۔ آنکھیں پتھرا سی گئیں دل قابو سے باہر تھا اپنے بازاروں میں سے
اس طرح گزرا کہ خبر نہ رہی۔ کہاں سے گزر رہا ہوں آخر اسٹیشن آیا۔ اسباب بک کرنے۔ ٹکٹ لینے کی بابت پڑتا ہے
میں رنج بہت کچھ دل سے بھول گیا۔ یہاں تک کہ گاڑی میں بیٹھا اور خاموش۔ اداس صورت۔ رنج کی تصویر
بنا ہوا۔ علی گڑھ کے اسٹیشن پر جا اترا۔ افسوس یہی اسٹیشن تھا۔ جہاں تین مہینے قبل جو صورت تھی بشاش
نظر آتی تھی اور یہی اسٹیشن تھا جہاں جو صورت اس وقت اتری تھی اداسی کی تصویر تھی مجھکو یاد ہے کہ عرصہ تک
یہ غم دل سے دور نہیں ہوا۔ جب کبھی خیال آتا تھا کلیجہ دھڑکنے لگتا تھا اور ٹھنڈے سانس گلا گھونٹنے لگتے
تھے۔ افسوس میں رخصت ہو کر گھر سے چلا تو مجھکو سفر نے اپنے خیالات میں مشغول کر دیا۔ لیکن آہ گھر والوں
کی جن کو بجز میرے تصور کے اور کوئی چیز مصروف کرنے والی نہ تھی مجھکو نہ پا کر کیا حالت ہوئی ہوگی۔

یہ ایک جھلک ہے اس دنیا کی جو ہر شخص کے کاسۂ سر میں بند ہے اور جس کا ایک بہت ہی مختصر سا
پہلو ظاہر کی صورت میں دنیا کے سامنے نمایاں ہے۔ دنیا کی روشنی اس عمیق دریا کی صرف سطح کو دیکھ سکتی
ہے۔ اس کی گہرائیوں میں غوطہ لگانا کسی دوسرے کا کام نہیں یہی دنیا ہے جو ہر شخص کی اپنی دنیا ہے ماسوا جو کچھ
ہے وہ عالم احساس میں سب کی ایک مشترک ملکیت ہے یہی دنیا ہے جو ہر شخص کی اصلی دنیا ہے ماورا جو کچھ ہے
وہ اس کا عکس و پرتو ہے۔ اگر ہستی مطلق کو "تماشائی" مانیں تو عالم ظاہر اس کے لئے کچھ زیادہ دلچسپی اپنے
اندر نہیں رکھتا۔ عالم باطن ہی وہ عالم ہے جو اپنی ندرت کی بنا پر اس ہستی کا اصلی "تماشا گاہ" کہا جا سکتا ہے
ہر شخص کا عالم ظاہر ایک ناتمام کہانی ہے جس میں واقعات و حالات کی کڑیاں جابجا سے غائب ہیں عالم باطن
ہی وہ عالم ہے جس کے سوانح عالم ظاہر کے حذف شدہ حالات و واقعات ہیں۔ غرض خارج میں انسان ایک
یک رخی تصویر ہے اور ظاہر اس تصویر کا الٹا رخ ہے۔ تصویر کا سیدھا رخ دیکھنا ہو تو باطن کی سیر کیجئے میں تو
یہاں تک کہونگا کہ عالم ظاہر انسانی زندگی کا عامیانہ پہلو ہے۔ خاص پہلو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے
جس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ مقدس رموز باطنہ کی امانت داری کے لئے ظاہر کا ہر کارہ

بیٹ کا ہلکا اور بد دیانت خیال کیا گیا۔ ہمارا کالج ادراکی نقطۂ خیال سے جو کچھ ہے وہ مختصراً ان جوابات میں مبین ہے جو بڑی باتوں کی صورت میں اوپر بیان ہوئے۔ جذباتی نقطۂ نظر سے اُس کا وجود عالم لامتناہی ہے جس کا بیان انسان کے امکان سے باہر ہے۔ سطورِ بالا اس عالم کی ایک جھلک ہے جو تشنہ لبانِ حکایاتِ تصورات و جذبات کے واسطے ایسی ہی ہیں جیسے تپتے توے پر بوند۔

(باقی آیندہ)

بندۂ نامی

غزل

ابھی رہ اور محوِ خواب پھر بیدار ہو جانا — دلِ غفلت پسند اچھا نہیں ہشیار ہو جانا

اگر شوقِ رہائی ہے تو زنداں سے محبت کر — علاجِ درد ہے لذت کشِ آزار ہو جانا

انھیں ناکامیوں پر انحصارِ کامیابی ہے — کتنا لیت کا سبب ہے عقدہ کا دشوار ہو جانا

میں اس عالم سے محبت کے ڈرتا ہوں کہ ممکن ہے — مری حرکات سے افکار کا اظہار ہو جانا

رہِ وقت گزار رستے پر چلنے والے تھم — دلیلِ گمرہی ہے جادہ کا ہموار ہو جانا

تمناؤں کی کثرت مبطلِ آرامِ فرقت ہے — جو فرصت ہو تو وقفِ آرزوئے کار ہو جانا

ہوئی کیا بادپائے عمر کی وہ تیز رفتاری — کمپنی زندگی ہے موردِ افکار ہو جانا

نزولِ رحمتِ حق کا یہی ہنگام ہے جعفر
مبارک ہو یہ تدبیر کا بےکار ہو جانا

جعفر بیگ

قطعاتِ سخا

جناب سخا کے چند قطعات مرسل ہیں۔ آپ اس صنفِ سخن میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی کئی سو رباعیات اور قطعات کا مجموعہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ آپ کو خاتم الشعراء استاد داغ مرحوم سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ آپ نے آیندہ بھی اس سلسلہ کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

(عزیز)

(۱)

بے نتیجہ پڑھ لیا سائنس تو کیا فائدہ — یعنی جنباں ہیں زباں اور دست و پا ہیں شل
گر نہ کی فکرِ ہنر تو فقر بڑھتا جائے گا — عاقبت کی لو خبر اے عالمانِ بے عمل

(۲)

پندرہ گز کا ہو عمامہ مقطع داڑھی — اور لمبا سا چغہ جب کوئی دیندار رکھے
یہ تو سب سچ ہے مگر اس سے بہت ڈرتا ہوں — کہ مبادا کوئی آزاد و ریاکار رکھے

(۳)

سارا دین و دیانت و تقوے — وعظ میں ہے معاملوں میں نہیں
اس کا باعث یہ ہے کہ صدیوں سے — حلق تک ہے خدا دلوں میں نہیں

(۴)

یورپ گئے تو لائے یہ انگلینڈ کی سوغات — میخواری کی افراط اور ایک میم خداداد
اور لوٹ کے تو کہتے ہیں غصے سے کہ ہم لوگ — آزادی کے پابند ہیں پابندی سے آزاد

(۵)

مختلف امراض کی طغیانیاں آتی رہیں — سیپیاں باقی رہیں طوفاں میں موتی بہہ گئے
میں نے عزرائیل کا دیکھا رجسٹر تو کھلا — جینے والے مر گئے اور مرنیوالے رہ گئے

(۶)

جس جگہ برداشت سے اولاد کا نمبر بڑھا — اس قدر لاحق ہوئیں فکریں کہ بڈھا مر لیا
شستِ غم کا سبب پوچھا تو بولا وہ غریب — غاصبوں نے حقِ آسائش پہ قبضہ کر لیا

(۷)

واعظ سے میں نے عرض کیا اس کا کیا سبب — کرنے کے کام اور سکھانے کے اور ہیں
اس نے کہا سخا تجھے یہ بھی نہیں خبر — کھانے کے دانت اور دکھانے کے اور ہیں

مجتہد الشعرا سید حسن سخا دہلوی

ماضی و حال

(۱)

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے (غالب)

بارش برس کر کھل چکی تھی اور فضائے آسمان نے شب کی تاریک چادر اوڑھ لی تھی، میں ایک عزیز کی عیادت کرکے مکان کو واپس ہو رہا تھا کہ تاریک سڑک پر جہاں میونسپلٹی کی دقیانوسی لالٹینیں تاریکی کو اور زیادہ مہیب بنا رہی تھیں، ایک شخص نے شب کے تاریک گہرے سکوت کو اپنے بلند نغمہ سرائی سے توڑا اور بڑے شد و مد سے الاپنا شروع کیا :-

لیا ہے دل سرِ محفل کسی کا : تڑپتا رہ گیا بسمل کسی کا

گانے والے پر معلوم ہوتا تھا کہ وقت اور موسم نے اپنا پورا اثر کیا تھا، وہ بار بار اپنے سوزِ نہانی کو شاعر کی زبان سے ادا کرتا تھا۔ اپنی درد انگیز خوش الحانی سے کبھی آواز کے اوتار چڑھاؤ سے انتہائی خلوص دل کے ساتھ شاید یہ سمجھ کر کہ اس تاریک عالم میں وہ تنہا اور اکیلا ہی راہ پیمائی کر رہا ہے۔ اپنا عرض حال اپنے خالق سے کر رہا تھا۔ اس کے نغمہ میں کچھ اس غضب کا افسوں تھا کہ میرے قدم خود بخود رکنے لگے اور میری زندگی کے اس نے بعض بہترین لمحے یاد دلا کر مجھے محو بیخودی کر دیا۔ آہ!

تڑپتا رہ گیا بسمل کسی کا

کیا گانے والا واقعی بسمل ہے ؟ اس سوال نے مجھے حضرتِ دل کے بارہا بسمل ہونے کا واقعہ یاد دلایا۔ ڈاکٹر جانسن جس کا محبوب علم ادب رہا وہ بھی حسن کی فسوں گری سے نہ بچا۔ نپولین اعظم جو اس جذبۂ انسانی سے محروم بتایا جاتا ہے کیا واقعی وہ ایسا ہی تھا؟ نہیں یہ ہرگز صحیح نہیں، پھر کیا جوزیفائن کے لئے اس کے قلب پر کبھی کوئی حقیقی جذبہ پیدا نہیں ہوا، کیوپڈ سا (Cupid) تیر انداز نشانہ بنائے اور پھر کوئی بچے ممکن نہیں میں نہ مانوں گا۔ کوئی لاکھ سمجھائے۔ دن، مہینے، برس گزرتے گئے گزر گئے، انقلاباتِ زندگی نے وہ تھپیڑے لگائے کہ پہلا سا اب سودائے خام بھی نہیں رہا۔ مگر ہاں بھولا نہیں۔ بلکہ خوب یاد ہے کہ

تڑپتا رہ گیا بسمل کسی کا

یہ تڑپ کیوں تھی؟ اس کا بسمل مدتوں نیم جاں تڑپا۔ سر دھنا، بدحواس پھرا، مگر زمانہ گزرتا رہا اور درد حد سے گزر کر خود دوا بن گیا۔ تڑپ کی ظاہراً شکل مٹ گئی۔ ظاہرا اسباب تڑپ کے باقی نہ رہے لیکن ہاں میرے قلب مرحوم کا پوسٹ مارٹم کرو، اس کو چیر کر دیکھو کہ اس کے مرکزی حصے میں یہ تڑپ کس طرح نہاں ہے۔ اس کی سوزش نہانی میری روح کو برابر تحلیل کر رہی ہے، آف ابھی راستہ اور باقی ہے ہاں، اے گانے والے اے تنہا تاریک راستہ طے کرنے والے اپنی آواز پھر وجدانی کیف کے ساتھ اٹھا۔ ہاں پھر نغمہ سرائی کر، میرے قلب غم خوردہ پر پھر بجلیاں گرا، میری حسیات مضطربانہ پر دل کھول کر برق پاشی کر، سر محفل تو نہیں لیکن کہیں دل کا چھپا جانا ضرور یاد ہے۔ وہ ساعت یاد ہے، وہ ادا یاد ہے، وہ نگہ یاد ہے جس نے اسے بسمل کیا۔ مفتوح کیا اور ہمیشہ کے لئے اپنا مقبوضہ بنا لیا۔ میرے محسوسات قلبی کو دائمی طور پر مضطرب کر دیا۔ میں از خود نجد کے صحرا میں نہیں بلکہ اسی بستی کے کوچوں میں دیوانہ وار پھرا نہایت گنجان آبادی میں ہو کر گزرا، مگر وارفتگی کہ اس کو بھی صحرائے غیر آبادی سمجھا۔ اگر احباب کے مجمع نے کبھی آ گھیرا تو بھی اپنے کو تنہا ہی تصور کیا۔ میرا دل خود محشرستانِ آرزو تھا۔ بے شمار جذباتِ متلاطم کا مرکز تھا۔ کس کا خیال مجھکو وحشی بنا چکا تھا۔ اس وحشت کے عالم میں اُن کے دروازہ تک پہنچتا۔ وہاں رک کر گھنٹوں سوچتا کہ میرا اُن تک پہنچنا کا نہ جانا کہیں اُن کے سکون قلب کو متلاطم نہ کر دے۔ سوچتا اور پھر سوچتا۔ اگر بسالت قلبی نے جرأت دلا دی تو ضرور اُن تک پہنچتا لیکن آہ! کتنی ہی مرتبہ میری ہمت نے میرا ساتھ چھوڑا۔ بارہا میں نامراد بلا دید واپس ہوا۔ وہ لیلائے نجد نہ تھے کہ اپنی دیوار تک بھی مجھے آنے نہ دیتے۔ میرے جذبات شاعرانہ کی وہ دل سے قدر کرتے تھے۔ میری وحشت اور وارفتگی کے حقیقی سبب کو خوب پہچانتے تھے۔ میرے بڑھتے ہوئے اضطراب کو ان کی آغوش دلبرانہ نے بارہا مسکن کیا، میری لرزاں اور مرتعش ہستی اُن کے سامنے جا کر مجسم سکون و طمانیت بنتی۔ اُن کی مسترضی نگاہیں میرے قلبِ مضطرب کی تڑپ میں سکون و راحت پیدا کر لی تھیں۔ آخر زمانہ نے کروٹ بدلی۔ اب نہ وہ قلب وحشت پسند ہی باقی ہے اور نہ وہ نگاہیں جو وحشت کی درماں تھیں۔ تموج گزر چکا تلاطم مبدل بسکون ہوا۔ زندگی کا دریا ایک غیر دلچسپ سکون کے ساتھ ہمیں نامعلوم دہانہ کی طرف بہا رہا ہے اے سیلِ زمانہ جس طرف چاہے بہائے چل، ہم تیرے ساتھ ہیں۔ ہم سے پہلے تو نے بڑی بڑی شخصیتوں کو بہایا اور دم لینے کا موقع نہ دیا۔ بوناپارٹ کو سمندروں پار بہا کر سینٹ ہلینا (Sent Halena) کی چٹان تک تو نے ہی جا پٹکا۔ ہاں چل ہم بھی تیرے ساتھ ہیں مگر اپنی تڑپ نہ چھوڑیں گے، تیری متلاطم موجوں کو اپنی تڑپ سے اور زیادہ تڑپائیں گے، ہم مصنف خیالستان نہیں جو بلا تڑپے بہ جائیں۔

---

(۲)

خیالستان کے مصنف سے پوچھئے کہ حضرت آپ کی تڑپ کیا ہوئی! آپ نے اپنی حیاتِ مضطربانہ کو کس سرداب کے سپرد کر دیا، وہ مجسم کیفیتِ اضطراب، وہ قلبِ بسمل جس کی تڑپ ہر فقرۂ خیالستان کو نوکِ نشتر سے زیادہ موثر بناتی تھی کس کی نذر ہو گئی؟

خارا اور نسرین نوش کی سراپا جذبات سرگزشت کا لکھنے والا اب کس سرگزشت میں مصروف ہو گیا؟ یارب یہ کیسا انقلاب ہے کہ جذباتِ مضطرب کی آتش فشانی اب ایسی سرد ہوئی کہ کسی چنگاری کا بھی پتا نہیں۔ وہ تجسسِ مضطربانہ کس عامیانہ 'واقعیت' کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اے کاش دفتری حیثیت اُن کے حیاتِ لطیفہ پر تسلط نہ کرتی اور وہ بھی ہماری طرح کسی راہگیر ہی کی نغمہ سرائی سے چوٹ کھاتے!!
کیا یہ سچ ہے۔

وہ جنوں انگیزیاں رخصت ہوئیں　　　عقل سے وہ شرمساری اب کہاں　　([illegible])

(۳)

ہمارا دور علی گڑھ کالج مرحوم کا قریب قریب آخری دور تھا۔ جہاں کبھی ہم تھے اور ہمارا مرحوم کالج اب وہاں ایک نو عمر یونیورسٹی کا مسکن ہے۔ نیا رنگ ڈھنگ ہے۔ وہ نقوشِ ماضی اب کہاں؛ سیلِ زمانہ بہا لے گیا۔ بس اب یاد ہی یاد باقی ہے جو قلب کو تڑپاتی ہے ہم اب بھی بسمل ہیں۔ اسٹریچی ہال میں اقتصادیات کے غیر دلچسپ گھنٹوں میں پیچھے کی نشستوں پر، پرنسپل صاحب کی گرفت سے دور، انگلستان کے مشرقی جذبات شاعر بائرن کی نظم ڈان جوآن اور چائلڈ ہیرالڈ پر امیر احمد مرحوم سے مکالمہ اور تبصرہ، اور کبھی سجاد انصاری سے آسکر وائلڈ اور برنارڈ شا کی تصانیف پر مباحثہ، کبھی سر سید کورٹ مغربی میں فخری قدوائی کے کمرہ پر سہیل اور ان کی شبلیت کا مظاہرہ۔ غرضکہ رنگا رنگ کی علمی دلچسپیاں اس آخری دور کی یادگار دلوں میں باقی ہیں۔ سہیل اور فخری کا ہر امر میں مشرقی مذاق کو سراہنا اب یادِ ماضی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ یہ انجمن جو کالج میں بوہیمین کے نام سے موسوم تھی کبھی کی منتشر ہو چکی۔ کئی اُس کے رکن دنیا سے بھی رخصت ہو گئے سنتا ہوں کہ سجاد انصاری نے بھی بے وفائی کی اور ہمیں چھوڑ کر امیر مرحوم کی رفاقت کو ترجیح دی ہمدم نے کس سجاد انصاری کی تاریخ وفات شائع کر کے ہمارے زخمِ جگر کو تازہ کر دیا۔ آہ! کیا ہمارا سجاد مرحوم ہو چکا۔ خدا کرے کہ یہ خبر غلط ہو؟ اچھا اگر یہ سچ ہے تو جاؤ، امیر تنہا تھے تمہاری رفاقت اُن کی روح کو مسرور کرے گی۔ مگر تمہارے وہ احباب جو قیدِ حیات اور بندِ غم میں ہنوز مبتلا ہیں اُن کو تمہاری یاد ہمیشہ بسمل رکھے گی۔ تمہاری ہستی شاعرِ فطرت کا ایک لطیف شعر تھی۔ اُس کو فنا کے بے رحم حملے سے

محفوظ رکھنا خود فطرت کا فرض تھا۔ مگر نہیں صانع فطرت ایسی لطیف ہستیوں کو خود پیار کرتا ہے اور زیادہ عرصہ اپنے سے جدا نہیں رکھتا۔ اچھا جاؤ، فضائے بالا کی سیر تمھیں مبارک ہو۔ ستاروں کی مصاحبت مدام تمھاری محفل ہو۔ جب تک ہوگا ہم تنہا ہی زمانہ کی سرد مہری سہیں گے۔ لیکن دیکھو کہیں ہماری تڑپ تمھیں وہیں بے چین نہ کرے۔ یہ اضطراب قلب کہیں تمھارے سکون مدام میں مخل نہ ہو۔ ہمارا سوز و ساز تمھاری روح کو نہ تڑپائے۔ اچھا، خیر۔ اب ہم محض سکوت، ضبط، جبر بن کر رہیں گے۔ تم چین سے ملائک کے ساتھ فضائے بالا میں پرواز کرو۔ وہاں کے عجائبات مشاہدہ کرو، وہاں کے اثرات قبول کرو، لطائف گفتگو سے اپنے خاص انداز میں جسے چاہو تسخیر کرو۔ ہم چُپ رہیں گے۔ ہمارا سکوت ہماری آہ ہوگی۔ ہمارا ضبط ہماری فریاد ہوگی، ہمارا جبر ہمارا صبر ہوگا۔ تمھارے لئے موت کا خواب شیریں اور ہمارے لئے حیات مضطر کا خواب پریشاں!

(ش۔ح) از سہارن پور

غزل

شاہراہِ ہستی میں جستجو ہے راحت کی
انتہا ہے اے میناؔ کوئی تیری غفلت کی

خوب ہی مزے لوٹے دورِ لن ترانی میں
لطفِ غم سے ہیں مانوس کاوشیں محبت کی

نقش میرے سجدوں کے در سے کیوں مٹا ڈالے
چند سیہ لکیریں تھیں وہ بھی میری قسمت کی

دعوتیں جوانی میں دیدیں موت کو میں نے
کفر ہوگئی آخر زندگی محبت کی

اس جنوں نوازی سے جسم کی بڑھی زینت
سیکڑوں ہیں تصویریں پیرہن میں وحشت کی

میناؔ زبیری (علیگ)
از میرٹھ ستارہ

کتاب چور

اس مندرس عنوان سے ناظرین کو یہ دھوکا نہ ہو کہ اس کے تحت میں اُس معمولی حریف کا ذکر ہوگا جو کسی نہ کسی بہانے سے اپنے دیکھنے یا اپنے پاس رکھنے یا بیچ ڈالنے کے لئے پرائی کتابیں چُرا لے جاتا ہی۔ یہاں اُس قسم کے بانی کارِ چور کا تاریخی واقعہ لکھا جاتا ہی جس کی انتہائی کمند انگنی کا نقشہ کسی پہنچے ہوئے شاعر نے یوں کھینچا ہی۔

دزدے کہ گلیم را بدزدد | درکعبہ حطیم را بدزدد صنگگ کحیم
برفاتحہ دست رس چو یابد | رحمان ورحیم را بدزدد

نقب زنی، قفل شکنی، جیب تراشی۔ یہ سب عوام و رذائل کے طریقے و خصائل ہیں، عمائد و خواص میں بُری خصلتیں ان صورتوں میں جلوہ گر نہیں ہوتیں، ڈاکو، اُچکّے، بٹ مار، رذالتِ اخلاق کے اثر سے اتنے دلیر نہیں ہوتے جس قدر یہ شیرانِ قالین اپنی جسارت کی میخیں جمائے ہوئے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہی کہ دزدانِ معروف کی وارداتیں رات کی خواب آور کمائی سے زیادہ دیرپا نہیں ہوتیں اور ان سارقان مجہول الحال کے واقعات نقش فی الحجر بنے رہتے ہیں۔ ایک علم دوست کو اپنے مرتب کتاب خانے کی سجی ہوئی کتابوں میں سے کسی کتاب کے ضائع ہو جانے کا ضرور رنج ہوتا ہی مگر نہ اتنا جتنا کہ ایک مصنف کو اپنے جیتے جی اپنی تصنیف کا دوسرے کے نام سے منسوب ہوتے ہوئے دیکھ کر ہوتا ہی۔ یہ دلیری و جسارت گزشتہ زمانے کے لئے ہی مخصوص نہ تھی بلکہ اب بھی بکثرت ایسا ہو رہا ہی چنانچہ اس پیشے کی ترقی دیکھتے ہوئے بیخود صاحب کے تقاضائے مضمون پر مجھے ہوش آیا کہ اگر موجودہ مصنفین اور غربائے تحریر کو ایک تاریخی واقعے کی خبر دے کر چونکا دیا جائے تو اس سے بہتر کوئی تحقیقی (Research) مضمون نہ ہوگا۔

حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نام نامی سے تمام اہل علم آگاہ ہیں، نیز اُن کی تصانیف معو سے بھی اکثر اہل نظر ناواقف نہیں ہیں۔ اُن کی مصنفات میں متعدد مفید و نایاب کتابیں اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔ اُنھیں میں ایک "تذکرۂ ید بیضا" ہی جو فن تاریخ میں موصوف کی پہلی تالیف ہی۔ اس کے متعلق جو واقعہ پیش آیا ہی اُسی تذکرے کی ترتیب دوم کے آخر میں خود جناب آزاد نے قلم بند کر دیا ہی۔

اگرچہ اصل فارسی انشا پردازی کا لطف اردو ترجمے کی نقل میں نہیں آ سکتا، مگر فارسی کی کساد بازاری

دیکھتے ہوئے عام ناظرین کی واقفیت کے لئے مطلب خیز ترجمہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میر آزاد لکھتے ہیں۔

"چار سال سے زیادہ قیام سیوستان کے زمانے میں اکثر اوقات کتب تواریخ اور دواوین شعرا کے مطالعے کا مشغلہ رہتا تھا، اسی مشغلہ میں خیال آیا کہ ایک ایسا تذکرۂ شعرا لکھا جائے جو متقدمین و متاخرین کے احوال و اشعار پر حاوی ہو، چناں چہ منتخب دواوین، معتبر کتب اور معتمد مجموعوں سے ۱۱۴۱ھ میں ایک تذکرۂ شعرا مرتب ہو کر تمام ہوگیا۔ اہلِ سیوستان نے اس نسخے کی متعدد نقلیں لے لیں اور ایک شخص اُس کی نقل دلی بھی لے گیا اور جب کہ سیوستان سے واپس ہوتے ہوئے فقیر لاہور پہنچا تو محمد فقیر اللہ متخلص بہ آفرین لاہوری نے بخواہش تمام ایک نسخہ مجھ سے لے لیا۔ الہ آباد پہنچنے کے بعد اس تالیف کے لئے تازہ مواد بہم پہنچا، ناچار پہلے نسخے کو منسوخ کر کے دوسرا نسخہ مرتب کرنا پڑا۔ اور ۱۱۴۸ھ میں یہ کام تمام ہوا جس کا قطعہ تاریخ اس طرح کہا گیا۔

این چہ سوادے ست کہ حرفِ او — لمعۂ اعجاز سخن وا نمود

مصرعِ تاریخ رقم زد خرد — طبع کلیم ید بیضا نمود (۱۱۴۸ھ)

ان دونوں نسخوں کی تالیف کا حال نسخۂ آخر کے دیباچے میں لکھ دیا گیا ہے۔ الغرض اس نسخے کے تمام ہو جانے کے بعد تقریباً دو سال تک کبھی الہ آباد اور کبھی بلگرام میں میرا قیام رہا اور انھیں دنوں میں کم و بیش دس نقلیں عزیزوں نے حاصل کیں اور جا بجا لے گئے۔ اس کے بعد میں نے حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا۔ بعد واپسی حرمین شریفین، زمانۂ قیام اورنگ آباد دکن میں میر محمد یوسف (جن کا ذکر ید بیضا کے خاتمے پر ہے) کا خط ۱۴ رمضان ۱۱۵۶ھ کا لکھا ہوا بلگرام سے آیا جس میں تحریر تھا کہ " میرے حرمین شریفین جانے کے بعد ایک بیارسی شخص نے میدان خالی پاکر تذکرے کو اپنے نام سے موسوم کر دیا اور جہاں کہیں اس گم نام کا نام اور ذکر تھا اُس کو نکال دیا اور اس طرح اُس کی نقلیں جا بجا بھیج دیں۔ حدیث صحیح کا یہ مفہوم ہے کہ منافق تین علامتوں سے پہچانا جاتا ہے ایک اُس وقت جب کہ اس کا جھوٹ ظاہر ہو۔ دوسرے جب کہ وہ وعدہ خلافی کرے تیسرے اس حالت میں کہ خیانت اختیار کرے۔ نیز حدیث میں آیا ہے کہ علم کی خیانت، خیانتِ مال سے شدید تر ہے۔ بے شک خیانت مال کی سزا قطعِ ید ہے اور خیانتِ علم کی سزا قطعِ ایادی یعنی خدا کی بے انتہا نعمتوں اور لاتعداد فوائد سے محروم ہو جاتا ہے جو کام یہود و نصاریٰ نے بذریعۂ تحریف ہمارے جدِ امجد کی کتاب کے ساتھ کیا وہی اس عزیز نے ہماری کتاب کے لئے عمل کیا۔ بے شک من تشبہ بقوم فھو منھم۔ معاذ اللہ دیدہ و دانستہ فرقۂ محرفین میں اپنے آپ کو داخل کیا اور ابدی طوق لعنت اپنے گلے میں ڈالا۔

عجیب تر یہ ہے کہ فقیر نے جو نقول و حکایات نادر اور نایاب تصنیفات و تالیفات سے نقل کی تھیں اُن سب کو اپنی تحقیق قرار دیا گویا اُن کی سیر چشم خود اُس نے کی ہے۔ حالانکہ وہ بے بصر اُن مصنفات سے باخبر

نہیں اور بالفرض بعض نسخوں کو دیکھا بھی ہو تو بہت سی نادر کتابیں ایسی ہیں جو اُس کے خواب وخیال میں بھی نہ آئی ہوں گی اور پھر بعد تحصیل زیارت حرمین شریفین اور ہندوستان کی واپسی کے بعد بعض نیا مواد ہاتھ آیا اور بہت سے فوائد چن چن کر بعض اعزۂ وطن کے پاس بھیجے گئے تاکہ وہ تذکرے میں داخل کرلیں اور اس کے بعد بھی بشرط حیات بہت سے فوائد ہاتھ آئیں گے اور شامل ہوتے رہیں گے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ یہ ایک طریقہ منقول و معقول ہے یعنی جب تک مصنف زندہ ہے تصنیف ناتمام ہے۔ چنانچہ مولف قاموس نے بتدریج اور وقتاً فوقتاً بہت سے اضافے مدتوں تک اپنے لغت میں کئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ قاموس کے مختلف نسخوں میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں، الحاصل اصول الحاقات سے قطع نظر کرکے سارق نارسی سے تذکرے کے مجموعی اصول کی بابت اگر پوچھا جائے تو ساری قلعی کھل جائے اور اُس کی نضیحت ظاہر ہوجائے یعنی خود اُس کی زبان بفحوائے لاعلم لنا الا ما علمتنا (ہم کو کچھ علم نہیں مگر جتنا تونے سکھایا) اور بمقتضائے الآن حصحص الحق (اب تو ظاہر ہو ہی گئی حق بات) گویا ہوجائے۔ یہ عزیز قاطع الطریق نئی قسم کی جسارت رکھتا ہے کہ مصنف کے عین حیات لعادت کرتا ہے اور باوجود شہرت مصنف اور اشاعت کتاب اپنی رسوائی کا خیال بھی خاطر میں نہیں لاتا

ع چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد

یہ بھی یقینی ہے کہ یہ عزیز بے تمیز لباس استعداد سے برہنہ ہے کیونکہ کسی کے مال کا چرالینا چور کے لئے خود فراموشی کا سرمایہ ہوتا ہے۔ جہاں کہیں تذکرے میں تصرف کیا ہے اُسی سے بے استعدادی کی علامت اور طرز کلام کی مغائرت مصنف و سارق کی ظاہر ہوسکتی ہے۔ دونوں نسخوں کے مقابلے سے دزد نارسی کی چوری ناظرین پر خود بخود کھل جائیگی اس لئے کہ صبح صادق کے طلوع ہوتے ہی صبح کاذب کا رنگ بے ثبات اُڑ جاتا ہے۔ ناصر علی نے اس موقع کے لئے کیا خوب کہا ہے اور کیسے بے نظیر موتی پروئے ہیں :-

دگر اے مدعی کوتاہ کن لاف	سخن پیشہ ست دراحیاءِ انصاف
تو دیوی خاتم جم را نشائی	اگر از کوچۂ دزدی درآئی
و لے زیں دولتِ تیزت چہ حاصل	وزیں شمشیر خوں ریزت چہ حاصل
بدزدی می بری تاجِ سرِ شاہ	لبسر مشکل کہ گردد تیغ جاں کاہ
گرفتم مکر دیوت در مزاج ست	سلیمانی بروں از تخت و تاج ست
بگوشم خورد صوتِ دلنشینی	ز نوکِ کلک معنی آفرینی
گر انگشتِ سلیمانی نہ باشد	چہ خاصیت دہد نقشِ نگینی

اگلے زمانے میں بھی ایسے تصنیفے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً شیخ جلال الدین سیوطی کی خصائص نبوی

کو جسے اُنھوں نے بیس برس کی محنت سے لکھا تھا کسی معاصرِ سیوطی نے مقدمۂ کتاب اور بعض عبارتوں کو اُدل بدل کرکے اپنے نام سے منسوب کر دیا جب سیوطی کو خبر ہوئی تو اُنھوں نے ہنگامہ برپا کیا اور والی مصر اور تمام اکابرِ وقت کے سامنے اس کو ذلیل و رُسوا کیا، بالآخر سیوطی نے اپنی مقامات نامی کتاب میں سارق مذکور کا قصہ ایک مقام پر لکھا ہے اور اُس کا باب الفارق بین المصنف والسارق قائم کیا ہے۔ اسی میں لکھا ہے کہ بزرگانِ با دیانت غیر کی ادنیٰ کارگزاری کو بھی اپنے نام سے منسوب کرنا معیوب سمجھتے تھے۔ مثلاً مُزنی رحمۃ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب مختصر کے عنوان میں لکھتے ہیں کتاب الطہارۃ ۔ قال الشافعی۔ قال اللہ تعالیٰ وانزلنا من السمآء ماءً طہوراً ۔ یہاں کلام اللہ کی آیت کو قولِ شافعی کے بعد لکھنے پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ " کیا مُزنی نے اس آیت کو خود قرآن میں نہیں دیکھا تھا کہ شافعی سے نقل کیا۔ حالانکہ مُزنی کی غرض اس سے یہ ہے کہ کتاب الطہارت کا افتتاح اس آیت کے ساتھ شافعی کا مقرر کردہ نظام ہے نہ کہ اپنی ترتیب۔ اسی طرح شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی گلستان میں ایک حکایت لکھتے ہیں کہ ایک سپاہی اپنی بڑائیاں کرتا ہوا قافلۂ حجاج کے ساتھ شہر میں وارد ہوا اور کہا کہ میں سفرِ حج سے آرہا ہوں۔ اُس کے بعد اُس نے ایک قصیدہ بادشاہ کی خدمت میں یہ کہکر پیش کیا کہ میں نے کہا ہے۔ اتفاقاً اسی سال کوئی ندیم بادشاہ دریائی سفر سے آیا تھا اُس نے کہا کہ اس شخص کو میں نے بقرعید کے دن بصرے میں دیکھا تھا یہ حاجی کس طرح ہو سکتا ہے ۔ دوسرے مصاحب نے کہا کہ میں اس کو پہچانتا ہوں اس کا باپ نصرانی تھا اور جو اشعار اُس نے پڑھے ہیں وہ انوری کے دیوان میں موجود ہیں۔ غرض کہ یہ سارق بنارسی اُس سیاہ رو کا برادرِ معنوی ہے جس نے ہماری تصنیف کو چرایا ہے عجب نہیں کہ ہمارے حج و سیادت کو بھی اپنے نام سے منسوب کرے۔ ان شاء اللہ اپنے بھائی کی طرح یہ بھی رسوائے عالم ہوگا ۔"

راقم مترجم نے اصل تحریر سے بعض احادیث و آیاتِ عربی کو مخصوص نقل نہیں کیا ہے کیوں کہ ناظرین تک صرف مفہوم کا پہنچا دینا مقصود تھا۔ نہ اظہارِ قابلیت لیکن اس واقعے کے بعد حضرت مصنف (آزاد) نے جو قطعہ موزوں کیا ہے وہ بلفظہٖ درج کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اُس کے اکثر خصوصی الفاظ اور قوافی کسی طرح دوسری زبان کی ترجمانی کے لائق نہیں۔

قطعہ

بے شعورے از بنارس کرد فکرِ نارسے — خواست تا در دست گیرد شعلۂ جوالۂ
بُرد تصنیفِ من و شہرت بنامِ خویش داد — از بہارم کرد غارت یک گلستاں لالۂ
خواند و از بر کرد توریتِ کلیم اللہ را — گفت من صاحب کتابم، طوطیِ بنگالۂ

سامری باشی و دعوائے ید بیضا کنی | رو کہ در دستِ تو می زیبد دُم گوسالۂ
رنگ با زد در حضورِ صدقِ تصویرِ دغل | آب گردد از فروغِ گوہرمن ژالۂ

آخر میں چند فقرے لکھکر یہ تحریر ختم کی جاتی ہے کہ واقعاتِ مذکورہ اُس زمانے کے ہیں جب کہ دنیا میں ابلہانِ جنت (اھل الجنۃ بلہ) کی کثرت تھی۔ ان وارداتوں میں بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں فی زمانا یہ جرائم جس دلیری اور شوخ چشمی سے کئے جا رہے ہیں وہ منکرین یا مذبذبین جنت و دوزخ کی پختہ مکاریوں کے شایانِ حال ہیں۔

راقم اثم

احسن مارہروی

جلوۂ نیرنگ

مایۂ ہست و بود دنیا ہے | ایک آشوب جلوۂ نیرنگ
اس کا جلوہ تو کچھ نہیں لیکن | اپنی حیرت کو دیکھکر ہوں دنگ
کشمکش ہائے آرزو کیوں ہے | دل ہے یا کوئی قید خانۂ تنگ
پھر یہ پیرِ خاکش زندگی کیوں ہے | میں ہوں جب بے نیازِ صلح و جنگ
میں ہوں رنگ آشنائے بزمِ جہاں | مجھسے پوچھے کوئی جہاں کے رنگ
میری تمکین اضطراب سے ہے | رنگِ بیرنگ جلوۂ نیرنگ

اس کی کثرت دلیل وحدت ہے
ہستی دہر ہے شرارۂ سنگ

عرش

محسوساتِ فانی

دل چرا کر نگاہ ہے خاموش — ہوش اور مست ہو کے اتنا ہوش

مست کو چاہیے بلا کا ہوش — خم دے اور دیا نہ اذنِ خروش

ہر مسافر سے پوچھ لیتا ہوں — خانہ برباد ہوں کہ خانہ بدوش

ہوس جلوہ اور نظر غافل — کہ نظر ہے صلائے جلوہ فروش

شاید اب منزلِ عدم ہے قریب — یادِ خاکِ وطن ہے طوفاں جوش

فضل تیرا شفیع طاعت و زہد — عدل عاصی نواز و عصیاں پوش

ہجر نے کی مفارقت فانیؔ — لیے مبارک ہو موت کا آغوش

بے ادب گریۂ محرومیٔ دیدار نہیں — ورنہ کچھ در کے سوا حاصلِ دیوار نہیں

زندگی جبر ہے اور صبر کے آثار نہیں — ہائے اُس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

آسماں بھی ترے کوچہ کی زمیں ہے لیکن — وہ زمیں جس پہ ترا سایۂ دیوار نہیں

دیر و حرم کا افسانہ

(۱)

ایک مسلمان نے کسی دہریے سے پوچھا کہ تو خدا کو کیوں نہیں مانتا تو دہریے نے جواب دیا کہ ؎

تمہارا خدا ماننے کے قابل ہو تب کوئی مانے یا یونہی مان لے۔ تم جب چھیڑتے ہو تو سنو ا۔

زہرا بائی پیدا ہوئی اور بڑھی تو اس کی آنکھوں کو دیکھ کر شرابی ہشیار اور ہشیار شرابی ہو گئے مگر اسی محلہ میں شریفن پیدا ہوئی تو دونوں آنکھوں سے اندھی! اندھی شریفن کو انکھیارے کیوں نے زندگی بھر نہ پوچھا۔

تمہارا خدا اگر انصاف ور تھا تو اس نے شریفن کو اندھا پیدا کر کے فاقے کیوں کرائے اور زہرا بائی کو چشم میگوں دیکر بادۂ عشرت کیوں پلایا؟

عین طوفان میں ایک بچہ تباہ شدہ کشتی کے تختہ پر پیدا ہوتا ہے۔ ماں فوراً مر جاتی ہے سمندر کا تلاطم اوس ٹوٹے ہوئے تختہ کو ساحل پر لگا دیتا ہے۔ بچہ صحیح سلامت رہتا ہے اور مہ نو کی طرح بڑھتا ہے۔ اس کا عروج بہشتِ شداد سے پوچھ لو۔ مگر ایک دوسرا بچہ سیٹھ کروڑی چند (عرف لاولد) کے یہاں پیدا ہوتا ہے اور اور شفاء الملک کی نگرانی میں دیا جاتا ہے۔ لیکن شفاء الملک بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے اور نوزائیدہ دم توڑ چکا! اگر تمہارا خدا رحیم ہے تو لاولد سیٹھ کے جگر میں ناسور کیوں ہے؟ یہ کیا ہے کہ جو بچہ طوفان کی گود میں تھا وہ بچا لیا گیا اور جو بچہ شفاء الملک کی گود میں تھا وہ چھین لیا گیا؟

مصر کے فراعنہ اپنی شادی زیادہ تر اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے کرتے تھے۔ اور جب یہ نعمتیں ان کو میسر نہ ہوتیں تب کہیں باہر سے لڑکی لاتے تھے۔ وہ اس خیال سے کہ باہر کی لڑکی آئے گی تو کہیں ایسا نہ ہو اس کے مانگ والے سازش کر کے تختِ مصر کو اپنے خاندان میں منتقل کر لیں۔ اور کبھی اس خیال سے کہ دنیا بھر کی آسائش جب اپنی لڑکی اور بہن کو ہم خود دے سکتے ہیں تو پھر کسی داماد یا بہنوئی کی تلاش میں گھاس کیوں کی جائے۔ اور کبھی اس خیال سے کہ اپنے خانہ باغ کی چڑیا باغِ اغیار کی ہزار داستان سے اچھی ہے۔ بہرکیف اس فلسفہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرعون نمبر ۱ نے اپنی شادی سگی بہن یا بیٹی سے کی تو اس کا بیٹا فرعون نمبر ۲ اپنی ماں کا سگا بھائی اور اپنی پھوپی کا بیٹا ہوا۔ اور خود فرعون نمبر ۱ اپنے بیٹے کا نانا اور اپنے بھانجے کا باپ ہوا۔ اور فرعون نمبر ۲ کی ماں اپنے شوہر کی نواسی ہوئی۔ یہ فرعونیت تمہارے

خدا کو اگر بھائی نہ تھی تو اُس نے ان کتوں کو تختِ مصر پر لوٹنے کیوں دیا؟ میرا روئے سخن جابرِ فرعونیت کے اُس تلچھٹ کی طرف نہیں ہے جس کو عہدِ موسوی کے افسانہ گو کہتے ہیں کہ تمہارے خدا نے دریائے نیل میں بہا دیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ بیسوں فراعنہ جو صدیوں تک اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے شادیاں کرتے رہے اور جن کی نجاست سے دُنیا نجس ہو گئی، ایسے گدہ مصروجنس کی شاہنشاہی کے لیے کیوں چھوڑ دیئے گئے؟

واہ رے تمہارا خدا کہ ابرہہ کی سرکوبی کے لیے ابابیلیں اور ابابیلوں کے پنجوں میں کنکریاں بھیجتا ہے۔ مگر ۶۴ھ ہجری میں جب خود کلمہ گویوں نے مکّہ کا محاصرہ کیا[1]، خانۂ کعبہ کو نقصانِ عظیم پہونچایا، اور نیز مدینہ میں مسجدِ نبوی کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور انصار کو چُن چُن کر مارا۔ اور ۱۴۵ھ ہجری میں جب خلیفہ المنصور[2] نے مدینہ کا ناکہ کر کے قحط کرا دیا، اور امام ابو حنیفہ کو قید خانہ میں جھونکا، اور امام مالک کو کوڑے لگائے۔ اور ۳۱۷ھ ہجری میں جب ابو طاہر[3] نے عین حج کے دن حاجیوں کو ذبح کیا، اور خانۂ کعبہ کو نجس کیا، اور سنگِ اسود کو اکھاڑ کر بائیس برس تک بیت اللہ کو بے چراغ رکھا۔ ان موقعوں پر تمہارا خدا ابابیلوں اور کنکریوں سے مطلق کام نہیں لیتا! آخر کیوں؟ میزبان نے اپنے مہمان حاجیوں کو ذبح ہونے سے کیوں نہ بچا لیا؟ صاحب خانہ نے گھر کو تاراج ہونے کے لیے بے پناہ کیوں چھوڑ دیا؟

یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو طمانچے لگائے، منہ پر تھوکا، اور سولی پر چڑھا دیا۔ تمہارا خدا کہاں تھا کہ ایسے وفادار غلام کی ذلت دیکھتا رہا؟ تمہارے رسول کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، بدن پر اونٹ کی انتڑیاں ڈالی گئیں، زہر دیا گیا۔ تمہارا خدا کہاں تھا کہ اُس نے اپنے حبیب کو اُسی طرح نہ بچا لیا جس طرح افسانہ گو کہتے ہیں کہ اُس نے جناب خلیل کو آتشِ نمرود سے اور جناب موسیٰ کو دریائے نیل سے بچا لیا؟

تمہارے رسول کے نواسہ کا سر کاٹ کر نیزہ پر چڑھایا گیا اور پھر دربارِ عام میں یزید کے سامنے تحفۃً پیش ہوا اور یزید نے لبہائے شہید سے گستاخیاں کیں! تمہارا خدا اُس وقت کہاں تھا کہ اپنے فدائیوں کی رسوائی دیکھتا رہا۔ اور کیوں نہ ایسا ہوا کہ غضب الٰہی نے اُسی وقت یزید اور یزید کے درباریوں پر بجلی گرا دی؟

کیا فرماتے ہیں ہستیٔ موہوم کا کلمہ پڑھنے والے اس باب میں کہ بنی اسرائیل چیختے رہ گئے کہ اے موسیٰ! تم دعوے میں سچے ہو تو اپنے خدا کو سامنے لاؤ۔ مگر جب جوش میں آکر موسیٰ نے نقاب پھاڑنا چاہا تو اُن کا خیالی نقاب پوش ملکا رہا تھا کہ۔ دور باش! حضرت موسیٰؑ کی اس شکستِ فاش کے بعد اب

---

[1] ہسٹری آف سرسین مصنفہ جسٹس سید امیر علی ص ۹۰ [2] ایضاً ص ۲۲۳ [3] ایضاً ص ۲۹
[4] انجیل

کس کا منہ ہے کہ خدا کی ہستی کا دعویٰ کرے؟ مذعی سست او رگواہ چست! اگر خدا تھا تو بنی اسرائیل کے سامنے کیوں نہ آیا؟ اور اب بھی ہے تو میرے سامنے کیوں نہیں آتا؟

---

(۲)

کلہ گو نے دہریئے سے کہا کہ ہم تیری باتوں کا جواب یوں دینگے کہ کسی مدرسہ میں چند طلبا اُردو فنیات سیکھتے تھے۔ صرف و نحو اور بالخصوص فن عروض کی بیسیوں کتابیں درس میں تھیں۔ سالانہ امتحان میں جب طلبا شریک ہوئے اور اُردو کا پرچہ سامنے آیا تو اُس میں سوال تھا کہ:-

مندرجۂ ذیل الفاظ میں املا کی جو غلطیاں ہوں اُن کو درست کر کے غیر مرتب الفاظ سے ایک شعر کہو:-

ذو۔ ضمد۔ دیکھے۔ کہ۔ ہم۔ سے۔ بے۔ کو۔ ر۔ کر۔ کو۔ مادر۔ یح
بلغیب۔ کیا۔ مانینگے۔ چلطے۔ یکیں۔ ہنن۔ اوص۔ ہیں۔ رکھ۔

اس سوال کو دیکھ کر طلبا نے قہقہہ مارا۔ اور یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ یارو! اگر ہمیں مکتب و ہمیں ملا کار طفلاں تمام خواہد شد! قافیے کا پتہ نہیں۔ ردیف کا پتہ نہیں۔ بحر کا پتہ نہیں۔ مضمون کا پتہ نہیں الفاظ کی بے سر و سامانی یہ ہے جیسے میدانِ جنگ سے بھاگتی ہوئی فوج کا توشہ خانہ۔ پھر فرمائش یہ کہ شعر کہو۔ یا تو سوال چننے والا پاگل ہے، یا نہیں تو کوئی جناتی مذاق ہے۔ ایسے ہذیان کا جواب دینا عقلمندوں کا کام نہیں ہے!

ہوبہو یہی حالت منکرین خدا کی ہے۔ طلبا نے اُردو کے پرچہ کو ہذیان سمجھکر اُس کا جواب دینا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ اور دہریوں نے خود اپنی ہستی کو ارتقائی ہذیان سمجھ کر خدا کی ہستی سے انکار کر دیا مگر طلبا اگر صبر سے کام لیتے تو اُن کو معلوم ہو جاتا کہ املا کی غلطیاں صرف نو ہیں (ذو۔ ضمد۔ ہم۔ سے۔ یح۔ بلغیب۔ چلطے۔ یکیں۔ اوص) جن کی صحت کی جائے تو الفاظ یوں ہوں گے:۔ ضد۔ زاد۔ ہم۔ ہے۔ بیہ۔ بالغیب۔ چلتے۔ یقین۔ اوس"۔ باقی رہا غیر مرتب الفاظ کو ترتیب دینا۔ تو گھڑی ساز کی دوکان میں سیکڑوں پرزے منتشر رہتے ہیں مگر وہ آتا ہے تو سب کو ترتیب دے لیتا ہے۔ اسی طرح ناظمین کا پیشہ یہی ہے کہ خیالات کی منتشر فوج کو ہر وقت ترتیب دیا کرے، اُس کے لیے مشکل نہیں کہ چند منتشر الفاظ کو ترتیب دیکر ایک شعر نظم کر دے۔ پس طلبا کا امتحان اسی بات کا تھا کہ وہ بھی فن عروض کی کنگھی سے اس زلفِ پریشان کو سلجھا سکتے ہیں یا نہیں۔ قہقہے نے سب کام بگاڑ دیا ورنہ

غیر مرتب الفاظ کو مناسب ترتیب دینے سے جو شعر ہوتا وہ یہ ہے :-

یہ کیا ضد ہے کہ بے دیکھے نہیں مانینگے اُس کو ہم ؟
یقینِ بالغیب رکھ کر کورِ مادر زاد چلتے ہیں !

یعنی عجائب خانہ میں رکھنے کے قابل وہ بچّہ ہے جو دونوں آنکھوں سے اندھا پیدا ہوا کیونکہ اُس کی زندگی کا ہر ورق گلستانِ سعدی سے زیادہ سبق آموز ہے۔ ماں باپ کی صورت، آسمان زمین کی صورت اپنے مکان کے در و دیوار کی صورت، بستی والوں کی صورت، آگ مٹی اور پانی کی صورت۔ آج تک اُس نے دیکھی نہیں! پھر بھی نادیدہ ہر شے کا اس کو یقین ہے۔ آگ کو مٹی نہیں سمجھتا، مٹی کو پانی نہیں سمجھتا، اور پانی کو آگ نہیں سمجھتا۔ کبھی وہ یہ عذر نہیں پیش کرتا کہ ماں کو ماں اور باپ کو باپ کیوں مانیں جب آج تک ہم نے اُن کو دیکھا نہیں ہے۔ سڑکوں پر نکلتا ہے تو اُس کا ہر قدم یقین بالغیب کا نتیجہ ہے۔ نشیب و فراز سے بچتا ہوا جاتا ہے، اس لیے نہیں کہ نشیب و فراز آنکھوں سے دیکھ رہا ہے بلکہ اس لیے کہ اپنے عصا اور راستہ بتانے والوں کو وہ جھوٹا نہیں سمجھتا۔ کسی نے ٹوک دیا کہ آگے کنواں ہے تو یہ سنتے ہی وہ اپنا رخ بدل دیتا ہے۔ حجت نہیں کرتا۔ منطق نہیں شروع کر دیتا۔ پس ایک کورِ مادرزاد کی زندگی شاہد ہے اس بات کی کہ کسی چیز کا ماننا اُس چیز کے دیکھنے پر منحصر نہیں ہے۔ ایک مریض کہتا ہے کہ میرے بدن میں درد ہے۔ طبیب اُس درد کو دیکھ نہیں سکتا مگر نادیدہ پر یقین رکھتا ہے اور درد کی دوا دیتا ہے۔ اسی طرح سقراط، رستم، حاتم طائی، بابل و نینوا کے شاہی محلات، پانی پت کی لڑائیاں، لیلیٰ مجنوں کا مکتب میں الف بے پڑھنا، بابر کا ہمایوں پر صدقے ہو کر مر جانا، ہارون الرشید کا بھیس بدل کر راتوں کو نکلنا، سکندر کی تلوار خون آشام، فرہاد کا تیشہ، بت شکن محمود کا نعرۂ اللہ اکبر، نمرود کی سرکوبی کرنے والا مچھر، اور امیر علی ٹھگ کا رومال ۔ یہ سب چیزیں، یہ سب لوگ، یہ سب مناظر، قبرستانِ ماضی میں آج مدفون ہیں۔ کوئی نہ ان کو دیکھتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے۔ مگر نادیدہ سب کو یقین ہے! کوئی یہ عذر پیش نہیں کرتا کہ پانی پت کی لڑائی اور فرہاد کا تیشہ جب میری آنکھوں نے کبھی دیکھا نہیں تو ہم اُن کو مانیں کیوں۔ مگر ہاں! جب خدا کے ماننے کی باری آتی ہے تو بنی اسرائیل، کفارِ مکہ، اور دہریے چیخ اُٹھتے ہیں کہ واہ واہ جب اُس کو دیکھا نہیں تو مانیں کیوں؟ مگر یاد رہے کہ کوہِ طور پر صدا یہی آئی تھی کہ "لن ترانی"! اور کفارِ مکہ کو جواب یہی ملا تھا کہ ہم کو دیکھنا ہو تو "ہماری نشانیاں" دیکھ لو! خاک کو عالمِ پاک سے، یا مخلوق کو خالق سے، کوئی نسبت نہیں۔ مگر یہ کیا ہے کہ مخفی زیب النساء کے نادیدہ عاشقوں نے جب اُس کی زیارت چاہی تھی تو اُس نے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ۔ "ہر کہ دیدن میل دارد ؛ در سخن بیند مرا"!

۹۹۶؁ ہجری کا تاریخی واقعہ ہے کہ شہنشاہ اکبر جب کشمیر گیا تو وہاں شاہ عارف[1] حسینی سے ملاقات ہوئی۔ شاہ عارف ہمیشہ نقاب پوش رہتا تھا۔ اس لیے اکبر نے شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح گیلانی کو اُس کی خدمت میں بھیجا۔ دونوں نے پہونچکر عرض کی: "شاہا! کیا مضائقہ ہے اگر نقاب اُٹھا دو۔ ہم بھی تمہارا جمال دیکھ لیں" عارف حسینی نے نہ مانا اور کہا: "ہم فقیر لوگ ہیں۔ جانے دو۔ بہت مت ستاؤ!" حکیم ابوالفتح گیلانی شوخ و بیباک تھا۔ ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ نقاب کھینچ لے۔ شاہ عارف حسینی اس گستاخی پر جامہ سے باہر ہوگیا اور بولا: "میں مجذوم یا معیوب نہیں۔ لے دیکھ میرا منھ۔ مگر تجھے اسی دو ہفتے میں دیکھ لیگا!" یہ کہکر نقاب پھاڑ کر پھینک دیا۔ ابھی دو ہفتے بھی نہ گذرے تھے کہ کشمیر سے واپسی میں حکیم ابوالفتح گیلانی دردِ شکم اور اسہال میں گرفتار ہوگیا۔ اکبر کا ماتھا ٹھنکا۔ شاہ عارف حسینی کا غصہ دھیما کرنے کے لیے کچھ روپے بھیجے کہ تبت کے محتاجوں کو تقسیم فرمادیجیے۔ مگر یہ پیش بندی کچھ کام نہ آئی اور مرض اتنا بڑھا کہ حکیم ابوالفتح گیلانی نے راستہ ہی میں انتقال کیا۔ تاریخ وفات نکلی تو یہ نکلی کہ "خدایش سزا دہاد!" (۹۹۷ھ)

پس جب زیب النساء اور شاہ عارف حسینی کے خاک نشینوں کا دماغ یہ تھا کہ اپنے تماشائیوں کو مستحقِ دیدار نہ سمجھا تو پھر جو واقعی جانِ عالم ہے، بے نیاز ہے، یگانہ و یکتا ہے، جسم و مکان کے قیود سے مبرّا ہے، ہر اول سے اول ہے، ہر آخر سے آخر ہے، لم یلد و لم یولد ہے، خود آپ ہے۔ وہ ہم خاک نشینوں کو مستحقِ دیدار کیوں سمجھے؟ اور سمجھے بھی تو یہاں طاقتِ دیدار کس میں ہے؟ اسی لیے طالبِ دیدار کی تنبیہ کے لیے دنیا میں کورِ یا دِرزاد بھیج دیا گیا کیونکہ اُس کی زندگی کی پوری عمارت صرف ایمان بالغیب پر کھڑی ہے۔ اور یہ عمارت زندہ گواہ ہے اس بات کی کہ بغیر دیکھے ہوئے کسی شے کو کیونکر مانا جاسکتا ہے! اگر خدا کا ماننا اُس کے دیکھنے پر منحصر ہوتا تو دنیا میں جتنے اندھے ہیں اُن کو معافی کا پروانہ ملجاتا۔ وہ یہ منطق پیش کرتے کہ ساری دنیا خدا کو مان رہی ہے تو آنکھ سے دیکھ کر مانتی ہے میرے پاس جب آنکھ ہی نہیں تو ہم کیونکر دیکھیں اور کیونکر مانیں؟ اس منطقی عذر سے بچنے کے لیے اگر خدا ساری دنیا کو آنکھیں دیدیتا یعنی کسیکو اندھا نہ پیدا کرتا، اور خود اپنے کو فضائے آسمانی میں چاند سورج کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معلق کردیتا تاکہ ساری دنیا ہر وقت اُس کو دیکھتی رہے اور انکار کا موقع کسی کو نہ ہونے پائے تو بھی اُن تمام لوگوں کو معافی کا پروانہ ملجاتا جو کور مادر زاد نہ تھے

---

[1] دربار اکبری صفحہ ۶۶۱-۶۵۹

مگر بعد میں چوٹ کھا کر یا امراض کی وجہ سے یا بڑھاپے میں اندھے ہو گئے۔ ان میں سے ہر شخص یہ اعلان کر دیا کہ کل تک ہم خدا کو دیکھتے تھے اس لیے مانتے تھے، آج دیکھ نہیں سکتے اس لیے مان نہیں سکتے!

اب سوال یہ ہے کہ خدا کو ہم دیکھنا ہی چاہیں تو کس طرح دیکھیں؟ رنج راحت، سردی گرمی، نیکی بدی، وقت، روح، درد، غصہ، رحم، ستم۔ کی شکل و صورت آج تک کس نے دیکھی ہے؟ صرف آثار و نتائج سے پتا چلتا ہے کہ جو مچھلی جال میں تڑپ رہی ہے اُس میں ابھی روح ہے، اور جو تڑپ کر سرد ہو چکی اُس میں اب روح نہیں ہے۔ مگر روح بذاتِ خود کیا ہے یہ انسانی آنکھوں نے آج تک دیکھا نہیں جب روح کی لطافت و نزاکت یہ ہے تو روح کا پیدا کرنے والا اپنے کو دکھاتا تو کس طرح دکھاتا اور ہم دیکھتے تو کس طرح دیکھتے؟ کیا اُن آنکھوں سے جو شیر کے سامنے جھپک جاتی ہیں؟ کیا اُن آنکھوں سے جو مہرِ نیم روز کے سامنے خیرہ ہو جاتی ہیں؟ کیا اُن آنکھوں سے جو کوہ طور پر ایک نظر غلط انداز تک سے شکست کھا گئیں؟ یہی جواب ہے میرا تیرے اُس سوال کا کہ اگر خدا تھا تو بنی اسرائیل کے سامنے کیوں نہ آیا اور اب بھی ہے تو میرے سامنے کیوں نہیں آتا ؎

جو دکھلائیں تو غش ہوں سب۔ نہ دکھلائیں تو منکر ہوں

وہ یکتائی پہ اپنے حسن کی خود ہاتھ ملتے ہیں!

یہی وجہ ہے کہ آسمانی کتابوں نے اعلان کر دیا کہ چشمِ ظاہر خدا کو دیکھ نہیں سکتی، جس کسی کو دیکھنے کی تمنا ہو وہ چشمِ باطن سے اُس کو دیکھ لے۔ حسرتِ دیدن پوری کیونکر ہو جب آلۂ دیدن ہی ناقص ہے۔ اس لیے مجبوراً اس آلہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے آلہ سے کام لینا ہو گا۔ اور وہ دوسرا آلہ وہی چشم باطن و گوش باطن ہے جس کی طرف تمام الہامی کتابیں اشارہ کر رہی ہیں کہ کاتب کو دیکھنا ہو تو اُس کا مکتوب دیکھ لو مگر اس نابینائی کا کیا جواب ہے کہ دہریوں نے جب مکتوب دیکھا تو خبط ہو گئے اور جھنجلا کر چلا اٹھے کہ بھائیو! یہ مکتوب سراسر ہذیان ہے اور ایسے کاتب کو ماننا ہم لوگوں کی شان کے قطعی خلاف ہے۔ جب پوچھا کہ ہذیان کیونکر ہے تو کہنے لگے کہ کاتب نے زہرا بائی کو چشم غزالاں دیکر فاتح اور شیریں کو چشم کور دیکر مفتوح کیوں کیا؟ اور خانۂ کعبہ کو ابرہہ کے چنگل سے بچانے کے لیے اگر ابابیلوں کی فوج بھیجا کر دی تھا تو وہی فوج ابو طاہر کی سرکوبی کے لیے بھی کیوں نہ بھیجی گئی جب وہ بیت اللہ کو تاراج کر رہا تھا؟ مگر یاد رہے کہ سالانہ امتحان دینے والے طلبا بھی اردو کے پرچہ کو ہذیان سمجھ کر قہقہہ مارتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے حالانکہ وہ سوال ہذیان نہ تھا بلکہ غلط املا اور غلط ترتیب قصداً تھی! قصداً اس لیے کہ ممتحن کو اسی بات کا امتحان لینا تھا کہ ان غلطیوں کو درست کر کے کون کون صحیح جواب دیتا

ہے اور سوال کو ہذیان سمجھ کر کون کون اُٹھ جاتا ہے۔ لے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! یہ قفسِ دنیا بھی دار الامتحان ہے۔ اشرف المخلوقات کا امتحان ہو رہا ہے۔ اوراقِ زمین و آسمان اور اس مجموعۂ منتشرہ کے تمامی مکتوبات امتحان کے سوالات ہیں۔ اور ان سوالات میں بھی جا بجا املا کی غلطیاں اور الفاظ کی بے ترتیبی قصداً چھوڑ دی گئی ہیں۔ املا کی غلطیاں یہ ہیں کہ ممتحن نے کسی کو اندھا پیدا کیا، کسی کو گونگا بہرا، کسی کو اپاہج، کسی کو بونا، کسی کو دیوانہ، کسی کے ہاتھ گھٹنوں تک پہونچا دیئے، کسی کے ہونٹ الٹ دیئے، کسی کی ناک چپٹی کر دی، کسی کی گردن کوتاہ کر دی، اور کسی کے کان دراز کر دیئے!

عمر خیام کہتا ہے کہ ماہ صیام کے تمام ہونے پر جب اور لوگ عید کا چاند دیکھ رہے تھے اُس وقت ہم ایک کمہار کی دوکان پر کھڑے تھے۔ سامنے طرح طرح کے مٹی کے پیالے سجے ہوئے رکھے تھے۔ اتنے میں ایک پیالہ پوچھ بیٹھا کہ بھائیو! کوزہ گر کون ہے اور کوزہ گر کون ہے؟" دوسرے پیالہ نے جواب دیا کہ "خاموش! کیا تم سمجھتے ہو کہ کمہار نے کھیت کی روندی ہوئی مٹی کو ندیکر اپنی تمام صناعی اُس پر اسی لیے صرف کی ہے کہ اس عجیب و غریب پیالہ کو توڑ کر پھر کھیت کی مٹی کر دے؟ ہرگز نہیں!" تیسرے پیالہ نے کہا کہ لاریب! کوئی کیسا ہی شوریدہ مزاج ہو مگر یہ نہیں کریگا کہ جس جام سے بادۂ عشرت پی چکا ہو اُس جام کو دے پٹکے! اب کمہار پر اس بات کا شبہ کیوں ہے کہ جن پیالوں کو خود اپنا دل بہلانے کے لیے اس قدر شوق و محبت سے وہ بنا چکا اُنہیں پیالوں کو بعد میں جھنجلا کر وہ چکنا چور کر دیگا؟" یہ سنکر اور پیالے تو خاموش ہو گئے مگر ایک بدصورت پیالہ بول اٹھا کہ بھائیو! تم لوگ خوبصورت ہو۔ تمہارے گاہک ایک نہیں ایک لاکھ۔ مگر ہم ایسے بھونڈوں کو کون پوچھے؟ دنیا ہم پر ہنستی ہے۔ خدارا بتلاؤ کہ ہم کو بناتے وقت کیا کمہار کے ہاتھوں میں رعشہ تھا؟ اگر کمہار کا ہاتھ اُس وقت تھرایا نہیں تھا تو ہم بدصورت کیوں ہو گئے؟"

کمہار کی دوکان میں جو بحث چھڑی تھی اُس کا جواب امیر مینائی یوں دیتا ہے ؎

شبیہ نظر ہے کس کی؟ کہ کوئی صورت نہیں اُترتی! | مٹا دیئے صانعِ ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر!

یعنی روزِ آفرینش سے آج تک اتنی تصویریں جو خاک میں ملا دی گئیں اُس کا راز یہ ہے کہ مصور کی مرضی کے مطابق آج تک کوئی تصویر اتری ہی نہیں۔ مصورِ غریب ابھی مشق کر رہا ہے۔ ہر صبح قلم ہاتھ میں لیتا ہے اور ہر شام کاغذ کو جھنجلا کر پھاڑ دیتا ہے! عمر خیام کی یہ رندانہ جرأت کہ پیالہ جب ٹیڑھا کیڑا ہے تو ضرور کمہار کے ہاتھوں میں رعشہ تھا، اور امیر مینائی کی یہ شاعرانہ جودت کہ تصویریں جب ہر صبح شام

بھاڑ کر پھینکی جا رہی ہیں تو مصور و مصوّرا پنے فن میں ابھی کچا ہے، یہ دونوں شانِ ایزدی میں سراسر گستاخیاں ہیں۔ کیونکہ بھول چوک، ہاتھ کانپ جانا، خیال بٹ جانا، تصویر ٹھیک نہ اُترنا۔ ان الفاظ کا اطلاق صاحب کن فیکون کی ذات پر ہو ہی نہیں سکتا ؎۵

دہد نطفہ را صورتے چوں پری!

کہ کردہاست بر آب صورت گری!

پس تصویر اگر بھونڈی ہے تو قصداً بھونڈی ہے اور پیالہ اگر ٹیڑھا ہے تو قصداً ٹیڑھا ہے قصداً اس لیے کہ مصور اور کمہار کو امتحان لینا منظور ہے۔ زہرا بائی کی طرح شریفن کو بھی وہ چشم غزالاں دے سکتا تھا مگر قصداً نہیں دیا تاکہ اسی ذریعہ سے فرزندانِ آدم کا امتحان ہو جائے۔ چنانچہ اس امتحان کے لیے جب شریفن و زہرا بائی بیکوقت دنیا کے سامنے پیش ہوئیں تو ظاہر پرست دنیا نے با عصمت کو ٹھکرا دیا اور فاحشہ کو گلے لگایا۔ ہرن کے شکار کے پیچھے ایک اندھی کو کچل ڈالا۔ حالانکہ وہ اندھی فرزندانِ آدم کے رحم و کرم کی زیادہ مستحق تھی بہ نسبت اُس کے جو چشم غزالاں رکھتی تھی! شریفن کا کورمادرزاد ہونا دراصل املا کی ایک غلطی تھی جو امتحان لینے والے نے بالقصد چھوڑ دی تھی۔ اس غلط املا کو کسی نے درست نہ کیا۔ آنکھ والوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ شریفن کی طرح ہمیں اگر اندھے پیدا کیے جاتے تو اس وقت کیا ہوتا۔ اور یہ کہ آنکھیں جب ہم کو دی گئی ہیں تو اس شکرانۂ نعمت میں ہم کو دنیا کے تمام نابیناؤں پر لطف و کرم کرنا چاہیے یا نہیں۔ فرزندانِ آدم نے جب نابینا شریفن کو ٹھکرا دیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس خاص امتحان میں سب کے سب ناکامیاب ہوئے۔ مگر خود شریفن کے امتحان کی جب باری آئی یعنی اندھے ہونے کے جرم میں جب کسی نے اُس سے عقد نہ کیا تو اُس وقت اُس نے گداگری پر فاقہ کو ترجیح دی اور عصمت پر کبھی بٹہ نہ لگائی۔ ان اللہ مع الصابرین! اس لیے شریفن اس امتحان میں کامیاب رہی۔ اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! اس دارالامتحان میں جتنے اپاہج اندھے، لولے لنگڑے، دیوانے، اور بدصورت ہیں، سب کے سب امتحان کا ایک ذریعہ ہیں۔ جو اپاہج پیدا کیے گئے اُن کے صبر و تسلیم کا، اور جو تندرست و صاحب جمال پیدا کیے گئے اُن کے لطف و کرم اور انکسار کا بیکوقت امتحان ہو رہا ہے۔ اس امتحان کی سرگذشت شیراز کا ایک طالب علم یوں بیان کرتا ہے کہ:- "ہرگز از دورِ زماں نہ نالیدہ ام و روئے از گردشِ ایام

۵۔ گلستان باب سوم

درہم نکشیدہ مگر وقتیکہ پایم برہنہ بود و استطاعتِ پاپوشی نہ داشتم۔ بہ جامع کوفہ درآمدم دل تنگ۔ یکے را دیدم کہ پائے نہ داشت! سپاسِ نعمتِ حق بجامی آوردم و بر بے کفشی صبر کردم!"

ننگے پاؤں پھرنے کی شکایت کیوں کیجائے جب اوروں کے پاس پاؤں ہی نہیں۔ مگر اسی آزمائش میں فرزندانِ آدم کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں۔ آوردہ اندکہ فقیہے دختر داشت بہ غایت زشت رُو۔ بجائے زناں رسیدہ باوجود جہاز و نعمت کسے در مناکحتِ او رغبت نہ می کرد۔ فی الجملہ بہ حکم ضرورت باضریرے۔ (نابینائے) عقد نکاحش لبستند۔ وآوردہ اندکہ حکیمے درآں تاریخ از سراندیب آمدہ بود کہ دیدۂ نابینا را روشن ہی کرد۔ فقیہہ را گفتند چرا داماد خود را علاج نہ کنی؟ گفت۔ ترسم کہ بینا شود و دخترم را طلاق دہد!"

اُس فقیہہ کو تجربہ ہو چکا تھا کہ لڑکی سن بلوغ سے کوسوں آگے بڑھ گئی مگر بدصورتی کے جرم میں دنیا نے اُس کو پوچھا نہیں۔ خدا خدا کرکے ایک نابینا داماد ملا۔ تو وہ داماد کہاں کا ایسا خداترس و خداشناس تھا کہ آنکھیں پاکر اپنی منکوحہ سے وہی سلوک نہ کرتا جو آنکھ والی دنیا کر چکی تھی؟ اس لیے اندھے داماد کو زندگی بھر اندھا ہی رکھنا خوب تھا۔

الغرض جس طرح املا کی غلطیاں قصداً ہیں اُسی طرح الفاظ کی بے ترتیبی بھی قصداً ہے۔ ممتحن نے اپنے سوالات میں الفاظ کی بے ترتیبی یہ رکھی ہے کہ ابرہہ کی شکست کے لیے ابابیلیں بھیجیں مگر ابو طاہر کو سنگِ اسود اُکھاڑنے دیا۔ جنابِ عیسیٰؑ ابن مریم کو طمانچے کھانے کے لیے، خاتم النبیینؐ کو کانٹوں پر چلنے کے لیے، اور امام الصابرین حسینؑ ابن علیؑ کو ریگِ تفتہ پر ذبح ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ مگر فراعنۂ مصر کو صدیوں تک تختِ مصر کی حکمرانی نصیب فرمائی۔ ایک بچّہ کو بادشاہ کے گھر میں پیدا کیا، دوسرے کو فقیر کے گھر میں۔ ایک کو متقی کے گھر میں، دوسرے کو ٹھگ کے گھر میں۔ ایک کو طوفان کی گود سے بچا لیا اور دوسرے کو شفاء الملک کی گود سے چھین لیا ؎

حسن ز بصرہ، بلال از حبش، صہیب از روم،
ز خاکِ مکّہ ابوجہل! ایں چہ بوالعجبی است؟

مگر اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! بساطِ شطرنج پر مُہروں کی ترتیب صرف کھیل سے پہلے درست رہتی ہے! کھیلتے وقت وہ ترتیب کہاں؟ بازی جس وقت شروع ہو گئی اُس وقت پیادوں کی قطار اور شاہ کے مصاحبین یمین و یسار کی صف بندی ناممکن ہے! دیکھیے وقت فرزین کے داہنے کبھی پیادہ ہے اور کبھی رُخ۔ رُخ کے بائیں۔ کبھی فیل ہے اور کبھی اسپ۔ اور اسپ کبھی بازی کو زیر و زبر کر رہا ہے

سلہ گلستان بابِ دوم

اور کبھی خود عیسیٰ کی خدمت میں پیش ہو گیا۔ اسی طرح "انی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ" کے اعلان کے بعد جب بساطِ کونین پر مُہرے بچھنے شروع ہو گئے تو اب وہ اگلی ترتیب و صف بندی کیونکر قائم رہتی؟ شجرِ ممنوعہ والی جنّت میں ہرگز ایسا نہ تھا کہ ایک اپاہج و نابینا ہو اور دوسرا تندرست و توانا ایک گداگر فاقہ کش ہو اور دوسرا صاحب تاج و تخت، ایک اسماعیلؑ ذبیح ہو اور دوسرا بلا کو خاں اُس جنت میں جو تھے وہ ہم پایہ و ہم سنگ تھے!۔ مگر ہاں جس دن وہ جنّت چھن گئی اور مشیّت ایزدی نے آدمؑ و حوّا کو دارالامتحان میں بھیج دیا، اُسی دن سے وہ تمام بے ترتیبیاں قصداً شروع کر دی گئیں جو آزمائش کے لیے اشد ضروری بھی گئیں۔ اجتماعِ ضدّین اور بے ترتیبی ازمائش کے لیے اگر اشد ضروری نہیں ہے تو فرعون کی ڈاڑھی جب اُس کے بھتیجے (حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے نوچی تھی اور اس لیے پر اُس کو شبہ ہوا تھا کہ یہ بچہ کہیں وہی تو نہیں ہے جس کے بارے میں نجومیوں نے خبر دی تھی کہ میرا خاتمہ کر دے گا" اور اس لیے جب فرعون نے اُس بچہ کا امتحان لینا چاہا" تو اُس نے ایک تھالی میں آتشیں لعل اور دوسری تھالی میں جلتے ہوئے انگارے اُس بچہ کے سامنے کیوں رکھے تھے؟ یقیناً اسی آزمائش کے لیے رکھے تھے کہ یہ بچہ اگر فہمیدہ ہے تو انگاروں کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے گا اور اگر واقعی ناسمجھ ہے تو انگاروں کو ہاتھ میں لے لیگا۔ اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! پھر یہ کیا ہے کہ اس دارالامتحان میں اجتماعِ ضدّین کو دیکھ کر تو چیخ اُٹھتا ہے کہ اگر خدا ہوتا تو اس قسم کی بدنظمی کیوں ہونے پاتی؟ تیری یہ باتیں اُس ملک الشعرا[1] سے ملتی جلتی ہیں جو ایک مرتبہ خود مرضِ چشم میں گرفتار ہوا تو عرق کی چند بوتلیں لیکر دوکان کھول بیٹھا اور تختی لٹکا دی کہ

"یہاں آنکھوں کا علاج ہوتا ہے۔ قیمت فی شیشی ایک آنہ!"

اتفاقاً ایک پردیسی مریض اُس دواخانہ میں داخل ہوا تو ملک الشعرا کی اوبلی ہوئی خون کبوتر آنکھوں کو دیکھ کر اُس نے ایک شیشی عرق کے لیے دو آنہ پیسے دیے۔ ملک الشعرا نے جھنجلا کے کہا۔ کیا تجھکو معلوم نہیں ہے کہ ایک شیشی عرق کی قیمت صرف ایک آنہ ہے؟ خریدار نے جواب دیا کہ یہ بات مجھکو معلوم نہ تھی تو آخر میں نے دوگنی قیمت کیوں دی ہے! ملک الشعرا نے پوچھا یہ کیا ہے؟ خریدار نے جواب دیا کہ ایک آنہ زائد اس لیے ہے کہ حضور بھی اپنی دوکان سے ایک شیشی عرق خرید لیں اور

---

[1] اورینٹل بائیوگرافی مؤلفہ مسٹر بیل مطبوعہ لندن ایلن کمپنی [illegible] ملک الشعرا کا تخلص شیخی تھا۔ سلطان مراد اول (آل عثمان) کے دربار میں تھا۔

اپنی آنکھوں کا علاج کر لیں!" معلوم نہیں ملک الشعرا نے اُس ایک آنہ پیسہ سے اپنی آنکھوں کا علاج کیا یا نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ دہریوں نے آج تک اپنی آنکھوں کا علاج نہیں کیا۔ منطق یہ پیش ہوتی ہے کہ خدا ہوتا تو سامنے ضرور آتا۔ جب کہا گیا کہ سامنے آنے کی وہ چیز نہیں اور خود تم حضوری کے قابل نہیں، تو عذر یہ ہے کہ بغیر دیکھے ہوئے کیونکر مانیں جب کہا گیا کہ نقش یا دیکھ کر پہچان لو تو کہنے لگے کہ یہ نقش نقش برآب ہے، فرضی ہے، موہوم ہے، اُلٹا سیدھا ہے، بالکل بے ربط ہے! یہ کیا کہ حضرت عیسیٰ مُلاطم کھائیں اور فرعونی گُتے تختِ مصر پر لوٹیں؟

کلمہ گویوں کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی بے ترتیبی و بے ربطی قصداً ہے۔ کیونکہ انکارِ سجدہ کے بعد سے جب شیطان ہمیشہ اس دُھن میں ہے کہ آج رشوت دیکر فرزندانِ آدمؑ کو کسی طرح اپنا کر لو تاکہ کل یہ کہنے میں آئے کہ ایسے کم ظرفوں کو سجدہ نہ کرنا ہی خوب تھا، تو ایسی حالت میں مشیت ایزدی نے بھی یہی چاہا کہ فرزندانِ آدمؑ شیطان کی رشوت قبول کرنے نہ کرنے کا فیصلہ خود ہی کریں۔ نسلِ آدم اپنے اعمال و افعال میں خود مختار چھوڑ دی گئی ہے۔ پرندوں کی طرح ہم فضائے آسمانی میں اڑ نہیں سکتے مگر دارالامتحان کی سرزمین پر جس طرف چاہیں جا سکتے ہیں اور خانۂ دل میں جس قسم کے خیالات کو جگہ دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔ اگر نسلِ آدم اپنے افعال میں مجبور کی جاتی تو پھر میزانِ محشر اور تخلیقِ بہشت و دوزخ کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ مجبوروں سے بازپرس کرنا صریح ظلم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لڑکے جو سنِ تمیز کو نہ پہونچے ہوں یا وہ لوگ جو اپنے حواس میں نہ ہوں قیودِ مذہب سے آزاد کر دیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ہر شخص اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے کیونکہ ہر شخص آزاد ہے۔ اس دارالامتحان میں دیر و حرم کے دروازوں پر ایک ایک تختی لٹکی ہوئی ہے۔ دیر کی تختی پر بابِ جہنم کندہ ہے اور حرم کی تختی پر بابِ جنت کندہ ہے۔ راستہ چلنے والوں کے پاؤں بالکل آزاد کر دیے گئے ہیں۔ کسی کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ہیں۔ جس کو جس طرف جانا ہو جا سکتا ہے مگر کس طرف جانا چاہیے اور کس طرف نہ جانا چاہیے اس کا اشتہار ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ عرش نشیں کی سرکار سے ہزاروں قاصد زبانی اور تحریری پیام لا چکے ہیں۔ گلی گلی منادی کر دی گئی ہے۔ اس اعلان کے بعد بھی ابوجہل حرم کو چھوڑ کر دیر کی طرف جائے تو اس کی ذمہ داری خود ابوجہل پر ہے نہ کہ اللہ یا اُس کے رسولوں پر۔ دہریوں کا اعتراض ہے کہ ابوجہل اگر دیر کی طرف جا رہا تھا تو اللہ نے اپنے بندے کو شیطان کے پنجہ سے زبردستی چھڑا کیوں نہیں لیا۔ گلہ بان کیسا ہے کہ بکریاں شیر کی طرف جا رہی ہیں اور وہ لاٹھی کے زور سے بکریوں کو روکتا نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پیرِ نوحؑ کو اگر گود میں اٹھا کر زبردستی کشتی

نوحؑ پر ٹھلا دیا جاتا تو پھر امتحان امتحان نہیں باقی رہتا ہے۔ امتحان لینے والے کو یہی تو دیکھنا مقصود ہے کہ کون کون بہ رضا و رغبت اُس کی طرف آتا ہے اور کون کون دیدہ و دانستہ ابلیس کی طرف جاتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین! یہی وجہ تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اتمام حجت کے لیے تکرار آواز دی کہ بیٹا! میری کشتی پر اب بھی چلا آ۔ شیطان کی رشوت مت لے!" مگر بیٹے نے کشتی پر آنے سے جب قطعی انکار کر دیا تو حضرت نوح علیہ السلام نے بھی خموشی اختیار کر لی۔ حضرت نوحؑ اُس وقت سرکاری کام میں تھے۔ سرکار کا حکم یہی تھا کہ جو شخص اپنی خوشی سے تمہاری کشتی پر نہ آئے اُس کو زبردستی نہ بٹھلانا۔ اگر یہ حکم نہ دیا جاتا اور پسرِ نوحؑ کو شیطان کے پنجہ سے چھڑا کر جبریہ کشتی پر سوار کر دیا جاتا تو پھر عبدیت و بغاوت میں کوئی امتیاز باقی نہ رہتا، دودھ میں مکھی پڑ جاتی، اور معصومیت کو معصیت کے ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھنا پڑتا۔ امتحان کے وقت جبر و تشدد ہو نہیں سکتا اگر ہو سکتا تو شداد ابن عاد جس وقت معماروں سے اول اول باغ ارم کی فرمائش کر رہا تھا اُسی وقت یا تو اُس سے جبریہ توبہ کرائی جاتی یا فوراً روح قبض کر لی جاتی۔ مگر ان دونوں صورتوں میں امتحان ادھورا رہ جاتا۔ جبریہ توبہ سے امتحان کی اصل و غایت اس لیے فوت ہوتی کہ بہت دقت ہے اُس کتے میں جو اپنے مالک کی آہٹ پا کر خود بخود اُس کے پاس دوڑا جاتا ہے اور اُس بکری میں جو لاٹھی اور گلے کی رسّی کے زور سے قصّاب کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اور فوری قبض روح کا حکم دیا جاتا تو دنیا شکایت کرتی کہ باغ ارم کا محض خیال ظاہر کرنا اور چیز ہے باغ کا تعمیر کرنا اور چیز ہے۔ غریب شداد نے اپنے خیال پر ابھی عمل کہاں کیا تھا کہ اُس کی روح قبض کر لی گئی۔" یہی وجہ تھی کہ شداد نے اپنے کفرانِ نعمت کی، اور ہمارے اللہ نے اپنے امتحان کی، جب تکمیل نہ کر لی اُس وقت تک قبض روح کا حکم نہیں دیا گیا! ان دونوں باتوں کی تکمیل اُس وقت ہوئی جب خدائی کا دعویٰ کرنے والا شداد باغِ ارم کے دروازہ میں داخل ہو رہا تھا۔

اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! ہمارے خدا نے شداد کو طوفان کی گود سے بچا کر اور سیٹھ کروڑی چند کے نوزائیدہ کو شفاء الملک کی گود سے چھین کر دہریوں کے منہ پر دو طمانچے لگائے ہیں! کیا بات تھی کہ شفاء الملک کا علم سینہ و سفینہ، اور سیٹھ کا گنج فراواں جسم و روح میں وصل قائم نہ رکھ سکا؟ اور کیا بات تھی کہ سمندر کا تلاطم کشتی کو پاش پاش کرنے کے بعد اُس گوشت کے لوتھڑے کو نابید نہ کر سکا؟ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ! قادرِ مطلق کی قدرت کاملہ کا نظارہ جس کو کرنا ہو وہ اول کی بقا اور ثانی کی فنا دیکھ لے! باقی رہا یہ اعتراض کہ ہمارا اللہ جب رحیم ہے تو لاولد سیٹھ کے جگر میں ناسور کیوں

ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ گندم از گندم بروید جوز جو۔ سیٹھ کہتا ہے کہ میرے دھرم میں جیو مارنا منع ہے
یا پاپ ہے کہ کھٹمل بھی ہم کو کاٹے تو ہم اُس کو ماریں نہیں بلکہ اُٹھا کر باہر پھینک دیں کیونکہ اپنی زبان کے
چٹخارے کے لیے بے زبانوں کو ذبح کرنا خاص مسلمانوں کی شان ہے۔ مگر رحم دل سیٹھ کا دھرم دیکھنا
ہو تو اُس کا بہی کھاتہ دیکھو کہ کس طرح قتلِ عام ہو رہا ہے۔ دیکھو کہ سود در سود کی شمشیر بے نیام سے
کس طرح ہزاروں لاکھوں کے سر قلم ہو رہے ہیں۔ کس طرح یتیموں بیواؤں فاقہ کشوں اور دیگر قرض
خواہوں کی قبریں کھود کر رحم دل سیٹھ اون قبروں پر جا بجا مندر اور دھرم شالے بنوا رہا ہے۔ اور
دیکھو کہ خود اپنے گھر میں چراغ جلانے کے لیے کس طرح وہ ایک جانشین کی تمنا کر رہا ہے۔ ایسے
مکار قاتل کی سزا اگر یہ کی گئی کہ جانشین گود میں بٹھلا کر چھین لیا گیا تو اس میں ظلم کیا ہوا؟ سیٹھ نے خلق اللہ
پر ظلم کیا اور خلق اللہ کی آہ نے سیٹھ کی گود سے اُس کا بچہ چھنوا لیا کیونکہ اسی بچہ کے لیے سیٹھ دولت
جمع کر رہا تھا۔

ہمارے اللہ کا قانون عدل و انتقام دیکھنا ہو تو دیکھو کہ مزدوروں اور فاقہ کشوں کے جھونپڑوں
میں نعمت اولاد کی یہ فروانی ہے کہ وہاں پاؤں پھیلا کر کوئی سو نہیں سکتا۔ اور اغنیا اور بادشاہوں
کے محلات میں بچوں کا یہ قحط ہے کہ جانشینی کے لیے زیادہ تر غیروں کے بچے گود لیے جاتے ہیں۔
یہ کیوں؟ اس لیے کہ غربت و امارت امتحان کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ یعنی جو غریب ہے اُس کے
صبر کا، اور جو امیر ہے اُس کے شکر کا، بیک وقت امتحان ہو رہا ہے۔ قارون کو گنج بے پایاں دیا گیا
مگر اُس نے احسان فراموشی کی اور اس لیے شداد کی طرح وہ بھی سزایاب ہوا۔ خاتم النبیینؐ نے اپنی
غربت و فاقہ کشی پر الفقر فخری کا اعلان فرمایا اور اس لیے انعام میں "خیر البشر" کا تمغہ پایا۔ گندم از
گندم بروید جوز جو! شیطان کی رشوت قبول کرنے نہ کرنے کا فیصلہ ہر شخص خود کرتا ہے۔ لا اکراہ
فی الدین۔ ابلیس فراعنہ نے رشوت قبول کر لی۔ مگر جناب عیسیٰؑ نے خدا کی راہ میں خود تمانچے کھا کر
شیطان کو تمانچے لگائے ہیں۔

اگر خدا۔ جناب عیسیٰ کو تمانچے کھانے کے لیے، حضرت خیر البشر کو کانٹوں پر چلنے کے لیے،
اور جناب سید الشہدا کو ریگ تفتہ پر ذبح ہونے کے لیے چھوڑ نہ دیتا، تو اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے
والے! آج دنیا کو کس طرح پتہ چلتا کہ فدائیوں کی شان کیا ہے اور شیطان کی رشوت کس کس نے
نہیں قبول کی! اور ہمارا اللہ اپنے ہر فدائی کو حضرت ابراہیم کی طرح آتش نمرود سے، حضرت موسیٰؑ کی
طرح تعاقب فرعون سے، اور حضرت عیسیٰؑ کی طرح صلیب جہود سے، اگر بچا لیتا تو شیطان اُس وقت

یقینی ہے جو اُٹھا کہ واہ واہ تلوار کی جھنکار اور چیز ہے، تلوار کا گلے پر چلنا اور چیز ہے۔ ہر شخص جب حضرت اسماعیلؑ کی طرح چھری سے بچا لیا گیا تو فرزندانِ آدمؑ کے امتحان کی تکمیل کب اور کس پر ہو گی؟ لیس فدائیانِ سابق کے امتحانات کی تکمیل جب ساحلِ فرات و دربارِ یزید و قید خانہ دمشق میں ہو رہی تھی اُس وقت تکمیل میں نقص رہ جاتا اگر فوجِ الٰہی و فوجِ ابلیس کی باہمی زور آزمائیوں میں تائیدِ الٰہی آکر ذرا بھی دخل دیدیتی! اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تسلیم و رضا، نیاز و عبدیت، دعوئ الفقر فخری و طلاقِ دنیا، یکقلم ناممکن العمل ہو جاتے۔ دار الامتحان میں پھر جو آتا وہ بھی کہتا کہ علاء الدین کا چراغ ہم کو بھی مل جاتا تو ہم بھی رات بھر میں موتی محل تیار کر دیتے۔ مسلمانوں کے خدا نے بیشک اپنے ایک فدائی کو آتشِ نمرود سے بچا لیا اور دوسرے فدائی کو شمشیرِ شمر کا شکار ہونے دیا تاکہ فرزندانِ آدمؑ باغِ ابراہیم کی سند پاکر وعدۂ باغِ جنت کو مشکوک نہ سمجھیں، اور سر فروشیٔ حسین کی سند پاکر تسلیم و رضا کو ناممکن العمل نہ سمجھیں! مگر یاد رہے کہ ان زبردست اسناد و نظائر کے ہوتے جب یزید نے شیطان کی رشوت قبول کر لی، اور اصحابِ فیل کا انجام معلوم ہونے کے بعد بھی جب ابو طاہر نے بیت اللہ کو تاراج کیا، تو اللہ نے بھی یزید ابو طاہر کی جرأت و ہمت دیکھ کر دونوں کی رسی دراز اور کر دی۔ ورنہ نمرود والا مچھر اور اصحابِ فیل والی ابابیل ہمارے اللہ کے پاس ہر وقت موجود ہیں۔ خود ابلیس کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ بزمِ قدس سے نکالے جانے کے بعد وہ جہنم کی چار دیواری میں بالکل محبوس نہیں کر دیا گیا۔ بلکہ اُس کی رسی اتنی دراز کر دی گئی کہ بھیس بدل کر جنتِ آدمؑ میں وہ باریاب بھی ہوا، شجرِ ممنوعہ کا راز بھی فاش کر سکا، اور اس دار الامتحان میں آدمؑ و حوّاؑ کی تشریف آوری کے وقت سے اُس کو اسکی بھی اجازت ہے کہ جب تک امتحان ہوتا رہے، وہ نسلِ آدم کو رشوت دیکر یہ بھی مشاہدہ کرتا رہے کہ کون کتنے پانی میں ہے! اور کون کتنے پانی میں ہے؟ زلیخا کے دستِ ہوس و پائے ناز، چشمِ فسوں ساز و جبینِ نیاز، رسنِ شباب و کمندِ التجا کی متحدہ زور آزمائیاں ایک طرف۔ اور ایک پردیسی غلام کی "نہیں نہیں" دوسری طرف!

کیونکر اُس کی نگہِ ناز سے جیتا ہوگا   کہ زہر دے۔ اور یہ تاکید کہ پیتا ہوگا

کال جل کی کوٹھری سے کورا نکل آنا اور قعرِ دریا میں تختہ بند ہونے کے بعد بھی دامن تر نہ کرنا ہی تو ہے کہ ملوکیوں کی روحانی معراج تھی! اور اسی مشاہدہ نے آشکارا کر دیا کہ مٹی اشرف المخلوقات کیونکر گردانی گئی اور ملائکہ اُس کے آگے سجدہ کرنے پر کیوں مجبور کئے گئے۔

کون کتنے پانی میں ہے؟ سید سالار علی بیگ خاں لکھنوی، عباس ایرانی سے کہتا ہے کہ اس مرتبہ عشرۂ محرم میں ہم کو ایک یزید کی ضرورت ہے تم کو قبول ہو تو دو ہزار کی تھیلی حاضر ہے!

عباس ایرانی لکھنؤ کا ایک معمولی دوکان دار۔ دو ہزار کا نام سنکر فوراً راضی ہو جاتا ہے۔

عشرۂ محرم شروع ہوتا ہے۔ لکھنؤ کا عشرہ اور وہ بھی شجاع الدولہ کے زمانہ کا! لاکھوں کا مجمع ہے جس میں عباس ایرانی کے بیسیوں بھائی بند اور روز کے ملنے والے بھی موجود ہیں۔ اتنے میں عباس ایرانی یزید کے بھیس میں آتا ہے۔ اور سامان تو پہلے ہی سے موجود ہیں۔ عباس کے آتے ہی دربارِ دمشق کی سماں بندی شروع ہو جاتی ہے:۔ دیکھو دیکھو وہ ناقے آرہے ہیں۔ ناقوں پر فاقہ کش بیبیاں ہیں۔ سر ننگے ہیں۔ چادریں چھن چکی ہیں۔ ساحل فرات سے پیاسی آرہی ہیں۔ تلواروں کے سایہ میں ہیں۔ ناقہ کی مہار ایک بیمار کے ہاتھ میں ہے۔ بیمار پاپیادہ ہے۔ پاپیادہ ہے مگر پابزنجیر ہے۔ زنجیریں بھاری ہیں۔ جھنکار زنجیروں کی سنائی نہیں دیتی۔ قہقہوں کی آواز سب پر بالا ہے۔ آج یوم العید ہے۔ تماشائی گویا سیلِ دریا ہیں۔ بلند نیزوں پہ شہیدوں کے سر ہیں۔ ایک نیزہ پر شباب الجنت کا سر ہے۔ یہ سر تحفۃً دربار میں پیش ہوتا ہے۔ کس طرح پیش ہوتا ہے؟ ایک طشت میں! کہاں رکھا جاتا ہے؟ تاجدار دمشق کے پیروں کے پاس! تاجدار کیا کرتا ہے؟ بید کی چھڑی سے ٹھکراتا ہے! کس چیز کو ٹھکراتا ہے؟ لبہائے شہید کو! کیوں ٹھکراتا ہے؟ تاکہ قبر مدینہ کی دیواریں ہٹ جائیں! کیوں ہٹ جائیں؟ اس لیے کہ صاحب قبر مطہر انھیں لبوں کے بوسے لیا کرتا تھا!"......... اس سماں بندی کے بعد اب ایرانیوں کو تاب کہاں؟ ہر گوشہ سے "بکُش بکُش بزن بزن" کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ بے خودی میں سیکڑوں تلواریں بے نیام ہوتی ہیں بجلی کی طرح یزید کے سر پہ چمکتی ہیں۔ مصنوعی یزید خود اپنے بھائی بندوں کو شمشیر کف دیکھ کر چلاتا ہے "ہاں ہاں میں یزید نہیں۔ تم لوگ پاگل ہوئے میں عباس ہوں۔ عباس! شہید کربلا کا ماتم دار ہوں۔ دشمن نہیں۔ ٹھرو ٹھرو! میں عباس ہوں۔ اچھی طرح پہچان لو۔ یزید نہیں ہوں۔ عباس! عباس! عبا...... " مگر سیکڑوں تلواریں اُس عباسی یزید کو چشم زدن میں قیمہ کر ڈالتی ہیں۔ اللہ رے یزید کی نحوست! جس کسی نے ایک گھنٹے کے لیے بھی تفریحاً یزید بننا چاہا اُس کو مزہ مل گیا کہ اس نام کی برکت کیا ہے!

---

[1] سیر المتاخرین جلد چہارم صفحہ حاشیہ

کون کتنے پانی میں ہے ؟ دمشق کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے لیے نمازی آچکے ہیں۔ خلیفہ ولید[1] ثانی کی خدمت میں آدمی پر آدمی جاتے ہیں کہ یا امیرالمؤمنین! اب صرف آپ ہی کا انتظار ہے۔ امیرالمومنین جواب دیتے ہیں کہ چلو ہم فوراً آئے۔ خدا خدا کرکے امیرالمؤمنین مسجد میں تشریف لاتے ہیں۔ ہزاروں تہلدی صف بہ صف استادہ ہیں۔ امیرالمؤمنین امامت شروع کرتے ہیں۔ امامت ختم ہوتی ہے اب نمازی مصافحہ کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ امیرالمومنین کو کسی کی دل شکنی منظور نہیں۔ امیرالمومنین بھی اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھاتے ہیں —— آئین! یہ ہاتھ تو واقعی چومنے کے قابل ہیں! پنجۂ مرجان، مخملی ہتیلیاں، پتلی اونگلیاں، نازک کلائیاں صاف بتا رہی ہیں کہ یہ ہاتھ کسی زلیخا یا میش بائی کے ہاتھ ہیں! حضرت امیرالمومنین خود نیامدہ اندا ما بہلے عزت افزائی بیت اللہ وتفریح نماز گذاران، معشوقۂ خود را فرستادہ اند! نمازی اب سر پیٹ رہے ہیں مگر سر پیٹنے سے کیا ہوتا ہے۔ امیرالمومنین کی معشوقہ امیرالمومنین کے حکم سے امیرالمومنین کے بھیس میں آئی بھی اور نماز جمعہ پڑھا کر اب واپس بھی جا رہی ہے!

کون کتنے پانی میں ہے ؟ مہاراجہ شتاب[2] رائے، عظیم آباد کا نائب ناظم، ایک مرتبہ جنرل اسمتھ سے ملنے کے لیے باڑھ جاتا ہے۔ باڑھ میں ایک مندر کے پشت پر خیمہ زن ہوتا ہے۔ مندر کے چالاک برہمن وقت تاک کر خدمت میں کب حاضر ہوتے ہیں جب شتاب رائے جنرل اسمتھ سے ملنے کے لیے پالکی میں بیٹھ رہا ہے۔ شگون کا وقت ہے۔ برہمن دست بستہ عرض کرتے ہیں:- مہاراج! آنند آنند! جہاں پر تم کھڑے ہو وہ جگہ مہا پوتر ہے۔ خود مہادیو جی کے چرن اس کو چھو چکے ہیں۔ آج پورنیما ہے۔ پجاریوں پر بھی مہاراج کی دیا ہو!" شتاب رائے جواب دیتا ہے، "یہ باتیں تم اس سے کرنا جو یہاں تیرتھ کو آیا ہو یا مندر میں درشن کا بھوکا ہو ہم کو تم سے یا تمہارے مندر سے کیا کام؟" یہ کہکر پالکی میں بیٹھ جاتا ہے اور کسی کو ایک کوڑی نہیں دیتا!

مہاراجہ شتاب رائے جب کوئی نیا محل تعمیر کرتا ہے تو بھائی بند دوست احباب تقاضہ کرتے ہیں کہ برہمنوں کو بھوج دیکر محل کی نیو اور اپنا دھرم مضبوط کرلو تو شتاب رائے جواب دیتا ہے کہ گرجان طلبی مضائقہ نیست مگر اپنے مکان کو ہم نجس نہیں کر سکتے۔ برہمنوں کو بھوج دینا ایسا ہی فرض ہے تو گنگا کا کنارا موجود ہے۔ روپے ہم سے لیلو۔" مہاراجہ شتاب رائے کا سخن تکیہ اٹھتے بیٹھتے "واللہ باللہ" ہے۔

---

[1] ہسٹری آف سرسین مصنفہ جسٹس سید امیر علی ص ۱۹۶ [2] سیر المتاخرین جلد سوم ص ۱۱۲-۲

ہر سال مُشکلکشا کا دسترخوان چُنتا ہے۔ ماہِ صیام میں شبِ ضربت آتی ہے تو کھیر اور مٹھائیوں پر فاتحہ دیکر تمام شہر میں تقسیم کرتا ہے۔ اور اپنے دونوں لڑکوں کا ختنہ کراتا ہے۔ اس کھلم کھلا بغاوت پر خاندان بھر میں کہرام مچتا ہے۔ تالیفِ قلب کے نسخے تجویز ہوتے ہیں۔ مرلی دھر، رائے قتل داس اور سردسنگھ، احباب خاص اصرار کرتے ہیں کہ شہر میں ایک برہمن آیا ہوا ہے۔ رشی ہے۔ مہاتما ہے۔ درشن کے قابل ہے۔ تم بھی چلو۔ شتاب رائے مجبوراً ساتھ ہو لیتا ہے۔ گرگِ باراں دیدہ برہمن مہاراج شتاب رائے کو دیکھ کر اپنا وار یوں شروع کرتا ہے:۔ "مہاراج! ہم نے تمہارا جنم پترا دیکھ کر ایک بچار کیا ہے۔ نام بہت ہی سُندر ہے۔ رات دن تم اُسی نام کا مالا جپا کرو۔" شتاب رائے شیشہ کا جواب پتھر سے دیتا ہے:۔ "جوگی مہاراج! اللہ کے ایک ہزار ایک نام۔ اُنھیں ناموں میں سے ایک نام اپنے لیے ہم پہلے ہی بچار چکے ہیں!" برہمن گھبرا کر پوچھتا ہے کہ آخر وہ کون سا نام ہے۔ شتاب رائے کہتا ہے کہ وہ نام بتلانے کا نہیں ہے! برہمن کہتا ہے کہ جب بتانے کا نہیں ہے تو جپنے کا بھی نہیں ہے۔ شتاب رائے کہتا ہے کہ اچھا سنو! وہ نام "رحیم" ہے۔ نبض شناس برہمن قہقہہ مار کر کہتا ہے:۔ "مہاراج! رام اور رحیم تو ایک ہی پرماتما کے دو نام ہیں!" شتاب رائے ہیرے کو ہیرے سے کاٹتا ہے:۔ "گروجی مہاراج! اب آگے نہ بڑھنا! رام کو رحیم سے کیا نسبت؟ رام کا نام سُنتے ہی دسرتھ یاد آجاتا ہے۔ رام بیٹا اور دسرتھ باپ! مگر اللہ کے نام میں جا لڑ پھندا کچھ بھی نہیں۔ اس نام میں کسی رشتے ناتے کی بو تک نہیں!"

کون کتنے پانی میں ہے؟ پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزارِ نسیم پڑھکر برہمن لوگ مارے غصہ کے بھوت ہو رہے ہیں۔ پنڈت سے پوچھتے ہیں:۔ "ایں! خیر تو ہے! تیرے منہ سے حمد، نعت اور منقبت، کیسی؟ اللہ رسول پنجتن کر رشتہ جوڑنے کے کیا معنی؟" پنڈت دیا شنکر آخر شاعر ہے۔ فی البدیہہ کہتا ہے:۔ "مہاراج! اس میں جین بہ جبیں ہونے کی کون بات ہے؟ میری مثنوی کا مطلع پھر پڑھیے۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری!

یعنی اپنے "ہیرو" کا نام ہم نے پہلے سے لیا تھا تب "حمد باری" شروع کی تھی!" برہمنوں کے ماتھے پر اب ایک شکن نہیں۔ سب خوش خوش گھر واپس جا رہے ہیں۔ مگر پنڈت دیا شنکر قلم ہاتھ میں لے کر اس کو یوں مخاطب کرتا ہے:۔ "ارے سُنتا ہے؟ یہ رسائی فکر اور دگرگوں علاجی

ثمرہ ہے حمد باری کا! اللہ کی حمد نہ کیے ہوتے تو اس وقت یقینی شہ مات تھی!"

کون کتنے پانی میں ہے؟ بکسر کی لڑائی کو دس برس ہو چکے ہیں۔ شجاع الدولہ تختِ اودھ کی بہاریں دیکھ رہا ہے یکایک قریب ناف ایک پھوڑا نمودار ہوتا ہے۔ پھوڑا کیا ہے ایک چھوٹا تربزہ پھوڑا پھوٹتا ہے۔ اطبا کہتے ہیں کہ یہ لاعلاج ہے۔ آخر یہ پھوڑا ہوا کیونکر؟ چشم دید گواہ کہتے ہیں کہ حافظ رحمت خاں سپہ سالار روہیلکھنڈ جب مارا گیا تو شجاع الدولہ نے اُس کی بی بی بچوں کو اپنی حرم سرا میں نظر بند کیا۔ مرحوم کی ایک لڑکی تھی۔ دوشیزہ، سترہ کا سن، کشیدہ قامت، صاحبِ جمال، باعصمت! شجاع الدولہ نے ہم آغوشی چاہی ناجائز وجبریہ ہم آغوشی۔ لڑکی جب خلوت میں طلب ہونے لگی تو ماں نے بلا کر کہا ——— بیٹی! یاد رکھنا کہ تیری رگوں میں سپہ سالار حافظ رحمت کا خون ہے! تو اس لیے پیدا نہیں ہوئی تھی کہ کسی کی داشتہ بنکر رہے۔ بالخصوص اُس کی داشتہ جو تیرے باپ کا قاتل ہے!" دوشیزہ نے اپنی زلفوں میں ایک زہرآلود چاقو چھپا لیا اور خلوت میں حاضر ہوئی شجاع الدولہ نے بسترِ عیش پر شجرِ ممنوعہ سے پھل توڑا مگر اُسی عالم میں دوشیزہ کے زہرآلود چاقو نے عیش پسند کو غم کا سبق پڑھایا۔ عیش پسند نے اُسی کرب و اذیت میں خوجہ سراؤں کو اشارہ کیا تین خوجہ سراؤں نے دوشیزہ کو خنجر سے فوراً ٹھنڈا کر دیا۔ آیندہ کے خدشوں سے بچنے کے لیے دو ہزار بیگمیں شاہی محل سے شہر بدر کی گئیں۔ ان دو ہزار میں چار سو ایسی تھیں جنھیں سات برس کی مدت میں یعنی دو ہزار پانچ سو چھپن راتوں میں صرف دو بار شجاع الدولہ کی ہم بستری نصیب ہوئی تھی! الغرض چشم دید گواہ کہتے ہیں کہ یہ پھوڑا اُسی زہرآلود چاقو کی یادگار ہے۔ مگر اور لوگ کہتے ہیں کہ نہیں۔ آج سے ایک برس پہلے ایسا ہی زخم پُشت یا شانہ پر نمودار ہوا تھا۔ شجاع الدولہ نے پانچ لاکھ کی نذر مانی تھی۔ اور جب صحت یاب ہوا تھا تو نذر اُتار بھی دی تھی۔ شجاع الدولہ پر کیا ہے اُس کے باپ اور نانا کو بھی یہی عارضہ تھا اور اسی میں دونوں فوت بھی ہوئے۔ پس یہ پھوڑا کسی زہرآلود چاقو کا اثر نہیں ہے بلکہ باپ اور نانا سے ترکہ میں ملا ہے ——— کوچہ و بازار میں اس طرح کی روایتیں مشہور ہو رہی ہیں اور اُس طرف شاہی محل میں اندھیر ہو رہا ہے۔ پھوڑا اپنے شباب پر ہے۔ اس شباب کو زوال نہیں۔ شجاع الدولہ پریشان ہو کر فیض آباد جاتا ہے۔ وہاں کی آب و ہوا سے فیض ثابت ہوتی ہے۔ یہاں بھی وہی پھوڑا ہے اور وہی جاں کندنی ہے۔ ۲۲ ذیقعدہ روز پنجشنبہ ۱۱۸۸ھ ہجری اس

سیر المتاخرین جلد چہارم ص۲۹۔ نیز حاشیہ ص۲۸

جاں کندنی سے نجات ہوتی ہے۔

کون کتنے پانی میں ہے؟ شجاع الدولہ کو غسلِ میت دیا جا رہا ہے۔ غسل وکفن ہو چکا۔ اب جنازہ محل کے باہر آ گیا ہے۔ جنازہ کہاں جا رہا ہے؟ گلاب باغ جا رہا ہے۔ یہ باغ کہاں ہے؟ چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ جنازہ کے ساتھ کون کون ہیں؟ مرزا علی خاں اور سالار جنگ ہیں، وزرائے سلطنت اور مشاہیرِ فوج ہیں۔ شاہی خاندان اور متوسلین خانداں ہیں۔ غرض کہ فیض آباد کی ٹھیکری ہے۔ ہاتھی گھوڑوں کی قطار پیچھے ہے۔ کیا یہ سب لوگ چار میل تک پیدل ہی جائیں گے؟ دو میل کی مسافت طے ہو چکی مگر دیکھو تو شانہ بدلنے کے لیے لوگ اب بھی ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ ایں! یہ ماتم داروں کی صف چیرتے ہوئے کون بدتمیز چلے آ رہے ہیں؟ یہ بدتمیز قاصد ہیں مرزا امانی کے! مرزا امانی کون؟ مرزا امانی عرف آصف الدولہ جس کا جنازہ جا رہا ہے اسی کا سپوت بیٹا۔ کیا آصف الدولہ اپنے باپ کے جنازہ کے ساتھ نہیں ہے؟ ساتھ ہوتا تو ہرکارے کیوں بھیجتا آخر ساتھ کیوں نہیں ہے؟ اپنی سعادت مندی کا ثبوت دے رہا ہے۔ ہرکارے کیوں بھیجے ہیں؟ مرزا علی خاں اور سالار جنگ کو پیام آیا ہے کہ جنازہ چھوڑ کر میرے پاس فوراً چلے آئیے۔ یہ دونوں آصف الدولہ کے کون ہیں؟ سگے ماموں ہیں۔ ماموں ہرکاروں ہرکاروں سے کیا کہہ رہے ہیں؟ کہہ رہے ہیں کہ جنازہ جب تک گلاب باغ نہ پہنچ لے ہم کیونکر چھوڑیں اور چھوڑیں بھی تو خلق اللہ کیا کہے گی۔ — ایں! اب یہ دوسرے ہرکارے صفِ ماتم کو چیرتے ہوئے کیوں آئے ہیں؟ یہ حکم لیکر آئے ہیں کہ دونوں ماموں اگر یوں نہ آئیں تو پکڑ کر لے آؤ۔ تب؟ دونوں ماموں مجبوراً جنازہ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں اور خلق اللہ انگشت بہ دنداں ہے۔ ماموں بھانجے میں کیا گفتگو ہو رہی ہے؟ بھانجا اپنے دونوں ماموں سے کہہ رہا ہے کہ باپ کا غم ہوتا رہے گا، پہلے آپ لوگ ہم کو جانشین قرار دے لیجیے۔ پھر؟ پھر یہی کہ دونوں ماموں کانوں پر ہاتھ رکھ رہے ہیں کہ اتنی عجلت کیوں ہے۔ مگر بھانجا کہتا ہے کہ واہ! نمازِ میت کے بعد ہی گلاب باغ میں اگر میرا چھوٹا بھائی مرزا سعادت علی جانشین قرار دیدیا گیا تو پھر ہم کیا کر لیں گے۔ تب؟ تب یہی کہ مرزا علی خاں، سالار جنگ اور کرنل کلیس مجبوراً آصف الدولہ کے سر پر شاہی عمامہ باندھ رہے ہیں۔ فوجی باجا تخت نشینی کا اعلان کر رہا ہے۔ جنازے کے ساتھ جتنے مشاہیر تھے سب دربار میں بلا لیے گئے[1]

---

[1] سیر المتاخرین جلد چہارم ص۱۰۱ ‎‎‎

ہیں۔ صرف غربا و مساکین نماز میت کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ اس طرف سپوت بیٹا مشاہیر سلطنت کی نذریں لیے رہا ہے اور اُس طرف باپ کی لاش پیوند خاک ہو رہی ہے! مرزا امانی عرف آصف الدولہ تخت اودھ پر بیٹھ کر کیا کرتا ہے؟ سب سے پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنے پالکی بردار کہار کو راجہ کا خطاب دیکر امورِ سلطنت میں شریک کرتا ہے!

کون کتنے پانی میں ہے؟ جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی طرف سے میر مدن دعوا کر رہا ہے استنے میں ایک توپ کا گولہ آتا ہے اور میر مدن کی ران غائب! میر مدن کا انجام دیکھ کر سراج الدولہ اپنی ٹوپی میر جعفر خاں سپہ سالار کے پاؤں پر رکھتا ہے کہ اب میری جان اور آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میر جعفر خاں کہتا ہے کہ اب اسوقت تو شام ہوئی کل صبح کو دیکھا جائیگا۔ اب یہی گفتگو ہو رہی ہے کہ اتنے میں موہن لال، سراج الدولہ کی طرف سے، آگے بڑھ گیا۔ اُس کو بڑھتا دیکھ کر میر جعفر خاں حکم دیتا ہے کہ "موہن لال! بھاگ آؤ!" سراج الدولہ میر جعفر کا منھ تکتا ہے۔ میر جعفر خاں جواب دیتا ہے کہ حضور! میری تو یہی رائے ہے!" موہن لال کو بھاگتا دیکھ کر فوج کے پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں۔

سراج الدولہ اب میدان میں بے یار و غمگسار اکیلا کھڑا ہے۔ مجبوراً میدان چھوڑتا ہے۔ رات بھر چلتا ہے۔ آٹھ بجے صبح کو منصور گنج محل میں پہونچتا ہے۔ افسران فوج کو حکم دیتا ہے کہ کم سے کم میری ذاتی حفاظت کے لیے محل میں پہرہ کا سامان کر دو۔ ایک سپاہی نہیں آتا۔ اس عالم میں تین بجے رات کو محل سے پوشیدہ فرار ہوتا ہے۔ بھگوان گولہ سے ہوتا ہوا ناؤ پر راج محل کے دوسرے ساحل پر پہونچتا ہے۔ صرف ایک گھنٹہ کے لیے اترا ہے کہ کھچڑی پکا کر تین دن کا فاقہ توڑے۔ تین برس کی بچی جو ساتھ ہے وہ بھی فاقہ سے ہے۔ سراج الدولہ چولھا سلگانے بیٹھتا ہے! قریب ہی شاہ دانا کا جھونپڑا ہے شاہ دانا فاقہ کشوں کے پاس آتا ہے۔ دیکھکر پہچانتا ہے۔ کہتا ہے کہ حضور فقیروں کا نان و نمک قبول ہو۔ نان و نمک حاضر کرنے کے لیے شاہ دانا اپنے جھونپڑے میں واپس جاتا ہے۔ وہاں پہونچکر میر قاسم اور میر داؤد کو خفیہ خبر بھیجتا ہے کہ —— جلد آؤ! تمہارا شکار اسوقت میرے دام میں ہے! شکاری پہنچتے ہیں۔ سراج الدولہ[1] ہوکر مرشدآباد آتا ہے۔ دوپہر کا وقت ہے میر جعفر خاں اب شاہ بنگالہ ہے۔ بھانگ کے نشہ میں بے ہوش پڑا ہے اُس کا بیٹا میرن حکم دیتا ہے کہ سراج الدولہ کو بغل کے کمرے میں بند کر دو۔ پھر میرن اپنے مصاحبین خاص میں سے محمدی بیگ کو قیدی کے کمرہ میں بھیجتا ہے۔ جلاد کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر سراج الدولہ عرض کرتا ہے کہ وضو کے لیے تھوڑا سا پانی دیدو کہ "نماز توبہ" پڑھ لیں۔ محمدی بیگ توبہ کا دشمن ہے اس لیے پانی دینے سے انکار

---

[1] سیر المتاخرین

کرتا ہے۔ سراج الدولہ چلاتا ہے — " پانی! پانی! ایک گھونٹ پانی خدا کی راہ میں! آخر اُس کی پیاس بجھاتا ہے
مگر صرف آبِ شمشیر سے! سراج الدولہ اوسی جاں کندنی میں در و دیوار سے کہتا ہے! - بس بس! ہم چلے! الفراق
اے دنیا الفراق! لو حسین قلی خاں کا خون بیباق!" جلاد اپنی شمشیر خون آشام سے لاش کو پارہ پارہ کرتا ہے
میرن اُس نعشِ صدپارہ کو ہاتھی پر رکھوا کر مرشد آباد کے بازاروں میں گشت کے لیے بھیجتا ہے۔ فیلبان اپنی
کسی ضرورت سے ہاتھی کو اتفاقیہ بازار میں ٹھہراتا ہے۔ مگر ہاتھی جس دروازہ کے سامنے اُس وقت رکتا ہے وہ
خدا کی شان کہ حسین قلی خاں کا دروازہ ہے! ہاتھی رُکتا ہے اور نعشِ صدپارہ سے خون کے چند قطرے
ٹھیک اُس جگہ پر گرتے ہیں جہاں آج سے دو برس پہلے شام کے وقت سراج الدولہ نے حسین قلی خاں کا
خون بہایا تھا! بیشک حسین قلی خاں کا خون آج بیباق ہوگیا! ہاتھی اب آگے بڑھتا ہے۔ گشت کرتا ہوا اُس محل
سے گذرتا ہے۔ جہاں سراج الدولہ کی ماں آمنہ بیگم ہے۔ کسی نے آمنہ بیگم سے کہدیا کہ — " بی بی! آپکو بیٹے کی
کچھ خبر بھی ہے؟ جوان بیٹے کی لاش گشت کے لیے جارہی ہے!" آمنہ بیگم چیخ مارتی ہوئی ننگے پاؤں ننگے سر،
زنانخانہ سے بازار میں دوڑی آتی ہے بیٹے کی لاش پر گر کر بلائیں لیتی ہے۔ آمنہ بیگم کی فغاں و سینہ کوبی سے بازار
میں زلزلہ آگیا۔ خلقِ خدا ماتم کر رہی ہے۔ شقی القلب خادم حسین خاں اپنی چھت سے یہ تماشہ دیکھ رہا ہے! اپنے عصا
برداروں کو دوڑاتا ہے۔ عصا بردار بازار میں آتے ہیں اور آمنہ بیگم کو تھپڑ گھونسہ اور لاٹھیوں سے مار کر بیٹے
کی لاش سے چھڑاتے ہیں! اب ہاتھی آگے بڑھتا ہے۔ اِدھر نعشِ صدپارہ گشت ہو رہی ہے اور اُدھر میر جعفر خاں
بھانگ کے نشہ سے ہوش میں آتا ہے۔ خبر ہوتی ہے کہ سراج الدولہ قید ہو کر آگیا۔ میرن کو رقعہ لکھتا ہے کہ — "بیٹا!
قیدی بھاگنے نہ پائے! خبردار!" میرن حاملِ رقعہ سے کہتا ہے کہ — " اباجان سے کہدیجیو کہ آپ کا بیٹا آپ
سے زیادہ تیز ہے!"

کون کتنے پانی میں ہے؟ سراج الدولہ کے بعد اُس کے چھوٹے بھائی مرزا مہدی[1] کی باری آتی ہے
پندرہ برس کا لڑکا۔ نہایت حسین۔ دو تختوں میں داب کر مار ڈالا جاتا ہے۔ اس کے بعد آمنہ بیگم اپنی بڑی بہن
گھسیٹی بی بی کے ساتھ قید کر کے ڈھاکہ بھیجی جاتی ہے۔ جسارت خاں گورنر ڈھاکہ کو میرن خط بھیجتا ہے کہ ان دونوں
کو وہیں دریا میں ڈبا دو۔ جسارت خاں جواب دیتا ہے کہ گورنری کو سات سلام مگر یہ امر عظیم ہم سے نہیں ہوگا
تب میرن اُس کو لکھتا ہے کہ اچھا حاملِ رقعہ کے ساتھ اُن دونوں کو میرے پاس مرشد آباد بھیج دو۔ جسارت خاں
دونوں کو حاملِ رقعہ کے ساتھ کر دیتا ہے۔ میرن کا قاصد دونوں کے ساتھ ناؤ پر سوار ہوتا ہے۔ جب ناؤ ایک سنسان
مقام پر پہونچتی ہے تو قاصد کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں کیونکہ اب اُس کو میرن کے پوشیدہ حکم کو بجالانا ہے۔ کہتا ہے

---

[1] سیر المتاخرین صفحہ ۲ جلد دوم   [2] سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۳۶۹-۳۷۱

کربیٹھو۔! آج تمام دن تم لوگوں نے کچھ کھایا نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ فاقہ شکنی کرلو اور اُجلے کپڑے بدل لو کیونکہ یہ آخری سفر ہے!" آخری سفر کا نام سنکر گھسیٹی بی بی اور آمنہ بیگم تھرا جاتی ہیں۔ پھر چھوٹی بہن سنبھل کر بڑی بہن سے کہتی ہے کہ۔" سنو جی! موت سے ڈرنا کیا؟ جو آتا ہے مرنے کے لیے آتا ہے۔ عید مناؤ کہ اس خونِ ناحق سے ہم دونوں کے گناہوں کی گٹھری خود بخود میرن کے سر پر چلی جائیگی! موت کی موت، کفّارہ کا کفارہ اور انتقام کا انتقام ہے! ایسی موت تو قسمتوں سے ملتی ہے!" یہ کہکر دونوں بہنیں وضو کرتی ہیں، کفن کی جگہ اُجلے کپڑے پہنتی ہیں۔ خاکِ شفا ملتی ہیں۔ دعائے توبہ پڑھتی ہیں پھر میرن کے قاصد سے کہتی ہیں کہ۔" ہم دونوں اب تیار ہیں۔ بھیا! تم اپنا کام کرلو!" قاصد جھجکتا ہے۔ یہ کہکر دونوں بہنیں ہاتھ پھیلا کر بہ آوازِ بلند دعا مانگتی ہیں کہ۔" خدایا! اپنے گنہگار کنیزوں کی آواز سن! جس رکابی میں میرن آج کھا رہا ہے وہ رکابی تیری کنیزوں کی ہے۔ کنیزیں گنہگار ہیں تو تیری نہ کہ میرن کی! محسن کُش میرن کی سرکوبی کے لیے اپنے قہر کی بجلی بھیج اور اپنی کنیزوں کا انتقام لے!" اس مناجات و فریاد کے بعد دونوں بہنیں قبلہ رو ہوتی ہیں۔ کلمہ پڑھتی ہیں۔ خاکِ شفا کو بوسہ دیتی ہیں۔ اور ایک کا ہاتھ تھام کر بیکوقت دریا میں کود پڑتی ہیں!

کون کتنے پانی میں ہے؟ جس شب کو دریائی موجوں نے گھسیٹی بی بی اور آمنہ بیگم کو اپنے آغوش میں لیا اُسی شب کو تقریباً تین سو کوس کے فاصلہ پر میرن اپنے مصاحبین خاص کے ساتھ دریا کے کنارے خیمہ زن ہے شروع برسات ہے۔ بادل کی گرج اور موسلہ دھار پانی سے عاجز ہو کر گیارہ بجے رات کو اپنے بڑے خیمہ سے ایک مختصر دلیر خانے خیمہ میں پناہ کے لیے آتا ہے۔ اس چھوٹے خیمہ میں آکر میرن ابھی پلنگ پر لیٹ ہی رہا ہے۔ کہ اتنے میں بجلی خیمہ کو چیرتی ہوئی آتی ہے اور اُس کے سر پر گرتی ہے! اب دیکھا جاتا ہے تو پلنگ کے سرہانے پٹّی جل کر راکھ ہوگئی ہے مگر خود میرن کا جسم راکھ نہیں ہے۔ بلکہ سر میں چھ سوراخ اور پیٹھ پر چھ سات کوڑوں کے نشان ہیں!! اخفائے موت کے لیے یہ لاش صبح کو ہاتھی پر گشت کرائی جاتی ہے۔ وہ اس طور پر کہ دونوں پاؤں ہودج سے باہر لٹک رہے ہیں تا کہ دیکھنے والے سمجھیں کہ میرن بیمار ہے اور سو رہا ہے مگر دیکھنے والے فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ بیمار نہیں بلکہ مردہ ہے۔ اور یہ مردہ اُسی کا ہے جس نے آج سے تین برس پہلے سراج الدولہ کی نعش صد پارہ ہاتھی پر گشت کرائی تھی۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے!!

کون کتنے پانی میں ہے۔؟ میرن کا باپ میر جعفر خاں شاہ بنگالہ ۷۴-۷۵ برس کا بڈھا بستر علالت پر پڑا ہے۔ جسم میں دم ہے۔ شعبان کی چودھویں سہ شنبہ کا دن سنہ ۱۱۷۴ ہجری ہے۔ آثار موت نمایاں ہیں۔

---

[1] سیر المتاخرین جلد دوم ص ۳۶۵-۳۶۶ و ۳۷۱-۳۷۳

مہاراجہ نند کمار عیادت کو آیا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ نواح مرشد آباد میں "کرت کونا مندر" ہے اُس مندر میں دیوتاؤں پر جو جل[1] چڑھایا جاتا ہے۔ آبِ حیات ہے۔ میر جعفر خاں حکم دیتا ہے کہ دیوتاؤں کا اُلش فوراً حاضر کیا جائے۔ مندر سے آبِ حیات آتا ہے۔ دیوتاؤں کا پانی میر جعفر خاں کی آخری پیاس بجھاتا ہے۔ آخری پیاس اس لیے کہ یہ آبِ حیات حلق سے اترتا ہے اور میر جعفر دریائے حمات میں غرق ہو جاتا ہے!!

اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے باشیطان کے ریشہ دوانیوں کا اندازہ کرنا ہو تو ان اسناد و نظائر کو دیکھ لے۔ قیافہ شناس ابلیس صورت دیکھ کر سمجھ جاتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے اور پھر جس کو جیسا پاتا ہے ویسی ہی رشوت دیتا ہے۔ کسی سے کہتا ہے کہ تف ہے تمہاری صید افگنی پر کہ حافظ رحمت کی پارسا لڑکی اب تک شکار نہیں ہوئی۔ کسی سے کہتا ہے کہ شاید تم نے مکڑیوں کا جال کبھی دیکھا نہیں کہ مکڑیاں گھر بیٹھے کس طرح بادشاہت کرتی ہیں۔ پس جنازہ کے ساتھ گلاب باغ جانے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ جنازہ کے ساتھ جتنے لوگ ہیں اُنھیں کو اپنے پاس پکڑوا بلاؤ۔ کسی سے کہتا ہے کہ خضر و سکندر کو شرمانا ہو تو کرت کونا مندر سے دیوتاؤں کا اُلش منگوا کر پی لو۔ کسی سے کہتا ہے کہ بہشت شداد کی تمنا ہو تو علی وردی شاہ بنگالہ کی صاحبزادیوں اور نواسوں کے سینہ پر چڑھ کے بہشت کا دروازہ کھول لو۔ کسی سے کہتا ہے کہ امیر المومنین کسی کا غلام نہیں ہے کہ نماز جمعہ پڑھانے کے لیے ہر آٹھویں دن مسجد میں دوڑا جائے۔ طلبی کے لیے اگر آدمی پر آدمی آ رہا ہے تو کیوں نہیں تم اپنی محبوبہ کو اس وقت امانت کے لیے بھیج دیتے ہو؟ ـــہ

---

[1] مرشد آباد نگر سے کرت کونا مندر صرف ایک کوس ہے۔ مشہور ہے کہ دکھشا نام ایک دیوتا نے اپنے یہاں دعوت میں سب دیوتاؤں کو مدعو کیا مگر اپنی بیٹی ستی اور داماد شیوجی کو فہرست سے چھانٹ دیا۔ بیٹی ناخواندہ مہمان بن کر اپنے باپ کے گھر گئی بھی تو دیوتاؤں کی برادری نے اُس کی طرف رخ نہ کیا۔ اس غم میں ستی نے خودکشی کر لی شیوجی کو اس کی خبر ہوئی تو وہاں دوڑا گیا اور اپنی بی بی کی لاش کندھے پر رکھ کر ناچنا شروع کیا۔ اس رقص سے اہل محفل کے ہوش اڑ گئے۔ دنیا میں زلزلہ آ گیا۔ مجبور ہو کر سب دیوتاؤں نے مل کر بشنو دیوتا سے فریاد کی کہ شیوجی اگر یوں ہی ناچتا رہا تو عنقریب دنیا پاش پاش ہو جائے گی۔ یہ سن کر بشنو نے ستی کی لاش کو جو شیوجی کے کندھے پر تھی اپنے رتھ کی پہیوں سے ٹکڑے ٹکڑے کرنا شروع کیا۔ نہ رہیگا بانس نہ بجے گی بانسری! لاش کے ۵۲ ٹکڑے ممالک ہند و آسام میں ۵۲ مقامات پر گرے مثلاً کر دپ لنگھیا میں اندام نہانی کٹ کر گرا۔ اور دیوگھر میں جہاں بیجناتھ کا مندر ہے دل کٹ کر گرا۔ اور باقی حصے کالی گھاٹ (کلکتہ) اور دسا سگا باڑی (بنارس) وغیرہ میں گرے۔ اس لاش کے سر پر جو تاج تھا اُس کا ٹکڑا اُس مقام پر گرا جہاں اب کرت کونا مندر ہے۔ کرت بمعنی تاج۔ اور کونا بمعنی ٹکڑا۔ کرت کونا بمعنی تاج کا ٹکڑا۔

کہاں پھر جوانی کہاں پھر یہ جوش؟
غفوراست ایزد۔ تو ساغر بنوش!"

کسی سے کہتا ہو کہ عشرۂ محرم کا ڈراما موثر ہو نہیں سکتا جب تک یزید کا انتظام نہ کیا جائے۔ خبردار! یزید کی تلاش میں تم روپے کا منہ مت دیکھنا! دو ہزار میں بھی کوئی آدمی مل جائے تو غنیمت جاننا۔ کسی سے کہتا ہو کہ بھائی ایک گھنٹے کے لیے تعزیہ کا یزید بن جانے میں آخر نقصان کیا ہے؟ ایمان میں خلل کیوں آنے لگا؟ کیا امام حسین تم سے گلہ کرنے آئیں گے؟ ارے دو ہزار کی رقم اس وقت مفت مل رہی ہے۔ اس کو لے لے۔ بعد میں عاقبت سنوار لینا!

اللہ کے بندے جب شیطان کی رشوت قبول کر لینے کا تہیہ کرتے ہیں تو بالعموم اُن کی رسّی اور دراز کر دی جاتی ہے تاکہ اسی ذریعہ سے اور لوگوں کی آزمائش ہو سکے۔ چنانچہ یزید نے جب شیطنت اختیار کر لی تو یزید کے ساتھ دیگر بندگانِ خدا کا بھی امتحان ہو گیا۔ یعنی ابلیس پرست شمر کی طرح ہزاروں لاکھوں نے یزید کا ساتھ دیا لیکن خدا پرست حضرت حُر کی طرح چند آدمیوں نے امام الصابرین کا ساتھ دیا۔ فوجِ ابلیس کو وقتی عروج اور فوجِ الٰہی کو وقتی زوال یقینی ہوا۔ مگر اسی عروج و زوال میں ایک بہت بڑا امتحان پنہاں تھا ؎

اسپِ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم!

دہریے اس طریقۂ امتحان سے ناواقف ہیں، اس لیے فوجِ الٰہی کی وقتی شکست کو دیکھ کر فوراً خدا کی ہستی سے انکار کر دیتے ہیں اور انکار کی وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر خدا موجود تھا تو اپنے فدائیوں کی ذلت کیوں دیکھتا رہا۔ کلمہ گویوں کا جواب یہ ہے کہ جس خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو طمانچے کھانے کے لیے چھوڑ دیا تھا اُسی خدا نے امام الصابرین کو بھی ریگ تفتہ پر ذبح ہونے کے لیے مصلحتاً چھوڑ دیا تھا تاکہ فوجِ الٰہی کی شکست دیکھ کر ابلیس کے جھنڈے کے نیچے کون کون جا کر پناہ لیتا ہے!

سید وصی احمد بلگرامی (فانی)
ڈپٹی مجسٹریٹ، بڑلیہ ضلع مان بھوم شنبہ
۱۸ر جولائی سنہ ۲۴ء

علی گڑھ میگزین

جلد (۳) | بابت ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۲۷ء | قیمت سالانہ مع محصول ڈاک للعہ
نمبر (۶) | | قیمت فی رسالہ مرادی ۸ر

فہرست مضامین

مرتبہ :- محمد اشفاق حسین صدیقی بیخود

پرنٹر و پبلشر :- محمد مقتدیٰ خاں شروانی منیجر مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ

علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹرایٹ لا

کے

اُردو کلام کا مجموعہ موسومہ

"بانگِ درا"

چھپ کر تیار ہوگیا ہے۔ جلد منگوائیے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا

قیمت چار روپیہ (للعہ) ۔ محصولڈاک بذمہ خریدار

المشتہر

شیخ طاہرالدین بازار انارکلی لاہور

نئے عقیق کے تبرک نگینے

ہمارے ہاں اعلیٰ درجے کے اصلی سرخ عقیق کے نہایت ہی خوش نما، چمکدار چھوٹے سے قیمتی نگینہ پر پوری سورۃ قل ہو اللہ یا کلمہ طیبہ یا آیت کریمہ یا آیت نصر من اللہ یا لا الٰہ الا اللہ الملک الحق المبین یا چھوٹی سی کوئی اور عربی دعا بہ محنت کاریگری اور صفائی سے نہایت ہی خوش نما کھودی جاتی ہے۔ کھدے ہوئے حرف پختہ سفید ہوتے ہیں۔ ان حرفوں کا روشن چمکدار سفید رنگ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے جو اگر کبھی بھی مٹ جائے بلکہ ہلکا یا کم یا کبھی میلا بھی ہو جائے تو اپنی قیمت واپس منگالیں قیمت فی نگینہ صرف دو روپے ۔ اگر سورۃ یا دعا کے نیچے اپنا نام بھی کھدوائیں تو ع۲ نام والے نگینہ کے لئے ۴ر کے ٹکٹ پیشگی بھیجیں۔ دو ورقوں پر پورا لکھا ہوا عجیب حیرت انگیز قرآن شریف ہدیہ ایک روپیہ۔ مفت کلمہ طیبہ لکھا ہوا چاول ایک آنہ کا ٹکٹ محصول کیلئے بھیج کر مفت منگالیں

منیجر کارخانہ تبرکی انگوٹھی ہاپوڑ ضلع میرٹھ

شذرات

عرضِ حال :-

اڈیٹر کی معذرت اور آئندہ کے لئے تلافیِ مافات کے وعدے کچھ اس قدر فرسودہ یا "عادتِ قدیم" سے تعبیر کئے جانے لگے ہیں کہ اگر واقعاتِ حقیقی کا بھی اظہار ہو تو "صدا بہ صحرا" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ ہم حیران ہیں کہ "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کیونکر اس فرض سے عہدہ برآ ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میگزین کی ادارت کی خدمات تقریباً ایک سال سے ہمارے سپرد ہیں۔ اغلباً ناظرین آگاہ ہیں کہ جن جن حالات و ماحول میں ہم نے چارج لیا ہے وہ زمانہ میگزین کی زندگی کا اگر نازک ترین وقت کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ قلمی معاونین کی بے اعتنائی اور خود طلباء یونیورسٹی و انٹرمیجیٹ کالج کی سخنی و قلمی امداد کی جانب سے بے پروائی ہماری داستانِ مشکلات کے دو مستقل باب ہیں۔ موخر الذکر عزیزوں سے اس سے پیشتر بھی اپنی معروضات کے ضمن میں عرض کیا گیا تھا کہ "میگزین" طلبا کا ہے۔ اس کی زیب و زینت انھیں کے قلم کے نقوش و گلکاری پر منحصر ہے۔ نہایت تاسف کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس اپیل کے اعادہ کی پھر ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ عزیز جو نووارد ہیں اور جن کی خدمت میں ہنوز ہم کو تعارف حاصل نہیں ہے وہ میگزین کا معیار ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ اس ادبی تحریک میں حصہ لیں۔ ہم نہایت خوشی سے اُن کا خیر مقدم کریں گے۔

ہمارے قدیم و بیرونی معاونین کچھ اپنے ذاتی مشاغل میں ایسے مصروف و منہمک رہے کہ باوجود پیہم اصرار و معروضات کے اکثر "صدائے برنخاست" کا مضمون رہا۔ بعض دیرینہ

کرم فرماؤں کی مہرِ سکوت اب تک نہ ٹوٹ سکی" اور نہ ٹوٹنے کی وجہ بھی تھی"؟ اور یہی وجوہ ہیں جو اس امر کے جواب دہ ہیں کہ بعض اوقات چند ماہ کے پرچے یک جا شائع کئے۔ مگر بحمد اللہ اب ہماری اُن معذوریوں کا خاتمہ ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور آئندہ ہم اپنے گزشتہ عہد کا ایفا بہر طور کر سکیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

کتابت و طباعت کا خاطر خواہ اور بر وقت انتظام کرنے میں جو دقتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں اُن کا اندازہ ہم ہی کر سکتے ہیں یا وہ حضرات جن کو ان معاملات میں ذاتی تجربہ ہو۔

بایں ہمہ اب تک جہاں تک ہماری مساعی کا تعلق ہے ہم نے مشکلے نیست کہ آساں نہ شود کو ہمیشہ ملحوظ رکھ کر اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوشش کی ہے اور یہی ہے جو ہم کر سکتے ہیں السعی منی والاتمام من اللہ تعالےٰ

خواجہ کمال الدین :-

خواجہ صاحب۔ مدظلہ تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں جو شہرت اور قبولیت حاصل کر چکے ہیں یہاں اس کا اعادہ بے کار ہوگا۔ خواجہ صاحب موصوف نے اپنی خدا داد خطیبانہ قابلیت اور جوش اسلامی کی بدولت، یورپ میں جو غلط فہمیاں صدیوں سے اسلامی معتقدات کے متعلق پھیلی ہوئی تھیں، اُن کو نہ صرف دُور کیا بلکہ اسلام کی حقانیت کو روزِ روشن سے زیادہ واضح اور نمایاں کر دیا ہے۔ خوش قسمتی سے ماہ نومبر کے دوسرے ہفتے میں خواجہ صاحب نے مع مولوی محمد علی صاحب و ڈاکٹر یعقوب بیگ صاحب کے سرزمین علی گڑھ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا۔ حکام و طلباء یونیورسٹی کی درخواست پر آپ کی متعدد تقریریں مختلف موقعوں پر ہوئیں۔ خواجہ صاحب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا موضوع تقریر مخاطبین کے مطابق و مناسب ہوتا ہے جس سے پورے پورے استفادے کا موقع مل سکے۔ چنانچہ پہلا لکچر بہ صدارت میاں محمد شریف صاحب (پرو وائس چانسلر)

اسٹریچی ہال میں ہوا۔ خواجہ صاحب نے اس بیان میں "عمل" اور "کوشش" کو رازِ حیات انفرادی اور اجتماعی بہ آیات قرآنی و احادیث صحیحہ نہایت عمدہ پیرایہ میں ثابت کیا۔

چونکہ عام طور سے یہ تقریر مقبول و مطبوع ہوئی۔ لہذا طلباء کے اصرار پر ایک اور نہایت پُرمغز تقریر فرمائی جس میں بدلائل عقلی و نقلی "وجود باری تعالیٰ" کو ثابت کرتے ہوئے موجودہ سائنٹفک تحقیقات پر بھی روشنی ڈالی۔ اگرچہ تقریر علمی اور تحقیقی تھی۔ مگر خواجہ صاحب کے پُرلطف پیرایۂ بیان نے اس قدر دلچسپ بنا دیا کہ سامعین نے آخر تک بڑے غور و توجہ سے سُنا۔

آخری تقریر جو یونین میں ہوئی وہ کسی طرح دوسری تقریروں سے کم نہ تھی خصوصیت اس تقریر کی یہ ہے کہ انگریزی میں تھی اور یورپ کے حالات پر مشتمل تھی۔ اس کا مبحث زیادہ تر یہ تھا کہ اشاعت اسلام کی یورپ میں آج کل بڑی ضرورت ہے اور کامیابی کی قوی اُمید ہے۔ تقریباً ایک عشرہ قیام فرما کر تشریف لے گئے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) جو تعطیل کلاں سے کچھ پہلے انگلستان تشریف لے گئے تھے الحمدللہ کہ یکم ستمبر کو بخیر و عافیت علی گڑھ واپس تشریف لے آئے۔

اگر ہر جزو اپنے کل اور ہر فعل اپنے فاعل سے نسبت و وابستگی رکھتے ہوئے اپنی اصلیت کی کچھ جھلک دکھاتا ہے تو ہمیں اس کہنے میں ذرا بھی مشرقیت نہیں معلوم ہوتی کہ بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے خلوص دلی اور نیک نیتی کا بدیہی اثر ہے کہ ہمارا قومی مرجع علوم اب سے پہلے جب کہ ایم اے او کالج تھا اور اب کہ مسلم یونیورسٹی سے موسوم ہے ہر وقت اور ہر طرح اپنے سکرٹری اور وائس چانسلرز کے عہدوں کی حیثیت سے ایک ممتاز تعلیمی مرکز رہا ہے۔

اس عہدِ قحط الرجال میں جب کہ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور نواب محمد

اسحٰق خاں مغفور جیسی پرانی اور مقطع ہستیاں ڈھونڈے نہیں ملتیں، نئی پود میں کسی ایسی جامع ہستی کے مل جانے کی کس کو امید تھی، جس نے سرسید اعظم سے لے کر آخر سکرٹری کے زمانے کو، واقعات کو اور صحبتوں کو بلا واسطہ مشیر کار بن کر بچشم خود دیکھا ہو، سمجھا ہو اور برتا ہو۔ اور جس کا دلی رجحان اور طبعی لگاؤ قومی و ملی خدمات کی طرف برغبت مائل ہو۔

یقیناً یہ اسی بنیادی نیک نیتی کا پھل ہے کہ آج صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب عملاً مشرقی رنگ ولباس میں اور علماً مغربی اخذ و اقتباس میں ہم کو نظر آ رہے ہیں صاحبزادہ صاحب نے جس طرح اپنے ملک و وطن میں اپنے آبا و اجداد کی تربیت و شعائر کو اپنا جزوِ زندگی بنایا ہے اسی طرح بکرات و مرات یورپ اور انگلستان کے طویل دورانِ قیام میں تعلیمی انتظام اور سیاسی انقلابات کے جزر و مد کو بعین البصیرت ملاحظہ فرمایا ہے، ان کے تجارب ذاتی اور مشاہدات عینی کی بدولت قوم کو کامل امید ہے کہ جناب موصوف کا وجود مسعود مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حق میں ایک روشن اور درخشاں وجود ہوگا، جس کے ثبوت کے لئے

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

یونیورسٹی کے اربابِ نظم ونسق میں چانسلر اور پرو چانسلر کے بعد وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر کی دو ایسی نمایاں ہستیاں ہیں جن کو یونیورسٹی کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب سے تشبیہ دینا شاعرانہ قصیدہ گوئی نہ سمجھی جائیگی۔ اس وقت جس طرح مسلم یونیورسٹی کے بعض بیرونی مخالفین وائس چانسلر کے وجود کو باوجود بعض جزوی اختلاف کے مبارک و مسعود سمجھ رہے ہیں، اسی طرح بکثرت مقامی واقفین متفق الرائے ہیں کہ تنہا ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب (پرو وائس چانسلر) کی ذات مستجمع صفات عموماً یونیورسٹی کے مقاصد خاص اور خصوصاً تعلیمی فوائد عام کے لئے بے حد مفید و کارآمد ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایثار نفس کم از کم اپنی قوم کے اہل ایثار کے مقابل میں اس وقت تک بے مثال ہے۔ جس کسی کو ان کی کاروباری اور شبانہ روزی زندگی کا مشاہدہ ہوا ہے وہ آپ کی ان تھک انہماک و اشتغال کا اندازہ

کر سکتا ہی۔ آپ اوائل ستمبر میں بحصولِ رخصت (۶ ماہ) انگلستان تشریف لے گئے ہیں۔ بظاہر یہ سفر
اگرچہ دل و دماغ کے سکون و راحت کے لئے معلوم ہوتا ہی مگر اہل نظر وثوق کامل رکھتے ہیں کہ
اس خواب آور اور آرام جان سفر کی تعبیر میں مسلم یونیورسٹی کے لئے کوئی نہ کوئی بیدار بختی
نظر آئیگی۔ دعا ہی کہ خدائے برتر و قادر آپ کو بخیر و عافیت واپس لائے

ڈاکٹر صاحب کی عدم موجودگی میں جناب میاں محمد شریف صاحب پرووسٹ و چیرمین فلاسفی
ڈپارٹمنٹ، پرو وائس چانسلر کی خدمات بھی انجام دینگے۔ یہ قائم مقامی ہر حیثیت سے مناسب و موزوں
ہی۔ جناب شریف صاحب اپنی ذاتی خصوصیات اور کثرت خدمات کی نسبت سے مختلف کاموں کی
انجام دہی میں ڈاکٹر صاحب کے قدم بقدم ہیں۔ تمام بورڈنگ ہاؤس اور فلاسفی ڈپارٹمنٹ اور ان کے
جزوی و کلی انتظامات آپ سے وابستہ ہیں جن کو عرصہ دراز سے بحسن اسلوبی و خوبی انجام دیرہے ہیں
آپ کی علمی قابلیت بہرصورت پرو وائس چانسلر کی خدمات کی اہلیت رکھتی ہی اور اس کا ثبوت اب سے
پہلے بھی اسی خدمت کے مفوض الیہ ہونے پر دے چکے ہیں اور اب اس سے زیادہ توقع و امید ہی۔

کم و بیش ۳ سال سے علی گڑھ کا مرکز تعلیمی ۳ شاخوں میں پھیلا ہوا ہی۔ مجموعی حیثیت سے اس کا
نام مسلم یونیورسٹی ہی۔ تفصیل یہ ہی کہ جہاں بی اے، ایم اے، ایل ایل بی، بی ٹی کی تعلیم دی جاتی ہی
وہ عمارت یونیورسٹی سے موسوم ہی اور جہاں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے نصاب کا درس ہوتا
ہی اس کو کالج کہا جاتا ہی اور درجہ نہم سے نیچے جتنی جماعت ہی اس کی تعلیم گاہ کا نام اسکول ہی
جب سے انٹرمیڈیٹ کالج قائم ہوا اس کے پرنسپل میجر ڈین صاحب مقرر ہوئے۔ میجر صاحب پنشنر
فوجی عہدہ دار ہیں اور علمی قابلیت اور تعلیمی تجارب میں بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ان کی
پرنسپلی کا زمانہ ایک حد تک کامیاب زمانہ کہا جاسکتا ہی۔ ان کی امتیازی حیثیت علمی میں خصوصی
حیثیت جغرافیہ دانی ہی۔ چونکہ یونیورسٹی میں جغرافیہ کی چیر Chair خالی تھی اور وہ ہر طرح
اس کے لئے موزوں و مستحق تھے اس لئے پرنسپل کالج کی جگہ اب وہ یونیورسٹی جغرافیہ کے
پروفیسر مقرر ہوئے ہیں اور اگرچہ وہ کالج اور کالج کے طلبا اور انتظامات کی دلچسپی کی وجہ سے

اپنی جدائی پر ہمدردانہ افسوس کرتے ہیں پھر بھی اس عہدۂ جدیدہ سے وہ خوش ہیں کہ اس میں درس وتدریس کی محنت ومشقت تو زیادہ ہے مگر ذمہ داریاں کم ہیں۔

میجر صاحب کی قائم مقامی کے لئے جناب عبدالمجید صاحب قریشی کا انتخاب نہایت کامیاب انتخاب ہے۔ جو ہمارے ممتاز یونیورسٹی کے اولڈ بوائے ہیں ان کی دانشمندی تدین اور متانت و لیاقت ان کی ذات کو مرجع خلائق بنائے ہوئے ہے۔ کالج کے ابتدائی، وسطی اور موجودہ تمام واقعات آپ کے پیش نظر ہیں۔ ایسے ماہر ومبصر سے بہتر کالج کی پرنسپلی کے لئے اور کون موزوں ہو سکتا ہے۔ آپ کئی سال سے کالج یونیورسٹی میں ریاضیات کے پروفیسر تھے اور مسٹر ایڈمنڈ کے بعد قدیم کالجیٹ اسکول کی ہیڈ ماسٹری جس کامیابی اور قابلیت کے ساتھ کی ہے اس سے واقفان حال آگاہ ہیں۔ غرضکہ جناب قریشی صاحب کا انتخاب کیا بلحاظ فہم وفراست اور کیا بحیثیت تجربہ وقابلیت ہر طرح بہترین انتخاب ہے اور مسرت ہے کہ آج ہم اپنی یونیورسٹی اور کالج کو سرتاپا اپنے قومی ہاتھ میں دیکھ رہے ہیں۔

سید سجاد حیدر صاحب:۔

ہماری یونیورسٹی کے مشہور ادیب انشاپرداز سید سجاد حیدر صاحب (رجسٹرار) ۶ ماہ کی رخصت پر بہ غرض سیاحت وسفر یورپ وٹرکی تشریف لے گئے تھے۔ بحمد اللہ کہ سید صاحب موصوف ماہ نومبر میں مع الخیر علی گڑھ واپس ہوئے۔ آپ نے طلبا اور حکامان یونیورسٹی کے استدعا پر اسٹریچی ہال میں اپنے چشم دید حالات ومشاہدات ٹرکی کے متعلق بیان فرمائے۔ چونکہ سید صاحب نہایت اعلیٰ درجے کے مبصر اور سیاست میں زبردست قوت مشاہدہ رکھتے ہیں۔ لہذا ٹرکی کے تغیرات اور گورنمنٹ کے جدید انتظامات اور تعلیمی اصلاحات پر جو آپ نے بہ چشم خود معائنہ کئے تھے نہایت وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی۔ تقریر کے ختم پر بعض سامعین نے بہ اجازت چند ضروری سوالات ٹرکی کے متعلق کئے جس کے نہایت شافی اور معلومات سے پر جوابات آپ نے دیئے۔

(اڈیٹر)

اعتذار

میگزین کے تعطیلات نمبر میں پروفیسر یعقوب بیگ صاحب نامی کا مضمون بہ عنوان "عجائبات کالج" درج ہو چکا ہے نہایت افسوس ہے کہ پروفیسر موصوف کے ایک شاگرد رشید کا لکھا ہوا ابتدائی نوٹ شایع نہ ہو سکا۔ نوٹ مذکور کا مضمون یہ تھا کہ یہ مضمون پروفیسر صاحب کی زمانۂ طالب علمی کی مشق کا نتیجہ ہے۔

(۲) پروفیسر وحید الدین صاحب سلیم (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) کو کاتب کی غلطی سے "پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد" لکھدیا گیا تھا لہذا ہم ناظرین کرام سے اطلاعاً عرض کرتے ہیں کہ سلیم صاحب مدظلہ حسب سابق خدمات پروفیسری انجام دے رہے ہیں۔

مرزا تصدق حسین صاحب صدق جائسی کے اشعار پر جو نوٹ "اڈیٹر" کی جانب سے شائع ہوا ہے وہ فی الحقیقت عزیز احمد خاں صاحب کا لکھا ہوا ہے سہواً "قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند"۔

شعر (۶) کا مصرعہ اولیٰ یوں ہے: دل گن رہا ہے گھڑیاں ہیمان دل ربا کی۔

سید شجاعت حسین صاحب بی اے (علیگ) کو بی اے ایل ایل بی لکھ دیا۔ اگرچہ غلطی ہے تاہم فال نیک ہے۔

سید نظیر حسن کے بجائے سید نظیر الحسن درج ہو گیا۔

حسب ذیل حضرات کی غزل کا مصرعہ یوں پڑھئے

عزیز احمد خاں صاحب عزیز۔ مطلع مصرعہ ثانی		اٹھ گیا پردہ تیری محمل کا
"	شعر (۶) مصرعہ اولیٰ	کشتی اب رحم پر ہے موجوں کے
"	شعر (۸) مصرعہ ثانی	مل ہی جاتا نشان محمل کا

جعفر عباس صاحب	شعر (۵) مصرعہ اولیٰ	رہ دقت گزار راستی پر چلنے والے تھم
فانی صاحب	شعر (۹) مصرعہ اولیٰ	زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
مینا صاحب	شعر (۳) مصرعہ ثانی	چند یہ لکیریں تھیں وہ بھی میری قسمت کی

مسٹر مسعود الحسن (کیپٹن ہاکی ٹیم) نے ایک رپورٹ جو ہاکی ٹیم کے کارناموں پر مشتمل تھی بہ غرض اشاعت ارسال کی تھی جو جگہ کی قلت کی وجہ سے افسوس ہے کہ درج نہ ہو سکی ۔ فی الحقیقت ہاکی ٹیم کے کارنامے فیض آباد ، لکھنؤ اور گوالیار وغیرہ پر نہایت قابل ستایش ہیں ہمیں امید ہے کہ ہاکی ٹیم اپنی شہرت و وجاہت کو آئندہ بھی قائم رکھے گی اور ہمارے دوست مسعود صاحب قابل مبارکباد ہیں ۔

(اڈیٹر)

ماہ دسمبر کا میگزین بھی طیار ہو گیا ہے اور انشاءاللہ تعالیٰ ماہ جنوری کے دوسرے ہفتہ کی ابتدا میں ضرور شایع ہو جائے گا ۔ اطلاعاً تحریر ہے ۔

(منیجر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڈھ میگزین

جلد (۳)	بابت اکتوبر و نومبر سنہ ۱۹۲۴ء	قیمت سالانہ چار روپیہ مع محصولڈاک
نمبر (۶)		قیمت فی رسالہ مرادی آٹھ آنہ

اجتہاد و تحقیق

یہ اتفاق اکثر ہوتا اور دیکھا گیا ہے کہ بعض خاص دل و دماغ کی ہستیاں اپنے انتقال سے کچھ پہلے یا عین نزع کے وقت ایسے شعر یا فقرات کہہ جاتے ہیں جن سے مرنے والے کی روحانیت اور علو مرتبت کا نمایاں وقار قائم ہو جاتا ہے۔ اُن الفاظ میں مستقبل کا تنات اور پیشین گوئیوں کے کچھ ایسے اشارات و کنایات ہوتے ہیں جن کا وہم و گمان بھی اُس کو ہوتے سے پہلے نہیں ہوتا۔ اسی سلسلے میں ذیل کا نا تمام مضمون ہے جس کو سجاد انصاری مرحوم نے اپنی موت سے کچھ پہلے لکھنا شروع کیا تھا اور ہنوز چند تمہیدی مبادیات مضمون کو بھی ختم نہ کرنے پائے تھے کہ خود تمام ہو گئے۔ علی گڑھ میگزین مرحوم کے افادات قلم سے اکثر ناظرین

کو محفوظ و مسرور کرتا رہا ہے۔ اس لئے یہ مضمون اس لحاظ سے کہ جناب سجاد کا لکھا ہوا ہے کوئی نئی بات نہیں مگر اس موقعے پر یہ اور صرف یہی ایک تجدید میگزین کی مایۂ ناز خصوصیت ہے کہ آن کی دائمی جدائی کے بعد بھی یہ فخر میگزین ہی کو نصیب ہوا کہ ان کی ناتمام زندگی کا ناتمام مضمون اُس میگزین میں شائع ہو رہا ہے جس سرزمین کی تعلیم گاہ کے وہ مرحوم مکمل یادگار تھے ؎

وفاداری بشرطِ استواری عینِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

جناب اصغر کا شکریہ بڑے سے بڑے الفاظ میں بھی ادا نہیں ہو سکتا کہ اُنھوں نے اس گراں بہا امانت کا امین میگزین کو بنایا۔ جناب سجاد کے نظم و نثر مضامین و اشعار کثرت سے میگزین میں چھپتے رہے ہیں۔ ناظرین آن کے اسلوبِ بیان، جدتِ تخیل، پُرزور استدلال کی حقیقت سے بے خبر نہ ہونگے۔ مگر اس ناتمام اور آخری مضمون کو جس عنوان کے ساتھ شروع کیا تھا اگر وہ تمام ہو کر شائع ہوتا تو دنیائے مجاز کے لئے حقیقت نما دستور العمل بن جاتا سلسلۂ مبادیات بتا رہا ہے کہ اس مضمون میں فلسفۂ جدید یا بالفاظِ دیگر مادیاتِ مغرب کا روحانیاتِ مشرق سے مقابلہ کیا ہے۔ اس تصادم و تقابل کا انجام کیا ہوتا اس کا فیصلہ بغیر ختمِ مضمون کون کر سکتا ہے۔ تاہم مضمونِ تحت میں چند جملے مرحوم کے قلم سے ایسے نکل گئے ہیں جو طریقتِ مشرقی میں شمعِ ہدایت بن سکتے ہیں اور جن کے عمیق مفہوم تک پہنچ جانا درسِ عرفان کا مکمل کر لینا ہے۔ مثلاً:-

"دنیا کی تضحیک صرف وہ بلند نظر انسان کر سکتا ہے جو عالی حوصلگی اور عالی ظرفی کے ساتھ دنیا کے حقائق سے بھی آگاہ ہو۔ حقیقت آشنا صرف وہ نظر ہے جو ایک بے نیاز تبسم کے ساتھ کائنات کے ہر واقعے کو ٹھکرا دے۔"

ذیل کی عبارت کو تقشّف و عصبیت کی کشاکش سے الگ ہو کر دیکھئے اور انصاف کیجئے:-

"... حشر و نشر کے مراحل پر اُن بدتوفیقوں کو ضرور ماتم کرنا چاہئے جنھوں نے خود اپنے ہاتھوں اپنی دنیا کو خدا کے لئے نہیں بلکہ محض اس لئے غیر دلچسپ بنا دیا ہے کہ عقبیٰ میں تمام مسرتیں دنیاوی اذیتوں کی جزا میں مل جائیں گی آن کی دنیا اور عقبیٰ دونوں عبرت خیز اور ماتم انگیز ہیں۔"

(بعنوانِ دنیا)

نیابت و خلافتِ الٰہی کے انتہائی مدارج حاصل کرنا ہیں تو سلوک کی راہیں جوش و خروش سے طے نہیں ہوتیں کیوں کہ اُن کی حقیقت یہ ہے:-

"نظام کائنات صرف اس لئے دل فریب ہے کہ وہ ایک طلسم ہے جس کی حقیقتیں افشا نہیں کی جا سکیں۔ انسان حقائق کائنات کا متحمل نہیں ہو سکتا جس وقت کائنات کے رموز منکشف ہو نگے شیرازۂ عالم بکھر جائے گا۔ قیامت اُسی وقت آئے گی جب انسان پر اُس کی انسانیت کا راز افشا ہو جائے گا۔"

یہ چند نمونے سرسری طور سے لکھ دیئے ہیں۔ اب ناظرین بالا ستیعاب مضمون مذکور سے محظوظ ہوں اور اس کے صلے میں مرحوم سجاد کے لئے دعائے مغفرت کریں۔

(اڈیٹر)

جہلا کی گمراہیاں ایک طرف اُن کے کسی انداز پر تبصرہ کرنا ہی حماقت ہے۔ قابلِ غور تو اس طبقے کی زندگی ہے جس نے ادّعائے علم و فن کی بدمستیوں میں حسن و قبح کا بھی ہوش کھو دیا، دنیا کا خیال ہے کہ اربابِ علم کی بے راہ روی عبرت انگیز ہوتی ہے، میں اس سے متفق نہیں، اربابِ بصیرت کبھی ممنونِ عبرت نہیں ہوتے۔ اُن کا مقدس ترین فرض یہ ہے کہ جس واقعہ کو عوام عبرت آموز قرار دیں وہ اُسی کو ایک بے نیاز قہقہہ میں گم کر دیا کریں، حاملانِ علم و فن کی گمراہیوں سے عبرت نہیں تفریح حاصل کرنی چاہیئے، اُن کی زندگی کی ہر لغزش مضحکہ خیز ہوتی ہے لیکن اس تماشے سے صحیح معنوں میں مسرور ہونے کے لئے مخصوص دل و دماغ چاہئیں، بے وقوف کبھی صحیح طور پر ہنس نہیں سکتا، دنیا کی تضحیک صرف وہ بلند نظر انسان کر سکتا ہے جو عالی حوصلگی اور عالی ظرفی کے ساتھ دنیا کے حقائق سے بھی آشنا ہو، حقیقت آشنا صرف وہ نظر ہے جو ایک بے نیاز تبسم کے ساتھ کائنات کے ہر واقعہ کو ٹھکرا دے، چشمِ گریاں اور نگاہِ عبرت اندوز دل و دماغ کی محرومیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے!

میرا مفہوم یہ ہے کہ میں مدعیانِ تحقیق کی لغزشوں پر اس لئے تبصرہ نہیں کر رہا ہوں کہ دوسروں کو عبرت ہو، میں ایسا تنگ نظر نہیں کہ دنیا کو تلقینِ عبرت کروں، مجھے صرف اُن واقعات

کی طرف اشارہ کرتا ہے جنھوں نے کائناتِ علم کو ایک حد تک مضحکہ انگیز بنا دیا ہے۔ اگر کسی میں یہ صلاحیت نہیں کہ ان اشارات پر متبسم ہو سکے اُسے چاہئیے کہ مصروفِ ماتم ہو جائے، دنیا پر نہیں خود اپنی بدنصیبیوں پر کہ فطرت نے اُسے ذوقِ تبسم سے محروم رکھا، میرا مخاطب وہ کج نظر اور کج فہم نہیں جو دنیا کے ہر واقعہ پر رونا چاہتا ہے، اگر کسی کو ماتم کرنا ہے اُس کے لئے ہزاروں مشاغل ہیں اور ہزاروں مرحلے، جوانِ صالح، زاہدِ خشک، حسنِ پارسا، فریبِ تصوف۔ غرض کہ اس طرح کے تماشے عبرت انگیز بھی ہیں اور لائقِ ماتم بھی۔ لیکن ایک صحیح انسان ان پر ہنستا ہے۔ البتہ حشر و نشر کے مراحل پر اُن بدتوفیقوں کو ضرور ماتم کرنا چاہیئے جنھوں نے خود اپنے ہاتھوں اپنی دنیا کو خدا کے لئے نہیں بلکہ محض اس لئے غیر دلچسپ بنا دیا ہے کہ عقبیٰ میں تمام مسرتیں دنیاوی اذیتوں کی جزا میں مل جائیں گی۔ اُن کی دنیا اور عقبیٰ دونوں عبرت خیز اور ماتم انگیز ہیں

یہ بےبسی اُس کے لئے باعثِ شرم ہو جاتی ہے، اُسے مجبوراً کسی نہ کسی طرف اپنے قوائے فکر کو متوجہ کرنا پڑتا ہے اس غرض سے کہ دنیا پر اس کی جہالت اور بےچارگی کا راز افشا نہ ہو۔ وہ لامحالہ عالمِ نامعلوم کے رموز کو ذاتی طور پر ممنونِ تحقیق کرتا ہے، نتائج معلوم ژولیدہ بیانی، کج فہمی، بے راہ روی، نادانیاں، حماقتیں، جہلِ مرکب، نہ منزل کا پتا نہ جادۂ منزل کا ہوش، دماغ کے سامنے کوئی راستہ نہیں، دل میں کوئی آرزو نہیں، الفاظ کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ کوئی مفہوم، ان تمام عقدہ ہائے لاینحل اور افکارِ لایعنی کا نام فلسفہ رکھا گیا ہے۔ ہیگل اور کینٹ کے ایسے معمہ پسند ہرزہ سرا پیدا ہو گئے، انسان جو کچھ سمجھنا چاہتا تھا وہ ہمیشہ کے لئے بھول گیا، اُس کے سامنے وہ مراحل آ گئے جن کو اگر اربابِ قضا و قدر بھی حل کرنا چاہیں تو کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے، انسان نے اپنے ادعائے تحقیق میں خدا کی ذات و صفات کے متعلق وہ نکات پیدا کر دیئے جن کو در اصل مذہب و خدا سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن فلسفہ نازاں ہے کہ معمائے کائنات حل ہو گیا اور اربابِ علم و فن متکبر کہ اُن کی عقدہ کشائی نے دنیا کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے، خدا نے ہزاروں پیامبر بھیجے مگر اربابِ تحقیق نے

بلا تامل اُن کی تکذیب کر دی۔ اُنھوں نے یہ امتیاز قائم کر دیا کہ پیامبر جہلا کی تشفی کے لئے ہیں
اور حامیانِ علم و اجتہاد ارباب نظر کے لئے، جہل مرکب رقص کرنے لگا۔ انسان نے ارباب حل وعقد
کو شکست دیدی اور یہی نہیں نظام عالم اور حیاتِ انسانی کی لطافتیں بھی ہمیشہ کے لئے برباد کر دی
گئیں۔ دنیا کی دل آویزی اُس کے رموز میں مضمر ہے۔ نظام کائنات صرف اس لئے دل فریب ہے
کہ وہ ایک طلسم ہے جس کی حقیقتیں افشا نہیں کی جا سکیں، انسان حقائق کائنات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔
جس وقت کائنات کے رموز منکشف ہونگے شیرازۂ عالم بکھر جائے گا۔ قیامت اسی وقت آئے گی
جب انسان پر اُس کی انسانیت کا راز افشا ہو جائے گا۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے تاہم مضطرب اور
بر خود غلط انسان طلسم کائنات کو توڑنا چاہتا ہے۔ اُسے اس سے بھی تشفی نہیں ہوئی کہ وہ ایک
ہیولائے مقدس ہے جس کا خاکہ بہشت کی فضاء لطیف میں تیار کیا گیا تھا، حیات انسانی
کی رنگینیاں اُسے مسرور نہیں کر سکیں۔ مشرق روحانی فضا سے مانوس ہے اُس کا اور اس کا
فلسفہ اگر کسی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اُسی عالم قدس کی طرف جس کی رنگینیوں کے پرتو سے یہ
دنیا معمور ہے۔ ایک گروہ نے اُسے حسنِ مطلق کا محض ایک پرتو قرار دیا۔ دوسرے نے اُس کو
اور اُس کے خدا دونوں کو معنیً متحد کرنا چاہا، لیکن مغرب! وہ کبھی اُڑنے کا عادی نہیں،
اُس کے افکار اُڑتے نہیں گرتے ہیں وہ اعلیٰ سے متنفر ہے اس لئے اس کا فلسفہ بھی اسفل
کی طرف آتا ہے، ڈارون مع اپنی تمام استخواں پرستیوں کے عرصۂ علم وفن میں نمودار ہو گیا
اور کائنات انسانی دفعۃً اپنی ازلی رنگینیوں سے محروم ہو گئی۔ مجھے حیرت تو مغرب کی رکاکتِ
مذاق اور کثافتِ تخیل پر ہے، اُنھیں انبساط و مسرت اس تصور سے نہ ہوئی کہ اُن کے اجسام
خاکی کی پرورش فردوس بریں کی اس فضا نے کی ہے جس کی دلفریبیاں آج بھی انسان کو
حریص و طامع بنائے ہوئے ہیں، دنیا باوجود اپنی تمام بہشت آفرینیوں کے اس فضا کے
ایک ذرہ کی بھی وقعت نہیں رکھتی۔ مغربی دل و دماغ کو اگر تسکین ہوئی ہے تو اس نتیجہ سے
کہ انسان حقیقۃً ہیولاء ارتقائی ہے جس کی پرورش کنار فردوس میں نہیں بلکہ آغوشِ میمونی

میں ہوئی تھی، حقیقت انسانی اُسے مضطرب کر رہی تھی حقیقت میمونی نے اُس کو مطمئن کر دیا
اس سے بحث نہیں کہ واقعۃً نظریۂ ارتقا صحیح ہے یا غلط۔ تخیلات اور توہمات کبھی صحیح یا غلط
نہیں ہوا کرتے اُن کے لئے صرف لطافت وکثافت کا امتیاز ممکن ہے۔ اس حیثیت سے مغربی
تحقیق و اجتہاد کی حقیقت تمسخر انگیز ہے اُن کے لئے یہ تصور لطیف نہ تھا کہ انسان عالم لاہوتی کا
ایک کرشمہ ہے وہ صرف اس حقیقت سے مسرور و مطمئن ہیں کہ اُس کی حقیقت میمونیت میں مضمر ہے
اگر کسی حکیم نے خدا اور اس کے مظاہر کو بھی ممنون احسان کرنا چاہا اسی تحقیق کو خضر راہ
قرار دیا جس کے ذریعے سے ہر دینا وی مسئلے پر رد و قدح کی جاتی ہے۔ ڈیکارٹ اور برکلے
حقیقت خداوندی کی طرف متوجہ بھی ہوئے تو اسی جہل مرکب کے ساتھ، یقین کی جگہ پر علم طمانیت
قلب محال ہوگئی۔ دماغی اطمینان معیارِ حقیقت ٹھیرا۔ یہاں بھی ہرزہ سرائیوں کا وہی انداز
ہے جو دوسرے فلسفہ کے انکار و الحاد کے مباحث میں قائم ہے، لطف و انبساط، سکون و
مسرت، یقین و ایمان فنا ہوگئے۔

مغرب کی گمراہیاں لازمی تھیں، اُن کے پیغمبر کی تعلیم و تلقین موجودہ تمدن کی وسعتوں
کی کفالت نہیں کر سکتی تھی، نہ اُن کے ہر وعظ و پندگی کوئی مستقل ترکیب تھی جس کی رہنمائی
سے وہ گمراہیوں سے محفوظ رہ سکتے تھے، انجیل اپنے حقائق سے معرا ہو چکی تھی اقوال و
افعال، نقل و حرکت کی کوئی یادگار نہ تھی اُن کے لئے سوا اُن کی ذاتی کاوشوں کے
سکون و اطمینان کی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن مشرق اور بالخصوص عالم اسلامی۔.....
....

(سجاد علی انصاری مرحوم بی اے ال ال بی علیگ)

اقبال کا درسِ عمل

اور
اُس کی تضمینِ بے بدل

از علامہ مولانا حکیم محمد قیام الدین صاحب تخت جونپوری

زاہدا جامۂ تفریق دریدن آموز — از قیودِ من و تو پاک رہیدن آموز
شورِ تکبیر ز ناقوس شنیدن آموز — دانۂ سبحہ بہ زنّار کشیدن آموز

گر نگاہِ تو دو بین ست نہ دیدن آموز

دل سے اے شیخ مٹا نقشِ دوئی کو ہر روز — سب کو اک آنکھ سے تو دیکھ کے ہو لطف اندوز
کفر و ایماں کے تو جھگڑے میں پڑا ہے دلسوز — دانۂ سبحہ بہ زنّار کشیدن آموز

گر نگاہِ تو دو بین ست ندیدن آموز

اپنی ہستی کو ہر اک رنگ سے نافع تو بنا — تیرا بس کام ہو ہمدردیِ مخلوقِ خدا
گلشنِ دہر میں آیا ہی تو کچھ کر کے دکھا — آفریدند اگر شبنمِ بے مایہ ترا

خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز

گر صبا تو ہے تو گلزار میں غنچوں کو کھلا ۔ آب نیساں ہے تو جا سیپ میں موتی بنجا
نہر تو ہے تو کر اشجار کو سیراب سدا ۔ آفریدند اگر شبنم بے مایہ ترا

خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز

تو کسی سے نہ خلش رکھ مری سن لے یہ پند ۔ اور بے وجہ کسی کو کبھی پہنچا نہ گزند
ہاں مگر وقت یہ رہ فرض کا اپنے پابند ۔ اگرت خارِ گلِ تازہ رسے ساختہ اند

پاسِ ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز

یہ سمجھ رکھ کہ فنا ہی میں ہے بس تیری بقا ۔ مٹکے ہربار اُبھر مثل حباب دریا
اپنی پامالی و مجبوری کا کچھ کر نہ گلا ۔ باغباں گر ز خیابانِ تو بر کند ترا

صفتِ سبزہ دگر بارہ دمیدن آموز

کعبہ تیرا ہو مکاں یا کہ وطن ہو کاشی ۔ جب تک آزاد نہ ہو۔ دوں تجھے کیا شاباشی
بحثِ اقبال نے کی خوب یہ گوہر پاشی ۔ تا کجا در تہِ بال دگراں می باشی

در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

افسانہ

نگہِ نیلوفری

تاریخ عالم کا مشہور سنہ ..... ۱۳۹۸ء کا زمانہ تھا .. سلطان مراد اول کا لشکر جرار ... نشہ فتح و مسرت سے چور ۔ میدان قزوہ میں خیمہ زن تھا .. جس کو منگاروی زبان میں گیمزن کے نام سے موسوم کرتے ہیں ... یہاں سے وہاں تک خیمہ و بارگاہیں نظر آتی تھیں ... اور بادی النظر میں یہ گمان ہوتا تھا ۔ کہ کوئی نئی بستی آباد ہوگئی ہے ۔ سارا لشکر پے در پے منازل طے کرنے کے بعد ذرا آرام کرنے کے لئے اس جگہ فروکش ہوگیا تھا ..

چھوٹے سے دریائے شبطرا کے دونوں کناروں پر خیمے نصب تھے ۔ جس کا صاف و شفاف پانی عثمانی فوج کے جزو لاینفک باربرداری کے شتروں اور سواروں کے رہواروں کی پیاس بجھانے کا کام دے رہا تھا ۔

ہر خیمہ و بارگاہ کے قبے پر ہلالی کلس آویزاں تھا جس پر اسلامی علم پھریرے لے رہا تھا .. فوج کے سرداروں کی شاندار و اعلیٰ بارگاہوں کے دل فریب و خوش نما مختلف رنگ کچھ ایسا دیدہ زیب اور عظمت آفریں نظارہ پیش کر رہے تھے ۔ کہ آنکھیں محو ہو جائیں .... اور طبیعت کو سیری ہی نہ ہوتی ..

فوج کے بالکل وسطی حصے میں سلطان مراد کی بارگاہ نصب تھی .. جس کے چاروں طرف وہ جاں نثار جمع تھے جنھوں نے کرمانیہ کے شاہزادوں کے خلاف جنگ میں صدہا مرتبہ جنگ کی مایوس حالت کو فتح و نصرت میں مبدل کر دیا تھا ۔

سلطان کے خیمے سے ذرا ہٹ کر مگر برابر فاصلے سے .. مربع شکل میں چار خیمے اور

نصب تھے.. جن کا مرکز سلطانی بارگاہ تھی.. ان میں سے پہلا خیمہ سلطانی حرم کا تھا.. جن میں خواص وسہیلیاں بھی شامل تھیں.... دوسرا اُس کے بڑے بیٹے شاہزادہ بایزید.... تیسرا اُس کے چھوٹے بیٹے شاہزادہ یعقوب کا تھا... اور چوتھا یقدبیگ تیمورتاش کا تھا... جس کے مانند جنگ جو... جری وشجاع ماہرِ جنگ جنرل عثمانی فوج میں کوئی نہ تھا۔

عثمانی افواج کے میدان قرزدہ میں پڑاؤ ڈالنے کے دوسرے روز صبح کو ایک قاصد مع چند محافظ سواروں کے فوج میں درآیا اور سلطان مراد سے ملاقات کی تمنا کی... یہ شخص شاہ لازر۔ بادشاہ سرویہ کا قاصد تھا... باریابی کی اجازت مل گئی... اور اس کو فوراً سلطان کے سامنے پیش کیا گیا.. جو اس وقت اپنی بارگاہ میں... فوجی جرنلوں کے درمیان گھرا ہوا... قیمتی صوفہ پر دراز تھا۔

قاصد نے اپنے محافظ سواروں کو دربارگاہ پر ٹھیرنے کا اشارہ کرکے... بآہستگی مودبانہ قدم بڑھائے.. اور عثمانی مملکت کے بادشاہ کو بصد عجز ونیاز آداب بجالایا..

اس کے بعد ذیل کی گفتگو ترکی زبان میں واقع ہوئی.. جس میں قاصد کو خاصا ملکہ حاصل تھا۔

"تیرا کیا نام ہے" سلطان نے اس سروی نوجوان کو سر سے پیر تک دیکھکر.. دل ہی دل میں اس کے موزوں جسم اور خوبصورت تناسب اعضا کو جذبہ تعریف سے خیال کرتے ہوئے کہا.. اس شخص کی خوبصورتی اور اُس کے ساتھ حسن شباب ۲۱ سالہ مردانہ وجاہت کے ساتھ مل کر بلا کا نظارہ پیش کر رہا تھا..

"مالوش قزلباش" جواب ملا..

"اور تیرا کام.... مقصد.." سلطان نے سوال کیا..

"والا قدر.. اعلیٰ حضرت۔ عالی مرتبت.. لازر شاہ سرویہ نے مجھے سفید علم کے ساتھ حضور پُر نور کی خدمت میں اس لئے روانہ کیا ہے.. کہ میں مبادیات صلح طے کروں.. شاہ لازر

اچھی طرح واقف ہو... کہ ترکی لشکر اُس کے لشکر جرار کے مقابلہ میں بلحاظ تعداد کوئی بھی مناسبت نہیں رکھتا.. وہ یہ بھی جانتا ہو.. کہ یورپی قواعد جنگ اس درجہ بہتر و اعلیٰ ہیں.. کہ جن کی برتری عثمانی فوج کی مشرقی قواعد دانی پر ظاہر و معلوم.... تاہم شاہ لازر اپنی وفادار رعایا کا بلاوجہ خون نہیں کرانا چاہتا.. اور اس لئے اُس نے مجھے ایسی شرائط صلح طے کرنے کے لئے روانہ کیا ہو... جو ایک دائمی امن و امان کا پیش خیمہ ثابت ہوں۔"

"اے نوجوان سلطان نے بہت ہی پُرسکون لہجے میں نظریں اُٹھا کر کہا۔ "تیرا فرض نہایت لغو و بیہودہ ہو.. تو نہیں جانتا.. کہ سلطان مراد سے... ایک باجگزار کی حیثیت سے علیٰحدہ ہو کر.. مساویانہ طریق پر گفتگوئے صلح کرنا.. عثمانی علم و اقتدار کی ہتک کرنا ہو۔"

"عالی جاہا... میرا فرض اُس نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے.. جن کے لئے حضور پُرنور نے بہ نفسِ نفیس... اور عالی جاہ کی ہمراہی فوج نے یہاں تک سفر کرنے کی زحمت گوارا کی ہو.. بہت زیادہ دلیری و شجاعت کا مظہر نہیں.." مالوش نے بہت ہی دلیری سے جواب دیا..

"اے گستاخ سروی... اگر تیرا شباب تیری سفارش نہ کر رہا ہوتا.." سلطان کی ابروؤں پر بل آگیا.. اور اُس نے غضبناک ہو کر کہا: "تو اس وقت صرف تیرا خون ہی ان گستاخانہ الفاظ کو دھو سکتا تھا... جا دور ہو... اور اپنے آقا سے کہدے.. کہ سلطان مراد تجھ سے بہتر جانتا ہو.. کہ کس طرح دشمن کو مفتوح کر کے اُس کا سر کچلا جاتا ہو.. جا.. میں تیری خطا سے درگزر کرتا ہوں... اور یقین رکھ.. کہ میں انشاء اللہ بہت جلد پا بجولاں کر کے بروصہ لے جاؤں گا... سن.. جس وقت تو اس فوجی پڑاؤ سے باہر ہو جائے... تو سمجھ لے.. کہ ہمارے درمیان عدویانہ جنگ کا آغاز ہو گیا... اگر اپنے مالک کے پاس واپس جاتے ہوئے.. اثناء راہ میں تجھے میری فوج کا کوئی دستہ نظر آجائے... تو تجھے اختیار دیا جاتا ہو... کہ تو اُن پر برابر حملہ کر دے... اور اگر تو اُن پر کامیاب ہو جائے..

تو انھیں گرفتار کر.. قتل کر... یا جو تیری مرضی ہو.. اور اگر اس کے برعکس تو نا کامیاب ہو کر خود گرفتار ہو جائے.. تو یاد رکھ.. کہ تیرا دوبارہ یہاں آنا.. لابدی موت ہو گی...

بس جا...... دور ہو.. یہ ہے.. تیرے پیغام کا جواب..“

مالوش کے خون میں جوش آگیا.. دنیا سیاہ ہو گئی... وفور غضب نے سینہ میں تلاطم ...روح میں ہیجان پیدا کر دیا.. قریب تھا.. کہ وہ زبان سے ان الفاظ کا کچھ جواب دے۔ کہ معاً بقد بیگ تیمور تاش نے اس نوجوان پر رحم کھا کر.. اور یہ ڈر کر کہ کہیں یہ نوجوان سلطانی عتاب کا فوری شکار نہ ہو جائے.. اُس کا بازو تھام لیا... اور اتنا موقع ہی نہ آنے دیا... کہ اس موضوع پر مزید گفتگو ہو سکے.. چنانچہ بجلی کی طرح تیزی سے درمیان آکر وہ مالوش کو ہاتھ پکڑے سلطان کے سامنے سے ہٹا کر باہر نکال لایا.. جہاں مالوش کا محافظ دستہ منتظر کھڑا تھا۔

”اے ناتجربہ کار.. جلد باز نوجوان“ جب دونوں بارگاہ سے کچھ پرے ہٹ کر آئے.. تو تیمور تاش نے کہا ”کیا تو نہیں جانتا.. کہ شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنا.. کیا معنی رکھتا ہے..“

”آف.. سلطان نے ایک باعزت و شریف النسب سروی کی انتہائی ہتک کی ہے۔“ مالوش نے اپنے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا.. ”اور خدا گواہ ہے.. کہ میں اس کا انتقام لوں گا۔“

”بے وقوف نوجوان... عمل کر کے دکھا.. لفاظی نہ کر“ تیمور تاش نے طعنہ جو مسکراہٹ سے کام لے کر کہا.. ”مسلمان عمل کی قدر کرتے ہیں“ اس کے بعد اُس نے بہت ہی عنایت آمیز لہجے میں باآہستگی ان الفاظ کا اضافہ کیا.. ”لیکن میں کسی کی غیبت نہیں کیا کرتا... تیرے یہ الفاظ میرے ہی سینہ میں محفوظ رہیں گے... میں انھیں سلطان کے سامنے بیان نہیں کروں گا۔ جا... جلدی کر... اور یہاں سے روانہ ہو جا.. تو نہیں سمجھتا.. کہ اس وقت تو ایک مہیب غار کے دھانہ پر کھڑا ہے...“

بس اتنا کہکر تیمور تاش اس خشمگیں نوجوان کو محافظوں کے درمیان چھوڑ کر.. ایک

نوکر سے مخاطب ہوگیا.. اور اُس کو ہدایت کی.. کہ ان سب کو فوجی پڑاؤ کے باہر بہ حفاظت پُہنچادے..

ترکی پڑاؤ کی عظمت آفریں آبادی.. اور دل فریب نظاروں سے مملو مقام کے باہر آتے ہی مالوسش کے جذبات پھر ایک مرتبہ برانگیختہ ہوگئے اور وہ دانت کٹکٹا کر قسمیں کھانے لگا.. کہ اگر زندگی باقی ہے.. تو اس مغرور سلطان سے ضرور بالضرور بدلہ لونگا.. جس نے میرا استقبال آج اس ہتک آمیز طریق پر کیا ہے..

"بس.. اب." مالوسش نے اپنے محافظ دستہ سے مخاطب ہوکر کہا.. "سمجھ لو.. کہ جنگ کا آغاز ہوگیا..... اور میں ہر مقدس ہستی کی قسم کھاکر کہتا ہوں.. کہ ہمیں کوئی بھی دستہ... یا فوجی رسالہ پڑاؤ کے باہر نظر آئے.. ہم فوراً حملہ کردیں گے.. اور یاد رکھو.. خواہ اُن کی تعداد ہم سے دوگنی ہی کیوں نہ ہو.. کچھ پروا نہ کرنا.. یہی قسم ہم سب کو مجبور کرتی ہے.. کہ یا تو ہم اپنے دشمنوں کو تہ تیغ کرکے ہلاک کرڈالیں یا انھیں گرفتار کرکے اپنے بادشاہ کی خدمت میں لے چلیں... یا پھر میدانِ جنگ میں ہم سب کی جان جائے."

تمام محافظ دستہ کی متفقہ آواز نے اس عزم صمیم پر لبیک کہا۔ اور یہ مختصر رسالہ اُن پُر بہار سبزہ زاروں.. اور نزہت بخش کھیتوں سے جن میں عنقریب انسانی خون کی آب پاشی ہونے والی تھی۔ گزرنے لگا..

قاصد اور اُس کے محافظ دستہ نے مشکل سے ایک میل راستہ طے کیا ہوگا.. کہ انھیں دریائے شیطزا کے دوسرے کنارے پر ایک دستہ سواروں کا نظر پڑا.. آفتاب عالمتاب کی بلندی اس وقت نصف النہار پر تھی.. اُس کی تیز چمک میں انھیں اُن سب کے خودوں پر ہلالی نشان چمکتا ہوا نظر آیا.. اُسی مختصر جماعت میں ایک سمت ایک سوار کے ہاتھ میں سلطنت عثمانی کا ہیبت شکن ہلالی علم بھی ہوا میں فراٹے بھر رہا تھا۔

"آہا.. دشمن!.." مالوسش کی زبان سے نکلا...

یہ کہتے ہی اُس نے اپنے رہوار کی باگ کو جنبش دی .. اور گھوڑا روک کر دشمن کی تعداد کا اندازہ لینے لگا..

"دیکھو .. اس طرف دریا کے کنارے تقریباً سو تیغ باز سوار ہیں .. اور ہم صرف ساٹھ نفر ہیں .. وہ جذبہ شہادت جو ہر شجاع جنگ جو کے سینہ میں ہونا چاہیئے. کس قدر صادق ہے .. کہ ہمیں اپنی اظہار شجاعت و فنون سپہ گری کا اس قدر جلد موقع مل گیا. بس وقت ہے .. کہ میں اپنی قسم کو پورا کروں"

"مالوش ... فتح و نصرت"! اس بہادر سفیر کے محافظ دستہ نے چلّا کر کہا ..

"جوانو .. بڑھو ... اور حملہ کردو" مالوش نے نہایت جوش میں اُسی تیزی سے جواب دیا ..

اُس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی .. رہوار بلا کی سرپٹ سے اُس میدان کو طے کرنے لگا .. جو اُس کے اور دریا کے درمیان حائل تھا .. زرا ہی دیر میں وہ دریا کے ساحل پر پہنچ گیا ... مالوش نے فوراً گھوڑا پانی میں ڈال دیا .. چشم زدن میں وہ اس پار تھا .. اس کا محافظ دستہ بھی برابر عقب میں چلا آرہا تھا .. چنانچہ یہ سب لوگ عثمانی دستہ کے بالکل قریب پہنچ گئے ... مالوش کو پہلی مرتبہ یہ علم ہوا .. کہ یہ محض چند خواتین کو اپنی حفاظت میں لئے ہوئے پڑاؤ کی سمت واپس جارہا تھا ... یہ خواتین برقعہ پوش .. سرتاپا ملبوس .... بلا کی خوبصورت عربی النسل گھوڑیوں پر سوار تھیں۔

اس محافظ فوج کے عین وسط میں جو خاتون تھی .. اُس کے لباس کی ندرت .. اعلیٰ طرق .. اور سواری کی گھوڑی کا کامدار جھول ... اور اُس کے گرداگرد چند برقعہ پوش خواتین کا جھرمٹ ... اُن کا تعظیمی طرزِ عمل ... زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا .. کہ یہ خاتون بہت ہی عالی پایہ اور بلند مرتبہ ہے ..

غرضکہ مالوش نے اس تفریحی دستہ کی سیر و تفریح کو معرکہ رزم و خوں ریزی میں تبدیل کرنے

کے لئے.. عثمانی سواروں کو للکار کر آگاہ کیا.. کہ ہشیار ہو جاؤ..

سروی جوانوں کی عدویانہ روش معلوم کرکے ان سب خواتین کی زبان سے چیخیں نکل گئیں
لیکن ترکی افسر نے یہ دیکھ کر ہماری تعداد دشمنوں سے زیادہ ہے.. اپنے ساتھیوں کو اُبھارا..
اُسے یقین کامل تھا.. کہ وہ بہت جلد ان عیسائی کتوں کو کاٹ کر رکھ دینگے.. مگر افسوس..
ان لوگوں کی یہ آرزو خلاف عقل.. یہ لشکر سے ہرگز اس اُمید پر نہیں نکلے تھے.. کہ راستہ
میں انھیں کہیں بھی جنگ وخون ریزی کا مقابلہ کرنا پڑے گا... زیادتی نفوس... بلا اسلحہ...
جنگ میں کام نہیں دے سکتی..

بس چشم زدن کی دیر تھی.. کہ جاں نثاران صلیب وہلال معرکہ آرائی میں مشغول ہو گئے..
خوں باری کا سماں قائم ہو گیا... ایک لمحہ کے لئے ایسا معلوم ہوا.. کہ ترکی سواروں نے
بازی مارلی.. مگر سروی سواروں کی چابک دستی.. اور جوش انتقام اس موقعے پر کام آیا
.. اور اُنھوں نے زیادتی تعداد کو بہت جلد کم کر دیا.. ترکی تیغ بازوں کے تیغے دشمن کی فولادی
زرہ بکتروں کا کچھ نہ بگاڑ سکے... اور اُن کی ساری جدوجہد بے کار و رائیگاں گئی..

جب حالت جنگ قائم ہوئے تھوڑا عرصہ ہو گیا.. تو مالوش نے اپنے آدمیوں کو اشارہ
کیا.. کہ وسطی حصہ کی طرف زور ڈالو... چنانچہ اُس نے خود پیش قدمی کرکے اس طرف
گھوڑا بڑھایا.. بس یہ حملہ فیصلہ کن تھا.. ترکی سواروں نے قدم قدم پر دشمن کو روکا مگر تاکجا
... آخر سب مارے گئے.. یہاں تک کہ دستہ کا ایک ایک فرد اپنے فرض حفاظت میں قربان
ہو گیا۔ بس ایک ہی گھنٹے کے قلیل عرصہ میں جنگ کا فیصلہ یکسو ہو گیا.. مالوش کے سواروں
نے ترکی سواروں کا قلع وقمع کرکے... شاہزادی اور اُس کی محافظ سہیلیوں کو نرغہ میں
لے کر گرفتار کر لیا..

"نازآفریں حسینہ.. خوف نہ کر.." نوجوان فاتح نے.. خوف زدہ دوشیزہ کی
طرف بڑھ کر کہا "تم فیاض دشمنوں کے ہاتھ میں ہو.... اور اگر قسم کا پاس نہ ہوتا.. جو مجھ

ظالم مراد کے کہنے سے مجھ پر واجب ہو گئی... تو یقین ہے.. کہ..."

"او عیسائی... مراد میرا باپ ہے.. خبردار.. اُس کی بابت کوئی کلمہ بدزبان سے نہ نکالنا.." شاہزادی نے بہت ہی مستقل لہجے میں کہا... "اور اس بدبخت ساعت کی قدر کر.. کہ شاہزادی نیلوفر تیرے ہاتھوں قید ہو گئی.."

مالوش چونک پڑا.. آہ.. یہ کون تھا.. شاہزادی نیلوفر... جس کے عدیم المثال حسن جہاں سوز کے چرچے اُس نے غائبانہ طور پر بہت سُنے تھے.. اور لوگوں کا بیان تو یہاں تک تھا.. کہ مملکت عثمانی میں اُس کے حسن کا جواب ملنا محال و ناممکن تھا..

آہ.. یہ خوبی قسمت.. کہ ملکہ حسن... سرخیل خوبان. شاہزادی نیلوفر آج سرزمین یورپ میں اُس کی اسیر تھی..... اب عجیب گومگو کا عالم تھا.. آیا وہ اُس کو اپنے آقا.. اپنے مالک شاہ لازر کے پاس لے جائے.. یا پھر اُسے اجازت دیدے.. کہ وہ بہ حفاظت اپنے پدر بزرگوار سلطان مراد کی خدمت میں چلی جائے..

اس نوجوان سردار کے دل میں جذبات کی جو کشمکش واقع ہوئی.. اُس کی نوعیت بغایت دل خراش تھی.... مگر پاس خودداری.. قسم کا لحاظ... اس موقعے پر غالب آیا... اور وہ فرائض کی مجبوریوں کو نظرانداز نہ کر سکا.. اُس نے دل پر انتہائی قابو پانے کے بعد حسرت بھرے الفاظ میں وہ واقعات بیان کئے.. جن کے زیر اثر وہ شاہزادی کو ایک باعزت قیدی کی حیثیت سے شاہ بوسینیا کی خدمت میں لے جانے پر مجبور تھا. جو اس وقت اتحادیوں کی ہراول فوج کا قائد اعظم تھا... اس کے بعد پھر اُس کی قسمت کا آخری فیصلہ شاہ لازر.. سپہ سالار اعظم کے حکم پر منحصر رہے گا..

"فیاض اجنبی.." شاہزادی نے باوقار انداز سے کہا.. "تیرا اخلاق.. تیری رواداری.. خود اس امر کی کافی ضمانت ہے.. کہ تیرے افسرانِ بالا بھی میرے ساتھ خاص توجہ و عزت سے برتاؤ کریں گے.. مجھے معلوم ہے.. کہ اہالیانِ یورپ اپنے قیدیوں سے

نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔۔ اور بہت ممکن ہے۔۔ کہ عنقریب میرا باپ ایک کثیر رقم زرِ فدیہ بھیجکر میری مخلصی کرا لے۔"

مالوشں نے بہت ہی موزوں و مودب الفاظ میں شاہزادی نیلوفر کو مکرر یقین دلایا۔۔ کہ وہ اُس کے افسرانِ بالا کے ہاتھوں کسی سختی و بُرے برتاؤ کا قطعی خوف نہ کرے۔ اس طرف شاہزادی نے اپنے اسیر کرنے والے پر یہ ظاہر کرنے کے لئے۔ کہ وہ کس درجہ اُس کی ممنونِ احسان ہے۔۔ اپنے برقعہ کا نقاب اولٹ دیا۔۔۔ اُس زمانہ میں مشرقی ممالک میں یہ عام قاعدہ تھا۔۔ کہ اگر کوئی خاتون کسی غیر جنس پر اپنے دلی شکریہ کا اظہار کرنا چاہے۔۔ تو وہ بالکل بے حجابانہ نقاب اولٹ کر سرِ تسلیم خم کر دیتی تھی۔ اس میں انتہائی التجائے رحم کے علاوہ۔۔ ممنونیت تعظیم۔۔ اور احساس تشکر یہ بھی مضمر ہوتا تھا۔۔

مالوشں کو یہ اُمید تھی۔۔ کہ شنیدہ روایات کے مطابق اُس کے سامنے کوئی خوبصورت چہرہ برآمد ہوگا۔۔ مگر جس وقت وہ نقاب اُس روئے آفتاب سے ہٹی۔۔ تو مالوشں پر ایک بجلی سی گر پڑی۔۔ اور حسن عالم سوز کی ضیاء جلوہ ریز نے اُسے بوکھلا دیا۔۔ اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔۔

اف۔ یہ کیا تھا۔۔۔ حسن۔۔۔ یا حسن کا حسین ترین نمونہ۔۔۔ آج تک اُس کی قوتِ تخیلہ بھی ایسی حسین تصویر کے تصوّر سے محروم تھی۔ اس کا ملائک فریب حسن۔۔ انسانی عقل کو ورطۂ حیرت میں ڈال سکتا تھا۔۔ کہ آیا واقعی یہ اسی دنیا کی کوئی ہستی ہے۔۔ یا حورانِ جنت کی ملکہ۔۔ جس کا بے عیب حسن۔۔ تابِ نظر بھی برداشت کرنے کے ناقابل تھا۔۔

ملک ہنگری بھی پری جمالوں کے حسن کے لئے مشہور ہے۔۔ اور مالوشں نے اس وقت تک بہت سی حور وش خواتین کو دیکھا تھا۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر اس فوق الفطرت حسن کے مقابلہ میں یورپی حسن و خوبروئی۔۔ ایک مضحکہ خیز مذاق تھی۔ وہاں عالم شباب یہاں صرف عمر۔۔ وہاں کی خوبروئی۔ یہاں کے پاؤں کا دھوون۔۔ وہاں کی نزاکت یہاں پاسنگ کے برابر بھی نہ تھی۔۔

ہمارے پاس اتنے کافی الفاظ ہی نہیں .. کہ ہم اُس حالت اضطرار کا صحیح نقشہ پیش کریں .. جو اس تاجدار محبوبی .. ملکہ حسن ... غیرت حور .. شاہزادی کے بے عیب حسن اور متناسب اعضا کو دیکھکر مالوش پر طاری ہوئی ..

اس کے محافظ سوار اپنے قتل کردہ دشمنوں کو لوٹنے کھسوٹنے میں مصروف تھے .. صرف اکیلا یہ تھا .. یا اُس کے سامنے یہ لعبۂ نور ..

شاہزادی کی سہیلیاں ہنوز (اس وقت تک) برقعہ پوش اپنی اپنی مادیان پر بے جان مجسموں کی طرح کھڑی ہوئی تھیں .. خدایا .. سچ تو یہ تھا .. کہ شاہزادی نیلوفر کا اس زمین پر جلوہ گر ہونا ہی .. زمین کے لئے باعثِ فخر و ناز تھا ..

مگر یہ سب اثر محض عارضی .. مالوش کو اپنی وارفتگی اور بد اخلاقی کا احساس کر کے سخت ندامت ہوئی .. اس طرف شاہزادی نیلوفر نے بلا کے دلربانہ انداز سے شرمگیں طریق پر اپنی سیاہ آنکھیں نیچی کر لیں .. اور اس طرف مالوش نے فوراً پاسِ ادب سے اُس کے چہرہ سے نگاہیں ہٹالیں ..

نیلوفر نے فوراً اپنا نقاب درست کیا .. اور ایسا معلوم ہوا .. کہ مالوش اور اُس ہستی کے درمیان جو ذرا دیر پہلے اُس کے دل میں ہیجان پیدا کرنے کا موجب ہوئی تھی .. ایک ناقابل عبور خلیج قائم ہو گئی ..

مقتولین کی لاشوں کا لوٹ کھسوٹ فوراً موقوف کیا گیا .. اور باقی ماندہ دستہ اتحادیوں کی ہراول افواج سے ملنے کے لئے .. مورچہ کی طرف بڑھا ..

اس قطع مسافت میں دو روز صرف ہوئے .. اثناء راہ میں صرف شاہزادی کو کافی آرام پہنچانے کے لئے مالوش نے معمول سے زیادہ پڑاؤ ڈال دیئے .. تاکہ راستہ کا تکان شاہزادی کی طبع نازک کو بار خاطر نہ ہو .. اور صرف یہی نہیں .. بلکہ اُس کو انتہائی آرام پہنچانے کی غرض سے اُس نے ایک پالکی کا انتظام کر کے اُس پر شاہزادی کو سوار کرایا .. اور خود اپنے محافظ دستہ

کے چند آدمیوں کو دوش بردار بنا کر۔ شاہزادی کو آرام سے جانے کا انتظام کیا۔۔
رات کے وقت ہمیشہ ایک بارگاہ شاہزادی اور سہیلیوں کے قیام کے لئے نصب کرادی جاتی اور کوئی بھی نگہبان نہ مقرر کیا جاتا۔۔ اس لئے کہ شاہزادی نیلوفر نے کہدیا تھا۔ کہ وہ ہرگز بچ نکلنے کی کوشش نہیں کرے گی اور اُس کا یہ کہنا۔۔ مالوش کے اطمینان کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔۔

آخرکار یہ دستہ ہراول فوج کے قیام گاہ میں پہنچ گیا۔۔ مالوش نے فوراً شاہ یوسینا کے پاس ملاقات کا پیغام بھیجا۔۔ باریابی ہونے پر اُس نے اپنی سفارت کی ناکامی اور اُن واقعات کا مجملاً سب حال بیان کیا۔۔ جن کے زیرِ اثر شاہزادی نیلوفر اور اُس کی سہیلیاں گرفتار ہو کر آئی تھیں۔۔

"میں نے مثل دیگر اتحادی بادشاہوں و سرداروں کے شاہ لازر کے احکامات ماننے کا حلف اُٹھایا ہے" طارق۔۔ شاہ یوسینا نے کہا۔ "پس یہ معاملہ بھی اُسی کے حکم کے مطابق طے ہونا چاہیئے۔۔"

"تو پھر عالی جاہا۔۔ از راہ مرحمت خسروانہ کسی قاصد کو سروی کیمپ تک روانہ فرمانے کا حکم صادر فرمائیں گے۔۔" مالوش نے دست بستہ عرض کیا۔ "اس واسطے کہ میں نے بھی اپنی عزت کا واسطہ دے کر اس باعظمت خاتون سے وعدہ کیا ہے۔۔ کہ اُس کی قسمت کا فیصلہ بہت جلد کرا دیا جائے گا۔۔ اس لئے کہ۔۔۔ ایسی کمسن دوشیزہ کو عرصہ تک حالت تذبذب میں رکھنا ایک مہذب بے رحمی و سنگدلی پر محمول ہوگا۔۔"

"تو پھر تو ہی قاصد کا فرض ادا کر۔۔۔ اور شاہ لازر کی خدمت میں جا" طارق کہنے لگا۔۔
"اس اثناء میں میں مقدس ہستی کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔۔ کہ شاہزادی اور اُس کی سہیلیوں کے آرام و احترام میں جو اُن کی شان کے مطابق ہو۔۔ کوئی کمی نہ کی جائے گی۔۔۔"
"تو نیلوفر کی جانب سے میں اعلیٰحضرت کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں" مالوش نے

اس سفارت کے خیال سے خوش ہو کر کہا۔۔ "مجھے تیار ہونے میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ لگے گا۔۔ اس کے بعد میں روانہ ہونے کے لئے قطعی تیار ہو جاؤں گا۔۔ اور کل ہی شام تک انشاء اللہ واپس آ جاؤں گا"

طارق نے اطمینان دلایا۔۔ کہ اس اثناء میں اس کی تیاری تک جملہ تحریرات بنام سپہ سالار اعظم۔۔ بغرض روانگی سروی کیمپ تیار ہو جائیں گی۔۔ چنانچہ یہ نوجوان فوراً شاہزادی نیلوفر کی خدمت میں پہنچا۔۔ اور بہت ہی مودبانہ طریق پر شاہ طارق کے وعدوں اور اپنی امیدوں کا ماحصل بیان کیا۔۔

شاہزادی نے پھر ایک مرتبہ اظہار شکریہ کے طور پر اپنی نقاب ہٹا کر اُسے رخصت کیا۔۔ یہ دوسرا موقع تھا۔۔ کہ مالوش اس حسن جانستاں کو دیکھ کر لٹ کھڑا گیا۔۔ اور ذرا دیر کے لئے محو حیرت بن گیا۔۔

وہ یک بیک ایسے عالم خیال میں پہنچ گیا۔۔ جہاں پاک و معصوم محبت کا جذبہ۔۔ انتہائی پاکبازی و احترام کے ساتھ کسی پر اثر کرتا ہے۔۔ جیوں ہی نقاب پھر اُس روئے روشن پر لکا بر کی طرح چھا گیا۔۔ مالوش کے دل میں ایسا دردسا پیدا ہوا۔ جس طرح انسان کسی احساس راحت کو کھو کر محسوس کرتا ہے۔۔۔ شاہزادی کی یہ سادہ ادائے جانستاں۔۔۔ فلکی حور کے مانند دل نوازانہ انداز۔۔۔ شیر خوار بچے کے مانند معصومیت۔۔ حیا دوشیزگی۔۔۔ اور اُس پر اسیر ہونے کا وہ مخفی حزن و ملال جس کا اثر چہرہ سے عیاں تھا۔۔ ایک ایسا نظارہ تھا۔۔ جس کا صحیح نقشہ بیان کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔۔

ایک ہی گھنٹہ بعد مالوش صرف چھ سواروں کی معیت میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔۔۔ اس لئے کہ اس نے اس موقعے پر زیادہ جماعت رکھنا خود ہی پسند نہیں کیا۔۔ مبادا راستہ میں دیر ہو جائے۔۔ دریائے مرآوا کے کنارو ں سبزہ زاروں میں اُس نے گھوڑے کو بسرپٹ چھوڑ دیا۔ محافظ سوار بھی برابر ہمراہ رکاب چلے آ رہے تھے۔۔۔ اس کے بعد وہ اُس

حصہ ملک کی طرف بڑھا.. جہاں اتحادی افواج کا قلبی حصہ خیمہ زن تھا.. ذات زیادہ گزر گئی تھی.. مگر اُس نے بلا کسی توقف کے منزل مقصود پر پہنچ کر دم لیا... اور صبح ہوتے ہی اُسے شاہ سرویہ کے حضور میں باریابی ہوگئی..

مالوش نے شاہ لازر کے سامنے بہت ہی اختصار سے کام لیا.. تاہم سلطان مراد کے ہاتھوں اپنے سفیر کا یہ استقبال معلوم کر کے لازر کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی. چنانچہ کچھ دیر تک تامل کرنے کے بعد اُس نے کہا..

" تو پھر کیا.. یہ کم بخت ترک.. بلا جنگ کئے باز ہی نہ آئیں گے... افسوس.. میری خواہش تھی. کہ ایسا نہ ہو... مگر وائے قسمت.. نوشتہ تقدیر مٹائے نہیں مٹتا...
اے نوجوان.. زرا یہ تو بیان کر. کہ کیا سلطان کو اپنی قوت پر کامل بھروسہ ہے.. یا یہ سب باتیں محض گیدڑ بھبکیاں ہیں "

" مانا کہ استبداد و ظلم کا مادّہ غالب ہے.. مگر اس میں زرا کلام نہیں.. کہ سلطان مراد شیر سے زیادہ جری و بہادر ہے" مالوش نے جواب میں عرض کیا " اگر میں شاہ لازر یا شاہ سرویہ کی خاطر ہتیار نہ اٹھا چکا ہوتا.. تو میں سچ کہتا ہوں.. کہ یہ تلوار سلطان مراد کے زیر سایہ نیام سے باہر نکل کر جوہر دکھاتی ہے "

" اخاہ - کیا جیسا تو کہتا ہے.. یہی بات ہے" شاہ لازر نے چونک کر کہا.. اور معاً ایک بڈھے مصاحب سے جو اُسی کے پہلو میں بیٹھا تھا.. کچھ سرگوشی کرنے لگا... اور تھوڑی دیر تک اُس سے گفتگو میں مشغول ہونے کے بعد کہنے لگا.. " خیر.. مالوش.. ایک گھنٹہ بعد تم فوراً اپنے آقائے اعظم.. والاجاہ.. شاہ بوسینیا کی خدمت میں واپس جانے کے لئے تیار رہو.. جو ہمارے احکام پر فوری توجہ سے کام لے گا.."

مقررہ وقت گزر جانے کے بعد مالوش کے پاس ایک سربمہر لفافہ بنام شاہ طارق... اور ایک فرمان مشعر عطائے فوجی اعزاز اُس کے پاس بھیجا.. جس میں اُسے

(مالوش کو) فوج کا ایک اعلیٰ سردار بنا دیا گیا تھا.. اس کے بعد شاہ لازر نے خود اپنے ہاتھوں سے چند شاہی تحائف عطا کئے.. اور ہدایت کی.. کہ وہ جلد از جلد سراول فوج کی قیام گاہ کو واپس جائے... یہ حکم عبث تھا.. اس لئے کہ مالوش خود اس بند لفافہ کی تحریر معلوم کرنے کے لئے بیتاب تھا.. اور محض شاہزادی نیلوفر کو حالت تذبذب سے نجات دینے کے خیال سے راستہ میں ٹھہرنا تو درکنار.. وہ ہوا زدئے شوق پرواز کرنے کا متمنی تھا۔

صرف ۲۴ گھنٹے کے قلیل عرصہ بعد وہ پھر ایک بار شاہ طارق کی خدمت میں موجود تھا.. لفافہ حوالہ کیا گیا۔ شاہ بوسینیا نے فوراً کھول کر اُس کا مطالعہ کیا.. مگر دوران مطالعہ ہی میں اُس کے چہرہ پر ایک بادل سا چھا گیا۔

مالوش کے حواس باختہ ہو گئے... یا الٰہی... کہیں غضب تو نہیں ہو گیا.. طارق نے ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا.. اور بحالتِ اضطراب وہ تحریر خود اس نوجوان سردی کے حوالہ کر دی مالوش نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس تحریر کو لیا.. اور خوف و اضطراب کے مشترکہ احساس کے زیر اثر بے چین ہو کر... اُس کی نگاہ نے بحالتِ کرب ان سطور کا مطالعہ کیا... عبارت یہ تھی۔

"اپنے اتحادی بھائی۔ شاہ بوسینیا کے قبضہ میں اسیر شدہ شاہزادی نیلوفر کی بابت ہم متفقہ طور پر یہ حکم صادر کرتے ہیں.. اور واضح کرتے ہیں.. کہ مفصلہ ذیل تدابیر اختیار کی جائیں۔

اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے.. کہ سرویہ و بوسینیا و نیز دیگر باعظمت اتحادی ریاستوں کا مفاد واحد ہے.. اور سلطان مراد خوں ریزی و غارت گری پر آمادہ ہو کر ہمارے پیش کردہ شرائط صلح کو ٹھکراتا ہے.. ہمارا فرض ہے.. کہ ہم مجبوراً اُن تدابیر کو کام میں لائیں۔ جن کو برتنے سے یہ ظالم سلطان سرزمین یورپ سے نکالا جاسکے۔

لہٰذا شاہزادی نیلوفر اپنے باپ کے افعال کی ذمہ دار قرار دی جائے..

اور ہمارے ارادوں کی اطلاع فوراً سلطان مراد کو دیدی جائے .. اور جیوں ہی شاہ بوسینیا کو سلطان کی جانب سے ذرا بھی آغاز جنگ کے آثار معلوم ہوں .. فوراً شاہزادی تیلوفر کا سر قلم کر دیا جائے .. ترک اپنے حتی الامکان کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں گے .. لہذا کیا ضرورت ہے .. کہ ہم خواہ مخواہ کسی ایسی فیاضانہ مثال کا نمونہ پیش کریں .. جس کی تقلید ان بدبختوں سے ہونا قریب قریب ناممکن ہے .."

اس طرف مالوش نے مشکل سے اس خوف ناک تحریر کا مطالعہ ختم کیا تھا .. کہ اتنے میں ایک گھبرایا ہوا سپاہی افتاں وخیزاں شاہ طارق کے خیمے میں در آیا .. اور اطلاع عرض کی .. کہ سلطان مراد نے بیرونی چوکیوں پر حملہ شروع کر دیا ہے .. اور شاید اپنی بیٹی کی نسبت یہ خیال کرکے کہ وہ اس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی .. اس نے فرط غضب میں یہ حکم دیدیا ہے .. کہ ہر عیسائی قیدی ہلاک کر دیا جائے .. چنانچہ تمام عیسائی قیدیان جنگ قتل کر دیئے گئے .. صرف وہ کسی معجز نما طریق سے یہاں تک پہنچ گیا ہے .. اور یہ اطلاع عرض کرنے کے لئے حاضر خدمت ہوا ہے

"آہ ... ستم ... غضب .." مالوش نے ایسی ذہنی اذیت کے زیر اثر جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا .. چیخ کر کہا .. اس لئے کہ وہ خود سمجھتا تھا .. کہ شاہ طارق کو اس موقعے پر کیا کرنا چاہئے تھا .. ہائے .. کیا صورت حال اس قدر جلد ایسی نازک ہو گئی .. کہ ظالم و بے رحم لازر کے احکام کی تعمیل میں کوئی توقف نہیں ہو سکتا ..

"اب کوئی چارۂ کار نہیں" طارق نے کہا۔ "میرے حلف کا خدا ناظر ہے .. اور جب تک کہ میں اتحادیوں کا شریک ہوں .. میرا فرض ہے .. کہ لازر کے احکام کی تعمیل کروں .. اور خاص کر ایسے نازک موقعے پر تو میں اس سے سرتابی کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا .."

"تاہم التجائے رحم شاید کچھ موثر ثابت ہو" مالوش نے ہاتھ جوڑ کر .. شاہ بوسینیا کے قدموں پر سر رکھتے ہوئے کہا ..

"مالوش۔۔ اٹھ۔۔ کھڑا ہو۔۔" طارق نے بے حد متاثر ہو کر کہا۔ "یہ حکم زبردست ہے۔۔ ہر ایک التجا بے کار ثابت ہوگی۔"

"عالی جاہا۔۔ میرے آقا۔۔ صرف دو روز کی مہلت عطا ہو۔ تاکہ میں پھر ایک مرتبہ شاہ لازر کی خدمت میں پہنچ کر واپس آسکوں" مالوش کی آواز دبے ہوئے جوش گریہ کی وجہ سے گلوگیر ہو گئی۔ "آہ۔۔۔ صرف دو روز کی مہلت۔۔ میں وہاں پہنچ کر لازر کے تخت کا پایہ تھام کر درخواست کروں گا۔۔ قدموں پر سر رکھ دوں گا۔۔۔ کہ خدارا۔۔ ایک معصوم و بے گناہ ہستی پر رحم کیا جائے۔۔ میں اُس کے مصاحبین اور تمام سرداروں کے سامنے التجا کروں گا۔۔ کہ حریفانہ جنگ میں ایسے مذموم فعل سے داغ نہ لگایا جائے۔۔۔ اوہ۔۔۔ مجھے اُمید ہے کہ۔۔ میں معافی نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"ناممکن۔۔ محال" شاہ طارق نے اپنی پرنم آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "یہ ناممکن ہے۔۔ فوج کا دل یوں ہی ہراساں و برداشتہ خاطر ہو رہا ہے۔۔ ایسے موقع پر کسی جرنیل کا حکم عدولی کرنا۔۔ نہایت خراب نتائج پیدا کرے گا۔۔۔ مالوش۔۔ یقین کر۔۔۔ خدا جانتا ہے۔۔ موقع کی نزاکت ایسی ہے۔ کہ اگر اِس وقت میری بھی بیٹی ہوتی۔۔ تو اُسے بھی ہلاک کرنا ہوتا۔"

"ہلاک۔۔۔۔۔ ہلاک۔۔۔ آہ نہیں۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔ اُس کے بجائے میں اپنی جان دیدوں گا۔" مالوش نے رحمدل۔۔ مگر مجبور و لاچار طارق سے انتہائی التجائی لہجہ میں شدت کرب سے تڑپتے ہوئے کہا۔ "آہ۔۔۔ میرے آقا۔۔۔ زبان سے ہلاکت کا لفظ نہ نکالئے۔۔۔ اف۔۔۔ اُس آفتابِ معصومیت۔۔۔ بے گناہ ملکہ جوردش کا ذکر کرتے ہوئے۔۔۔ ایسا لفظ زبان سے نہ نکالئے۔۔ میرے لئے تو موت صرف ایک خواب۔۔۔ معمولی واقعہ۔۔ یا ایک عالم سے دوسرے عالم میں تبدیل ہونے کا نام ہے۔۔ مگر جب اُس عزیز و شیریں نام نیلوفر کے ساتھ۔۔ یہ لفظ زبان سے نکلتا ہے۔۔ تو میں کس طرح اپنا دل چیر کر دکھاؤں کہ اس لفظ کا اثر کتنی کریہہ و مہیب صورت اختیار کر لیتا ہے۔۔"

"افسوس۔ کوئی علاج ... کوئی چارہ کار نہیں۔" طارق نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"میرے آقا ... میرے مالک ... بے شک ... صرف ایک ترکیب ایسی ہے۔ جس سے یہ خونریزی ٹل سکے ..." مالوش کے زرد چہرے پر یکایک کسی امید افزا خیال نے سرخی پیدا کردی ... اور اس نے خوش ہو کر کہا۔ "بس حضور یہ کہدیں۔ کہ وہ حکم آپ تک پہنچا ہی نہیں" میں تسلیم کرلوں گا۔ کہ وہ مجھ سے راستہ میں گم ہوگیا۔ یا میں نے تباہ کردیا۔ بہرحال جیسا بھی موقع ہوا ... صرف مہلت مل جائے ..."

"اور ہماری اس تمام گفتگو کا عینی گواہ ..." طارق نے اس خبر رساں سپاہی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ جس کی موجودگی کو مالوش شدتِ کرب میں قطعی نظرانداز کرگیا تھا۔

"آہ ... حضور ... یہ بھی ایک باغرت شخص ہے۔ یہ ہمارا راز محفوظ رکھے گا ..." مالوش نے اس شخص کی طرف لپک کر التجائی لہجے میں اس کا ہاتھ دابتے ہوئے کہا۔ "برادر بجاں۔ تم ہمارا راز محفوظ نہ رکھوگے۔ کیا تم اتنا بھی نہیں کرسکتے ... اس کو صرف یہ سمجھ لو۔ کہ تم نے کسی ایسے شخص کی گفتگو کا کچھ حصہ سن لیا تھا۔ جو اب مرچکا ... اس دنیا سے رخصت ہوچکا ... ہاں ... تم اتنا کرسکتے ہو ... بولو ... بولو ... جلد جواب دو۔"

یہ شخص کچھ جواب دینے ہی والا تھا۔ کہ طارق نے یک دم کسی قدر سخت لہجے میں قطع کلام کرتے ہوئے کہا ...

"مالوش ... سمجھ ... عقل سے کام لے۔ اس بچپنے سے باز آ۔ میں نے وہ حکم دیکھ لیا ہے۔ اور مجھے اس پر عمل کرنا پڑے گا ... رنج و افسوس لاحاصل ہے۔ فرض کی مجبوری بھی انسان پر لازمی ہے۔ یہی کاغذ اس امر کی ضمانت ہے۔ یہی کاغذ اس حکم کا حامل ہے۔ جس سے سرتابی کرنا میرے حیطۂ امکان سے باہر ہے ... یاد رکھ ... یہی وہ زندہ ثبوت ہے۔ جو میری عدول حکمی اور سرکشی کا بیّن ثبوت ہوگا ... اور میں کوئی بھی جواب پیش نہ کرسکوں گا ..."

"تو کیا حضور ... اسی پر عمل پیرا ہوں گے ... اور کسی بیکس کی بات نہ سنیں گے ..."

مالوش نے اُس تحریر کو جسے وہ اس وقت تک ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ شاہ طارق کو دکھلاتے ہوئے کہا۔ "اگر میں اسے حضور تک پہنچاتا ہی نہیں ۔ ...... تب ... "

"تو شاہزادی نیلوفر زندہ رہتی ۔۔ اور تجھے میدان قرنوہ کے سب سے زیادہ بلند درخت پر پھانسی دی جاتی ۔" طارق نے جواب دیا ۔۔

"کیا اس پرزہ کا کھو جانا ۔۔ گر پڑنا ۔۔ کسی صورت سے جاتا رہنا ۔۔ ممکنات سے نہیں " مالوش نے نت نئی تجاویز بہت سوچتے ہوئے ... پیشانی پر ہاتھ پھیر کر کہا ۔۔

"نہیں ۔۔ مجھے اپنے افعال کی ضمانت میں اُس کی موجودگی کی سخت ضرورت ہے ۔۔" شاہ بوسینیا نے کہا " اس لئے کہ بغیر اُس کے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔۔ "

" تو پھر اس کی موجودگی کی قطعی ضرورت نہیں ۔۔ " مالوش نے بغایت ہولناک آواز سے کہا اور یہ کہتے ہی کہتے اُس نے سپہ سالار اعظم کے حکم کو چاک کر ڈالا ۔۔ اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ایک طرف آگ میں ڈال دیا ۔۔ جہاں وہ چشم زدن میں جل کر خاکستر ہو گئے ۔۔

" کم بخت ۔۔ بدنصیب ۔۔ یہ تونے کیا کیا ۔" یکایک لپک کر ۔۔ اور مالوش کا بازو سختی سے پکڑ کر ۔۔ طارق نے گرجتے ہوئے کہا ۔

" بس ۔۔ میرے آقا ۔۔۔ اب حضور کے پاس کوئی حکم نامہ نہیں رہا ۔۔ " مالوش نے بہت سکون کے ساتھ جواب دیا ۔۔

طارق اپنے خیمے میں اس طرف اُس طرف قدم زنی کرنے لگا ۔۔ اُس کی زبان سے غصہ و حسرت میں الفاظ نکلتے جاتے تھے ۔۔ اس پر اس وقت وہی اضطرابی کیفیت طاری تھی ۔۔ جو چند لمحہ قبل مالوش پر اپنا اثر دکھا چکی تھی ... رہ گیا مالوش ۔۔ اُس کی سنجیدگی و اطمینان خاطری دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا ۔۔ کہ وہ اس وقت ایک بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔۔ اور طارق اُس کا ماتحت مجرم ہے ۔

" سپاہیو ۔۔ " طارق نے یک دم اپنے خیمہ کے دروازہ پر رک کر آواز دی ۔۔

چشم زدن میں ساری بارگاہ سپاہیوں سے پُر نظر آنے لگی۔
"میں تم لوگوں کا قیدی ہوں" مالوش نے اپنی تلوار نیام سے نکال کر۔ افسر کے حوالہ کرتے ہوئے کہا۔۔
"دیکھو۔۔ اس کی کافی نگرانی کرو۔۔ اور یہ سمجھ لو۔۔ کہ اس کی حفاظت پر تمہاری جانیں منحصر ہیں"۔ طارق نے حکم دیا۔
جب سپاہیوں نے مالوش کو اپنے درمیان لے لیا۔۔ اور اُسے لشکرگاہ کے آخری حصہ میں لے جاکر قید تنہائی میں رکھا گیا۔ اور اتنی سخت نگرانی مقرر کی گئی۔۔۔ کہ اگر یہ غریب کسی قسم کی کوشش بھی کرتا۔ تب بھی وہاں سے بچ نکلنا دشوار و محال تھا۔
مالوش کی یہ عدول حکمی بغایت سنگین تھی۔۔۔ چنانچہ شاہ بوسنیا نے فوراً اس کی اطلاع شاہ لازر کی خدمت میں پہنچائی۔۔۔ مگر اس نوجوان سردی اور شاہزادی نیلوفر کے بابت کسی فوری حکم سے کام نہیں لیا گیا۔۔ اس لئے کہ لازر اس اطلاع کو موصول کرتے وقت خود بھی ہراول فوج سے شرکت کرنے کی غرض سے تیاریاں کر رہا تھا۔۔ اب سلطان مراد سے جنگ ہونا۔ ایک لازمی بات تھی۔
چنانچہ چند روز اسی طرح گزر گئے۔۔ مالوش اور شاہزادی نیلوفر۔۔ دونوں جاں فرسا حالت تذبذب میں مبتلا رہے۔
شاہزادی کو ان تمام واقعات کی خبر پہنچ چکی تھی۔۔۔ ایک طرف اگر اس کو اس نوجوان سردی کے شجاعانہ کارروائی پر خوشی تھی۔۔۔۔ تو دوسری طرف اپنی اور اس کی قسمت کے فیصلے کا انتظار سوہان روح بھی تھا۔۔۔ تاہم مالوش کا یہ سرفروشانہ عمل ایسا نہ تھا۔۔۔ کہ اس کے پاک اخلاق پر اثر انداز نہ ہوتا۔۔۔ وہ سمجھتی تھی۔۔ کہ یہ سب کارروائی محض اُس کو بچانے کے لئے کی گئی تھی۔۔ یک بیک اُس کی فضائے دل پر کسی پُراسرار پرتو نے عکس ڈالا اور اُسے محسوس ہوا۔۔ کہ وہ مالوش کی کس درجہ ممنون احسان ہے۔۔۔ اور وہ کون سی صورت

ایسی ہو سکتی ہے جس سے اس بار احسان کا معاوضہ دیا جا سکے ..

آہ .. یہی وہ جانستاں اثر ہے .. جس کی جاں گداز ہوا .. غنچۂ دل کو پژمردہ بنا دیتی ہے .. یہ پاک و معصوم دوشیزہ کیا سمجھتی تھی .. کہ حضرت عشق اسی طرح پینگیں بڑھایا کرتے ہیں

معرکۂ قزوہ کے ایک روز پیشتر شام کو جب کہ تمام اتحادی افواج کے سردار .. مع اپنی اپنی فوج کے ترکوں سے مقابلہ کرنے کے لئے جمع ہو گئے .. تو شاہ لازر ... شاہ طارق ... اور سرداران افواج ہرزگو نیا .. البانیا .. و دیگر اتحادین .. شاہ سرویہ کی بارگاہ میں کھانا کھانے کے لئے اکٹھے ہوئے ... اس وقت بارگاہ میں جو عیش و نشاط کا سامان تھا .. اور جس غیر مہذب طریق پر اُس کا استعمال ہو رہا تھا .. اس کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا .. کہ کسی بڑے معرکہ کے فتح ہو جانے کے بعد یہ جشن منایا جا رہا ہے ... نہ یہ کہ اس کی صبح کو کوئی خوں ریز جنگ ہونے والی ہے .. شراب پینے میں کسی نے ادھار باقی نہیں رکھا .. روٹی پیٹ سے زیادہ بھری گئی .. مذاق ... ہنسی دل لگی .. لہو و لعب میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا .. بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا تھا .. کہ شرکاء مجلس اس بات سے قطعی بے خبر ہیں .. کہ صرف چند ہی گھنٹے بعد اُن کے پُر غرور خود میدانِ جنگ میں ٹھوکریں کھاتے پھریں گے .. یا کسے علم تھا .. کہ اُن کے کاسۂ سر کسی گھوڑے کی ٹاپ سے پائمال نظر آئیں ..

واقعی بیباکی و بے شرمی کی یہ اعلیٰ مثال تھی .. کہ جس وقت انسان کو موت کی بھیانک صورت دیکھ کر کانپ اُٹھنا چاہئے .. وہاں یہ لوگ شراب نوشی .. عیش و نشاط ... رقص و سرود .. اور ساغر لنڈھانے میں مشغول تھے .. کیا فانی انسان کی بد تہذیبی اس سے زیادہ نادر مثال پیش کر سکتی ہے ..

"کیوں ... ہمارے نوجوان دوست بلوشس کا کیا حال ہے ؟" شاہ لازر نے نشۂ شراب میں مست ہو کر سوال کیا ..

"آہ .. غریب نوجوان .." طارق کہنے لگا .. "کاش آپ اُس کے لئے موت کے علاوہ

کوئی دوسری سزا تجویز کرسکیں .. وہ ایک قابل قدر بہادر سپاہی ہے۔ اگر سچ پوچھئے .. تو اس عدول حکمی کی تہ میں رازِ محبت کام کر رہا تھا ..''

''اخاہ .. یہ بات ہے ..'' شاہ سرویہ نے کہا .''میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا .. لیکن ایک سپہ سالارِ اعظم کی حیثیت میں ... و نیز ایسے وقت میں جب کہ جنگ کا آغاز سر پہ ہو .. میں اس کے اظہار کی جرأت نہ کرسکتا تھا ..''

''اے شاہ لازر'' طارق نے بہت مستقل لہجہ میں جواب دیا .. ''میں اس نوجوان کے لئے خود نگاہ رحم کی درخواست کرتا ہوں .. اور جانتا ہوں .. کہ اس کے برابر شجاع و جری میرے تمام سرداروں میں کوئی نہیں .. علاوہ بریں میں نے آپ سے وہ تمام واقعات بیان کردیئے ہیں .. جن کے زیر اثر یہ شخص فوجی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کا مرتکب ہوا''

''کل کی جنگ میں اُس کے لئے کوئی سخت کام تجویز کردیجئے'' سردار البانیہ نے تجویز کیا'' اور اس طریقے سے اُس کی آزمائش کیجئے ... معلوم تو ہو .. کہ ہمارے برادر .. شاہ بوسینیا نے اس کے متعلق کہیں غلط رائے تو قائم نہیں کرلی ہے''

''شاباش ... مرحبا .. یہ بالکل درست ہے ..'' لازر نے خوش ہو کر کہا .. اور فوراً حکم دیا .. کہ مالوش قزلباش کو سامنے لایا جائے .

''لیجئے .. یہ بہادر دغاباز آگیا ..'' جس وقت مالوش بارگاہ کے اندر داخل ہونے لگا .. تو طارق نے کہا ..

''صرف تو .... میرے آقا ... میرے مالک ... میرا سچا ہی خواہ و ہمدرد ہے'' مالوش نے شاہ بوسینیا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے پُرجوش لہجہ میں کہا ..

''اے نوجوان .. ناعاقبت اندیش یہ نہ کہہ ..'' لازر نے کہا . ''کیا تو نہیں جانتا .. کہ ہم سب اس وقت تیرے ہی مدد کے لئے جمع ہوئے ہیں''

''بس میری جاں بخشی فرمایئے ..'' مالوش نے یکایک کسی فوری اُمید سے خوش

ہوکر کہا۔ " میرے آقائے نامدار۔ میری اور ... کی جاں بخشی کیجئے ... اور وہ شرط بیان فرمائیے۔ جو اُس کے عوض میں مجھ پر عائد کی جائے۔"

" بشرطیکہ اُسے شاہزادی نیلوفر کے مصائب سے کوئی تعلق نہ ہو" شاہ طارق نے نوجوان مالوشں کے پرستار دل کو مزید تقویت دینے کی نیت سے۔ ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

" بیشک ... میرے آقا۔ بیشک ... ہاں۔ اس شرط کا اُس معصوم سے کوئی تعلق نہو۔ اس کے علاوہ میں ہر ایک امر کے لئے تیار ہوں۔"

" اچھا تو ... پھر اس نوجوان کی آزمائش کرنا ضروری ہے۔" شاہ لازر نے کہا۔ اچھا مالوشں۔ سن۔ شاہ خاور کے طلوع ہوتے ہی۔ کل صبح عیسائی افواج۔ نامرد و نابکار ترکوں سے دست بدست جنگ کرنے کے لئے میدان میں آترینگی۔ اب چونکہ تو نے میری مقرر کردہ شرط کو پورا کرنے کی قسم کھائی ہے۔ اس لئے یاد رکھ۔ اگر تو اس کو پورا کرنے میں کامیاب ثابت ہوا۔ تو تیری اور شاہزادی نیلوفر کی جاں بخشی کی جائے گی ... ورنہ ... ... تو خوب سمجھتا ہے ... "

" فرمائیے ... فرمائیے۔ میرے آقائے نامدار ... بیان کیجئے۔" مسرور مالوشں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ " جو مزاج عالی میں آئے ... کہہ دیجئے ... حضور ملاحظہ کریں گے۔ کہ میں اُسے کس خوشی و مسرت سے انجام دیتا ہوں۔ اور میں اس وقت تمام مقدس ہستیوں کی قسم کھا کر عرض کرتا ہوں۔ کہ وہ خدائے برتر۔ جو میرا ... حضور کا۔ اور جملہ مخلوق کا پیدا کرنے والا ہے۔ حاضر و ناظر ہے۔ اگر میں اُس سے انحراف کروں۔ تو اُس کا غضب براہ راست مجھ پر نازل ہو۔"

" اچھا۔ تو سن۔ وہ کام یہ ہے۔" شاہ لازر نے ایک ایسے تبسم کے ساتھ جس سے فاتحانہ انداز ٹپکا پڑتا تھا۔ کہا۔ " اگر تو نے اُسے پورا کر دیا۔ تو اُن نا ہنجاروں کی بھی زباں بند ہی ہو جائے گی۔ جو غیبت میں یہاں تک کہنے سے نہیں چوکے۔ کہ سلطان مراد کی دختر کے انداز جانستاں۔ حسن بے مثال ... اور شباب لاجواب نے عیسائی بادشاہوں کے حواس خمسہ آڑا دیئے

ہیں۔ کل میدان ترزوہ معرکہ جدال و قتال ہوگا.. اگر ترکوں کو کامیابی کا کچھ بھروسہ ہے۔ تو صرف سلطان مراد کی اعلیٰ مہارتِ فن پر... بس.. ادھر جنگ کا آغاز ہو.. اور اُس طرف تو اُس مقام کی طرف بڑھ... جہاں سلطان مراد کھڑا ہو.. اور عین سرداروں کے درمیان اُسے قتل کرکے واپس آ... اُن تمام سرداروں کا یک بیک محو حیرت ہوکر بدحواس ہونا یقینی امر ہے.. لہٰذا یہ وقفہ تیرے بحفاظت واپس ہونے کے لئے بہت کافی ہے.. وہ لوگ تھوڑی دیر تک بوکھلاہٹ میں کچھ نہ کرسکیں گے.. اُن کے حواس معطل ہو جائیں گے..،،

جس وقت شاہ لازر کے زبان سے یہ الفاظ نکلے.. جو بادی النظر میں مالوش کی فوری موت کا فتویٰ تھا.. سارے خیمہ میں ایک مہیب سنسنی چھاگئی۔ اس لئے کہ شاہ سرویہ کے مجوزہ حکم کو پورا کرکے ترکی عسا کر سے زندہ واپس آنا... سراسر ناممکن و خلاف عقل بات تھی. شاہ طارق کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں.. اور جس وقت شاہ لازر نے فاتحانہ انداز سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی.. تو شاہ طارق نے عمداً اُس کے حکم کی داد نہ دینے... اور اس پر دبا ہوا اظہار ملامت کرنے کی نیت سے اپنی نگاہیں نیچی کرلیں..

مالوش بھی اس عجیب حکم کو سُن کر لڑکھڑا گیا.. بدحواس ہوگیا.. اُس کا جسم کانپنے لگا.. پیروں میں لغزش ہوئی.. سر چکرانے لگا.. تھوڑی دیر تک اُس پر عجیب عالم طاری رہا.. تاہم کچھ دیر بعد۔ جب اُس کی عقل بجا ہوئی.. اور اُس نے غور کیا تو اُسے اپنی بےلبسی و بےکسی کا احساس ہوا... وہ مجبور و لاچار تھا. اُس نے بہت ہی سخت قسم کھائی تھی... جس کا پاس ضروری و لازمی تھا.. آہ.. مہربانی بھی کسی کی ستم آمیز رہی.... افسوس.. اب کیا چارۂ کار تھا..

اُس پر ایک نزعی کیفیت طاری تھی.. وہ خاموش کھڑا رہا... اور یک دم دیوانوں کی طرح اپنے تمام معزز سرداروں کو سلام کرکے ایک آزاد شخص کی طرح بلا کسی نگراں و محافظ کے اپنے خیمہ میں واپس گیا..

شاہ لازر کو اچھی طرح علم تھا۔ کہ نوجوان مالوش کے نزدیک قسم کو بھنچانا ناممکن ہے۔

خواہ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے.. مگر وہ اپنے قول سے انحراف نہیں کر سکتا..

یہاں مالکوش اپنے خیمہ میں پہنچ کر اپنے آرام دہ بستر پہ گر پڑا.. جو اس وقت اُس کے لئے خارِ مغیلاں سے زیادہ اذیت دہ تھا... اُس کا دماغ جن آلام کا جولانگاہ بنا ہوا تھا... اُس کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے... جس اُمید موہوم پر اُس نے اپنی عزیز جان کو بچانے کا ارادہ کیا... وہ محض ایک دھوکا نکلا... افسوس -- وہ یہ مذموم حرکت کرنے کے بعد کیا اُمید کر سکتا تھا..
اُس کا ضمیر خود ملامت کر رہا تھا... مگر... مگر... وہ کیا کر سکتا تھا.. ایفائے عہد. قسم کا پاس لازمی تھا... خواہ کچھ ہو..

* * * * * *

جنگ کی صبح بنہایت غمناک و پر الم سماں کے ساتھ نمودار ہوئی.. رات کو موسلا دھار بارش ہو چکی تھی.. اتحادی افواج جس میں سروی.. بلغاری.. بوسنیا.. البانیا.. والاشین.. پولینڈ.. اور ہنگاروی شامل تھے.. بہ سرکردگی شاہ لازر.. شاہ طارق.. ووق برانکوش.. میدان میں صف آرا ہوئیں.. دوسری طرف ترکی عساکر کا داہنا بازو.. سلطان مراد کے زیر احکام شاہزادہ بایزید کے کمان میں.. بایاں بازو شاہزادہ یعقوب کے زیر کمان.. اور قلبی فوج کی کمان خود سلطان اور تقلر بیگ تیمور تاش کے سپرد تھی..

سلطان نے آغازِ جنگ کا اشارہ کیا.. جس وقت یہ دونوں حریف لشکران ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوئے ہیں.. اُس وقت کا سماں فانی آنکھیں بہت کم دیکھتی ہیں.. تلواروں کا نیام سے نکلنا.. آفتاب کی کرنوں میں چمک چمک کر.. عدو کا سر.. گردن و بازو کاٹ کر خون سے ڈوبی ہوئی نظر آنا.. زرہ بکتر کے خودوں... اور نکڑوں کا زمین پر گر گر ٹھوکریں کھانا. صلیب و ہلال کا کشمکش کرنا.. ایک ایسا منظر تھا.. کہ خدا کی پناہ.. حضرت عیسیٰ کے جاں نثاران اور اور سر فروشانِ حضرت محمد مصطفٰے کا انتہائی جد و جہد کے بہ.. دست آزمائی کرنا.. اس امر کی شہادت دے رہا تھا.. کہ آج دونوں فریق اس بات پر تلے ہوئے ہیں.. کہ حق و باطل کا فیصلہ کرلیں..

کہ کس کا مذہب سچا اور کس کا جھوٹا ہے۔۔ اور اس کا نتیجہ بس۔۔ فتح و شکست پر منحصر تھا۔۔
یکایک سروی لشکر کی طرف سے ایک معزز سردار۔۔ بلا کے تیز رہوار پر سوار۔۔ انتہائی تیزی کے ساتھ سرداروں کی جماعت سے باہر آیا۔۔ اور مختلف کاوے دیتا ہوا۔۔ چیرتا پھاڑتا۔ صفوں کو درہم برہم کرتا ہوا۔۔ اُس مقام میں در آیا۔۔ جہاں سلطان مراد کھڑا ہوا تھا۔۔ اور فوجوں کو جنگ کے احکامات دے رہا تھا۔۔
سلطان کے گرداگرد جاں نثاروں کی جماعت نے یہ سمجھا۔ کہ یہ شخص وہی سفیر ہے۔۔ جو ایک مرتبہ آچکا ہے۔۔ اور اب شاید دوبارہ سروی بادشاہ کی طرف سے پیغام صلح لے کر آرہا ہے۔۔ انھوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔۔ اور محض اسی دھوکے میں یہ نوجوان سلطان مراد کی جگہ تک باطمینان پہنچ گیا۔
اُف۔۔ چند روز قبل اسی عثمانی سلطان کے ہاتھوں اُس کی سخت ہتک ہوئی تھی۔ اُس کا یاد آنا تھا۔۔ کہ بازوؤں کا زور سوا ہو گیا۔۔ وہ انتقام کا پیاسا تھا۔۔ اور خدا کے روبرو قسم کھا چکا تھا۔ جس سے انحراف کرنا روز حشر میں خدا کا جواب دہ بنتا تھا۔۔
سلطان مراد منتظر تھا۔۔ کہ آپ کی آمد کا منشاء معلوم کرے۔ لیکن اس طرف کیا تھا۔۔ مالوش نے اپنے پہلو سے خنجر نکالا۔۔ اور چشم زدن میں لپک کر سلطان کے پہلو میں بھونک دیا۔۔
سلطان نے دل خراش آہ کا نعرہ مارا۔ زمین پر گر پڑا۔۔ جاں نثاروں نے اس ارتکاب قتل کا مشاہدہ کر کے کچھ ایسے حواس کھوئے۔۔ کہ وہ ذرا دیر کے لئے محو حیرت ہو کر بوکھلا گئے۔۔ اور اس اثناء میں مالوش صاف بچ کر نکل گیا۔۔
اس موقعہ کی نزاکت۔۔ اپنے بچنے کا خیال۔۔ جیسا کچھ اہم تھا۔۔ اُس کا اندازہ ہمارے ناظرین خود کر سکتے ہیں۔۔ مالوش نے اُسی تیزی سے اپنے گرم رہوار کو ایڑ لگائی۔۔ اور بجلی کی طرح وہ اُس مقام سے فرار ہوا۔۔ جہاں اُس نے اپنی قسم کو پورا کیا تھا۔۔ اور جہاں سلطان مراد۔۔۔ اس وقت اپنے تمام حوصلوں و آمیدوں کا دم واپسیں کی طرح انتظار کر رہا تھا۔۔
اس وقت جس مقام پر جنگ ہو رہی تھی۔ وہاں سے ایک میل کے فاصلہ پر نازآفرین نیلوفر

اور اُس کی ہمدم سہیلیاں دریائے شیطرا کے کنارے ایک اعلیٰ بارگاہ میں مقیم تھیں۔۔ نتیجۂ جنگ کے متعلق جو فکر و تشویش نیلوفر کو لاحق تھی۔۔ اُس کا اندازہ کچھ اُسی کا دلِ محزوں خوب کر سکتا تھا۔۔ اُس غریب کو کیا علم تھا۔ کہ مالوش نے کیسے خوف ناک کام کا بیڑا اُٹھایا ہے۔۔ اور اُس نے اُسے کس طرح انجام دیا۔۔ وہ سمجھتی تھی۔۔ کہ اس وقت اُس کی قسمت کا فیصلہ بھی سروی کی شکست پر منحصر ہے۔۔ مگر جس وقت مالوش کی وفاداری کا خیال آتا۔۔ تو اُس کی وہ دعائیں جو وہ اپنے باپ کی فتح و نصرت کے لئے مانگ رہی تھی۔۔ اتنی دلی اور صادق نہ رہتیں۔۔ جو ایک بیٹی کو فطرتاً اپنے باپ کے لئے کرنا چاہئے۔ ملکۂ حسن۔۔ شاہزادی نیلوفر نقاب ہٹائے۔۔ کھلے بندوں۔۔ بارگاہ کے وسط میں بچھی ہوئی مسند زریں پر لیٹی ہوئی تھی۔۔ اور وہ حزن و ملال جو اُس کے چہرہ پر چھایا ہوا تھا۔۔ بلا کا دل فریب جانستاں انداز لئے ہوئے تھا۔ یکایک اُسے گھوڑے کے قدموں کی آہٹ گوش زد ہوئی۔۔۔ اور اُس نے یک دم سراسیمہ ہو کر اُسی کی طرف کان لگا دیئے۔۔ یہ آہٹ اُسی کی بارگاہ کے دروازہ پر ختم ہوئی۔۔ اور چشم زدن میں وہ کیا دیکھتی ہے۔۔ کہ مالوش سامنے کھڑا ہے۔۔

"اے ملکوتی حسن رکھنے والی شاہزادی" نوجوان سروی نے اس آفتاب حسن کے چہرہ پر نظریں ڈالتے ہوئے۔۔ جو اُسے تشکرانہ انداز سے مسکرا رہی تھی۔۔ گلوگیر آواز میں کہا۔ "آہ۔۔ تو میرا خوشی و مسرت سے استقبال کرتی ہے۔ مگر صرف ایک لمحہ کی دیر ہے۔ کہ تو مجھے اپنے سامنے سے ٹھوکر مار کر نکالنے کے لئے مجبور ہو جائے گی۔۔ اور شاید میرا روئے نحس بھی دیکھنا گوارا نہ کرے۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ناممکن۔۔" شاہزادی نیلوفر نے جواب دیا۔ "میں تیری بدل ممنون و مشکور ہوں۔۔ اور صرف تیری ہی بدولت میری جان بچی ہے۔۔"

"ہائے۔۔۔ کس طرح کہوں۔۔۔ ناز آفریں شاہزادی۔۔۔ کیسے کہوں۔۔" مالوش نے بغایت حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ "اگر میں نے تیری جان بچائی ہے۔۔۔ تو دوسری طرف ایک ایسی جان لے بھی لی ہے۔۔ جو تیرے لئے اپنی جان ہی کے برابر عزیز تھی۔!"

"کیا حالت جنگ میں۔۔" رنگی جور نے پوچھا۔ "کیا بدقسمتی سے تو نے میرے کسی عزیز کو

ہلاک کیا ہو..."

"آہ.. ہاں... اور عزیز بھی کیسا.. بے حد عزیز.." مالوش نے قطع کلام کرتے ہوئے جواب دیا.. ..

"کیا میرے کسی بھائی کو.. بایزید کو تو نہیں.... یا شاید یعقوب کو.." نیلوفر نے اپنے دلربا و ماہوش چہرہ پر بڑے بڑے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "لیکن.. لیکن... اگر یہ ہلاکت مساویانہ جنگ میں..."

"نہیں... آہ... نہیں... بلکہ ان ہاتھوں نے بزدلانہ قتل کا ارتکاب کیا ہے" مالوش نے اپنی مٹھیاں زور سے سینہ پر مارتے ہوئے. سخت اذیت دہ لہجہ میں جواب دیا.. "اور یہ سب.. محض ایک نامعقول قسم کی وجہ سے.... افسوس میں ایک خوف ناک قتل کا موجب بنا۔"

"آخر تیرا شکار... تیرا مقتول... بتا تو.." نیلوفر نے بہ عجلت سوال کیا..

"اُف.. تیرا باپ.. سلطان مراد.." مالوش نے لڑکھڑا کر گرتے ہوئے کہا۔ "شاید وہ اس وقت تک زندہ بھی نہ ہو۔"

مالوش فرط یاس... فرط ندامت.. اور کرب و اضطراب میں زمین پر گر پڑا.. شاہزادی نیلوفر پر بجلی سی گر پڑی.. زرا دیر تک انتہائے غم نے اُس کے آنسو خشک کر دیئے.. .. دیوانگی و وحشت نے حواس معطل کر دیئے.... کچھ دیر تک اسی حالت میں رہنے کے بعد اُس کی زبان سے نکلا..

"افسوس... میرے اللہ... میرے لئے اب اس دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں.." ایک آہ سرد بھر کر۔ اُس نے زرا دیر تامل کیا.. اور بجلی کی طرح تیزی سے اپنے دست نازک سے وہ پیش قبض کھینچا.. جو کمر سے لٹکا ہوا تھا.. اور قابل رشک استقلال و دلیری کے ساتھ اُسے اپنے دل کے قریب بھونک لیا.. .. مالوش نے بحالت اضطرار بھی کوشش کی.. کہ لپک کر خنجر چھین لے.. مگر اُس کی امداد بے کار ثابت ہوئی.. وار اپنا کام کر چکا تھا.. برق وش..

نازآفریں.. غیرت حور نیلوفر.. اُسی صوفہ پر جس پر وہ ذرا دیر قبل بہ اطمینان دراز تھی.. اب مردہ لاش کی صورت میں گر پڑی..

٭ ٭ ٭

اس طرف سلطان مراد نے یہ دیکھ کر کہ میں کوئی دم کا مہمان ہوں.. بعلز بیگ و شاہزادہ بایزید کو جنگ کے متعلق ہدایات دینا شروع کیں.. یہ بھی قدرتِ خدا کا ایک نمونہ تھا.. کہ ایسی حالت میں بھی اُس کے ہوش و حواس اتنے بجا تھے.. کہ اُس کی بتائی ہوئی ترکیبوں و چالوں سے ترکی عساکر اس خوبی و عمدگی سے لڑیں.. کہ آفتاب غروب ہوتے ہوتے تمام عیسائی افواج گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالی گئیں..

شاہ لازر قید ہوگیا.. اور وہ تمام سردار جو شریک اتحاد تھے.. گرفتار ہوئے.. اور جس وقت یہ لوگ مرنے والے سلطان مراد کے سامنے لائے گئے.. اُس وقت اِن کو علم ہوا.. کہ مالوش نے اپنے فرض کو کس حسن و خوبی سے انجام دیا تھا.. ادھر سلطان نے ان تمام معزز قیدیوں کی موت کا حکم دیا.. اُس طرف اُس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی..

جنگ کے خاتمہ پر چند ترکی جوانوں نے مالوش کی لاش بھی پائی.. جس کو بعض گرفتار شدہ عیسائی قیدیوں نے شناخت بھی کیا..

ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے.. کہ وہ شاہزادی نیلوفر کی بارگاہ سے بحالت اضطراب فرار ہوکر گھمسان کی جنگ میں شریک ہوگیا.. اور اُسی سلسلہ میں کسی کے ہاتھوں مارا گیا..

اس نوجوان سروی کی زرہ بکتر.. آج تک قسطنطنیہ کے عجائب خانہ میں رکھی ہوئی ہے.. اور ترکی مورخین ہمیشہ اس کا نام ایک دغاباز قاتل کے لقب سے یاد کرتے ہیں.. اور سروی لوگ تاایندم اسے اپنی قوم کا سرمایہ ناز ہیرو تصور کرتے ہیں.. اور اُس کو اُسی مقدس طریق پہ یاد کرتے ہیں۔ جس طرح یونانی ہرمیدس کو یاد کیا کرتے ہیں..

تین سنگی ستون آج تک میدان قزوہ میں اُس مقام پر موجود ہیں.. جہاں مالوش کی لاش

ملی تھی۔۔ اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک شاندار مسجد ایک سیاح کی آنکھوں کو یہ بتلاتی ہے۔۔ کہ یہ سلطان مرادؔ اور اُس کی دختر نیک اختر۔۔ ارضی حور شاہزادی نیلوفر کی جائے وفات ہے۔

(ماخوذ)

احقر
شمیم بلہوری

غزل

کبھی ابتدائے کرم تری کبھی انتہائے جفا ہوں میں
مری زندگی تو طلسم ہے مجھے کیا خبر ہے کہ کیا ہوں میں

مجھے قیدِ غم سے چھڑائیگا۔ مری جان لے کے یہ جائیگا
جو یہی ہیں درد کی شدتیں تو قفس سے آج رہا ہوں میں

کبھی تیری جلوہ گہ ادا میں تھا حسن و عشق کا آئینہ
کبھی بنکے صورتِ نقشِ پا سرِ رہگزار مٹا ہوں میں

مری آہِ سرد کے فیض سے مرے دل کے زخم ہیں سب ہرے
نہ غرض ہے مجکو نسیم سے نہ رہین لطفِ صبا ہوں میں

کبھی اس سے پہلے نصیب ہے یہ نمود موت کو کب ہوئی
مرا ذرہ ذرہ پکارتا ہے کہ جلوہ گاہِ فنا ہوں میں

ترے وعدے کی مجھے کیا خوشی میں کہاں سے لاؤنگا زندگی
مری آرزو کا تو قول ہے ترے حق میں دستِ قضا ہوں میں

مری راہِ غم سے جدا نہیں مری مرگ یاس کی منزلیں
کبھی ماجرائے شکستگی۔ کبھی واقعاتِ فنا ہوں میں

مرے منہ سے نالۂ بیکسی نے نکل کے ہائے یہ کیا کہا
مجھے سن کے ہادیِ بے خبر کہ شکستِ دل کی صدا ہوں میں

ہادی (مچھلی شہری)

ارشاداتِ عزیز

خودکشی غم میں کوئی بات بھی ہے؟ — ہمّت اے دل اندھیری رات بھی ہے

یوں نہ ظالم مٹا کہ اس دل میں — میری اور تیری کائنات بھی ہے

واعظوں کو خبر نہیں شاید — رند صد شیوہ مستِ ذات بھی ہے

میری افسردگی کے ہیں اسباب — تم خفا ہو تو کوئی بات بھی ہے

یہ دلِ سادہ لوح اے ناداں — لوحِ اسرارِ کائنات بھی ہے

مستحق اک نگاہ کا تیری — دل کہ محرومِ التفات بھی ہے

غور سے دیکھ مقبروں کی طرف — ان میں دنیا کی واردات بھی ہے

دیکھ لو اپنے کشتۂ غم کو — اب وہ شایانِ التفات بھی ہے

محوِ عشرت سرائے فانی سوچ — اس طرب گاہ کو ثبات بھی ہے

کوئی ذرّہ نہیں یہاں کا شک — حاملِ بارِ واقعات بھی ہے

اس کے ملنے میں دونو عالم ہیں — زندگی بھی ہے اور ممات بھی ہے

موت ہے گر حیات کو لازم — موت کے واسطے حیات بھی ہے

جادۂ عشق ہے عزیز عزیز
مر مٹو گر تو ایک بات بھی ہے

عزیز لکھنوی

دو بزرگانِ دین

(۱) حضرت سلمان فارسیؓ

آپ آں حضرت محمد صلعم کے غلام تھے۔ آپ کے اہل وطن آپ کو لینے فارس سے آئے اور آں حضرت صلعم نے جانے کی اجازت بھی دی جو ایک طور پر آزاد کرنا تھا۔ لیکن آپ نے صحبتِ نبوی ترک نہ کی۔ آپ کا شمار اہل بیت رسول میں ہوتا ہے۔ آپ آں حضرتؐ کی صحبت میں برابر رہے۔ اور حضرت علیؓ کی صحبت میں بھی رہے۔ لیکن باطنی انتساب آپ کا ابو بکر صدیقؓ سے تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے وقت میں آپ مدائن کے حاکم ہوئے اور پانچ ہزار درم سالانہ بیت المال سے ملنے لگا۔ لیکن یہ اپنی تنخواہ فقیروں کو دے دیتے تھے اور خود زنبیل بُن کر اپنا خرچ چلاتے تھے۔ ایک ہی کمل آپ کا دن کو پہننے اور رات کو اوڑھنے میں کام آتا تھا۔ بازار میں ایک دن آپ جا رہے تھے کہ کسی شخص نے آپ کو مزدور سمجھ کر پکڑ لیا اور آپ اُس کا بوجھ اپنے سر پر لے چلے۔ جب راستہ میں اُسے معلوم ہوا کہ آپ حاکم شہر ہیں تو وہ بہت گھبرایا۔ لیکن آپ اُس کا بوجھ اُس کے گھر تک پہنچا کر رُکے۔ حاکم شہر اور یہ سادگی! میں آپ کی تعریف کروں یا آپ کے منتخب کرنے والے حضرت عمر فاروقؓ کی تعریف کروں۔ عقل حیران ہے کہ صحابہ رسول کیسے برگزیدہ حضرت تھے! حضرت عمرؓ نے خالد بن ولید ایسے زبردست شخصیت کے سپہ سالار کو فوج شام کی سرداری سے علیحدہ کیا اور حضرت سلمان ایسے درویش منش کو مدائن ایسے اہم مقام کا حاکم مقرر کیا۔ اور پھر بھی معاملات فوجی اور ملکی میں ترقی ہی ہوتی رہی۔ میں آن میں اُن مخالفین کی رائے پر کیا کہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی ترقی کا راز تیغ زنی تھا۔ صحابۂ رسول نے جو فیض یاب صحبتِ نبوی تھے محض اپنے اثرِ صحبت سے ۲۳ سال کے اندر بحر اسود

سے بحر جنوبی یمن اور سرحد افغانستان اور دریائے جیحوں سے سرحد مراکو تک نہ صرف ممالک پر بلکہ اہالئے ممالک کے دلوں پر قبضہ کرلیا۔ وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ظاہری اور باطنی خدمتیں جدا جدا نہ تھیں جیسا کہ زمانۂ مابعد میں واقع ہوا کہ خلفاء راشدین کے بعد سلطان کا درجہ الگ قائم ہوا اور قطب یا قطب الاقطاب کی خدمت جدا قائم ہوئی۔ مدائن میں ۳۲ھ یا ۳۳ھ میں آپ نے وفات پائی۔ عمر آپ کی بعض روایات میں ڈہائی سو سال اور بعض روایت میں ساڑھے تین سو سال بیان کی جاتی ہے۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ایک طور پر حضرت سلمان فارسی کسریٰ کے قائم مقام تھے اور کسریٰ اپنی رعایا میں نوشیرواں عادل مشہور ہوا تھا۔ حضرت سلمان شاہ فارس کے قائم مقام (والی مدائن) ہوکر رعایا کے حمّال بنے پھر بھی وصف حمالی سے یہ مشہور نہ ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ نوشیرواں کا عادل ہونا غیر معمولی امر تھا اور صحابۂ کرام میں سے ہر ایک انکسار اور تواضع میں ایک دوسرے سے بڑھا ہوا تھا۔ غیر معمولی بات کسی میں ایسی نہ تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے ہمسروں میں غیر معمولی طور پر امور اخلاقی میں ممتاز سمجھا جاتا۔

(۲) حضرت مجدد الف ثانی از ولادت تا قیومیت

شہر سرہند میں جمعہ کی رات نصف شب گزرنے کے بعد چودہ شوال ۹۷۱ھ کو حضرت مجدد الف ثانی پیدا ہوئے۔ آپ کا نام شیخ احمدؒ کنیت ابوالبرکات لقب بدرالدین تھا۔ ایام حمل اور ولادت کے وقت بہت سے عجائبات ظہور میں آئے جن کا ذکر کرنا تاریخی حیثیت سے چنداں ضروری نہیں ہے۔ جب آپ سن شعور کو پہنچے تو تھوڑی ہی مدت میں آپ نے قرآن مجید حفظ کرلیا اور تحصیل علوم ظاہری زائد تر اپنے والد مخدوم عبدالاحد سے کی اور سیالکوٹ میں جاکر مولانا کمال کشمیری سے معقولات کی بعض کتابیں پڑھیں اور حدیث کی کتابیں مولنا یعقوب کشمیری خلیفہ شیخ خوارزمی کبری سے پڑھیں تحصیل علم کا زمانہ بلوغ سے پہلے کا ہے امام المحدثین شیخ عبدالرحمٰن سے بھی آپ نے حدیثیں پڑھیں تحصیل علم کے زمانہ میں آپ نے

چند رسالے بھی لکھے تھے۔ بالآخر علوم ظاہر میں آپ نے ایسا کمال پایا کہ آپ کو درجۂ اجتہاد ملا۔

دسویں صدی ہجری کے اخیر میں شہنشاہ اکبر علانیہ سنت نبوی کا مخالف ہوا۔ لوگ تو کہتے تھے کہ وہ دین محمدی سے پھر گیا تھا مگر میں یہ کہنا پسند نہیں کرتا فیضی اور ابوالفضل ایسے ذی علم اشخاص بادشاہ کی ہر باتوں کی تائید کرتے تھے۔ حضرت مجدد تحصیل علم سے فارغ ہو کر شروع جوانی میں اکبرآباد (آگرہ) پہنچے جو دارالسلطنت تھا۔ بادشاہ کا تمام لشکر آپ کی علمی قابلیت دیکھکر متحیر ہوا اور علمائے عصر بڑے فخر سے حدیث اور تفسیر کی کتابوں کی سند آپ سے حاصل کرنے لگے۔ اس سے آپ کے علم اور درجۂ اجتہاد کا شہرہ ہوا۔ ایک روز حضرت سلیم چشتی کے ایک خلیفہ نے آپ کو دیکھکر کہا "میں نے انھیں اس کے پہلے خواب میں دیکھا تھا اور مجھ پر ظاہر ہوا تھا کہ یہ ایک بڑے بزرگ ہیں، لیکن ابھی تک ان کے ظہور کا وقت نہیں آیا ہے"۔ فیضی اور ابوالفضل بھی حضرت مجدد کی شہرت سن کر حاضر خدمت ہوئے اور باہم مراسم دوستی قائم ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ فیضی تفسیر قرآن بے نقط لکھ رہا تھا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں حضرت مجدد نے بھی شرکت کی تھی۔ کچھ دنوں بعد حضرت مجدد ان دونوں سے ناخوش ہوئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ ابوالفضل اور فیضی نے علمائے دین کی توہین کی اور حضرت مجدد نے سننا گوارا نہ کیا۔ اس پر بھی سلسلۂ آمد و رفت قائم رہا۔ لیکن ایک روز ابوالفضل نے رسالت پر کچھ شبہات اس طرح بیان کئے کہ حضرت مجدد بے کیف ہوئے اور پھر ابوالفضل کی معذرت کرنے اور معافی مانگنے پر بھی حضرت مجدد نے اُس کی طرف توجہ نہ کی۔ حضرت مجدد کا رسالۂ "اثبات النبوۃ" کی وجہ تصنیف ابوالفضل کا مناظرہ تھا۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد شاہزادہ سلیم (جو بعد کو جہانگیر مشہور ہوا) کے اشارہ سے ابوالفضل ایک ہندو کے ہاتھ سے قتل کیا گیا۔

حضرت مجدد عرصہ سے اکبرآباد میں تھے۔ آپ کے والد مخدوم عبدالاحد آئے اور اپنے ساتھ سرہند واپس لے گئے۔ اثنائے راہ میں شیخ سلطان ایک مقرب شاہ ہند کی لڑکی سے حضرت مجدد کا عقد ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس عقد کی بابت آنحضرت محمد صلعم کی روحانیت سے شیخ سلطان

کو خواب میں حکم ہوا تھا - اس عقد سے حضرت مجدد کی مالی حالت بہت درست ہوئی اور ایک نئی
حویلی حضرت مجدد نے اپنے لئے سرہند میں بنوائی - اس کے بعد حضرت مجدد اپنے باپ کے ساتھ برابر
تا وفات سرہند میں رہے - آپ کے باپ نے خرقۂ خلافت چشتیہ (جو شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے
ملا تھا) خرقۂ خلافت قادریہ (جو حضرت کمال الدین کیتھلی سے ملا تھا) اور خرقۂ سہروردیہ جو آبا و اجداد
سے چلا آتا تھا آپ کو عنایت فرماکر اپنا جانشین قرار دیا - آپ نے طریقۂ کبرویہ میں حضرت یعقوب
صرفی سے جو کشمیر میں بہت مشہور تھے استفادہ کیا تھا -

اس کے بعد حضرت خواجہ بیرنگ باقی باللہ کابلی کو خواجہ بزرگ بہاء الدین نقشبند سے بشارت
ہوئی کہ ہند میں ایک مجدد ظاہر ہونے والا ہے وہ وارث ہے اس نسبت کا جو حضرت ابوبکر صدیق رض
سے امانت چلی آتی ہے - تم میرے خلیفہ خواجہ امکنگی کے پاس جاؤ اور ان سے یہ نسبت حاصل کرکے ہندوستان
جاؤ، اور یہ نسبت اس عزیز کے حوالہ کرو - اس کے بعد حضرت باقی باللہ، حضرت خواجہ امکنگی کے پاس
مرید ہوئے اور پھر حضرت مجدد کے مرید کرنے کی فکر میں چلے اور تلاش کرتے ہوئے اس وقت سرہند
پہنچے جب حضرت مجدد وہاں سے حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہو چکے تھے اور دہلی سے ہوتے ہوئے
عرب جانا چاہتے تھے - دہلی میں حضرت باقی باللہ، حضرت مجدد سے ملے اور سلسلۂ نقشبندیہ
میں آپ کو مرید کرکے وہ تمام نعمتیں عطا کیں جو عطا ہونے والی تھیں اور حضرت مجدد وحدت وجود
سے وحدت شہود تک پہنچے -

حضرت مجدد نے اپنے مکتوب ۲۰۶ دفتر اول میں تحریر فرمایا ہے کہ "میں نے معارف توحید وجودی
وغیرہ کے بارے میں جو کچھ پہلے لکھا تھا وہ محض عدم اطلاع کی وجہ سے لکھا تھا - جب اصل حقیقت معلوم
ہوئی - تو میں شرمندہ اور مستغفر ہوا" پھر ایک مقام پر آپ فرماتے ہیں کہ وحدت وجود کے متعلق
میری تحریر مشہور ہو گئی ہے میں اس سے تائب ہو کر چاہتا ہوں کہ جس طرح میرا گناہ مشہور ہوا میرا توبہ
بھی مشہور ہو جائے - غرضکہ حضرت خواجہ باقی باللہ نے جب ۱۰۰۸ھ میں حضرت مجدد کو القا فرمائی اور
سرہند کی طرف روانہ کیا - اس کے بعد آپ مجدد الف ثانی اور قیوم اول مشہور ہوئے -

حضرت مجدد چاروں سلسلے میں مرید کرتے تھے - لیکن پھر آپ کے بعد آپ کے خلفا صرف

سلسلۂ قادریہ اور سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید کرتے تھے اور جو سلسلہ قادریہ آپ سے چلا اُسے سلسلۂ قادریہ مجددیہ کہتے ہیں۔ حضرت مجدد گھر سے بہ ارادۂ سفرِ حج سرہند سے چلے دہلی میں حضرت باقی باللہ کی صحبت نے سفرِ حج سے باز رکھا اور پھر کبھی سفرِ حج کا اتفاق نہ ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدمتِ مجددی اور خدمتِ قیومیت نے حج سے باز رکھا، تو یہ حضرت مجدد کی علوِ شان کے خلاف ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ دیگر موانع پیش آئے ہوں اور اُن کی تشریح نہ کی گئی ہو۔ یہ خیال کرنا کہ کعبہ خود حضرت مجدد کی زیارت کو آیا تو آپ کیوں زیارتِ کعبہ کو جاتے۔ حضرت مجدد کی شان پیروی سنتِ نبوی سے بعید ہے کیونکہ آں حضرت محمد صلعم مدینہ سے حج کے لئے مکہ میں اُس وقت تشریف لائے جب امن قائم نہ تھا اور پھر امن قائم ہونے پر زیارت کے لئے دوبارہ تشریف لے گئے سلسلہ مجددیہ میں سفرِ حج اور زیارتِ کعبہ کی اہمیت کسی طرح نظرانداز نہیں کی گئی ہے۔ کیونکہ حضرت مجدد کے پسر قیول دوئم نے نہایت اہتمام سے اپنے وقت میں اسے انجام دیا تھا۔

۱۰۰۷ھ میں حضرت مجدد حضرت باقی باللہ کے مرید ہوئے۔ تو ۱۰۰۹ھ میں خلعتِ مجددی اور خلعتِ قیومی حضرت مجدد کو اللہ کی طرف سے کیوں کر ملا؟ اس کا جواب علمِ باطن سے تعلق رکھتا ہے۔ بظاہر اتنا سمجھنا کافی ہے کہ جس طرح نبیوں نے دعویٰ نبوت اپنے وقتوں میں کیا تھا اُسی طرح حضرت مجدد نے مجددی کا اور قیومیت کا دعویٰ کیا اور علماء ظاہر کو دلائلِ ظاہری سے اور علمائے باطن کو دلائلِ باطنی سے سمجھا دیا اور سب کی تسکین ہوگئی۔

درجہ قیوم کے متعلق جو روضۃ القیومیہ میں لکھا ہے اس کا اخیر فقرہ یہ ہے کہ جو کچھ خیال میں آسکتا ہے وہ قیوم کی مرضی اور حکم بغیر ظہور میں نہیں آتا۔ مجددیوں کا اگر یہ عقیدہ ہے تو کفر کسے کہتے ہیں؟ مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ طرزِ بیان اچھا نہیں ہے۔ لیکن یہ خیالات تعلیمِ باطنی سے الگ نہیں ہے۔ صوفیہ دو عالم مانتے ہیں۔ عالمِ ظاہر اور عالمِ باطن اور یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں عالموں کے انتظام کے لئے جدا جدا عمال مقرر کر رکھا ہے۔ عالمِ ظاہر کے عمال سلطان کے ماتحت ہیں اور عالمِ باطن کے عمال قطبِ وقت کے ماتحت ہیں۔ حضرت مجدد کے وقت سے

قطب کے اوپر ایک درجہ قیوم کا ہوا۔ جس طرح سلطان کی مرضی سے عالمِ ظاہری میں کام ہوتا ہے
اسی طرح عالم باطن میں قطب یا قیوم کی مرضی سے کام ہوتا ہے۔ اور جس طرح سلطان کی مرضی مشیت
اور تقدیر الٰہی کے تابع ہے، اسی طرح قیوم یا قطب کی مرضی بھی مشیت یا تقدیر الٰہی کے تابع ہے۔
پہلے زمانہ میں پے درپے انبیا آتے تھے اور اُن کی ضرورت تعلیم علم الہیات و اخلاق
ہوتی تھی، تاکہ لوگ بیدار رہیں۔ خواب غفلت میں گرفتار نہ ہوں اور احکام الٰہی یاد رکھیں بھول
نہ جائیں۔ اسی طرح اُمت محمدی میں جتنے علمائے ظاہر یا علم باطن کے ہیں اُن کے تعلق بیدار
کرنے کی خدمت ہے اور اگر ایک قرن سو برس کا قرار دے کر یہ کہا جائے کہ ایسے لوگوں کے لئے
مجدد صد سالہ کا لفظ موزوں ہے تو کیا بے جا ہے؟ مجدد الف ثانی میں یہ خصوصیت تھی کہ دس
صدیوں کے بعد آپ کا ظہور ہوا اور آپ مجدد الف ثانی کے لقب سے ممتاز ہوئے اور قیومیت
کی خلعت سے بھی مشرف ہوئے۔ لوگوں نے لکھا ہے کہ پہاڑوں کے درمیان ہزار برس تک آفتاب
کے فیض پہنچنے کے بعد جو لعل پیدا ہوتا ہے وہ سب سے زائد بیش قیمت ہوتا ہے۔ حضرت مجدد
حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ ایسے دو پہاڑوں کے درمیان میں ہیں۔ اول سے
نسبت طریقت اور ثانی سے نسبت توالد ہے اور پھر آں حضرت محمد صلعم ایسے آفتاب دین اسلام
کا فیض ہزار برس تک پہنچنے کے بعد مجدد الف ثانی کا وجود ہوا۔ ایسے باریک نکات سے
حضرت مجدد کے علوے مرتبہ کا ثابت کرنا دیگر دلائل معقولی کے ہوتے ہوئے چنداں مستحسن معلوم
نہیں ہوتا۔

بہ حیثیت قیوم جو معارف اور اسرارِ مخصوصہ آپ پر منکشف ہوئے اُن کی چار قسمیں ہیں:۔
(۱) تاویل مقطعات و متشابہات قرآنی۔ اس کا اظہار آپ نے کسی پر نہیں کیا۔
(۲) وہ معارف جن کا اظہار صرف آپ نے اپنے صاحبزادوں سے کیا۔
(۳) وہ معارف جن کا اظہار اپنے خاص مریدین اور محرمان راز سے خلوت خاص میں فرمایا۔
(۴) وہ معارف جو بہ نیت افادہ طالبان یا با التماس سائلان آپ نے اپنے رسائل اور مکاتیب میں تحریر فرمائے

ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی

کلامِ گرامی

اے سرت گردم بگرداں جام را　　شیشہ بشکن گردشِ ایام را

بادہ گر خام است ساقی خام نیست　　دہ بشارت پختگانِ خام را

ہر یکے را در خورِ آں دادہ اند　　بادہ را مستی و گردش جام را

من ز خود رفتم کہ معشوقِ غیور　　بر نتابد نامہ و پیغام را

از ہوس بگسل کہ در ہر دانۂ　　تعبیہ کردند گویا دام را

لاف نسبت میزند با چشمِ یار　　یک جہاں سر بشکند بادام را

عشق می ورزی گرامی شکوہ چیست

غوطہ در آغاز دہ انجام را

گرامی
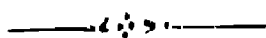
مسئلۂ ارتقا

کے متعلق

چند خیالات

(از مسٹر محمد عبدالشکور ایم اے (علیگ))

علماء کا ایک گروہ رصدگاہ میں کسی طاقتور دوربین سے دست و گریبان ہے اور ثوابت و سیارے کی حرکات و سکنات کے مشاہدہ و مطالعہ میں ہمہ تن مصروف، ایک جماعت برق و مقناطیس کی حیرت زا نیرنگیوں و بوالعجبیوں میں منہمک نظر آتی ہے، اور معمل طبعیات کا ایک جزو لاینفک بن گئی ہے، ایک فرقہ کیمیا کے اجزاے پریشاں کی ترتیب و تہذیب میں سرگرداں ہے، اس عظیم الشان جد و جہد کے نتائج اس قدر کامیاب ہیں کہ ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ صدی میں جس قدر علوم و فنون کے خزانے مالامال ہوئے اُس سرمایہ کا مجموعہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے انسان حاصل کر سکا۔ دنیا جانتی ہے کہ سائنس کے محیر العقول کارنامے ایک نہیں بلکہ سیکڑوں ہیں، مگر مسئلہ ارتقا کے سلسلہ میں جو جو حیرت انگیز و تعجب خیز انکشافات ہوئے وہ اگر ۱۸۲۴ء کی کسی عالمانہ صحبت میں بیان کئے جائیں تو شاید علما و حکماء وقت ہم کو ایک مسلوب الحواس شخص سے زیادہ وقیع تصور نہ کریں اور شاید ہماری دماغی قوتوں کے منتشر ہونے پر کفِ افسوس بھی ملنے لگیں مگر ہم جانتے ہیں کہ ۱۹۲۴ء میں اس مسئلہ کی کس قدر وسیع اہمیت ہے اور علمبرداران ارتقا مثلاً ڈارون، ہکسلے اور ہربرٹ اسپنسر کن عظمت اور وقعت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور متمدن ممالک میں اُن کے جواہر پاروں کی کس قدر قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ مہذب دنیا کا کوئی

گوشہ ایسا نہیں جس کی عالمانہ صحبتوں میں اُس کا بطلان کیا جاتا ہو یا اُس کی صداقت پر ایمان نہ لے آئے ہوں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے چار سو برس قبل علوم و فنون کی تحقیق و تفتیش کے لئے مکاتب کھلے تھے اور زمانۂ ماضی کے وسیع میدان میں بڑے بڑے باکمال شہسوارانِ علم و عمل نے اپنے اپنے جوہر دکھائے اور اوراقِ عالم کو اپنی طلعت ریزیوں سے جگمگا دیا مگر گزشتہ صدی کے دَورِ آخری کے لئے یہ عظیم الشان عظمت وقف کر دی گئی تھی کہ اس کی تاریخ اس زریں کارنامہ کی حکیمانہ داستانوں سے لبریز ہو اور دنیا ایک ایسے رازِ سربستہ سے آشنا ہو جائے جو دیرینہ اور مستحکم خیالات و عقائدِ عالم میں ایک تلاطم پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔

ڈارون اور ہیکل نے انسانی و حیوانی اجسام کا مطالعہ کیا، رومینس ارتقائے دماغی کا ماہر گزرا ہے، ہربرٹ اسپنسر اخلاقیات اور ایڈورڈ کیرڈ مذاہب کی جستجو اور تفتیش میں منہمک تھے مگر سب ایک ہی نتیجے پر پہنچے، یعنی انسانی، حیوانی و نباتاتی کوئی مملکت فطرت ایسی نہیں جس کے ہر دائرۂ حیات میں عمل ارتقا جاری نہیں۔

"اس مسئلہ نے زمانہ کے ساتھ وہی کیا جو علم نجوم نے فضا کے لئے کیا" لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ انسانی دماغ کی وسعت، انسانی ذہن کی روشنی، انسانی غور و فکر کی گہرائی اسی مسئلہ کی مرہون احسان ہے جس نے دماغِ انسانی کو از سرِ نو مرتب کیا اور اُس کے زاویۂ نگاہ کو بالکل بدل کر دنیا کا ایک تازہ ترین مرقع پیش کر دیا۔ اس سے قبل تمام علما و حکما اپنی اپنی جدا کاوشوں میں مبتلا تھے، فیلسوف مابعد الطبیعیات کی گہرائیوں میں غلطاں و پیچاں تھا، شاعر حسن و عشق کے دلدوز افسانوں میں ماخوذ تھا، کیمیاگر ادویات کے کوٹنے اور بھپتنے میں مصروفِ کار نظر آتا تھا، ماہر نباتات جڑی بوٹی کی تلاش میں افتاں و خیزاں سرگرم سفر تھا، سب کے کارنامے جدا، سب کی کوششیں علیحدہ اور سب کی کاوشیں تنہا تھیں، دفعۃً ارتقا کی ایک صدا بلند ہوتی ہے ماہرینِ علوم ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر سرگوشیاں شروع کر دیتے ہیں اور متفق ہو کر اس صدائے مسرت نما کا خیر مقدم کرتے ہیں اُن کے علوم و فنون سب متحدہ نظر آنے لگتے ہیں اور علم کی وحدانیت

کا ایک ایسا پختہ ثبوت ملتا ہے جس کی تردید کسی طرح ممکن نہیں۔

اپنی توجہ ایک چھوٹے سے بے حقیقت پرند کی جانب منعطف کیجئے جس کو کم مائگی اور بے بضاعتی کے لحاظ سے ہم ایک مشتِ استخواں کہہ سکتے ہیں، ذرا دیکھئے کہ وہ صبح سے شام تک کیا کرتا ہے؟ وہ فطرت کی صدا پر نورِ سحر کے ساتھ ساتھ بیدار ہو جاتا ہے اور آفتابِ عالمتاب کی نورانی شعاعیں اُس کو ایک شدید جد و جہد میں منہمک پاتی ہیں، وہ تمام دن غذا کے حصول کے لئے مصروف رہتا ہے، لیکن اُس کا کھانا کسی ایسی محفوظ جگہ نہیں ہے جہاں وہ بلا خوف و خطر چلا جائے اور سیر ہو کر واپس آجائے۔ سیکڑوں اور بھوکے پیاسے پرند اسی جستجو اور اسی تلاش میں منہمک اور اسی اُدھیڑ بن میں مشغول نظر آتے ہیں۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اس پرند کو کن کن مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور کس عنوان سے وہ منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے، بے رحم صیاد لذیذ پرند کی گھات میں صبح کاذب سے ہی جال بچھا دیتا ہے ؎

منہ ہی کھولا تھا کہ پر باندھنے صیاد آیا

ظالم شکاری جدا اپنا خنجر تیز کئے دوڑتا پھرتا ہے، اگر ان مظالم سے پرند محفوظ بھی رہا تو اس کو ایک ایسے کھیت میں غذا حاصل کرنے جانا پڑتا ہے جہاں ہوشیار وچست و چالاک کسان اُن پرندوں کو اڑانے کے لئے کمربستہ نظر آتے ہیں یا ایک ایسی کھلیان میں قدم رکھنا ہوتا ہے جس کا چپہ چپہ خوف و خطر کا مخزن ہوتا ہے، چنانچہ ہم پرند کو کبھی ناکام پاتے ہیں تو کبھی شادان و فرحاں، کبھی گرفتارِ دامِ بلا دیکھتے ہیں تو کبھی آزاد و مسرور، یہ پروگرام ایسا نہیں ہے جو ایک ہی دن یا ایک ہی فصل کے لئے ہو، بلکہ یہ نوشتۂ تقدیر عمر بھر کے لئے ہے اور بعض خاص حالتوں میں پرند کی دقتیں اور مصائب نہایت صبر آزما اور حوصلہ شکن ہو جاتے ہیں، جس زمانہ میں پیداوار موسمی ختم ہو جاتی ہے، گھاس خشک اور تالاب بے آب رہ جاتے ہیں۔ بعض پرندوں کو غذا حاصل کرنے کے لئے ہزارہا میل کا سفر طے کرنا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اُس خاص زمانہ میں اُن کی مصیبتیں دہ چند ہو جاتی ہیں، زندگی اسی کش مکش کا نام ہے۔ جب تک زندگی ہے اس کشاکش سے عہدہ برآ

ہونا ناممکن ہے، یہی نہیں بلکہ جس ذی حیات کو آپ دیکھیں وہ اسی چکّر میں گرفتار ہوگا، نہ صرف یہ بلکہ عمر کا کوئی ایسا دَور نہیں جب اس بلا سے نجات مل جاتی ہو ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کش مکش میں مبتلا کرنے سے فطرت کا مقصد کیا ہے؟ اس جد و جہد کی علت غائی کیا ہے؟ اس دردِ سر میں ذی حیات افراد کو کیوں ماخوذ کیا؟ یا یہ ہمارا خود ساختہ فرض ہے جو ہم نے اپنے اوپر عائد کر لیا ہے؟ ایک ایسے شخص کا تصور کیجئے جو قوانین فطرت کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ ہو اور ساکت رہنے کا قصد کر کے آفتاب کی گرم روشنی میں آرام سے بیٹھا ہو۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ وہ کب تک اس حالت میں بیٹھا رہتا ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ صبح سے دن کے دس بجے تک سورج کی گرمی بخوشی برداشت کر لے اور آرام سے ساکت بیٹھا رہے مگر جب آفتاب نصف النہار پر آکر اپنی پوری آب و تاب سے چمکنے لگتا ہے اور اُس کی جہنم نشان تپش اس قدر ترقی پذیر ہو جاتی ہے کہ اُس شخص کی نمِ حیات ہی معرضِ خطر میں آجائے، اُس وقت اس شخص کو حرکت کرنا ہوگی اور وہ مجبوراً پناہ کی تلاش میں چل کھڑا ہوگا۔ اُس کے علاوہ موسم سرما کی برف باری اور بارش جس کے ساتھ نہایت سرد ہوا کے دل ہلا دینے والے جھونکے ایک ایسے انسان کی مدتِ حیات جلد ختم کر سکتے ہیں جس کی سقفِ زرنگار محض تاروں بھرا آسمان ہو اور جس کے عالی شان مکان کا صحن یہ زمین جس کو ہم شب و روز روندتے پھرتے ہیں، فطرت خود ساکت و جامد نہیں، وہ چاہتی ہے کہ انسان بھی سکوت اختیار نہ کرے، ایسا کرنا فطرت سے جنگ کرنے کے مرادف ہے اور اس لئے شدید ترین خطرات سے مملو، دنیا میں بہت سے امیر و کبیر ایسے موجود ہیں جو ابتدائے پیدائش سے آخر وقت تک اگر چاہیں تو مطلق حرکت نہ کریں اور اس کے باوجود دنیا کا کوئی ایسا عیش و آرام نہ ہو جو اُن کو حاصل نہ ہو سکے، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا، فطرت انتقام لینے پر کمربستہ ہو جائیگی اور ہم اُس کو ایک بے کس اپاہج کی حیثیت میں دیکھیں گے، اس لئے کش مکشِ حیات کی آہنی

زد سے محفوظ رہنا ایک امر ناگزیر ہی جس سے رہائی ملنا مرجانے کے برابر ہی چنانچہ وہ حضرات جو قانونِ فطرت کے خلاف ایسا طرزِ عمل اختیار بھی کرلیں اُن کو کیسی کیسی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہی اور کس طرح وہ قبل از وقت لحد میں پہنچ جاتے ہیں، پناہ کی تلاش انسان کو ایک جھونپڑے کی تعمیر میں مصروف کردیتی ہی، گرسنگی اور تشنگی اُس کو غذا اور پانی کی جستجو میں محو کردیتی ہی اور اِس جدوجہد میں مبتلا ہوکر رفتہ رفتہ وہ عقیل تر، توانا تر اور ہوش مند تر ہوجاتا ہی۔ اس کی دماغی اور ذہنی قوتیں کام میں آتی ہیں اور اُس کی فہم و فراست روشنی سے مالامال ہونے لگتی ہی انسان کو فطرت نے مجبوراً شکاری بنایا، ورنہ وہ خود ایک شکاری کا خواص نہیں رکھتا۔ گوشت کی تلاش میں وہ پرند اور ہرن مارنے لگا، سمور کی تلاش میں اس نے بالدار جانور تہِ تیغ کئے اور یہ سب اُس کو مجبوراً کرنا پڑا۔ ورنہ اگر اُس کی مرضی کا جائزہ لیا جائے تو ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ وہ اُسی طرح سورج کی ضیاءِ تسکین بخش میں بیٹھا رہتا یہاں تک کہ موت اُس کا پیرہنِ حیات چاک کرکے اُس کے جسم و روح کو جدا کردیتی، علاوہ گرسنگی اور تشنگی کے دو اور تحریکیں ایسی موجود ہیں جو ہر ذی حیات کو چین و آرام نہیں لینے دیتیں، اولاً اُس کا ماحول اور اُس کے اثرات مثلاً موسم، سردی، گرمی، بارش، برف باری، ہوا جن سے مامون و مصئون رہنے کے لئے ایک مستقل اور پُر زور جد و جہد کی اشد ضرورت ہی، ورنہ انسان ضعیف البنیان آنِ واحد میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے، اس کے علاوہ اُس کی فطرت میں خود جدت اور اختراع کا ایسا زبردست مادہ موجود ہی جو ہمیشہ اُس کو کام پر مستعد رکھتا ہی اور غفلت کی نیند نہیں سونے دیتا، ایک خوش نما و وسیع جھونپڑا انسان کی اصلی ضروریات کے لئے کفایت کرسکتا ہی مگر دنیا تاج محل ویسٹ منسٹر ایبے اور جامع مسجد سے محروم رہ جاتی اگر یہ جدت طرازی اور ندرت نوازی انسان کی خمیر میں موجود نہ ہوتی ایک بوسیدہ اور تنگ و تاریک جھونپڑہ سے ترقی کرکے ہم ایک عالی شان محل تک پہنچ گئے ہیں۔ جو برقی شعاعوں سے بقعۂ نور بنا ہوتا ہی، پتے اور کھال کے لباس کو ہم نے اُتار دیا اور ہیٹ دی اور آکسن ڈیل کو محض اس لئے نوازا کہ ہم فطرتاً تبدیلی کے خوگر ہیں اور نت نئے

تراش و خراش کے شیدائی، مدافعت اور تباہی کے سامان پر ذرا نظرِ غور ڈالیے تو آپ کو ایک انقلابِ عظیم نظر آئے گا، ابتداے آفرینش میں انسان نے اغلباً درخت کی ایک شاخ کو آلۂ حرب اور سامانِ مدافعت بنایا، لیکن امتدادِ زمانہ نے اسی شاخِ شجر کو ہاوٹزر اور مشین گن کی لباس میں مبدل کر دیا جن کے تباہ کن کارنامے اس دَور میں کس قدر ہوش ربا ہیں۔ لیکن ذرا یہ دیکھنا چاہیے کہ اس حیرت انگیز ترقی میں کن کن منازل کو عبور کرنا پڑا اور ایک معمولی شاخ کس طرح ایک توپ بنی، بعض اوقات درخت سے اکھاڑتے وقت ایک ایسی شاخ بھی ہاتھ آجاتی ہے جو نوک دار اور تیز ہوتی ہے اور جو ہلاک کرنے میں زیادہ کار آمد ثابت ہوتی ہے، اس طریقے سے انسان گُرز اور بھالے سے آشنا ہوا اور میدانِ جدال و قتال میں ان دو آلوں سے زور آزمائی کرنے لگا، تھوڑے عرصے کے بعد اُس کو معلوم ہوا کہ اُن کو درخت کی بلندی پر سے غنیم پر پھینکنا زیادہ سود مند ہوسکتا ہے، چنانچہ اس کے بعد وہ اس کام میں لائے گئے اور کچھ مزید ایجادیں کی گئیں تاکہ غنیم پر اُن کا زیادہ ہلاکت بار اثر پیدا ہو، اسی طریقے پر مدافعت کا سامان تیار ہوا، اور ایسی ہی منازل طے کرتا ہوا آج اس معراجِ کمال پر پہنچا۔

آج اس عہدِ زریں میں ہم گُرز بھالے اور سپر پر خندہ زن ہوتے ہیں، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ایک بڑی مدت تک یہی زندگی کے اجزا تھے اور انھیں سے بڑے بڑے معرکے سر اور بڑی بڑی سلطنتیں زیر و زبر ہوتی تھیں، کش مکشِ حیات کی اولیں یادگاریں جو اپنی بوالعجبی کے لحاظ سے آج ہمارے کمروں کی آرائش و زیبائش ہیں اس لئے اور زیادہ قابلِ احترام اور واجب التعظیم ہیں کہ ہم اُن سے عہدِ ماضی کی تاریخِ ارتقا کا صحیح اندازہ کرسکتے ہیں، اور وہ ہمارے آبا و اجداد کے جنگی کارناموں کی اصلی یادگاریں ہیں۔ یہاں ایک اور قابلِ توجہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان آلات کے تخلیق کی وجہ کیا ہوئی۔ جب ہم جانتے ہیں کہ انسان کو انسان سے نفرت نہیں ہے بلکہ محبت، عداوت نہیں ہے بلکہ الفت، اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ انسان کی گرسنگی نے اُس کو شکار کرنے پر مجبور کیا مگر پھر یہ شکار کا سامان آلاتِ حرب کیوں بن گئے؟

ظاہر ہے کہ جب ایک ہی شے کی رغبت کل افراد کے دل میں جاگزیں ہو تو پھر صلح و آشتی کب تک جاری رہ سکتی ہے' اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جنگ بھی ضروریات فطرت میں شامل ہے اور انسان اس کی جانب مجبوراً متوجہ ہوتا ہے' تمام صنعت و حرفت جس کا میدانِ عمل دورِ حاضرہ میں یورپ کی ضیاء پاشیوں سے جگمگا رہا ہے محض حاجت اور ضرورت پر مبنی ہے اور تمام دنیا کی تہذیب و تمدن اسی کش مکش حیات کا مرہونِ احسان ہے' اس کش مکش کو دنیا سے محو کر دو صفحۂ عالم ایک سادہ سا ورق باقی رہ جائے گا۔جس پر لنڈن و پیرس اور نیویارک و برلن کے بجائے چند غار نما جھونپڑے نظر آئیں گے اور ایک مختصر جماعت ایسے وحشیوں کی جن کو ہم نہ جانور کہہ سکیں گے اور نہ انسان، طبائع کا اختلاف جو بالعموم دنیا کے گوشہ گوشہ میں نظر آ رہا ہے محض مقامی خصوصیاتِ ملکی کی وجہ سے رونما ہوا۔ اگر صفحۂ عالم تمام تر ایک ہی سا ہوتا یہ کش مکش بھی اختلافات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اور نہ پھر ہم کو طبائع کے اختلاف سے دوچار ہونا پڑتا۔ ملک کی حالت' زمین کی پستی و بلندی، تری و خشکی، آب و ہوا کے اختلافات، موسمی تبدیلیاں، بارش کی قلت و افزائش' یہ وہ اسباب ہیں جس کی وجہ سے ہم ایک عرب و بنگالی، ایک ترک و چینی' ایک کابلی و حبشی، ایک مغل و یہودی کے نہ صرف طبائع میں بلکہ ظاہری ساخت میں بھی زمین و آسمان کا اختلاف پاتے ہیں، علاوہ ازیں ایک ماہی گیر ایک کسان سے اور ایک سوداگر ایک پیشہ ور سے بعض ایسی خصوصیات میں مختلف ہوتا ہے جن کو ہم صورت دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں اور بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ سوداگر ہے اور یہ کسان۔ فطرت نے کچھ ایسی ترتیب عمل کی ہے کہ اس طرح زندگی گزار کر وہ جسمانی حالات و کیفیات میں بھی نشو و نما حاصل کرتے رہتے ہیں اور عقل و ہوش کے ساتھ ساتھ قوتِ ادراک بھی روشن ہوتی جاتی ہے' اس کے علاوہ انسان یہ بھی چاہتا ہے کہ اُس کا قبیلہ زندہ رہے جس کے لئے اُس کو کاشتکاری اور جہازرانی کرنی ہوتی ہے' وہ آگ کی خاصیت معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ کھانا پکانے، میدانِ جنگ میں اور دھات کا کام کرنے میں کس طرح مفید ہو سکتی

ہے۔ اس طرح فطرت کے دوش بدوش سفر کرنے سے اُس کا اخلاق نشوونما حاصل کرتا ہے اور وہ ایک شاندار و باوقار شخصیت کا مالک بن جاتا ہے، انسان فطرت کے اصلاحی اثر سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا، وہ دبستان قدرت سے فرار نہیں ہو سکتا۔ وہ ماحول سے جدا ہو کر کبھی زندہ نہیں رہ سکتا اور ماحول میں کچھ نہ کچھ تبدیلی کا ظہور پذیر ہونا لازمی اور بدیہی ہے جس سے انسان کا متاثر ہونا امر ناگزیر ہے۔

فطرت کا یہ شدید ترین تقاضہ ہے کہ اشرف المخلوقات کسی رتبہ پر پہنچکر ترقی سے سیر نہ ہو بلکہ ہمیشہ بلندی کا جویاں و متلاشی رہے، اسی لئے فطرت نے اس کش مکش کو انسان کی ایک ایسی فطری ضرورت سے منسلک کر دیا ہے جو کسی حالت میں اُس کے دامانِ حیات سے جدا نہیں ہو سکتی، جذباتِ محبت والفت سے ہم ایک کافی مدت کے لئے دست بردار ہو سکتے ہیں، جذبات شہوانی ونفسانی ایک طویل عرصہ تک انسان سے بالکل جدا رہتے ہیں، لیکن بھوک و پیاس ایک بے کس بچے سے لے کر نپولین اعظم اور حضرت عمر فاروق تک ہر کس و ناکس پر بلا کسی استثنا کے شب و روز حاوی ہے اور جس سے کنارہ کشی اختیار کر لینا اپنی ذات کو معرض ہلاکت میں ڈالنا ہے، موت ”اعضاءِ اجزا کا پریشان ہونا“ تو ضرور ہے مگر اس علم کی اصطلاح میں اُس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہستی کش مکش حیات کے میدان میں ناکارہ ثابت ہوئی اور صفحۂ عالم سے اس لئے جدا کر دی گئی کہ اس میں ارتقا پذیری کی صلاحیت باقی نہیں رہی اور بدیں وجہ اُس تودۂ خاک کو کارکنانِ قضا و قدر نے سپردِ زمین کر دیا۔

یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ڈارون اور ولیس کے اقوال ناظرین کی خدمت میں پیش کریں تاکہ غلط فہمی کا بخوبی ازالہ ہو جائے ”جب ہم اس کش مکش پر غور و تبصرہ کریں تو ہم کو یقینِ واثق رکھنا چاہیئے کہ فطرت کی اس جنگ عظیم میں خوف و خطر کی کوئی گنجائش نہیں ہے، موت وقتِ مقررہ پر خود بخود آموجود ہوتی ہے اور تندرست، توانا اور ہشاش بشاش نہ صرف زندہ رہتے ہیں بلکہ ترقی پاتے جاتے ہیں“۔

ویلیس نے اس مدعا کو پُر زور عبارت میں یوں بیان کیا ہے: "عوام الناس کا یہ خیال کہ یہ کش مکش رنج والم، کرب واضطراب، مصیبت ومشقت کا باعث ہوتی ہے بالکل غلط ہے بلکہ زندگی اور زندگی کی تمام ترشادمانی اسی سے وابستہ ہے، موت اور بقائے نسل کی نعمتوں کو شامل کرتے ہوئے ہم کسی اور اسکیم کو دنیا میں رائج نہیں کر سکتے تھے جس میں اس قدر فرحت و شادمانی حاصل ہو سکتی جس قدر کہ ہم اس نوعیت کی حیات حاصل کر لیتے ہیں۔

اس کش مکش میں جن جن مصائب اور تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے وہ بسا اوقات ہمت شکن اور حوصلہ سوز ہوتی ہیں مگر پھر بھی انسان کوئی نقصان نہیں برداشت کر رہا ہے اس جیب زیان میں بھی گوہر ہر سود موجود ہے، یہ تمام ملکی ومدنی، اخلاقی ومعاشرتی ترقیاں یہ دنیا کی محفلوں کی زیبائش وآرائش یہ مجالس کا سامانِ عیش وعشرت، یہ شہروں کی عظمت و سطوت، یہ بازاروں کی حشمت وشوکت، اس قیمت میں کچھ گراں نہیں حالانکہ بعض حضرات کی خواہش یہی ہے کہ نرخ اور زیادہ ارزاں ہوتا۔ لیکن اغلباً وہ حضرات اسی عظیم الشان ترقی کی لامتناہی وسعت سے کما حقہٗ واقف نہیں ہیں، میدان جدال وقتال میں جب ہم آمادۂ پیکار ہوتے ہیں تو خون کی ندیاں بہنے لگتی ہیں۔ زخمیوں کی چیخ و پکار سے میدانِ کارزار صحرائے قیامت کا ہم پلہ ہو جاتا ہے، مگر اس جد وجہد میں نتائج بالکل مختلف رونما ہوتے ہیں بجائے تباہی وبربادی، رسوائی وناکامی کے اس میں مسرت وابتہاج، صحت وتوانائی، شادکامی وکامرانی حاصل ہوتی ہے اور ہم میں ترقی کی شاہراہ پر گام زن ہونے کی بہترین صلاحیت آموجود ہوتی ہے۔

محض ایک مکمل جسم تکمیل انسانی کے لئے مکتفی نہیں، اس جسم میں اگر ہم ایک دماغ کا بھی اضافہ کر دیں تو ہم بلندی پر ضرور پہنچ جاتے ہیں مگر پھر بھی انسانی اوج کمال سے کمتر رہتے ہیں، دل اور دلِ دردمند جب تک نہ ہو انسانیت کا اطلاق محض ایک خواب وخیال ہے سہ

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

اور یہ وہ بارِ امانت ہے کہ جو "آسمان نتوانست کشید" وہ انسان جس کا ماحول محبت والفت کی خوشگوار آب وہوا سے معمور ہو، جس کی سانس بوئے عشق کی عنبر بیزی سے لبریز ہو اور جس کی آرزوئیں تمام تر اسی وادیٔ پرخار سے وابستہ ہوں۔ بہترین انسان ہے۔ کیونکہ یہی وہ دُرِ نایاب ہے جس کی جھلک اُس کو نورِ ایزدی سے منسلک کرتی ہے اور یہی وہ گوھرِ شب چراغ ہے جو نظمِ خداوندی سے وابستہ ہے، سوادِ انسانی ایک وحشت کدہ ہے جب تک اُس میں محبت کی دیوی جلوہ گر نہیں، محفلِ انسانی تیرہ وتاریک ہے جب تک اس میں مضرابِ محبت کی ترنم ریزی نہ ہو اور کل کائنات بازیچۂ اطفال ہے اگر اُس کے افراد دلِ بریاں ودیدۂ گریاں سے محروم ہیں لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئیے کہ آتشِ عشق شائستہ زمانہ کا عطیہ ہے، قرونِ اولیٰ کا زمانہ اُس کی تجلیوں سے خالی نہ تھا، اس کی ابتدا روزِ ازل سے ہوئی اور اُس کی چنگاریاں اُس وقت تک روشن رہیں گی جب تک کہ زمین آفتاب کے گرد چکّر لگاتی رہے گی، اور ہم اپنے حیات کا ذخیرہ سورج سے حاصل کرتے رہیں گے، لیکن شجرِ محبت آسمانی فیاضی کا مرہونِ کرم نہیں، بلکہ یہ درخت اسی زمین میں پیدا ہوا، اسی آب وہوا میں پھلا پھولا اور رفتہ رفتہ اس قدر عظیم الشان ہوگیا کہ اُس کا دل نواز سایہ حیات کے ہر شعبہ اور آبادی کے ہر طبقے میں پرتو فگن ہے۔

اس سلسلہ میں ہمیں ایک دوسرے فرض کی جانب متوجہ ہونا پڑے گا، یعنی اس کش مکشِ حیات کے دوش بدوش ایک اور جد وجہد جاری ہے جس سے افزائشِ نسل کے خوشگوار نتائج مرتب ہوتے ہیں اور بنی نوعِ انسان کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہتا ہے، پودوں اور درختوں سے تخم حاصل ہوتے ہیں تاکہ اُن کی نسل برقرار رہے اور اُن کا نام ونشان صفحۂ عالم سے محو نہ ہونے پائے، نباتات سے بڑھکر ذرا اور بلندی پر آئیے ایک ہرنی مرغزار کے حسین وپرسکون گوشۂ عافیت میں اپنے چھوٹے بچّے کو سینہ سے لگائے بیٹھی ہے، یہی ہے وہ ننھا سا وجود، یہی ہے وہ بیکس ہستی۔ جس کو وہ عدم سے وجود میں

لائی اور جو اپنی صغر سنی کی وجہ سے نہ زندہ ہے اور نہ مردہ، موسم کی گستاخیاں اس کی شمع حیات کو گل کرنے پر آمادہ ہیں، قطرات ہر چہار جانب سے اس پر مسلط ہیں، ہلاکت و بربادی کے آثار اس کے تخیل پر مستولی ہیں۔ لیکن ذرا دیکھئے کہ وہ ماں کس طرز عمل پر کاربند ہوتی ہے اور کس طرح پروانہ وار اپنے جگر گوشہ کی معاونت کرتی ہے، فطرت ہم کو صاف طور سے بتاتی ہے کہ یہ دنیا محض نفس پرستی کے لئے آماجگاہ نہیں ہے جہاں خود غرض انسان ہوسناکی میں مبتلا ہو کر خواب گراں میں محو ہو جائے، عقل و خرد سے معرا ہرنی کا مشاہدہ کیجئے، وہ خود بھوکی رہتی ہے لیکن اپنے بچے کی غذا کا خاطر خواہ انتظام کر دیتی ہے، خود موسم سرما کی سرد ہواؤں سے مامون مصئون نہیں مگر اپنے بچے کو تمام بلایات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھتی ہے، وہ خود ہدف تیر ہلاکت بن جاتی ہے مگر آخر وقت تک بچے کا بال بیکا نہیں ہونے دیتی، درحقیقت وہ گھڑی بھی کس قدر مبارک اور خوش آیند ہوگی جب اس کرۂ خاکی کو "ماں" نے اولین مرتبہ اپنے فرخندہ قدموں سے رونق بخشی۔ اور دنیا کو ایثار و قربانی کا پیام دیا، کیا اب بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انس و محبت، ہمدردی و جانبازی، الفت و شفقت جیسے برگزیدہ اور مایہ ناز جذبات کی ابتدا اس کارگاہ حیات میں صنف لطیف کے دم سے ہوئی اور یہ وہ خوبیاں ہیں جن کی بدولت ہماری نجات کے لئے ایک ابدی شمع ہدایت روشن ہے اور جن کا فقدان انسان کو حیوان کے زمرہ میں شامل کر دیتا ہے، دراصل ایک دوسری ذات کو عالم وجود میں لانے کے لئے اور اس کو کشمکش حیات کے واسطے توانا بنانے کے لئے سخت مصائب اور دقتوں کا سامنا ہوتا ہے اور اس امر کی ضرورت ہے کہ ایک تندرست، پختہ کار اور صحیح دماغ فرد بلا کسی معاوضہ کے نہایت تندہی سے خدمت کرنے پر ہمہ تن اور ہمہ وقت آمادہ ہو جائے اور وقت ضرورت اپنی صحت اور جان سے بھی دریغ نہ کرے، اس عظیم الشان فرض کو "عورت" نے اپنے سر لے کر اپنی عدیم المثال اولوالعزمی اور دلاوری کا ثبوت دیا، عالم نباتات میں بھی اس کی مرادف مثالیں پائی جاتی ہیں، ایسے پودے موجود ہیں جو فنا ہونے کے قریب تخم

مہیا کرتے ہیں اور اُس کے بعد ہی بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں، یعنی اپنے جانشین کے وجود کے لئے سامانِ حیات مہیا کرنے کے بعد خود ادائے ہستی سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اُن کی جگہ ہم زیادہ خوبصورت، زیادہ کمسن پودے پاتے ہیں جن میں اصلاح پذیری کی صلاحیت بہتات کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔

یہ ہیں وہ دو اہم ترین فرائض جو اس دنیا کی اسکیم کی روحِ رواں اور اس عالم کی عالیشان عمارت کے بنیادی پتھر ہیں، فرضِ اول ہم کو خود غرضی اور خود نمائی کا سبق سکھاتا ہے اور ہمارے دلوں میں ہمت و جرأت کا بیج بوتا ہے تاکہ ہم میدانِ کارزار میں ایک مردانہ وار سپاہی کی خدمت انجام دیں، فرضِ دوم ہم کو ہمدردی و بُردباری اور محبت و الفت کا درس دیتا ہے تاکہ ہمارے قلوب میں ایثار کا مادّہ پیدا ہو اور ہم صلح و آشتی قائم رکھنے میں مدد معاون رہیں، میں اُن حضرات کے خلاف ہوں جو یہ چاہتے ہیں کہ ہم میں حلم و بردباری اور ایثار و قربانی کا جذبہ اس درجہ ترقی پذیر ہو جائے کہ ہم اپنی خودی کو بھول جائیں اور اپنی ذات کو فراموش کر دیں کیونکہ اس حالت میں ہم ایک جانباز کی مردانگی کو عنقا پائیں گے اور ہم میں جنگ آزمائی کی صلاحیت موجود نہ ہوگی، ایک باہمت شیر دل بننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی ذات کا وقار اور اُس پر اعتماد کامل کریں، دنیائے اسلام کو اس پُر آشوب زمانہ میں حضرت عمر فاروقؓ، حضرت خالدؓ جیسے جانباز سپہ سالاروں اور نامور رہنماؤں کی اشد ضرورت ہے جنھوں نے گو ایثار و قربانی کے بے عدیل و بے نظیر کارنامے چھوڑے مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنی سطوت اور جبروت کے لحاظ سے بھی مرکزِ عالم سے زیادہ گراں قدر اور رفیع شمار کئے جاتے تھے۔

(باقی باقی)

محسوساتِ فانی

مر کر مریضِ غم کی وہ حالت نہیں رہی
یعنی وہ اضطراب کی صورت نہیں رہی

ہر لمحۂ حیات رہا وقفِ کارِ شوق
مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں رہی

اے دردِ عشق! اب تو خدا کے لئے نہ چھیڑ
دل میں کراہنے کی بھی طاقت نہیں رہی

ہر بے گنہ سے وعدۂ بخشش ہے روزِ حشر
گویا گناہ کی بھی ضرورت نہیں رہی

اے عرضِ شوق! مژدہ کہ دل چاک ہو گیا
تکلیف پردہ داری حسرت نہیں رہی

غیرت نے بیکسی کا نشاں بھی مٹا دیا
اُڑتی تھی جس پہ خاک وہ تربت نہیں رہی

محشر میں بھی وہ عہدِ وفا سے مکر گئے
جس کی خوشی تھی اب وہ قیامت نہیں رہی

یوں مٹ گئی وفا کہ زمانے کا ذکر کیا
اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی

فانی امیدِ مرگ نے بھی دیدیا جواب
جینے کی ہجر میں کوئی صورت نہیں رہی

مغلوں نے ہندوستان کے تمدن پر کیا اثر کیا

ہم نہایت مسرت کے ساتھ اپنے دوست مولانا عبد السبحان صاحب کا مضمون درج کرتے ہیں جو ہم کو مینا صاحب زبیری کے ذریعہ سے موصول ہوا ہے جو خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ مولانا عبد السبحان صاحب علی گڑھ میگزین کو اپنی چشم کرم سے محروم نہ رکھیں گے ۔

اڈیٹر

ایک یورپین مورخ مغلوں کے اقتدار اور اُن کی متضاد خصائص کے متعلق لکھتا ہے کہ مغلیہ بادشاہوں کے اقتدارات غیر محدود تھے اور ان کو وہ اس زرخیز ملک کی دولت کو اپنی طرف کھینچنے میں استعمال کرتے تھے اس کے ساتھ ہی وہ اس دولت کو نہایت فراخدلی اور فیاضی کے ساتھ صرف بھی کرتے تھے جس کی مثال تاریخوں میں بہت کم ملتی ہے۔ ان کے اباواجداد کے متعلق وہی مورخ لکھتا ہے۔ یہ دنیا پر یکایک ٹوٹ پڑے اور صرف اپنے تخیل کے زور سے مالک بن گئے۔ اُن کی فتوحات میں اور رومیوں اور عربوں کی فتوحات میں بڑا انتہا فرق ہے، رومی محض ملک گیری کے فوائد کی غرض سے ایک باقاعدہ طور پر اپنی فتوحات بڑھاتے رہے اور عربوں کو مذہبی جوش نے ملک گیر بنا دیا لیکن ان مغلوں کی ملک گیری محض اس غرض سے تھی کہ وہ اقوام عالم پر اپنا سکہ بٹھائیں انھیں اپنے جھنڈے کے نیچے ذلیل و خوار کریں اور مغل کے نام کو اور اُس بڑے خان کے جو اُن کا حاکم اور سرگروہ تھا شہرے کو تمام عالم میں پھیلائیں

چنگیز خاں اور تیمور لنگ وہ نام ہیں جن کے سننے سے ہمارے سامنے ایک ایسی خیالی صورت پیدا ہوتی ہے جس کے سر کے گرد آگ اور خون کا ہالہ بنا ہوا ہے لیکن ان مغل فاتحین کے بیدرد اور ظالمانہ فطرت کا ایک حصہ ایسا ہے جو مشکل سمجھ میں آتا ہے اور جس نے ان کی عظمت بہت کچھ بڑھا دی ہے۔ یہ وہ تضاد ہے جو اُن کی بیرحمی اور اُن کی رواداری میں واقع ہوا ہے۔ وہ تکبر جو ادنیٰ سے مقابلہ پر ہزارہا جانیں تلف کر دیتا تھا اور وہ شیرینی اور نرمی جو ان ظالم فاتحین کو اپنی مفتوح اقوام کے قدموں کے سامنے جھکا دیتی تھی وہ سرد اور بے رحم وحشیانہ حرکت جو مفتوحین کے سروں کے اہرام بنایا کرتی تھی اور وہ علوم و فنون کی قدر دانی جس نے انھیں علم و ادب کا دوست اور سرپرست بنا دیا تھا۔ پھر ان کی فتوحات کی نسبت لکھتا ہے۔ مغلوں نے اس وقت گویا تمام ایشیا کو فتح کر لیا تھا۔ اور یورپ کا بھی ارادہ کر رہے تھے، ایسے وقت میں یہ ہندوستان آئے، دنیا کی تاریخ میں کبھی کوئی اتنی بڑی حکومت اس قدر جلد قائم نہیں ہوئی۔ یہ گویا ایک ملک گیری کی ہوا تھی جو ان اقوام مغل کے جن کا اصلی شغل سائبیریا کے غیر متناہی اور سنسان بیابانوں میں مویشی چرانا تھا دفعۃً کانوں میں پڑ گئی اور انھیں برانگیختہ کر دیا۔ (دیکھو تمدن ہند)

ہم غیر اقوام کے مورخین کے اس صدائے احتجاج کے ہمنوا ہیں کہ سلاطین مغلیہ ملک گیری کی ہوس میں ہندوستان پر حملہ آوری کے جرم کے مرتکب ہوئے لیکن یہ حضرات دنیا کے اور کس قوم اور مذہب کے فاتحین اور کشور ستانوں کو اس الزام سے بری کر سکیں گے کیونکہ اگر ملک گیری اور کشور کشائی مذموم افعال ہیں تو ان کے مجرم نہ صرف مغل ہی ہیں بلکہ ہر فاتح خواہ وہ کسی قوم یا مذہب کا ہو۔ دیکھنے کی یہ بات ہے کہ مسلمانوں نے اپنی ہشت صد سالہ حکومت میں اپنے مقبوضہ ممالک اور رعایا کے ساتھ سلوک کیا کیا۔ اپنے مقصد سے قریب تر رہنے کے لیے ہم صرف مغلوں کے تمدن پر

بحث کریں گے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اُن کی حکومت کا ذکر تشکر و امتناں سے کیا جائے یا اس داستان کو تقویم پارینہ سمجھ کر نسیاً منسیا کر دیا جائے۔ ان فاتحین ہند نے نہ صرف ہندوستان کو فتح کیا بلکہ اپنا مذہب اپنی زبان اور اپنی صنعت ملک میں پھیلا دی اور جو عظیم الشان تغیرات انھوں نے پیدا کئے اس وقت بھی موجود ہیں۔ زبان اُردو جو اب ہندوستانیوں کی مادری زبان کہلائے جانے کی مستحق ہوتی جاتی ہے انہیں فاتحین کی زبان سے مشتق ہوئی ہے اور شعبوں میں البتہ ان کا ویسا اثر باقی نہیں ہے۔ اُس جدید تمدن نے جس کو افغان۔ ترک۔ اور مغل۔ ہندوستان میں لائے پہلے تو بہت کچھ انقلاب پیدا کر دیا لیکن آخر میں مفتوح قوم کے تمدن سے مغلوب ہو گیا۔

مغل خاندان کی مستقل حکومت کا آغاز پانی پت کی لڑائی کے بعد سے سمجھنا چاہیے جس کو فتح کرنے کے بعد بابر نے ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا سنگ بنیاد قایم کر دیا۔ بابر نے اُس وقت ہندوستان کا تمدن کس حال میں پایا اس کا مختصر ذکر مصنف نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ہم کسی قدر وضاحت کے ساتھ خود بابر کے الفاظ میں بیان کیے دیتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔ اسپ خوب نے، گوشت خوب نے، انگور و خربوزہ و میوہ ہائے خوب نے، یخ و آب سرد نے، حمام و مدرسہ نے، شمع و مشعل نے، شمعدان نے، بجائے شمع مشعل و جمع کثیر چرکینے می باشند دیوٹی میگویند، در دست چپ نو دسہ پایہ خورد سے را گرفتہ اند کہ ازیں سہ پایہ در کنار یک پایہ مثل سر شمعدان یک آہنے را بہ چوب بہ ہمیں سہ پایہ مضبوط کردہ اند۔ یک فتیلہ ستی را کہ برابر انگشت بودہ باشد بہ چوب آہن دار پایہ دیگر بستہ اند۔ در دست راست ایشاں یک کدوے است کہ سوراخ آں را تنگ گذاشتہ اند کہ روغن ازاں جا باریک شدہ می ریزد۔ بادشاہان و امرائے ایشاں شب ہا اگر کارے کہ احتیاج بہ شمع داشتہ باشند ہمیں دیوٹ ہاے چرکین ایں چراغ آوردہ نزدیک گرفتہ می ایستند۔ در باغ و عمارت ہا آب ہاے رواں نے۔ در عمارات او صفا و ہوا و اندام و سیاق نے،

رعیت و مردم ریزہ تمام پائے برہنہ می گردند۔ لنگوٹہ گفتہ یک چیز می بندند۔ زنان آں ہا خود یک لنگے بستہ اند نصف آں را در کمر بستہ اند و نصف دیگر را بر سر خود انداختہ اند۔"

مغلوں کے بعد خدا نے انگریزوں کو رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ان کی حکومت میں تمدن پر جو اثر پڑا اُس کے بیان کے لئے ایک نئے ضخیم تصنیف کی ضرورت ہے۔ پھر بھی آج ہندوستان کے بعض گوشے بابر کے بیان کی تصدیق کر رہے ہیں۔ مکانات بعض ضرور سر بفلک نظر آئینگے لیکن اُن میں ہوا یا روشنی کا گذر نہو گا۔ زیورات میں سونا چاندی بیشک استعمال کیا جاتا ہے مگر اتنے بھاری اور ایسے بھدے کہ خدا کی پناہ لباس میلے کچیلے۔ دستکاری میں وہی گاڑھا گزی۔ کاشتکاری کے لیے وہی ہل اور بیل۔ تمدن کے صدہا جزیات ہیں مگر کسی میں نفاست و آرائش کا نام نہیں۔ اب مغلوں نے بھی جو کچھ کیا اُس کا ذکر سُنیئے۔

ہندوستانی زراعت پیشہ ہیں لیکن اپنے وطن سے کبھی باہر نہ جا سکنے کی وجہ سے دیگر ممالک کے پھل اور پیداوار سے ناواقف تھے۔ مغلوں نے ایران و خراسان کے پھل اور پھول سارے ہندوستان میں پھیلا دیئے۔ قلم لگانے کو رواج دیا۔ میوہ جات میں شاہ آلو، انناس مختلف قسم کے انگور۔ درختوں میں سرو، صنوبر، چنار، سفیدار، بید مولہ، صندل، پستہ۔ پھولوں میں گل سرخ، نرگس، بنفشہ، یاسمن کبود، سوسن، ریحاں، رعنا، زیبا، شقایق، تاج خروس، قلغہ، نافرمان، خطمی، پیدا ہونے لگے۔ باغات میں چمن بندی، خیاباں، جدول، تختہ بندی، عمارات اور آبشار قائم و تعمیر کیے گئے۔

صنعت و مصنوعات میں بہت کچھ ترقی دی گئی۔ بڑے بڑے شہروں میں پارچہ بافی کے کارخانے جاری ہوئے۔ کپڑے تصاویر، نقش و بوٹہ و شگرف سے مزین ہونے لگے ریشمی کپڑوں میں مخمل زربفت، فرنگی، گجراتی، کاشی، ہروی، طاس گجراتی، دارائی، منقیش، شروانی شجر فرنگی، دیبائے فرنگی، دیبائے یزدی، خارا، اطلس خطائی، نوار خطائی، خسر، مخمل فرنگی خانی، سہ رنگ، قطنی، کتاں فرنگی، تافتہ، انبری، مطبق، سوتی کپڑوں میں جو تار، ململ، بیتنگہ

سری صاف، گنگاجل، بہیرون، سالو، بادشاہی، گریہ سوتی، شیلہ دکنی، جھرکل، سہن، جوہنہ، اساولی، محمودی، پنچتولیہ، جبولہ، چھینٹ وغیرہ کا رواج ہوا۔ شال مختلف رنگ اور مختلف قسم کی ایجاد ہوئیں۔ خاص لاہور میں اس کے ہزار سے زیادہ کارخانے جاری ہوگئے۔ زمین کی پیمائش کرائی گئی۔ اُس کی قسمیں قرار دی گئیں مثلاً قابل زراعت و ناقابل زراعت۔ تقاوی دینے کا رواج جاری ہوا۔ تشخیص جمع کے مختلف طریقے مقرر کیے گئے۔ مالگذاری وصول کرنے کے نرم اور آسان قواعد منضبط ہوئے۔

غیر ممالک سے مختلف النوع حیوانات منگوا کر اُن کی نسلوں میں اضافہ کرایا گیا۔ اونٹ ہندوستان میں کمیاب تھا اس کی افزائش کی گئی۔ عراق، عرب، روم، ترکستان، بدخشاں تبت سے سوداگر گھوڑے لاتے تھے ان سے بہتر نسلوں کے پیدا کیے جانے کا انتظام کیا گیا۔ خچروں کی نسل کو اس حد تک ترقی دی گئی کہ ہزار روپیہ قیمت تک فروخت ہونے لگے۔ صحرائی اور جنگلی جانور پال کر رام کیے گئے اور اُن سے بچے پیدا کیے جانے لگے۔

ایجادات و اختراعات میں بھی مغل پیچھے نہیں رہے ہے۔ حکیم علی نے سنہ ۳۹ جلوس اکبری میں ایک حوض بنوایا جس کے اندر ایک چھوٹا کمرہ تھا اس میں دس بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ہر طرف سے روشنی آتی تھی، ہوا کا رخ ایسا رکھا تھا کہ پانی نہ آسکتا تھا۔ امیر فتح اللہ شیرازی نے ایک چکّی ایسی ایجاد کی جو خود بخود چلتی اور آٹا پیستی تھی۔ اکبر کے وقت میں طرح طرح کی توپیں ایجاد ہوئیں۔ ایک توپ سترہ نال کی تھی جو سب ایک ہی دفعہ سر ہوتی تھیں۔ ایک توپ ایسی تھی جو چوڑیوں کے حلقہ کی طرح الگ الگ ہوجاتی تھی اور پھر ضرورت کے وقت حلقے ملا دیتے تھے۔ بادشاہ رات کو گیند کھیلتا تھا۔ اس لیے ایسی گیند بنوائی گئی جو رات کو شعلہ کی طرح چمکتی تھی۔

اسلامی تمدن نے ضروریات معاشرت میں بیحد ترقی کردی۔ سواری شکار۔ سفر۔ حضر۔ لباس طعام ہر چیز میں نئے نئے حاشیے چڑھا دیے گئے۔ آئین اکبری، تزک

جہانگیری میں ایک ایک بات کی تفصیل درج ہے۔ زنانہ لباس، زیور اور آرائش میں نورجہاں بیگم نے طرح طرح کی اختراعات کیں۔ عمدہ لباس اور زیورات کا نمونہ اب بھی بندیلکھنڈ کے نواح میں دکھائی دیتا ہے لیکن دہلی اور لکھنو کی تراش سب اُسی عہد کی یادگاریں ہیں۔

ہندوستان کی صدہا قسم کی پیداوار بے مصرف رہتی تھی۔ مغلوں کی خوش مذاقی و جدت پسندی سے ہزاروں چیزیں آرام و آسائش کے کام آئیں۔ اکبر کے عہد میں شورہ سے پانی سرد کرنے کا رواج ہوا۔ برف پہاڑوں سے آکر بازاروں میں بکنے لگی۔ خس کی ٹٹی بھی اکبر ہی کی ایجاد ہے۔

مغلوں کے زمانہ میں جو جدت و نفاست فن تعمیر میں پیدا کی گئی اور جن کی شان و شوکت کو کہا جاتا ہے کہ یورپ کی عمارتیں بھی نہیں پہونچتیں اس وقت بھی دیکھنے والوں کو حیرت زدہ بنا دیتی ہیں۔ اُن کے آثار آج بھی آگرہ و دہلی کے در و دیوار میں نظر آرہے ہیں۔ اگرچہ امتداد زمانہ سے اُن کی بہتری یادگاریں صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئی ہیں پھر بھی بعض عمارتیں گورنمنٹ انگریزی کے قانون تحفظ آثار قدیمہ کی بدولت اُس کاروانِ رفتہ کے نقش قدم کی شہادت دے رہی ہیں۔ جس طرز تعمیر کا رواج ہندوستان میں مغلوں نے دیا وہ عربی طرز تھا۔ لیکن ایرانی اثر سے مخلوط ہو چکا تھا۔ بابر سے بھی ایک صدی قبل سمرقند میں تیمور نے (۱۳۹۶ء سے ۱۴۰۴ء تک) جو عمارتیں بنوائی تھیں اُن میں ایرانی اثر غالب تھا۔ مثلاً نما گنبد جو مغلیہ طرز تعمیر کی خصوصیات میں داخل ہے اور ضیا کار استرکاری جو لاہور کی عمارتوں میں نمایاں ہے، نوکدار محرابیں۔ اور عالیشان پھاٹک جن پر نیم گنبد بنائے گئے ہیں۔ سب ایرانی طرز کے خاکے ہیں نمونہ کے طور پر ہم بعض عمارات کا ذکر باختصار کرتے ہیں۔

ہمایوں کے مقبرہ اور عرب سرا کا حال حاجی بیگم کے تذکرہ میں بیان ہو چکا ہے۔

سکندرہ میں اکبر کا مقبرہ اب تک موجود ہے جو مصنف کتاب کے اس خیال کا بین ثبوت ہے کہ اگر اس جلیل القدر بادشاہ کے بعد دو اس کے اور جانشین تعمیر کے دلدادہ نہ پیدا ہو جاتے جیسا کہ جہانگیر اور شاہجہاں ہوئے تو اکبر تعمیرات کے لحاظ سے بھی بہت مشہور ہوتا جس کی عمارات میں متانت اور مضبوطی پائی جاتی ہے - اکبر کو اس فن میں خاص شغف تھا - اس عمارت کی تعمیر اکبر کی زندگی ہی میں شروع ہوگئی تھی - اختتام شاہجہاں کے وقت میں ہوا۔ اکبر کے زمانہ کی ایک اور یادگار آگرہ کے قریب فتحپور سیکری میں موجود ہے جس کے آثار قدیمہ آج بھی سیاحوں کو حیرت زدہ بنا دیتے ہیں - آب وہوا کی خرابی کے باعث اکبر نے اس نئے پایہ تخت کو چھوڑ دیا تھا اور پھر یہ پرتکلف شہر جسے بقول مصنف تمدن عرب' یورپ کی بڑی ریاستیں بھی اپنا دارالسلطنت بنانے کا فخر کریں صرف شیروں کا مسکن و ماوا ہوگیا - آگرہ کا عظیم الشان قلعہ اُسی کی یادگار ہے - اکبر اور اس کے دیکھا دیکھی جہانگیر کی فکر یہی رہی کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہو جائیں چنانچہ انھوں نے تمدن کے ہر شعبہ میں یگانگت کی راہ پیدا کرنی چاہی اسی لیے اُن کی یہ کوشش رہا کی کہ طرز تعمیر ہی یکساں کر دیا جائے یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کی بہتری عمارتیں جیسا کہ فتحپور سیکری میں دیکھنے میں آتی ہیں ہندوانہ طرز لیے ہوئے ہیں - شاہجہاں کا زمانہ مغلیہ عمارت کے حق میں سب سے اعلیٰ زمانہ تھا اُس نے طرز تعمیر کو ہندوانہ اثر سے خالص رکھنے کی سعی کی - ہندی صناعی کی جان یعنی منبت کاری کے بجائے دندانہ دار محرابیں، شلغمی گنبد، سفید سنگ مرمر پر قیمتی پتھروں کی پچیکاری اینٹ کی مسجدوں میں مینا کاری استرکاری یہ شاہجہاں کے زمانہ کی عمارتوں میں زیادہ پائی جاتی ہے - جسے عربی اور ایرانی طرز تعمیر کا مرکب نمونہ سمجھنا چاہیے -

آگرہ کا روضہ تاج گنج ۱۶۳۱ء میں شاہجہاں نے ممتاز محل کی یادگار میں بنوانا شروع کیا تھا - اس پر چھ کڑور روپیہ صرف ہوگئے جس میں مزدوروں کا حساب شامل نہیں ہے مشرق کے تمام معمار جمع ہوگئے اور بیس ہزار مزدور روزانہ بائیس برس تک کام کرتے رہے

شاہجہاں نے دور دور سے نایاب اور بیش قیمت پتھر منگوا کر اس میں لگوائے۔ تمدن عرب کا فرانسیسی مصنف لکھتا ہے کہ "اگر اس قوم کو تنگ نا بھی کر دیں تو اس تخریج سے یورپ میں ایسی عمارت کا بنوانا محالات سے ہے جس کی خوبصورتی کا کافی اندازہ تصویر سے بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ روضہ بالکل سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے اور ایک بہت اونچے سنگ مرمر کے چبوترہ پر قائم ہے جس کی بلندی تقریباً ساڑھے پانچ گز ہے اور جس کا ہر ایک ضلع تقریباً ایک سو دس گز کا ہے سیاحوں کی عام رائے یہ ہے کہ یہ عمارت منجملہ عجائبات روزگار کے ہے۔ کسی شخص نے اس کی تعریف یوں لکھی ہے ... غرض جو کچھ صنعت کے قدرت میں تھا۔ یہاں افراط کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے اور ایک ایسا مجموعی اثر پیدا کر دیا ہے جس کا نظیر تمام عالم میں نہیں ہے۔ ایک اور شخص کی رائے ہے کہ محض اس کے دیکھنے کے لیے ہندوستان تک سفر کرنا جائز ہے اور یہ عمارت فی الواقع اس درجہ کامل ہے کہ اس کا مثل انسان کے ہاتھوں نے کبھی نہیں بنایا۔"

آگرہ کی موتی مسجد کو شاہجہاں نے ۱۶۵۶ء میں تعمیر کیا۔ ہیبر انگریزوں کا رئیس الاساقفہ لکھتا ہے کہ "اس مسجد کے دیکھنے کے بعد مجھے سخت شرم آئی کہ میرے مذہب کے معماروں نے کبھی کوئی عمارت ایسی نہیں بنائی جو اس خانہ خدا کا مقابلہ کر سکے۔"

دہلی کی جامع مسجد جو ۱۰۶۰ ہجری یعنی ۱۶۵۰ء میں تعمیر ہوئی سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ روکار پر سفید سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ نہایت صنعت سے لگائے گئے ہیں جو اس عمارت کی شان کو بڑھا رہے ہیں۔ دہلی کے شاہی قصر کی نسبت جسے شاہجہاں نے ۱۰۵۸ ہجری یعنی ۱۶۴۸ء میں ختم کیا کہا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ پُرشان کوئی اسلامی قصر ہندوستان و ایران میں نہیں ہے۔ موسیو اوسلی کا بیان ہے کہ "اس قصر کا اندرونی حصہ اس قدر پُرتکلف ہے کہ نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا" فرانسیسی سیاح ٹورنیر جو مصری لکھتا ہے کہ اس قصر میں سات تخت تھے جو ہیروں سے جڑے ہوئے تھے۔

ان میں سب سے بڑے تخت کی قیمت کا اندازہ اس سیاح نے سولہ کروڑ پانچ لاکھ روپیہ کیا تھا۔

ڈاکٹر گستاولی بان دہلی مرحوم کی نسبت کہتے ہیں کہ جو کوئی سیاح اس کے قریب پہونچتا تو اُسے گنبدوں اور میناروں کا جنگل سا نظر آتا تھا جس کے پیچھے ہندوستان کا نیلا آسمان بے ابر دکھلائی دیتا تھا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد سیکڑوں محلات اور پرستان کی سی عمارتیں نظر آتی تھیں جن میں مختلف رنگ کے کام بنے ہوتے تھے جو اُن کی حسن خوبی کی داستان زبان حال سے سنا رہے تھے" ان عجائبات کو سیاح نگاہ حیرت سے دیکھتا اور اپنے جی میں کہتا تھا کہ الف لیلہ کا جن بھی اس سے زیادہ خوبصورت سماں پیدا نہیں کرسکتا۔"

مغلیہ فوج۔ مصنف تمدن ہند لکھتا ہے کہ باوجود بدانتظامی کے اسلامی فوج کے بار بار ہندو افواج پر غالب آنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیشک اُن سے بہتر تھے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں جس وقت دکن کی فتوحات شروع ہوئیں تو بیجانگر کے راجہ نے اس امر پر نہایت تعجب ظاہر کیا کہ اُسے کبھی مسلمان فوجوں پر فتح نصیب نہ ہوئی اور اُس نے چھتریوں اور برہمنوں کی ایک مجلس منعقد کی اور اُن سے دریافت کیا کہ اس ناکامیابی کا اصلی سبب کیا ہے حالانکہ ہندوؤں کے پاس ملک اور روپیہ بمقابل مسلمانوں کے زیادہ ہے۔ برہمنوں نے جن کی باری پہلے آئی بیان کیا کہ یہ دیوتاؤں کی مرضی ہے لیکن چھتریوں نے اس امر کا اعتراف کیا کہ مسلمان تیرانداز ہندو تیراندازوں سے بہتر ہیں اور ایرانی اور عرب گھوڑوں کا مقابلہ دکن کے ٹٹوؤں سے نہیں ہوسکتا، اس کے بعد راجاؤں کی یہ کوشش ہوئی کہ وہ اپنی فوج کو مسلمانوں کے برابر بنائیں اور مسلمان سپاہیوں کو نوکر رکھیں .... اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج قائم کرلی تھی جس میں رسالے اور توپخانے اعلےٰ درجہ کے تھے"۔

جس زمانہ میں مغل ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے وہ زمانہ ایسا تھا کہ سلاطین کی ملکی فتوحات اور فوجی طاقت ہی سے سلطنت کی عظمت و شان کا اندازہ ہوتا تھا اس لیے تواریخ میں بھی زیادہ تر ایسے ہی کارناموں پر توجہ کی گئی وہ جنگ و جدال کے حالات سے بھری پڑی ہیں۔ بادشاہوں کی فیاضی، علمی سرپرستی، رفاہِ عام کے کاموں کا مشکل سے پتہ لگتا ہے۔ حالانکہ تحقیقات اور چھان بین سے یہ ثابت ہوتا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت ایک مہذب حکومت تھی۔ جیسا کہ علامہ شبلی کہتے ہیں "انتظام کے جدا جدا صیغے قایم تھے اور ہر صیغے کا وزیر یا سکرٹری الگ تھا۔ ہمیشہ تیسویں برس اراضی کی پیمایش ہوتی تھی اور زمین کی افزایش و لیاقت کے لحاظ سے دفتر خراج کی اصلاح و ترمیم ہوتی تھی پبلک ورک یعنی منافع عامہ کا وسیع محکمہ تھا جو سڑکوں کی درستی، پلوں کی مرمت، شہر کی صفائی، حفظانِ صحت، اور اس قسم کے تمام امور کا متکفل تھا۔ غرض ایک مہذب سلطنت کے جو جو لوازمات ہیں سب تھے لیکن آج ہم ان کی تفصیل بتانے سے بالکل عاجز ہیں۔"

ان مغلیہ سلاطین کو ہمیشہ اس کی ضرورت رہتی تھی کہ صوبجات میں جو کچھ ہو رہا ہو اُس سے آگاہ رہیں اس لیے اُن کے وقت میں ڈاک کا انتظام بہتر حالت میں تھا۔ خطوط و مراسلات جلد اور با قاعدہ آتے جاتے تھے۔ ہرکارے جا بجا مقرر تھے اُن کا کام ہی ڈاک کا ڈھونا تھا۔ یہ ہرکارے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بدلے جاتے تھے اور ملک کے کل بڑے راستوں پر ان کی آمد و رفت جاری تھی۔ اُجاڑ، دشوار گذار اور کم آباد راستوں میں جا بجا سفید پتھر نصب کر دیے گئے تھے تاکہ رات کے وقت یہ ستون ہرکاروں کو شمع ہدایت کا کام دیں۔ ان راستوں کے بہتر حالت میں ہونے کی تصدیق فرانسیسی سیاح ٹیورنیئر کرتا ہے جس نے سولہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کا سفر کیا ہے کہ یہاں کے راستے فرانس اور اٹلی کے راستوں سے بہت بہتر تھے۔

ہندوستان میں رفاہِ عام کے کاموں کا سنگِ بنیاد گو شیر شاہ نے رکھا لیکن مغلوں

نے اس پر مکمل عمارت تعمیر کر دی - پختہ سڑکیں مسجدیں - پختہ کنوئیں - سرائیں بنوائی گئیں
سڑکوں کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگوائے گئے - مسافر کی حفاظت کے لیے سپاہی
ساتھ رہتے جو اُن کی سلامتی کے ذمہ دار تھے - واپسی پر اپنے افسروں کو اطلاع کرتے
تھے - مسافر اگر خیریت سے نہیں پہونچا اور اُسے صعوبت سفر اٹھانی پڑی تو سپاہیوں کو
سزا ملتی تھی اور وہ اپنی خدمت سے موقوف کیے جاتے - پلوں کی مرمت کرائی گئی -
اسپتال تعمیر ہوئے - طبیب اور جرّاح مقرر ہوئے - جونپور کے قریب نالہ برکتہ اور نالہ
دمدمہ موضع کو بند میں لے لیا جن کی طغیانی سے شہر کے اکثر محلے ویران ہو جاتے تھے -
بابر کے عہد میں شیخ بہول نے ایک بہت بڑا بند بندھوا کر ایک پل بنوایا تھا - امیر رحیم داد
نے گوالیار میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا -

ہمایوں کے عہد میں شیخ زین الدین خاں وفا نے آگرہ میں جمنا پار ایک مدرسہ ایک
خانقاہ اور ایک مسجد تعمیر کرائی - خود بادشاہ نے قلعہ دین پناہ میں ایک بڑا کتبخانہ قائم کیا -
اکبر کے زمانہ میں تمام ممالک محروسہ میں مدرسے جاری تھے - اکبر آباد و آگرہ کلمائیتان مدرسہ
تعمیر ہوا جس کے آثار اوائل حکومت انگریزی تک موجود تھے - فتحپور سیکری میں مدرسہ ابوالفضل
اب تک مشہور ہے - مولانا علاء الدین لاری نے جنہوں نے شرح عقائد نسفی پر حاشیہ لکھا ہے -
سنہ ۹۶۹ ہجری میں بمقام آگرہ ایک مدرسہ جاری کیا - بدایونی نے اس مناسبت سے کہ
عمارت پر چھپر کا سایہ کیا گیا تھا مدرسہ خس اس کی تاریخ لکھی - جا بجا شفاخانے قائم تھے -
وزیر خاں مسیح الزماں، حکیم مصری، ملا میر طبیب ہروی، حکیم ابوالفتح گیلانی، حکیم زنبیل بیگ
شیرازی، حکیم حسن گیلانی اس زمانہ کے مشہور طبیب تھے - اکبر نے پنجاب میں سلطان پور
کے دریا پر بیس ہزار روپیہ کے صرف سے پل بنوایا - منعم خاں خانخاناں نے جونپور میں گومتی
کا مشہور پل صراط مستقیم بنوایا جو اب تک موجود ہے - ملا نور الدین نے نہر شیخو پلی کھدائی -
اکبر نے فتح اللہ شیرازی کو عضد الملک کے خطاب سے سرفراز کیا تمام ہندوستان میں

اُن کی شہرت کا ڈنکا بج گیا۔ اسی زمانہ میں حکیم شمس الدین اور اُن کے بھانجے حکیم علی گیلانی کی وجہ سے طب کو فروغ ہوا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نام نامی آج بھی طبقہ علما میں عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

جہانگیر نے تخت نشین ہوتے ہی جو بارہ احکام صادر کئے اُن میں ایک یہ تھا۔ راستوں پر منزل بہ منزل سرائیں، کنوئیں اور مسجدیں تعمیر ہوں۔ ایک حکم خاص شفاخانوں کے متعلق تھا۔ بادشاہ کے الفاظ یہ ہیں "درشہرہائے کلاں دارالشفاہا ساختہ اطبا بجہت معالجہ بیماران تعین نمایند وانچہ صرف وخرچ مے شدہ باشد از سرکار خالصہ شریفہ می دادہ باشند"

جہانگیر نے سلطانپور کے پل کے قریب ایک خوبصورت عمارت اور باغ تعمیر کرایا کہ آنے جانے والوں کو آرام ملے۔ الہ آباد کے مشہور سرائے کے مغربی پھاٹک پر اب تک یہ تین مصرعے تحریر ہیں ع بفرمانِ شہنشاہِ جہانگیر۔ کہ زیبد ملکش از مہ تا بماہی۔ بنا شد ایں سرائے آسمان قدر۔ کہا جاتا ہے کہ چوتھا مصرعہ کہ با دآباد خلد آباد شاہی گر کر ضائع ہو گیا ہے۔ بابا حسن ابدال میں پانچہزار کی لاگت سے ایک پل بنوایا۔ ممالک محروسہ میں حمالوں کے آرام کے واسطے سڑکوں پر تین تین گز کی دیواریں بوجھ رکھ کر ٹھہر جانے کے لیے بنوائیں۔ دریائے جہلم پر ۴۸ گز لمبا ۴ گز چوڑا پل تعمیر کرایا اور چار ہاتھی ایک ساتھ پل سے گزر والئے۔ ۱۴ جلوس میں آگرہ سے لاہور تک جدید سڑک بنوائی۔ ایک ایک کوس پر منارے تین تین کوس پر کنوئیں بنوائے۔ دوطرفہ سایہ دار درخت لگوائے اسی طرح آگرہ سے دریائے اٹک اور آگرہ سے بنگالہ تک دوطرفہ تمام سڑکوں پر میوہ دار درخت نصب کیے گئے۔ قلعہ سلیم گڑھ کا پل اور دہلی کا بارہ پلہ بھی جہانگیر کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ جہانگیر نے سڑک پر جو میل بنوائے تھے وہ بڑے بڑے چوڑے مینار کی شکل کے تھے اور آج بھی پنجاب کی راہ میں موجود ہیں۔

شاہجہاں کے عہد میں احمد آباد گجرات میں شفاخانہ قائم تھا جس کے افسرالاطبا

حکیم سید محمد ہاشم تھے۔ ان کے علاوہ صدرا، مسیح الزماں، حکیم ابوالقاسم، حکیم فتح اللہ حاذق اور مشہور حکیم تھے۔ سلطان جلال الدین فیروز خلجی نے پرگنہ خضرآباد میں دریا سے کاٹ کر ایک نہر تیس کوس یعنی پرگنہ سفیدوں تک تیار کرائی تھی۔ اکبر کے زمانہ میں شہاب الدین احمد خاں صوبہ دار نے اسے صاف کرایا تھا۔ ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں شاہجہاں نے بھی اسے صاف کرایا اور شاہجہاں آباد تک نئی نہریں کھدوا دیں اور بعد میں قلعہ اور شہر میں جاری کرائیں اور نہر بہشت نام رکھا۔ ڈاکٹر برنیر نے بنگالہ کے متعلق لکھا ہے "اس ملک میں جو دریائے گنگا کے دونوں طرف راج محل سے سمندر تک قریب تین سو میل کے ہے بے شمار نہریں ہیں جو مال تجارت لے جانے کے لیے گنگا سے کاٹ کر بڑی محنت سے بنائی گئی ہیں۔۔۔ ان نہروں کے دونوں طرف قصبے اور گاؤں آباد ہیں اور چاول اور نیشکر اور غلّہ اور بہت قسم کے ساگ پات اور سرسوں اور تل کے بڑے بڑے کھیت موجود ہیں۔" شاہجہاں اور عالمگیر کی عہد حکومت میں میرزاہد نامور ہوئے۔ یہ کہنا ایک حد تک حق بجانب ہے کہ درس نظامیہ کی بنیاد انہیں کے زبردست ہاتھوں کی ڈالی ہوئی ہے جن کے سلسلہ تلمذ میں قاضی مبارک اور شاہ ولی اللہ کا خاندان آسمان شہرت کا آفتاب بن کر چمکا اور حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، مولوی عبدالحی، شاہ محمد اسمٰعیل، مولوی محمد اسحٰق، مولوی رشید الدین خاں، مفتی صدرالدین جیسے روشن تارے جگمگا اُٹھے۔

عالمگیر کے زمانہ میں مدرسہ اکبرآباد کے مدرس ملا عبدالعزیز پسر ملا عبدالرشید اکبرآبادی تھے۔ اس بادشاہ نے تمام ممالک محروسہ کے شہروں اور قصبوں میں مدرسے جاری کیے اس کے عہد میں شہر سورت میں شفاخانہ موجود تھا۔ حکیم صادق خاں مشہور طبیب تھے۔ نواب خیراندیش خاں کنبوہ نے اٹاوہ میں ایک شفاخانہ جاری کیا تھا۔ اورنگ زیب نے تمام شہر اورنگ آباد میں نل لگا کر آبرسانی کا سررشتہ قائم کرایا تھا۔ مختلف مقامات پر چھوٹے

بڑے حوض اور تالاب بنوائے تھے ۔ نواب کمال خاں نے سانگی نام ندی سے جو قصبہ بیں ہاں سے چار یا پانچ کوس دکن کی جانب بہتی ہے ایک نہر کھدواکر رانی سر تالاب میں ڈال دیا تھا جس سے رعایا کو بہت آرام ہو گیا ۔

علم ہیئت میں مسلمانوں کے کارنامے مشہور ہیں مغلیہ خاندان اس صنف میں اپنا کمال دکھانے میں اور طبقہ کے مسلمانوں سے پیچھے نہیں رہا ۔ ان بادشاہوں نے رصدخانے اور دوربینیں نصب کرائی تھیں ۔ علم ہیئت کا شوق ان میں قدیم زمانہ سے تھا ۔ الغ بیگ جس کا ذکر مصنف نے کئی جگہ کیا ہے اس میں اس نے عجیب و غریب رصدی آلات نصب کیے جن میں سے وہ ربع دائرہ نہایت مشہور ہے جس کی بلندی ایا صوفیہ کے برابر بتائی جاتی ہے اس ربع دائرہ کے ذریعہ سے اس نے خود ہیئتی تحقیقات کی اور ان کو ایک کتاب میں جمع کیا جو زیچ الغ بیگ کے نام سے مشہور ہے ۔ رصدخانہ سمرقند کا بانی ہے اور جس میں علم ہیئت کے اہم مسائل پر بحث کی گئی ہے ۔ اور ستاروں کے مقامات نہایت صحت سے بتائے گئے ہیں ۔ یہ شاہرخ مرزا کا بیٹا اور تیمور کا پوتا تھا ۔ علم ہیئت کا بڑا ماہر استاد تھا ۔ بابر اس کے رصدخانہ کے متعلق لکھتا ہے "در سمرقند یک عمارت دیگر در دامنہ پشتہ کوہک رصد است کہ آلہ زیچ نوشتن است ۔ سہ اسیانہ است ۔ الغ بیگ میرزا باین رصد زیچ گورگانی را نوشتہ کہ در عالم حالا این زیچ معمول است و بزیچ دیگر عمل نہ کنند" ۔ ہمایوں علم ہیئت میں نہایت ماہر تھا ۔ ہندوستان میں اسی نے اصطرلاب کو رائج کیا ۔ وہ علامہ الیاس آردبیلی کا شاگرد تھا ۔ لوگ طویل سفر اختیار کر کے اس سے فن ہیأت کے لیے آتے تھے اس نے کرۂ ارض و کرات عناصر و افلاک و کواکب مختلف رنگ سے رنگ کر مجسم صورت میں بنائے تھے ۔ شاہجہاں نے بھی محمود جونپوری کو ایک رصدخانہ قائم کرنے کا حکم دیا تھا جو ناتمام رہا ۔ عالمگیر کی وفات سے نصف صدی کے اندر ہی ہندوستان کا باوا آدم بدل گیا ۔ صوبہ داروں نے خود مختاری

کا اعلان شروع کر دیا۔ ملک میں سیاسی انقلاب پیدا ہوتے گئے۔ نادر شاہ اور احمد شاہ نے پنجاب سے دہلی تک اور مرہٹوں نے دکن سے پنجاب تک طوفان بے تمیزی پیدا کر دیا۔ ان کے بعد ہی سکھوں نے سر اٹھایا۔ تیموری سلطنت بازیچہ اطفال ہو گئی پھر بھی مغلیہ خاندان کے پسماندہ فرمانرواؤں کو جب کبھی سکون حاصل ہوا وہ علمی سرپرستی سے غافل نہیں رہے۔ چنانچہ ۱۱۲۷ھ میں محمد شاہ کے حکم اور راجہ سوائی سنگھ والی جیپور کے اہتمام سے دہلی میں جدید طرز پر ایک رصد خانہ میں لاکھ کے صرف سے تعمیر کیا گیا جس کے اہتمام میں میرزا خیر اللہ مہندس، ہند و ایران کے متعدد علما یورپ کے اکثر ماہرین علم ہیئت شریک تھے۔ اس رصد خانہ کی تحقیقات کا مجموعہ زیچ محمد شاہی کے نام سے مشہور ہوا۔

شاعری

ہندوستان میں شاعری بابر کے ساتھ آئی۔ بعد میں مغلوں کی شاہانہ فیاضیوں نے ایرانی شعرا کو اپنی جانب کھینچ بلایا۔ یہ سلاطین خود ذوق سخن رکھتے۔ کلام کی تنقید کرتے اچھے برے شعر میں تمیز رکھتے، موقع محل پر شعرا کو ٹوکتے اور پھر ان کے عمدہ کلام کی داد انعام واکرام کی شکل میں دیتے رہتے تھے۔ اس لیے ان کے دربار شعرا کے لیے تعلیم گاہ تھے ان کی قدر شناسی اور فیاضی کا یہ اثر تھا کہ شعرا جھنڈ کے جھنڈ ایران سے امڈے چلے آرہے تھے اور ہر شاعر مغلوں کی فیاضی کا رطب اللسان بنا ہے۔

علوم و فنون اور دارالحکومت

اسلامی حکومت ہندوستان میں نہ صرف عربی تمدن ساتھ لائی۔ بلکہ علوم و فنون اور ادب کا مذاق بھی۔ چنانچہ سلاطین اسلام کی طرح مغل بادشاہوں کو بھی ادب و علوم و فنون کا بیحد شوق تھا۔ صناع، علما، شعرا کسی طبقہ کے کیوں نہوں دربار میں باریاب ہوجاتے تھے۔ احمد آباد، گور، دہلی، بیجاپور وغیرہ یعنی مغلوں کی قدیم دارالحکومتوں میں اب بھی جو آثار قدیمہ باقی ہیں ان کو دیکھ کر کسی قدر اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان فرمانرواؤں نے صنعت کو کسی حد تک ترقی دی تھی اور یہ کہ وہ علوم و فنون

کے کیسے اعلیٰ درجہ کے سرپرست تھے اور علما، و فضلا نہ صرف بڑے اور مرکزی مقامات پر جمع تھے بلکہ ہر چھوٹے حصہ حکومت میں پھیلے ہوئے تھے۔ سلاطین مغلیہ نے اُن اسلامی نظامات کو جو عربوں نے یورپ، ایشیا اور افریقہ میں قائم کیے تھے اپنی حکومت ہندوستان میں بھی جاری کیا۔ جس وقت تیمور نے سمرقند کو اپنی وسیع سلطنت کا دارالخلافہ بنایا تو اُس نے بھی بہت سے علمار کو جمع کیا، وہ علوم کا بڑا قدردان تھا، اس نے مدارس قایم کیے تھے اور خود صاحب تصنیف تھا۔ تیمور کی اولاد بابر اور جہانگیر میں بھی یہی مذاق تھا۔ بابر کی سوانح جس کا مقابلہ سیزر کی تاریخ سے کیا جاتا ہے اس قسم میں فی الواقع ایک بہت اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جبلت میں مدنیت شامل ہے۔ اس سوانح میں مغلیہ حکومت کے بانی بابر کی زندگی غور و مطالعہ کے لائق ہے کہ یہ چنگیز خاں اور تیمور کا پوتا جس کے اجداد نے سروں کے اہرام بنائے تھے کس قدر قابل اور سنجیدہ شخص تھا۔ یہ چغتائی، ترکی، عربی اور فارسی بلاتکلف بولتا اور فارسی میں تصنیف بھی کرسکتا تھا۔ اُسے علوم، ادب اور تاریخ کی کتابوں کے مطالعہ کا بیحد شوق تھا۔

ان واقعات کو پڑھ کر ناظرین ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے طرز سلطنت اور اُن کے انتظامات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس شک کو رفع کرنے کے خیال سے کہ دیباچہ لکھنے والا مسلمان طبعاً مسلمان حکمرانوں کی مدح سرائی کرنے پر مجبور ہے ہم الہ آباد یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر فنِ تاریخ بینی پرشاد ایم۔ اے کے ایک مضمون کا خلاصہ لکھتے ہوئے بیساختہ زبانِ حال سے عرض کررہے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

پروفیسر موصوف فرماتے ہیں "یہ قطعاً ناممکن تھا کہ اتنی عظیم الشان آبادی کو جو اس قدر وسیع رقبہ میں پھیلی ہوئی تھی کچھ عرصہ کے لیے بھی بزورِ شمشیر محکوم و منقاد رکھا جاسکتا۔

ایسا ہونا آج بھی جبکہ قواعد داں و باضابطہ فوج کے چند سپاہی بہت بڑی آبادی پر غالب آسکتے ہیں نہایت دشوار ہے نہ کہ اُس وقت جبکہ ہر فرد رعایا مسلح ہوتا تھا اور جنگجوی و نبرد آزمائی کے اعتبار سے باضابطہ سپاہ اور عام رعایا میں برائے نام ہی فرق تھا قطعاً ناممکن تھا مغلیہ حکومت کی بنیاد نہ زور شمشیر پر قایم تھی نہ مذہب پر نہ کسی ذات پات پر بلکہ "محض عام رعایا کی رضامندی و خوشنودی پر قائم تھی" عامۃ الناس کی خوشنودی کا سب سے بڑا راز مذہبی آزادی و رواداری تھی۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں و دارا کا ذکر نہیں خود اورنگ زیب تک نے "کبھی اُسے بالکلیہ پامال نہیں کیا"۔ دوسرا بڑا سبب رعایا کی خوشی کا معاشری آزادی تھی" تیسرا سبب رعایا کی وفاداری کا یہ تھا کہ مغل حکومت نے دیہات کی اس خود مختاری کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا جو قرنہا قرن سے اٹھارھویں صدی تک ہندی نظام معاشرت کا جزو لاینفک رہی" مغلوں نے ملکی فلاح اور رعایا کی بہبود کے لیے کیا کیا؟ اس کے جواب میں پروفیسر صاحب رقمطراز ہیں کہ "انھوں نے سڑکیں بنوائیں۔ شفاخانے تعمیر کرائے اور علوم و فنون کی نہایت فیاضی کے ساتھ قدردانی کی" اور آگے انھوں نے اُن مراعات کی تفصیل دی ہے جو جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے وقت اور اس کے بعد رعایا کے ساتھ کی تھیں مثلاً شراب و تمباکو کی فروخت کی ممانعت کی۔ مشرقی بنگال میں خواجہ سرا بنانے کا جو بیدردانہ دستور جاری تھا اُسے ممنوع قرار دیا۔ بہ کثرت مہمان سرائیں، مسجدیں، مدرسے شفاخانے تعمیر کرائے۔ ہر بڑے شہر میں سرکاری طبیب مقرر کیے۔ لاوارثوں کی جائداد کو بجائے خزانہ سرکار میں داخل کرنے کے تالاب و چاہ، پل و مہمان سرائے وغیرہ کی تعمیر میں صرف کرانے کے احکام جاری کیے۔ جاگیرداروں نے اپنے نفع کے جو طرح طرح کے محاصل جاری کر رکھے تھے انھیں موقوف کیا و قس علیٰ ہذا۔ سلطنت مغلیہ کی سب سے بڑی برکت کا ظہور اُس کی سرپرستی علوم و فنون میں ہوتا ہے۔ فارسی تاریخوں میں اُن ارباب فن و کمال کی طویل فہرستیں محفوظ ہیں جنھیں مغلوں کی قدردانی نے خاکِ احتیاج

سے اُٹھاکر اوج خوشحالی تک پہنچا دیا تھا۔ معاصر فارسی اور ہندی شاعروں کے حالات پڑھکر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی کتنی بڑی تعداد سرپرستیٔ دربار کی رہین منت تھی۔ اسس زمانہ میں دنیا کی کسی سلطنت میں سررشتۂ تعلیم نہ تھا مغلوں نے اس کی تلافی اپنی وسیع علمی قدردانیوں سے کردی۔ جہانگیر کی کوششوں اور قدردانیوں نے ہندوستان کی مصوری کو انتہائی کمال پر پہنچا دیا... خوشنویسی کا شمار فنون لطیفہ میں ہونے لگا۔ موسیقی کی خاص ترقی ہوئی" اس مضمون کی وقعت اس وقت اور بھی بڑھجاتی ہے جب ہم یہ خیال کریں کہ فاضل لکھنے والا اس بڑی قوم کا فرد ہے جس کی بڑی تعداد آج مسلمان بادشاہوں کے داستان مظالم کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنائے ہے اور جن کی نگاہوں میں مغل بادشاہوں کا ہر ہنر عیب نظر آتا ہے اور انھیں صرف یہ یاد رہگیا ہے ع کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا۔"

عبدالسبحان

غزل

بدلا ہے ہچکیوں سے پہلو مرے سخن کا
آنے کو ہے یقینی قاصد کوئی وطن کا

تم کو بھی ہوش آتا الفت کی بو سونگھتا
ٹکڑا جو کوئی پاتا یوسف کے پیرہن کا

ہاں ہاں صبا کا دامن ہے بوئے گل کا مسکن
دیکھ لے زمین گلشن یہ آسماں چمن کا

اُف اُف لہو جگر کا پہلو سے پھوٹ نکلا
کیوں کہہ رہا تھا قصہ رنگینیِ چمن کا

جینے لگے جس کو لالے اک دل ہزار چھالے
وہ آپ کو سنبھالے یا غم کرے وطن کا

یہ کہہ کے ایک غنچہ مجھ پر کسی نے پھینکا
لے کم نصیب لیجا صدقہ دیا چمن کا

نیرنگیِ جہاں کے یہ شمس رنگ دیکھے
شبنم کے اشک ٹپکے منھ دھلگیا چمن کا

افاداتِ ثاقب

سنگِ در پر شکلِ سائل ہیں دلِ رنجور ہے
میں نہیں کہتا کہ کچھ دے دو مگر دستور ہے

سوزِ غم بتلا کہ چشمِ عقل کیوں بے نور ہے
دل مرا جلتا ہے یا روشن چراغِ طور ہے

ہمّتِ سالک سے بھی افزوں ہے راہِ عشقِ دل
زندگی گزری مگر سنتا ہوں منزل دور ہے

سرد آہوں سے علاجِ سوزِ دل ہوتا نہیں
یہ ہیں ویسی ہی کہ جیسے شمع میں کافور ہے

جتنے پھاہے ہیں تسلّی کے وہ سب بیکار ہیں
زخم جو دل میں ہے وہ روتا ہوا ناسور ہے

سنتے ہیں کروٹ بدلتے ہی نہیں اہلِ مزار
کیا زمیں کے سونے والوں کا یہی دستور ہے

کوئی کیوں توڑے مرے دل کو کہ ہے بدستِ عشق
یہ وہ شیشہ ہے جو خود نشے میں اپنے چور ہے

دیکھنے والوں سے اُمیدِ شفاعت تھی مگر
جس میں میں بیتاب ہوں وہ رات بھی دیجور ہے

دیکھ میرے دل کو تو اے منکرِ اعجازِ عشق
گر نہیں سکتا ہے بادہ اور شیشہ چور ہے

بھاگتا کیا ہے حوادث ہی میں ہیں گنجِ عروج
طورِ صورت کو مگر وا دے تو پھر پُر نور ہے

اے جنونِ شعر ہے ثاقب نہ سودائے غزل
انتظارِ موت ہے میں ہوں دلِ رنجور ہے

خاکسار میرزا ثاقب قزلباش لکھنوی

مرگ مفاجات

شاہرہِ عام پر حسب معمول خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا سڑک پر کسی آدمی یا جانور کا گذر نہ تھا اور راستہ کی سنسانی پر بے بنیاد تیقن کو زیادہ وثوق دینے کے لیے خوش قسمتی سے رات بھی بہت پرلطف اور پرسکون رات تھی؛ میں خود اگرچہ امکانِ خطر کے خیال سے خالی نہ تھا، تاہم اِس عام سکوت اور خموشی سے اِس قدر متاثر ضرور ہو چکا تھا کہ بحرِ فکر و توہم میں غوطہ زن ہو جاؤں؛ اگست کا مہینہ تھا اور اسی مہینہ کے وسط میں میری سالگرہ واقع ہوتی تھی؛ سالگرہ کی رسم ایک ایسی رسم ہے جو ہر ذی ہوش شخص کو نہایت سنجیدہ اور اکثر اوقات اندوہ فزا تصورات میں مستغرق کر دیتی ہے؛ جن واقعات کو میں اِس وقت قلمبند کر رہا ہوں وہ خاص میرے آبائی وطن میں وقوع پذیر ہوئے جس کے جنوبی حصہ میں محنت شاقہ کی پہلی اور ماقبلِ تاریخ، مصیبت نازل ہوئی تھی، میرا خیال ہے کہ نہ متقدمین اور نہ متاخرین سوائے میرے وطن کے کسی ایسے خطۂ ملک سے واقف نہیں جہاں یہ آفت سب سے پہلے واقع ہوئی ہو؛ محنت شاقہ سے میری مراد صرف وہی محنت نہیں جو اجسامِ انسانی کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتی ہے، مثلاً کان کھودنے والوں کی محنت یا غلاموں اور نوکروں کی محنت، بلکہ اُس مشقت سے بھی جس کے ذریعہ نفسِ آتشبار پر عبور حاصل کیا جاتا ہے؛ غالباً کسی اور حصۂ زمین پر، ہر روز، طاقتِ بشری اِس قدر شدومد سے کبھی مستعمل نہ ہوئی تھی، اور نہ ہو سکتی تھی، جتنی کہ مذکورۂ بالا سرزمین میں برسرِ کار تھی؛ اِسی زمانہ میں، جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، عدالتہائے عالیہ کے روزانہ اجلاس، متعدد فراریوں اور تفتیش و تجسس کی دوڑ دھوپ کے سبب لنکاسٹر کے گرد و نواح، بلکہ سارے ملک ہی میں، اس قدر کھلبلی مچی ہوئی تھی کہ دن بھر سڑکوں پہ

آرجارہی تھی۔ لیکن قریب غروب آمدورفت کا یہ سلسلہ لامتناہی قدرے کم ہو جاتا تھا۔
ایک ناواقف شخص کے نزدیک (جبکہ اِس غیر معمولی تگ و دو کے ساتھ ساتھ یہ غیر متزلزل
خصوصیت بھی معلوم ہو کہ لنکاسٹر محنت مزدوری کا خاص مرکز بلکہ مورد و مصدر ہے)
خیالاتِ انسانی کو تنہائی حیرت و افسردگی کے ساتھ اِس متضاد خواب و خیال راحت
اور اِس ہنگامہ و بدہنگامی سے ہٹا کر اُس محفوظ و مصئون علوی مقام کی طرف راغب
کردیا کرتے ہیں جس سمت عالمِ تنہائی میں انسان کے سنجیدہ تر خیالات اکثر سفر کیا کرتے
ہیں؛ ہمارے بائیں جانب ہم سے بہت قریب ایک بحرِ عمیق موجزن تھا لیکن موجودہ صورت
حال میں وہاں بھی عام سکوت کا اثر و تاثر موجود تھا؛ سمندر، عام فضا اور روشنی
بینڈ بجانے والوں کی طرح ہم آہنگ اور ہم نوا تھے؛ چاند کی آخری کرنیں اور سپیدۂ صبح کی
پہلی جھلک ہم آغوش ہونے لگی تھیں اور یہ ہم آغوشی ایک ہلکے نقرئی غبار کے سبب (جو
غبار بالکل غیر متحرک اور غبارِ خواب کی مانند ہر طرف پھیلا ہوا تھا لیکن ہر طرف اور ہر سمت
یکساں و یک رنگ انعکاس کا برقعہ اُوڑھے تھا) اور بھی زیادہ بھلی معلوم ہوتی تھی؛ —
ہمارے گھوڑوں کی ٹاپ کے علاوہ (جو سڑک کے ریتیلے حصہ پر بکمال سلاست رواں
دواں تھے) دُور دُور تک سے کوئی آواز نہ آتی تھی، بادلوں اور زمین پر بھی وہی شاندار
سکوت طاری تھا جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، اور باوصف اِس کے کہ ہمارے اعلیٰ طفلانہ
خیالات بُری طرح پامال کیے جا چکے ہیں ہم یہ یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اُس دلفریب نورانی
منظر کی طرح، جو اِس قسم کی پُرسکوت راتوں میں کبھی کبھی ہمارے پیشِ نظر ہو جاتا ہے،
ہم عالمِ خیال میں اِس دارالمحن کو تیرباد کہہ کر آستانۂ دربارِ ایزدی تک پہنچ جاتے ہیں۔
میں اسی قسم کے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکایک ایک وحشت خیز آواز نے،
گویا کہ سڑک پر کوئی آہٹ ہوئی، مجھے چونکا دیا؛ میں نے نہایت خوف و ہراس سے
آواز کی طرف کان لگا دیے۔ لیکن یہ آواز صرف چند دقیقے فضا میں گونجی۔ اور پھر

یکلخت خاموشی طاری ہوگئی، عالمِ خیال سے بیدار ہو جانے پر میں گھوڑوں کی تیز رفتاری سے خائف ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ کامل دس سال کے تجربے نے میری آنکھوں کو رفتار و حرکت کا صحیح اندازہ کرنے میں ماہر کر دیا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ گھوڑے کچھ نہیں تو تیرہ ۱۳ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ضرور دوڑ رہے ہیں؛ میں اپنی حاضر دماغی کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا کیونکہ بلحاظ عمل و تعمیل میں اس صفت سے بالکل بے نیاز ہوں اور شک و شبہ، اور حیرت و تعجب کا ہجوم، بعض محوازیاد و واقعات کے تصور کے مجرمانہ بوجھ کی طرح، میرے حواس خمسہ پر بہت شاق گزرتا ہے خصوصاً اُس وقت جبکہ "بیکار مباش" کا جھنڈا ہوا میں لہرا لہرا کر ہر شخص کو مستعد و باکار رہنے کی صلاح نیک دے رہا ہو، ہاں، البتہ، یہ صفت مجھ میں ضرور موجود ہے کہ میں، کم از کم عالم تصور میں، کسی آنے والی مصیبت کے موقعہ پر اُس کا پورا پورا اندازہ کر لیا کرتا ہوں، اور ہولناک جملے کے پہلے ہی فقرے سے میں آخری الفاظ کا صحیح اندازہ کر لیتا ہوں؛ بہر حال، میں یہ تو نہیں کہتا کہ مجھے اپنے یا اپنے ساتھیوں کی بابت کسی قسم کا خوف لاحق تھا نہیں، ہرگز نہیں۔ (کیونکہ ہم سب اپنی تعداد اور گھوڑوں کی تیز رفتاری کے سبب ہر ایک تصادم اور خطرہ سے محفوظ و مامون تھے اور میں خود ایسے صدہا خطرات سے دوچار ہو چکا تھا جو نہایت درجہ خطرناک تھے، اور جن کا تذکرہ نہایت مضحکہ خیز، جن کا ماقبل خائف کن اور مابعد نہایت پُر مذاق تھا؛ غرض مجھے اپنی بابت تو کوئی خوف نہ تھا؛ رہی گاڑی، سو وہ نہ تو کسی جادو منتر کے زور سے تیار ہوئی تھی اور نہ کسی آفتِ ناگہانی کے لیے مقدر تھی کہ میں بلا وجہ بے سبب اُس کی مضبوطی اور صوئنت پر بھروسہ نہ کرتا، لیکن مجھے جو خوف تھا وہ یہ کہ اگر راستہ میں ہمیں کوئی اور گاڑی ملی تو یقیناً ہماری گاڑی کے مقابلہ میں نازک اور سبک ہوگی اور میں اپنی موجودہ حالت سے یہ فالِ بد پہلے ہی سے لے چکا تھا کہ ایسا ہوگا۔ اور ضرور ہوگا؛ ہم لوگ غلط راستہ پر تھے اور اگر کچھ اور لوگ بھی راستہ چل رہے تھے تو غالباً وہ بھی غلط راستہ پر تھے مگر یہ بات کچھ

دل کو نہ لگتی تھی، ہاں، البتہ، وہ خیال جس نے ہمیں سڑک کے داہنی جانب چلنے کی رغبت دلائی تھی (گو قانوناً ہم اُس کے مجاز نہ تھے) دوسروں کو بھی داہنی طرف چلنے کی ترغیب دیسکتا تھا کیونکہ بیچ کی پتھریلی سڑک کو چھوڑ کر ریت میں چلنا کچھ عجیب لطف دیتا ہے؛ بہرحال خیال یہ ہے کہ دونوں گاڑیاں یقیناً سڑک کے ایک ہی سمت چل رہی ہونگی اگرچہ دوسری طرف راستہ طے کرنا ہمارا فرض تھا، اور گو ہماری گاڑی کے روشن لیمپ ہماری ہوشیاری اور مستعدی کا پتہ دیتے تھے لیکن پھر بھی ہر مسافر اور ہر راہرو ہم سے راستہ بدل لینے کا متمنّی ہوسکتا تھا؛ یہ تمام باتیں (خواہ کتنی ہی خوفناک و مبہم کیوں نہوں) نہ میں نے تسلسل تخیّل کے ذریعہ معلوم کی تھیں، اور نہ کسی خاص دماغی کاوش و محنت سے بلکہ پیش بینی کے خوفناک تواتر کی ایک ہی جھلک میں آناً فاناً یہ تمام واقعات میرے پیش نظر ہو گئے۔

آہ! آنے والی مصیبت کی فوری پیش بینی و تصوّر کے دوران ہی میں وہ کس قدر ہیبت آگیں اور خوفناک سانس تھا اور کس قدر رنج و افسوس سے بھرا ہوا تھا جو سانس ہوا کے ایک اتفاقی جھونکے میں ہمارے گوش ہوش تک پہنچا؛ ہم نے بہت دُور سے دوبارہ پہیّوں کی گڑگڑاہٹ سُنی مگر یہ آواز بہت ہلکی اور دھیمی تھی، اور شاید تین چار میل پرے سے آئی ہوگی، اور نہایت خاموشی سے اُس مصیبت کا اعلان کررہی تھی جس کا اکثر بیشتر ہی سے تدارک بھی کرلیا جاتا تب بھی ناممکن الوقوع نہ ہوسکتی اور اگر تحقیق بھی ہوجاتی تب بھی آیندہ لگنے والے زخموں کا اندمال نہ کرسکتی، ایسی صورت میں بتاؤ کیا کیا جائے؟ اور ایسا کون ہے جو کچھ کرسکے یا کم از کم گھوڑوں کو اُس صبا رفتاری ہی سے باز رکھ سکے؟، بظاہر ایسا کوئی بھی شخص نہ تھا جو یہ کام کرسکے؛ کیا میں گھوڑوں کی باگ اُس نیم غافل گاڑیبان سے چھین لیتا؟ خوب تم سمجھتے ہوگے کہ غالباً میں ایسا کرسکتا تھا۔ خیر؛ میں بحث و تمحیص تو نہیں کرتا لیکن یہ تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ گاڑیبان نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی ٹانگوں میں کچھ اس طرح دبا رکھا تھا کہ باگ کا چھیننا آسان کام نہ تھا؛ کیا اب بھی تم خیال کرتے ہو کہ میں باگ چھین سکتا تھا؟ اگر

ایسا ہی تو ذرا تم ہی وہ اُس شہسوارِ فرنگ مورت سے جو تقریباً دو سو سال سے اسی طرح اپنے مرکب پر سوار اور گامزن ہے، اُس کے گھوڑے کے مُنھ سے لگام نکال دو! کیوں، کر سکتے ہو؟ خیر، نہ سہی، اچھا تم اس شہسوار کو ہی دو منٹ کے لیے نیچے اُتار دو، یا کم از کم اُس کے منقوش مرمری پاؤں ہی اُن منقوش مرمری رکابوں میں سے نکال دو؟ میں بھی تو دیکھوں تم کیسے دلا دیتے ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کام تمہاری طاقت وقدرت باہر ہیں تم ایسا نہیں کر سکتے، اور ٹھیک اسی طرح بھی گاڑیبان سے باگ چھین لینے سے قاصر اور معذور تھا۔

آنے والی آوازیں اب اور بھی زیادہ زور سے آنے لگی تھیں اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ گاڑی کے پہیوں کی آواز ہے، مگر سوال یہ ہے کہ یہ گاڑی کس کی تھی اور کونسی گاڑی تھی؟ کیا مزدوری پیشہ لوگ کسی محصول زدہ گاڑی میں سفر کر رہے تھے یا عیش پسند نوجوان اپنی عمدہ فٹن میں سیر و تفریح کو جا رہے تھے؟ کیا مجسّماتِ رنج و غم گامزن تھے یا راحت و عیش رواں دواں؟ کچھ خبر نہ تھی کہ یہ کیسی آوازیں ہیں اور کہاں سے آتی ہیں، کیونکہ آوازیں تھوڑے وقفے کے بعد سنائی دیتی تھیں اور فاصلہ کے سبب انکی بابت صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا؛ بہرحال اُن اجنبی مسافروں کو خطرہ سے آگاہ کرنا ہمارا اُسی قدر فرض تھا جتنا کہ خطرہ سے بچنا اُن کا کام تھا لیکن پھر بھی اطلاع دینے کی ذمہ داری ہم پر عائد اور بمنزلہ قرض کے تھی، اچھا، اب یہ اطلاع کیونکر دی جائے؟ کیا میں سنتری کا بگل بجا کر اُن لوگوں کو متنبہ کر دوں؟ کیوں؟ کیا خیال ہے؟ بگل بجانے کا خیال آنے سے پہلے ہی میں چھت پر چڑھ کر سنتری کے پاس پہنچنے کی کوشش کرنے لگا تھا لیکن چونکہ ڈاک کے تھیلے گاڑی کی چھت پر ہی انبار کیے جاتے ہیں اور چونکہ میرا تمام جسم تین سو میل سے زائد سفر باہر بیٹھے بیٹھے طے کرنے کے سبب بالکل سُن ہو گیا تھا، اس لیے بگل بجانا بھی نہ صرف مشکل بلکہ نہایت خطرناک کام تھا۔ خوش قسمتی سے بیشتر اِس کے کہ میں نے بگل بجانے میں وقت ضائع کیا ہو ہمارے مست و مخمور گھوڑے سڑک پر پڑے اور وہ مقام، جہاں یہ تصادم وقوع پذیر ہونے والا تھا، اور جہاں یہ

ناشدنی مصیبت پایۂ اتمام کو پہنچنے والی تھی) بالکل سامنے نظر آنے لگا، بظاہر اسباب تمام کام پہلے ہی انجام پا چکے تھے؛ عدالت کرسی انصاف پر متمکن ہو کر مقدمہ کی سماعت کر چکی تھی، انصاف ہو چکا تھا اور صرف فیصلہ سنانا باقی تھا۔

ہمارے بالکل سامنے تقریباً چھ سو گز لمبی ایک سیدھی سڑک تھی جس کے دونوں طرف لمبے لمبے سایہ دار درخت، موزوں و متناسب مقام پر، سلسلہ وار اُگے ہوئے تھے اور اُن کی سر بفلک چوٹیاں مسافروں کے سروں پر کچھ اس طرح ہمکنار تھیں کہ یہ پُر فضا سڑک ایک گرجا کے صحن سے مشابہ معلوم ہوتی تھی؛ ان درختوں کے سبب صبح صادق کی ہلکی ہلکی روشنی میں ایک ہیبت آگیں اثر پیدا ہو گیا تھا لیکن پھر بھی یہ صاف دکھائی دیتا تھا کہ سڑک کے اُس کنارے پر ایک نازک تیلیوں دار گاڑی میں ایک خوش رو جوان اور ایک نوخیز دوشیزہ بیٹھے ہوئے ہیں؛ اے نوجوان! تو یہاں کہاں؟؛ مانا کہ تیرا اس حسینہ سے سرگوشیاں کرنا ضروری ہے۔ لیکن کیا اس وقت بھی جبکہ سڑک پر دُور دُور کوئی شخص نظر نہیں آتا جو تیری باتیں سن سکتا ہو یا تیرے تخلیہ میں مخل ہو سکے، یہ لازم ہے کہ تو اپنے لبہائے شوق اس دوشیزہ کے لبہائے رنگیں تک لیجائے؟ خیر خیر۔ وہ سبک گاڑی چار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاری تھی اور چونکہ دونوں نوعمر شخص لطفِ صحبت سے بہرہ مند ہو رہے تھے اس لیے دونوں آگے کی طرف جھکے ہوئے تھے؛ میرا قیاس ہے کہ اُن دونوں کے حیاتِ ابدی سے معانقہ کرنے میں، ہر حساب اور گنتی کی رُو سے، صرف ڈیڑھ منٹ کی دیر تھی۔ خدایا، میں کیا کروں؟ کیا کہوں؟ اور کس سے کہوں، کہ اُن دونوں کو خبر ہو سکے! میں اسی کشش و پیچ میں مُبتلا تھا کہ یکایک (شاید لوگوں کو یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہو گی) مجھے ایلیڈ کا خیال آیا اور میں نے اِکِلیس کی روح فرسا آواز اور اُس کے حیرت انگیز اثر کا خیال کیا؛ لیکن اکلیس کو تو پیلاس نے مدد پہنچائی تھی، مجھے کون مدد دیتا اور میں اُس مشہور نعرہ زن کی طرح کیونکر آواز لگاتا؟ مگر بات یہ ہے کہ مجھے اتنے زور سے چلّانے

پہنچنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ جس سے تمام جنگ آزما ایشیا چونک پڑے، بلکہ میرے لیے صرف یہی کافی تھا کہ میں اپنی صدائے "ہوشیار خبردار" سے اُن دونوں مدہوشِ لذت نوخیزوں اور اُن کے گھوڑے کے دل میں خوف پیدا کر دوں، چنانچہ میری پہلی آواز تو کسی نے نہ سنی لیکن جب میں دوبارہ چلایا تو غالباً اُس نوجوان نے میری آواز سُن لی کیونکہ اس مرتبہ اُس نے اپنا سر اوپر اُٹھایا۔

الغرض وہ تمام کام کر چکا تھا جو میرے امکان اور قبضہ و قدرت میں تھے اور اس سے زیادہ کر سکنا مجھ سے ممکن نہ تھا، اُس نوجوان کو مصیبت سے نجات دلانے کے لیے سب سے پہلے میرا ہی قدم آگے بڑھا تھا، دوسرا قدم خود اُس نوجوان کا ہونا چاہیے تھا اور تیسرا قدم مشیتِ ایزدی یعنی دستِ قدرت کی امداد کا؛ میں نے خیال کیا کہ اگر وہ نوجوان دلیر اور ہمت دار آدمی ہے، اور اگر وہ واقعی اپنی ہم جلیسہ سے اُنس رکھتا ہے تو بلا شبہ وہ اُسے بچانے کی سعی بلیغ کرے گا اور اگر اُسے محبت نہیں ہے اور صرف اُس فرض منصبی کی اہمیت پر ہی غور کرتا ہے جس پر عمل کرنا ہر شریف النفس آدمی کا شیوہ ہے، یعنی یہ کہ آدمی اپنے حسین ساتھی کو، جو فی الوقت اُس کی حفاظت و سپردگی میں ہو، مصیبت سے بچانے کے لیے ہر ممکن سعی کرے، تب بھی اُسے کچھ نہ کچھ کوشش کرنی لازم ہوگی؛ اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام بھی رہے تب بھی وہ زیادہ تکلیف دِہ موت نہ مرے گا اور نہ اُسے مقدر سے زیادہ مصائب و آلام کا سامنا کرنا ہوگا بلکہ حقیقتاً اُس کا نام بہادروں کی فہرست میں شامل کیا جائیگا اور اُس کی موت اس طرح واقع ہوگی کہ اُس کا چہرہ آنے والی مصیبت کی طرف ہوگا اور اُس کے دونوں ہاتھ اُس دوشیزہ کی کمر پر ہونگے جسے بچانے کی اُس نے ناکام کوشش کی، لیکن اگر اُس نے ذرا بھی کم ہمتی سے کام لیا اور بغیر سعی بلیغ کئے اپنے فرض کی ادائگی سے پیچھے ہٹ گیا تو نہ صرف وہ دوشیزہ ہی طعمۂ نہنگِ اجل ہوگی، بلکہ یہ نوعمر بھی اپنی بزدلی اور کج خلقی کے سبب موت کا شکار ہوگا؛ ہیں اُس کے صفحۂ ہستی سے

اُٹھ جانے کا ہرگز قلق نہ ہونا چاہیے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے بزدل شخص کا مرجانا ہی بہتر ہے، اور اُس کی حسرتناک موت پر رنج و افسوس کرنا صریح حماقت ہے؛ اگر ہم نے ایسی صورت میں اِس نوجوان کی نوحہ خوانی نہ کی تو ہمارا تمام تر رنج و افسوس اُس بے مونس دیاور دوشیزہ کی بدقسمتی کے لیے مخصوص ہوجائیگا، جو بیچاری، محض اپنے ساتھی کی بزدلی کے سبب، بغیر اپنے گناہوں سے توبہ استغفار کیے چشم زدن میں دربار حق سبحانہٗ تعالیٰ میں پیش کردیجائے گی۔

لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ وہ نوجوان بزدل نہ تھا؛ اُس نے آواز سنتے ہی فوراً جواب دیا؛ اُس نے گھبرا کر چاروں طرف نظر ڈالی اور اُس خطرہ کو تاڑ لیا جو نازل ہونے والا تھا؛ مصیبت کے سیاہ اور خوفناک بادل اُس کے سر پر پہلے ہی گھرے کھڑے تھے اور وہ پہلے ہی اِس ناگہانی آفت سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنے ساعد وبازو کی پوری قوت کا اندازہ کررہا تھا۔ اُف! ہمت اور جسارت ہماری نظروں میں کس قدر حقیر شے معلوم ہوتی ہے جبکہ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ اکثر قومیں اپنی تمامی قوت وطاقت کو صرف چند نقرئی سکوں کے بدلے بالکل غیر قوموں کے ہاتھ فروخت کرتی رہتی ہیں، لیکن یہی قوت ہمیں کتنی شاندار اور پُرشوکت نظر آتی ہے، جبکہ بحرِ حیات میں امواجِ حوادث کا ایک تھپیڑا، کسی ذی روح کو اِس طرح بہا لیجاتا ہے گویا وہ شخص بادِ صرصر کے تیز اور تند جھونکوں سے بھی سبقت لیجانا چاہتا ہے؛ پھر یہی موجیں اُسی مصیبت کی کسی اعلیٰ وارفع اور ہوشربا بلندی پر پہنچا دیتی ہیں جہاں سے صرف دو ہی رستے اُس کے لیے کُھلے ہوتے ہیں اور ایک ناگفتنی آواز باآواز بلند کہتی ہے کہ "اے فلاں! تیرے لیے یہ راستہ نجات کا ہے اور وہ ہلاکت کا!" ۔ آہ! خیال کرو وہ کیسی شاندار کامیابی ہوتی ہوگی جبکہ اِس پُرخطر حالت میں بھی، کہ تمام دنیا اُس کے خلاف ہو اور طرح طرح کی مصیبتوں نے اُسپر نرغہ کیا ہو، وہ شخص اُن مصائب و آلام کا مقابلہ کرسکے، اور صرف ایک منٹ کے لیے ہی اپنے معبودِ حقیقی سے گویا بالمشافہ گفتگو کرلے اور راہِ ہدایت و نجات

پا جائے۔

اپنی زندگی کے چند بقیہ لمحوں میں اُس نوجوان نے ہم سب پر ایک غائر نظر ڈالی؛ وہ غالباً یہ دیکھنا اور قیاس کرنا چاہتا تھا کہ اُسے کس کس دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ ایک لمحہ بالکل بے حس و حرکت اور اِس طرح خاموش بیٹھا رہا گویا کہ وہ کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا ہے، پھر اُس نے اپنی متجسسانہ نظر آسمان کی طرف بلند کی گویا کہ وہ اِس مصیبت میں پھنس کر کسی زبردست شبہ میں پڑ گیا تھا اور نورِ حق سے رہِ راست کا طالب و خواستگار تھا؛ اس کے بعد وہ نوجوان سیدھا کھڑا ہو گیا اور باگ کو زور سے کھینچکر، جس کے سبب گھوڑے کے اگلے پاؤں زمین سے اُٹھ گئے، اُس نے گھوڑے کو کولھوں کے بل موڑا تاکہ اپنی گاڑی کو ہماری گاڑی کے مقابلہ میں زاویۂ قائمہ بنا دے، ابھی تک صورتِ حالات میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہوئی تھی بجز اِس کے کہ مزید کوششوں کو ممکن بنانے کے لیے اُس نوجوان نے ابتدائی کارروائی کر لی تھی؛ اگر وہ اِس سے زیادہ اور کچھ نہ کرنا چاہتا تھا تو اُس نے تو ابھی کچھ بھی نہ کیا تھا، کیونکہ اُس کی فٹن اب بھی (اگرچہ قدرے دوسری سمت میں) ہماری گاڑی کے سدِّ راہ تھی، لیکن اب بھی زیادہ دیر نہوئی تھی اور ابھی موقع باقی تھا، اور صرف ذرا سی کوشش سے یہ دشواری بآسانی حل ہو سکتی تھی؛ ارے ظالم! جلدی کر! پھُرتی سے کام لے کیونکہ وقت ہوا کی طرح اُڑتا ہے؛ اے مدہوش! خدا را جلدی کر کیونکہ ہمارے گھوڑے بھی بکمال سرعت و تعجیل ہوا سے باتیں کر رہے ہیں؛ لیکن انسانی طاقت و قدرت مصیبتوں سے نجات پانے کے لیے کافی ہو سکتی ہے، اور اسی لیے اُس نوجوان کی طرف سے فکر کرنی لاحاصل ہے کیونکہ وہ بہت شریف النفس اور پابندِ وضع شخص تھا، اُس نے اپنے فرضِ منصبی کو اچھی طرح سمجھا اور اُس کے عزیز جانور نے بھی اُس کا کہا مانا؛ اُس اجنبی نے چند لفظ کہے اور ہاتھوں سے کچھ اشارہ کیا اور وہ گھوڑا فوراً آچھپٹا اور گویا درمیانی رکاوٹوں سے گذر جانے کی کوشش میں اُس کے

اسگلے پاؤں سڑک کے موڑ پر ٹک گئے۔ فٹن کا زیادہ حصہ ہماری سر یفلک گاڑی سے دُور ہو چکا تھا اور یہ بات میری مضطرب و متفکر نگاہوں کو بھی واضح تھی، لیکن یہ بات ابھی نہ معلوم ہوتی تھی کہ ایک پُرانی اور خراب وسمار گاڑی تو بسلامتی راستہ طے کر لے اور دوسری عمدہ اور نفیس فٹن شکستہ اور پامال ہو جائے؛ کیا فٹن کا پچھلا حصہ تباہی سے واقعی محفوظ تھا؟ مگر اس سوال کا کون جواب دے؛ ایک سرسری نظر، ایک فوری خیال اور فرشتۂ رحمت کے بازو، اِن تینوں میں سے کون سی چیز ایسی سریع و تیز گام تھی جو سوال و جواب میں واضح تفرقہ و تمیز پیدا کر دے؛ بظاہر یہ نا ممکن تھا؛ ایک روشنی دوسری روشنی کے نقشِ قدم پر اس قدر ناقابلِ تقسیم و تفریق رفتار سے نہیں چلتی جس چال سے کہ ہماری جو بیّہ گاڑی اُس فٹن کے تعاقب میں جا رہی تھی؛ وہ نوجوان بھی غالباً اِس بات کو بخوبی سمجھ گیا تھا، لیکن اب اُس نے ہماری طرف سے پیٹھ کر لی تھی اور کسی مزید خطرہ سے باخبر ہو سکتا تھا؛ تاہم گھوڑوں کے سازوسامان کی کھڑکھڑاہٹ سے وہ کافی طور پر متنبہ ہو چکا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ اب وہ اپنے بچنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا؛ اُس نے پہلے ہی راضی برضا ہو کر ہاتھ پاؤں ڈال دیئے تھے، اور غالباً خدائے لم یزل سے یوں مخاطب تھا کہ:۔ "اے خداوندِ ارض و سما، میں نے دنیا میں رہ کر جو کچھ کیا ہے تو اُس کا صلہ مجھے عقبیٰ میں عطا کیجیو!"۔ القصہ ہم اُس بے بنا و مہیب دوڑ میں پن چکی کے بازوؤں سے بھی زیادہ سرعت سے جا رہے تھے اور غالباً ہماری تیز رفتاری کے سبب اُن دونوں نوخیزوں کے کانوں نہ معلوم کیا کیا وحشت خیز صدائیں گونج رہی ہونگی؛ بعدِ تصادم کڑک کر گرنے والی تھی؛ یکایک نہ معلوم ہماری گاڑی کا بم یا اگلے گھوڑے کا پٹھا اُس فٹن کے پچھلے پہیے سے ٹکرا یا دیہ پہیہ ذرا ٹیڑھا تھا مگر اتنا آگے بھی نہ نکلا ہوا تھا کہ اگلے پہیہ کے بالکل متوازی ہو) اور ہماری سرعتِ رفتار کے سبب اس قدر زور کا دھکا لگا کہ ہوا کہ الامان والحفیظ میں سراسیمہ ہو کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا تا کہ حالات وقوع پذیر غور کر دوں، اور میں نے اپنے بالائی نشستگاہ سے وہ جانگداز منظر دیکھا

جس نے ایک لمحہ میں مجھے اپنی ساری داستان کہہ سنائی اور جس نے ہمیشہ کے لیے میرے متوحش دل پر غیر فانی نقوش یادگار چھوڑے۔

اِس بے پناہ اور فوری تصادم کا نتیجہ بھی سُن لیجیے! فٹن کا گھوڑا اپنے اگلے پاؤں سنگلاخ زمین پر جمائے کھڑا تھا اور صرف وہی اکیلا ایک ایسی ہستی تھا جسے خطرۂ اجل کی زد سے محفوظ و مامون تصور کیا جا سکتا ہے؛ نازک اور نفیس گاڑی کے ہر دو ساکنین (کچھ تو حالیہ تصادم کے سبب پہیوں کی شکست و ریخت کے باعث اور کچھ اُس زبردست ٹکر کے سبب جو ہماری سے لگی تھی) لرزہ براندام تھے؛ نوجوان لڑکا بالکل بے حس و حرکت اور پتھر کی طرح بُت بنا بیٹھا تھا لیکن اُس کی یہ کیفیت اشتہائے وحشت و اضطراب کے سبب تھی جس نے اُس کے ہاتھ پاؤں پُھلا دیے تھے اور کثرتِ خوف نے کامل سکوت پیدا کر دیا تھا؛ ابتک اُس نے کسی طرف نگاہ نہ ڈالی تھی کیونکہ وہ یہ بخوبی جانتا تھا کہ اب اُس کے کیے کچھ نہ بن سکے گا اور یہ کہ کوشش کرنا محض فضول ہے؛ وہ یہ بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ آیا وہ اُس کی ہم جلیس دوشیزہ خطرہ سے محفوظ بھی ہیں یا اب بھی ہدف آلام ہیں؟ خیر اسے تو چھوڑو اُس کی لڑکی پر کیا بنی؟ - آہ! لڑکی، وہ لڑکی! - اچھا سنو! -

اُف، وہ بھیانک منظر میرے دل سے کبھی دور نہیں ہو سکتا!، آہ! اُس کا اُٹھنے کی کوشش کرنا مگر کثرتِ خوف و ہیبت سے لڑکھڑا لڑکھڑا کر اپنی جگہ پر گر جانا، پھر اُٹھنا اور پھر گر جانا؛ اُس کا انتہائے سراسیمگی میں ہاتھ اُٹھا کر ہوا میں کسی خیالی چیز کو پکڑنا چاہنا؛ اُس کا دم بدم غش کھانا، دست بدعا ہونا اور ہونٹھوں ہی ہونٹھوں میں کچھ بولنا؛ یاس و اُمید کی فوری جھلک اور اُس کی قطعی مایوسی؛ غرض یہ وہ واقعات ہیں جو میں ہرگز نہ بھولونگا؛ آپ ہی سوچیے، بھلا یہ باتیں کس طرح بھلائی جا سکتی ہیں؟ لیجیے! میں تمام واقعات کا اعادہ کیے دیتا ہوں؛ سنیئے! رات کا وقت ہے، ہر طرف تقدسی سکوت اور خاموشی طاری ہے؛ چاندنی کھلی ہوئی ہے؛ نورِ صبح ہویدا ہو رہا ہے؛ جنگل کا سماں ایک عالم نما کی

خواب کے تاثراتِ مابعد سے مشابہ ہے، قریب ہی ایک بحرِ زخّار موجیں مار رہا ہے، دوگاڑیاں آپس میں ٹکراتی ہیں اور یکایک، خوش مدانہ اور خفیہ عشق و محبت کی مردانہ رعنائی کے ساتھ (جس طرح کہ کرۂ ہوائی کا رازِ سربستہ چشم زدن میں افشا ہو جائے یا جس طرح بلاوجہ بلا سبب یکایک پاؤں کے نیچے سے زمین شق ہو جائے ٹھیک اُسی طرح) آوازہائے آبشار کی گونج کے مانند، تاجدارِ اجل، اپنے خدم و حشم کو ساتھ لیے ہوئے شیرِ نیستان کی طرح دڑوکا اور اُس عفیفہ پر حملہ آور ہوا۔

چند لمحے اُس کی زندگی کے اور باقی تھے اگرچہ کہ اُس کا کاروبارِ حیات بند کیا جاچکا تھا اور زندگی کا تماشہ ختم ہو چکا تھا؛ چشم زدن میں ہمارے گھوڑوں نے ہمیں اُس سایہ دار صحنِ کلیسا کے مشابہ، سڑک کے دوسرے سرے پر پہنچا دیا اور داہنی سمت مڑکر ہم پھر اپنی سابقہ رفتار سے سڑک کی اُسی جانب چلنے لگے جس طرف ہم اپنا سفر اب تک طے کرتے رہتے تھے، اِس موڑ کے سبب یہ خوفناک منظر میری نگاہوں سے بالکل چھُپ گیا مگر میرے دیگر توہمات و خیالات کے ساتھ مجھے ہمیشہ کے لیے ملول و کبیدہ خاطر چھوڑ گیا۔

"مرگِ مفاجات کا نظارہ" } مترجمہ محمد سلیم الحق حقی اختر دہلوی
ازطامس ڈی کوئنسی } علیگ غفرلہٗ

غزل

کشمکشہائے انتظار نہ پوچھ — گریۂ چشمِ اشکبار نہ پوچھ
کچھ خلش سی جگر میں ہوتی ہے — داستانِ دلکی بار بار نہ پوچھ
مثلِ نرگس میں دیکھتا تھا اُسے — نشۂ دید کا خمار نہ پوچھ
جو گذرتی ہے بس گذرتی ہے — مجھ سے کچھ حالِ قلبِ زار نہ پوچھ

بے گناہوں سے حشر میں مقصود
کس قدر میں وہ شرمسار نہ پوچھ

(مقصود)

کلامِ یاس

من کہ بر نمے تابم در دِ زیستن تنہا | صبحدم چساں بینم شمع انجمن تنہا
تا کجا امان یابد از ہجوم جانب زاں | گوشہ گیرِ فانوسے بہرِ سوختن تنہا
ذوق می تواں دانست رنگ حسنِ نادیدہ | ہست شاہدِ عادل بوئے پیرہن تنہا
ہر گلے و ہر خارے فتنہ ہا بر انگیزد | الحذر دلِ حیراں صد بہار و من تنہا
رہبرانِ خودگم را جز دعا چہ فرمایم | پاشکستہ و حیراں ماندہ در وطن تنہا
چارۂ پشیمانی۔ خوش دلی و خود کامی | توبہ از ریاکاران خندہ ہا ز من تنہا
ناخدا ز من بگذر۔ سوئے دیگراں بنگر | کارِ من بہ دریا در دست و پا زدن تنہا
صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دلتنگ | داورا نمی زیبد بال و پر بہ من تنہا
طرفہ محشرے دارد از فریب فردائی | زندہ زیرِ پیراہن مردہ در کفن تنہا
ایکہ کارہا کردی مدفنے مہیا کن | تا بہ کے نہاں دارد عیب من کفن تنہا

تازہ تحفہ دارم یاس بہرِ سر سپرد
دل نمی تواں برداشت لذتِ سخن تنہا

ابوالمعانی مرزا یاس عظیم آبادی

تتلی

پوشاک پہ اپنی نازاں ہوں، اس حسن پہ میں اتراتی ہوں
قدرت کی نمائش ہوتی ہے، میں گلشن میں جب آتی ہوں

میں نازک سادہ، زریں ہوں، البیلی چنچل رنگیں ہوں
چمکیلے پروں کی ساری سے، سب صحنِ چمن دمکاتی ہوں

موجوں میں ہوا کے پلتی ہوں، میں تیرتی پھرتی چلتی ہوں
میں خوش رمہ مطرب جھونکوں میں، دل ننھا سا بہلاتی ہوں

میں کلیوں کلیوں گھومتی ہوں، ہر چہرۂ گُل کو چومتی ہوں
میں باغ کی ڈالی ڈالی کو، خوشبوؤں سے نہلاتی ہوں

میں مست ہوا میں جھولتی ہوں، میں دیکھ کے غنچے پھولتی ہوں
میں تڑکے اُٹھ کر شبنم سے، مُنہ پھولوں کا دُھلواتی ہوں

زردار جو کپڑے پہنے ہیں، یہ پھول مرے سب گہنے ہیں
میں ایک منقش دیوی ہوں، اِن چیلوں پر اتراتی ہوں

کچھ برف کے دانے کلیوں پر، رکھتی ہے صبا جو پڑھ پڑھ کر
وہ اُس کے موتی کی مالا، میں توڑتی ہوں برساتی ہوں

میں خُنک فضا میں ڈھلتی ہوں، میں پھولوں پھولوں تلتی ہوں
اک جان ہوں ہلکی پُھلکی سی، پھولوں کی ہوائیں کھاتی ہوں

پھولوں کی مہک میں رہتی ہوں، میں پھول سی باتیں کہتی ہوں
سنتا ہے ترانے کون مرے، میں پھول کے نغمے گاتی ہوں

رس پھولوں کا میں پیتی ہوں، خوشبوؤں سے میں جیتی ہوں
میں سانس بھی میٹھی لیتی ہوں، میں پھولوں کی مدھ ماتی ہوں

کچھ پھول جو بچے توڑتے ہیں، وہ پیچھے میرے دوڑتے ہیں
میں بندپروں کو پھیلا کر، پھر کودتی ہوں شرماتی ہوں

جو پھول چمن کے کھلتے ہیں، اُڑتے ہیں گلے سب ملتے ہیں
اِک آگ فضا میں لگتی ہے، اُس آگ میں جلتی جاتی ہوں

پیغام صبا کچھ لاتی ہے، مستی سے چمن میں آتی ہے
واں حسن کے چرچے ہوتے ہیں، میں نغمۂ الفت گاتی ہوں

میں تھک کر ٹھنڈی گھاسوں پر، جب بیٹھتی ہوں پر پھیلا کر
معصوم پکڑتے ہیں آکر، گو لاکھ طرح کتراتی ہوں

وہ نور کے نوحے کون سُنے، سر اپنا کوئی لاکھ دُھنے!
وہ زور سے مجھکو دابتے ہیں، میں ہاتوں میں تھرّاتی ہوں

گو ہلکا روواں چھوٹتا ہے، ہر نقشِ محبت ٹوٹتا ہے
"پر تتلی" وہ سب کہتے ہیں، میں "تتلی" ہی کہلاتی ہوں

"وہ پیلے، نیلے، زرد، ہرے، وہ سُرخ سفید اور اودس بھرے"!
میں عشق میں رنگیں پھولوں کے، تصویرسے پر تڑواتی ہوں

فطرت کے تماشے کرتی ہوں، باغوں میں گُلوں پر مرتی ہوں
انورؔ میں گھڑی بھر خوش ہو کر، یوں جان سے اپنی جاتی ہوں

سردار انور متعلم بی-اے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

افکارِ اصغر

وہ سب میں نظر آیا یہ بُعد یہ حرماں ہے — صورت جو نہیں دیکھی یہ قربِ رگِ جاں ہے

ہے عشق کہ محشر میں یوں مست و خراماں ہے — دوزخ بہ گریباں ہے فردوس بہ داماں ہے

یہ حُسن کی موجیں ہیں یا جوشِ تبسّم ہے — اُس شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے

ہے عشق کی سوزش سے رعنائی و زیبائی — جو خون اُچھلتا ہے وہ رنگِ گلستاں ہے

اے پیکرِ محبوبی میں کس سے تجھے پوچھوں — جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدۂ حیراں ہے

اک غنچۂ افسردہ یہ دل کی حقیقت تھی — یہ موج زنی خوں کی رنگینیٔ پیکاں ہے

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا — جب آنکھ کھُلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

مضرابِ محبت سے اک زخمۂ لاہوتی — پھر جوشِ ترنم سے بیتاب رگِ جاں ہے

نیچ حُسنِ تعیّن سے ظاہر ہو کہ باطن ہو — یہ قیدِ نظر کی ہے وہ فکر کا زنداں ہے

پھر گرمِ نوازش ہے ضو مہرِ درخشاں کی — پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے

ایک ایک نفس میں ہے صد مرگ بلا مضمر — جینا ہے بہت مشکل مرنا بہت آساں ہے

وہ نغمۂ رنگیں سب میں بھول گیا اصغر
اب گریۂ خونیں میں رودادِ گلستاں ہے

حضرت اصغر

جلال الدین خوارزم شاہ

ایک ڈراما

پردہ دوازدہم

(گذشتہ سے پیوستہ بسلسلہ جنوری فروری ۲۴ء)

سجاد حیدر صاحب سیاحت کی غرض سے چھ ماہ کے واسطے چونکہ یورپ تشریف لے گئے تھے اس لیے آپ کے ڈرامہ کا سلسلہ اس عرصہ میں منقطع ہو گیا تھا۔ صاحب موصوف کی مراجعت پر ہم اُس کا بقیہ حصہ درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے اپنے حالات سفر لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے جس سے ہم آیندہ اشاعت میگزین کو مزین کریں گے۔

اڈیٹر

بقیہ مجلس دوم

نورالدین۔ لوگ اکثر کسی کے متعلق رائے اس کی اہلیت اور قابلیت سے قایم نہیں کرتے بلکہ اپنی ذاتی خواہش کی بنا پر اس کے بارے میں ایک خیال دل میں بٹھا لیتے ہیں۔ حضور کے متعلق اُن کے جو کچھ خیالات ہیں وہ حضور کے شاہانہ کاموں پر مبنی نہیں بلکہ وہ اُن کی ذاتی حسیات کا خلاصہ ہیں۔

جلال الدین۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟

نورالدین۔ اگرچہ سوء ادب ہے مگر میں عرض کرتا ہوں اے میرے بادشاہ، حضور نے خدمت

دین وطرفداریٔ ملت کی راہ میں جو کچھ کیا اُسے جب وہ اپنے خواہشات وافعال پر منطبق کرکے دیکھتے ہیں توکسی طرح انسانی فطرت کے مطابق نہیں پاتے اس لیے وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ایک نقاب ہے جو اصلی مقصد یعنی حصول سلطنت کو چھپانے کے لیے ڈالا گیا ہے۔ انہیں مکروریا کی اس قدر عادت ہے کہ اُن کے اعتقاد میں کوئی کام دائرہ ریا سے باہر ہو نہیں سکتا۔ اُن کے کچھ ندیمانِ خاص سے میری ملاقات ہوئی حضور نے جو غیرت اسلامیہ کا اظہار فرمایا ہے۔ اُسے وہ طرزعوام فریبانہ کے نام سے یاد کرتے ہیں یہانتک کہ اُن کے نزدیک لوگوں پر حضور کی بہادری سے زیادہ اِس عوام فریبانہ طرز کا اثر زیادہ ہے۔

جلال الدین۔ الٰہی! اگر تیری محکمۂ عدالت میں ثبوتِ ایمان لوگوں کی گواہی پر منحصر ہوتا تو ہم جیسے عاجز کیا کرسکتے۔ خیر یہ لوگ جو چاہیں سمجھیں جو چاہیں یاد کریں میں ہر شخص کے خیالات کو بدلدینے پر قابض نہیں۔ میں نے جو کچھ خدمتِ دین کی ہے وہ اس لیے تو نہیں کی کہ ان حضرات کی تحسین وتوصیف کا تمغہ حاصل کروں یا اُن کی رائے کو اہمیت دوں۔ دیکھو وہ جو چاہیں شرط پیش کریں۔ آخلاط کیا گرجستان کے بھی طالب ہوں اور مجھے کمزور اور ذلیل سمجھیں پھر بھی میں مسلمانوں پر تو تلوار کھینچوں گا نہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ کا جسم تھک جائے مگر آپ کی ہمت میں فتور نہیں آتا یہ بھی اللہ کی راہ میں ایک خدمت ہے۔ لیجیے تیاری کیجیے۔ قونیہ شام۔ جہاں ضرورت ہو وہاں جائیے اور فوجِ اسلام سے اِس اختلاف کے دور کرنے کی کوشش کیجیے۔ لڑائی نہ ہونی چاہیے۔ صلح کے لیے جو شرائط پیش کئے جائیں میں سب کے لیے راضی ہوں۔

اورخاں۔ مجبوراً میں بھی حضور کی سمع خراشی کرونگا۔ اے میرے پادشاہ! اعادۂ صلح کا امکان باقی نہیں رہا۔

جلال الدین۔ کیا کہا۔ صلح میں کس وقت خلل آیا کہ اعادۂ صلح کا امکان باقی نہ رہے۔

اورخاں۔ اے میرے پادشاہ! صلح میں خلل پڑے چوبیس گھنٹے ہوگئے۔ چونکہ حضور کی طبیعت نصیب اعدا کچھ ناساز تھی میں نے خبر نہ دی۔

جلال الدین۔ یہ کیا فضول بات ہے کیا تمہیں میرا مجھسے زیادہ خیال ہے۔ بادشاہ کی طبیعت ناساز بھی ہو تو کیا اُسے ملک کے حالات سے بیخبر رکھا جا سکتا ہے میرے ماتحت جس قدر مسلمان ہیں اگر انمیں کوئی گزند ہو پہنچے تو اس کا ذمہ وار میں ہوں۔ تم نے کس جسارت سے

سے مجھے خبر کیے بغیر لڑائی شروع کر دی میں دیکھتا ہوں کہ آجکل تمہارا طرز عمل عجیب ہے ۔ میں تمہاری وفاداری سے بھی شبہ کرنے لگوں گا ۔

اور خان ۔ ہاں اے میرے پادشاہ بیشک ہمیں حضور کا حضور سے زیادہ خیال ۔ ہزار مرتبہ زیادہ ہے ۔ ہزار مرتبہ کیا بلکہ بھی کم ہے ۔ ہم نے کبھی حضور کو اپنے نفس ہمایوں کا خیال کرتے نہیں دیکھا کہ ہم اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ حضور اپنی ذات پر کس قدر رحم فرماتے ہیں اور کس قدر شفقت ہاں میرے پادشاہ اگر کوئی پادشاہ بیمار ہوتا ہے تو طبیبوں کا یہ حکم ہوتا ہے کہ اُس کے اعادہ صحت کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ فکر و اندیشہ و اشتعال سے بچایا جائے ۔ اور اس سے مجبوراً اُسے ملک کے حال سے بے خبر رکھا جاتا ہے ۔ ہم حضور کے غلام ہیں حضور کے سپاہی ہیں جلاد نہیں ہیں کہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھیں کہ حضور کس اضطراب روحانی میں مبتلا ہیں اور پھر ایسی خبر بد حضور کو سنا ہیں جو قلب شاہانہ پر شدید اثر کرنے والی ہو ۔ ہمارا دل اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ اپنی ولی نعمت کو شکنجہ میں ڈالیں ۔ ہم نے ذات ہمایوں کو اطلاع دیے بغیر جو کام کیا اُس کی ذمہ داری خدا کے نزدیک حضور پر نہیں یقیناً خدا کے نزدیک اور حضور کے نزدیک بھی ہم غلاموں پر ہے جو لڑائی چھڑ گئی ہے اُس کی مسؤلیت تمام تر مجھ پر ہے ۔ اے میرے پادشاہ ! لڑائی ہم نے شروع نہیں کی ۔ کیقباد اور اشرف اچانک راہ زنوں کی طرح آ پڑے اور اُن مسلمانوں پر اور اُس ملک اسلام پر جو حضور کے زیر فرمان تھا مسلط ہو گئے ۔ نہ معلوم اُن کے جسموں میں اُن تاتاریوں کی ارواح خبیثہ گھس گئی تھیں جنہیں ہم نے تہ تیغ کیا تھا یا کیا جو گاؤں قصبہ اُن کے راستہ میں پڑتے ہیں جس طرح سانپ اپنے بچوں کو کھا جاتا ہے یہ لوگ وہاں عورتوں اور بچوں تک کو نہیں چھوڑتے میں نے پے در پے دو ایلچی اُن کے پاس بھیجے ۔ صلح کی طرف مائل ہونا کیسا وہ یہ بھی نہیں بتاتے کہ وہ چاہتے کیا ہیں ۔ اُن کے مُنہ میں انتقام کے سوا دوسرا کوئی کلمہ نہیں، اُن کی تلواروں سے خون ۔ تیروں سے زہر برس رہا ہے ۔ ہم نے چند ہزار آدمیوں کی جمیعت اُن کے مقابلہ کے لیے بھیجی مگر اُن کو تنبیہ کر دی کہ صرف مُدافعانہ لڑائی لڑیں ۔

جلال الدین ۔ آہ ! آخلاط ؛ اخلاط ! یہ ساری مصیبت ہم پر اُس حرکت سے آئی جو اخلاط میں کی گئی ۔

اور خان ۔ اے میرے پادشاہ ! آخلاط پر ضرب فوج کی طرف سے پڑی تھی ۔ عورتوں سے جو اپنی زندگی تمام لڑائیوں سے علحدہ بسر کرتی ہیں، اور بچوں سے جو خدا کی نظر میں بھی معصوم ہیں

کیا اس کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

نورالدین۔ اے میرے بادشاہ! حکم دیجیے کہ ایک مکمل فوج ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کی جائے تاکہ مسلمانوں کے سر سے ان کا شر دفع ہو۔

جلال الدین۔ مولانا! وہ بھی مسلمان ہیں۔ ہم ان کا شر مسلمانوں پر سے ہٹائیں گے، یا تاتاری شر کہ ہمارا شر ان کے سر سے، دفع کریں گے۔

نورالدین۔ میں چاہتا ہوں کہ بات مختصر ہو، مگر بات میں سے بات نکلتی ہے۔ مجبور ہوں حضور کی سمع خراشی کروں۔ حضور یہ اسلام نہیں۔ مسلمان، اپنے بھائیوں کے مذہب و عرض و جان پر ضرب نہیں لگاتا۔ حضور مجھے معاف فرمائیں، مگر کیا حضور کا مقصد یہ نہیں کہ مسلمانوں کو اس تاتاری بلا سے نجات دی جائے۔

جلال الدین۔ تو کیا آپ بھی میرے مقصد سے شبہ کرنے لگے۔

نورالدین۔ استغفراللہ اے میرے بادشاہ! شبہ نہیں بلکہ ایک مسئلہ کو نتیجہ تک پہنچانے کے لیے بطور مقدمہ کے عرض کیا تھا۔ اب چونکہ مقصد یہ ہے کہ عالم اسلام کو تاتاری پنجے سے چھڑایا جائے، تو سب سے اول کیا یہ لازم نہیں کہ جس چیز سے تاتاریوں کو قوت اور مسلمانوں کو ضعف حاصل ہوتا ہے، اسے شکست دی جائے۔

جلال الدین۔ بیشک لازم ہے، اچھا دیکھیں آپ اس مسئلہ کو کس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔

نورالدین۔ اس نتیجہ پر اے میرے بادشاہ! تاتاریوں کو جو چیز قوت دے رہی ہے وہ ان کا اتفاق ہے، ہمیں جس چیز سے ضعف پہنچ رہا ہے وہ ہمارا آپس کا اختلاف ہے۔ اس اختلاف کے ہوتے تاتاریوں کا مقابلہ کرنا، ایک ٹوٹی ہوئی تلوار سے لڑائی کو نکلنا ہے۔

جلال الدین۔ مگر میں کیا کروں۔ اختلاف کا سبب میں نہیں۔ تم ان کا حال نہیں دیکھتے۔

نورالدین۔ نہیں میرے بادشاہ! حضور کا اختلاف کا سبب نہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ حضور ان تدابیر سے استغنا فرماتے ہیں جو اتحاد کے لیے لازم ہیں۔

جلال الدین۔ وہ کونسی تدبیر ہے جس سے میں نے استغنا ظاہر کیا ہے۔

نورالدین۔ میری عرض یہ ہے کہ اگر عالم اسلام لطف و عنایت سے متحد نہیں ہوتا، تو جبر و قہر سے اسے متحد کرنے کی تدبیر نہیں کی گئی۔

جلال الدین۔ مولانا! کیا آپ واقف نہیں کہ تلوار جدا کرتی ہے ملاتی نہیں۔

نورالدین۔ جانتا ہوں اے میرے بادشاہ! اگر زخموں سے جو خون بہے گا وہ ملا دیگا۔
جلال الدین۔ اللہ اللہ! دنیا میں ہر شخص کی آرزو مسلمانوں کے خون سے ہی حاصل ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ تاتاری مسلمانوں کے خون کے خواہاں، خلیفہ، اسلام مسلمانوں کے خون کا خواہاں، سلاطین اسلام مسلمانوں کے خون کا خواہاں یہاں تک کہ نجات اسلام جیسا مقصدِ مقدس بھی مسلمانوں کے خون کا خواہاں معلوم ہوتا ہے۔ کیوں؟
نورالدین:۔ ہاں میرے بادشاہ! ہم ایسے بدبخت زمانے میں ہیں کہ وہ مقصدِ مقدس بھی بغیر مسلمانوں کے خون کے حاصل ہوتا نظر نہیں آتا۔
جلال الدین:۔ مولانا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا میرا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ تاتاریوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ تیغ آزمائی کروں۔
نورالدین:۔ اگر حضور مسئلہ کو اس طرح ہر قسم کی شرائط سے علیحدہ اور مجرد کرکے ملاحظہ فرمائیں گے تو البتہ میرے معروضات ہذیان معلوم ہوں گی۔ غلام یہ عرض نہیں کرتا کہ مسلمانوں سے لڑائی مطلقاً، مشرکوں سے غزا کرنے کے مقابلہ میں کارِ ثواب ہے۔ میں تو عرض کرتا ہوں کہ تاتاریوں سے جنگ آزمائی کرنے کے بجائے جن پر غلبہ پانے کے لیے ہزار میں ایک احتمال بھی نہیں کیونکہ ہمارے پاس اتنی جزوی قوت ہے ہمارا یہ فرض ہے کہ مسلمانوں کو ایک رایت حمیت کے ماتحت لانے کی غرض سے انہیں اُن خائنوں کے پنجۂ تسلط سے آزاد کرنے کی کوشش کریں حضور! آپ خیال فرماتے ہیں کہ یہ مسلمان ہیں خدا شاہد ہے کہ اہانت اسلام میں سب کے سب تاتاریوں سے بھی بدتر ہیں، اس کو ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔
جلال الدین:۔ (بات کاٹ کر) جانتا ہوں، جانتا ہوں، اگر لڑائی میں وہی آدمی مارے جاتے جنہیں آپ نے خائن کے لقب سے یاد کیا ہے تو اُن سے لڑنا تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کی نسبت ہر قسم کے فرض سے بالا تصور کرتا، مگر آپ یہ نہیں سوچتے کہ اُن سے لڑائی لڑنے میں کتنے بے قصور مارے جائیں گے۔ وہ خائن ہیں مگر اُن کے سپاہیوں کا کیا قصور، وہ بیچارے کیا جانیں کہ کون خائن ہے۔
نورالدین:۔ اے میرے بادشاہ! اگر چند سادہ دل سپاہیوں کو یہ خائن اُن غازیانِ اسلام کے مقابلہ میں کشاں کشاں لے آئیں جو حضور کے تابع ہیں تو اس کا وبال حضور کی گردن پر نہیں، اگر ہم اس خیال سے اصحابِ غفلت کو اُن کے حال پر چھوڑ دیں کہ اپنے کیے کی سزا وہ خود بھگتیں گے تو شیطان سے بڑھ کر چند ملعون ممالک اسلام میں جس قدر امصار مسلمین ہیں اُن سب کو مشرکوں کی زنجیرِ تغلب میں پابند کراکے رکھ دیں گے۔ عراق اور کاشغر سے غرناطہ تک ساری اقلیم کو اسیروں کا بازار کردیں گے
(راستہ کے کپڑے پہنے ہوئے ایک سپاہی کمرے میں داخل ہوتا ہے اور اورخاں کو ایک خط دیتا ہے۔)
جلال الدین:۔ (اورخاں سے، جو خط کھول کر پڑھتا ہے) یہ کیا ہے۔
اورخاں:۔ اے میرے بادشاہ! یہ امیر ابراہیم کا جسے ہم نے دشمن کے مقابلہ کے لیے بھیجا تھا خط ہے۔

جلال الدین - پڑھو۔

اورخاں - (خط پر نظر ڈال کر اُسے نورالدین کو دیتا ہے اور حقارت و تاثر سے بھری ہوئی آواز میں کہتا ہے) آپ پڑھیے -

جلال الدین - مولانا آپ ہی پڑھیے، اورخاں ایسی متانت قلب کا مالک ہے کہ اُس نے اپنے حقیقی بھائی کو جو فوج اسلام سے علیحدہ ہو گیا تھا، اپنے ہاتھ سے تیغ کیا مگر اس کاغذ کے ٹکڑے نے اُس کو رُلا دیا ہے، کون سی مصیبت اس میں درج ہے۔

نورالدین :- (پڑھتا ہے) حضور کے تعمیل ارشاد میں ہم ازنجان کی طرف بخط مستقیم جا رہے تھے کہ دو منزل بعد ہمیں دشمن کا ہراول ملا، یہ ممکن تھا کہ ایک حملہ میں ہی اُن کو روک دیتا مگر چونکہ حضور کا حکم نہ تھا اس لیے میں نے صرف اُن راستوں کی ناکہ بندی کر دی جدھر سے وہ گذرتے دو ایک قیدی جو ہاتھ آئے اُن کے بیان سے معلوم ہوا کہ دشمن پچیس ہزار کی قوت سے ہماری طرف آ رہا ہے گاؤں والے اُس کی قوت کو اور بھی زیادہ بیان کرتے ہیں اگر اُن کے بیان پر اعتبار کیا جائے تو ایک لاکھ سپاہیوں کی فوج آ رہی ہے، مگر بظاہر یہ عوام کا واہمہ ہے۔

جلال الدین :- (اُس کے پڑھنے کو روک کر) ممکن ہے ایک لاکھ سوار مبالغہ ہو لیکن حضرات ملک اتنے ہمت والے نہیں کہ محض پچیس ہزار کی جمعیت سے مجھ پر حملہ آور ہوں - بہر حال آگے پڑھیے -

نورالدین :- (پڑھتا ہے) ہیبت اللہ تزوقی جس سے آپ واقف ہیں صبح شریف سے واپسی کے وقت ادھر سے گذرا تھا - حضور واقف ہیں کہ وہ باہوش ہے اور صاحب تدقیق ہے اور حضور کے وفادار بندوں میں سے ہے، کہتا تھا کہ جب میں شام میں تھا تو وہاں جن اشراف و امراء سے ملاقات ہوئی اُنکا خیال یہ پایا کہ جب تک دولتِ خوارزم شاہ بالکل نیست و نابود نہ کر دی جائے باقی حکومت کو آرام نصیب نہ ہوگا - اس غرض کے لیے آپس میں متحد ہونے کے علاوہ اُنہوں نے عیسائیوں اور تاتاریوں کے پاس ایلچی بھیجے ہیں - اور اُن کے بیان سے یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ اُنھیں حسب مراد جواب بھی ملے ہیں اُن کا یہ خیال ہے کہ اس تاتاری بلا کی وجہ سے دولتِ خوارزم شاہی کا ظہور ہوا اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سلطنت مٹے تو فتنۂ تاتاری کو بھی سکون ہو۔

جلال الدین :- کیا خوب عاقبت بینی ہے - کیا یہ لوگ چمگادر کی طرح روشنی نہیں دیکھ سکتے۔

نورالدین :- یہ خیال کیا جائے گا کہ مسلمان بادشاہ اپنے ہم مذہبوں سے لڑنے کے لیے کفار سے مراجعت نہ کریں گے مگر میں نے ان لوگوں میں کوئی اثرِ اسلام نہیں دیکھا اور اس لیے اُن کے متعلق جو خبر میں نے سُنی وہ صحیح ہوگی - اُن مردوں کو جو اپنی عورتوں کو بچانا چاہتے ہیں اور اُن ماؤں کو جو اپنے بچوں کی جان بچانے کی کوشش کرتی ہے یہ لوگ خاوندوں کو عورتوں سے سینہ بسینہ اور بازو بہ بازو کر کے اور اسی طرح ماؤں کو بچوں کے ساتھ ملا کر اُن کے جسموں میں میخ ٹھوک دیتے ہیں - میں نے ایک ہزار سے زیادہ اس طرح کے جوڑے تڑپتے دیکھے آدھے تو مر چکے تھے اور آدھے اس شکنجہ میں مبتلا ہزار اذیتوں سے جان دے رہے تھے۔

جلال الدین - بس نورالدین بس - یہ ملعون چنگیز سے بھی بڑھ گئے - حجاج ابن زیاد سے بھی بڑھ گئے نہیں، نہ یہ مسلمان نہ ان کے سپاہی مسلمان - تاتاری کمینے شیطان سے بھی اوّل ان سے مقابلہ

کرنا ہمارا فرض ہے۔ اور خاں ہماری فوج کس قدر ہے اگر ہم آج یہیں سے فوج بھیجیں تو کتنے آدمی بھیج سکتے ہیں؟

اور خاں:۔ آٹھ دس ہزار کے قریب۔

جلال الدین:۔ انشاء اللہ ہمارے دس ہزار ان تیروں کے ایک لاکھ پر بھاری ہونگے جاؤ افسروں کو حکم دو۔ آج کوچ ہے۔

نورالدین:۔ اے میرے بادشاہ! خدا آپ کا معین و مددگار ہو، کام اب شروع ہوا ہے۔

جلال الدین:۔ (اپنا ہاتھ آنکھوں پر لیجا کر مایوسانہ انداز سے) مجھے خوف ہے کہ شاید ہم اس کام کی انتہا تک نہ پہنچیں گے " مولانا تیاری کیجیے۔ نوکروں سے کہیے کہ ملک سے جاکر کہیں کہ یہاں آئیں۔ (داہنے ہاتھ سے اپنے سر کو ٹکراتا ہے اور کمرہ میں ادھر اُدھر ٹہلتا ہے) نہیں یہ ابتدائی کار نہیں ہے۔ انتہائی کار ہے۔ یہ آگ کیا ہے جو میرے جسم کو جلا رہی ہے۔ یہ توہمات، یہ خیالات۔ جو مشابہت کو حقیقت بنا رہی ہیں، جو مہرجہاں کو نیرہ بنا رہے ہیں کہاں سے آرہے ہیں۔ یہ آگ تپ محرق ہے۔ یہ مقدمۂ موت ہے۔ میں نے نیرہ کو اپنے ہاتھ سے دریائے سنت میں چھوڑ دیا تھا اور اپنے ہاتھ سے اُسے نکال کر اُس دریا کے ساحل پر اپنے ہاتھوں سے دفن کیا۔ مہرجہاں کو دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیرہ زندہ ہوگئی۔ یہ خیال مجھے کبھی کبھی عین حقیقت معلوم ہونے لگتا ہے۔ اُف! ... ملت ... باپ ... رکن الدین ... نیرہ ... قطب الدین ... یہ سب فدا ہوگئے۔ ہاتھ سے گئے ... سیف الدین ... ناصر ... قیاث کیقبا ... اشرف ... خیانت، خیانت، خیانت (بیہوش ہوکر ایک طرف کو روتا ہوا گرتا ہے) دنیا جسے کہتے ہیں وہ دارامتحان ہے، انسان وہ مخلوق ہے جو قرب الٰہی سے مردود ہوکر یہاں پھینکی گئی ہے۔ کوشش سے ہوش میں آکر) سکراتِ موت، سکراتِ موت! آہ، خدا نے مجھے کیسا بدبخت پیدا کیا کہ جس قدر شہید ہونے کی آرزو کی اس قدر ہی زندہ رہا۔ میں شدید تپ میں مبتلا ہوں۔ سکراتِ موت کی کیفیت ہے۔ لیکن وہ بھی میری زندگی کو بڑھا رہی ہے۔ اے فلک، کیا اس لیے کہ مجھے اپنے پر بھروسا ہے تو مجھے مصیبتوں میں ڈالتا ہے۔ یارب! یارب! ان مصیبتوں سے۔ ان غموں سے، تو میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ میرے قلب پر ہزاروں شکنجے اپنا کام کر رہے ہیں۔ ہزاروں دوزخیں بھڑک رہی ہیں اے میرے اللہ اے میرے اللہ میں اس زندگی سے بیزار ہوگیا، اگر میرے جسم اور میرے ذہن پر ضعف آنے کو ہے اگر میں خدمتِ اسلام سے عاجز ہونے کو ہوں تو تیری عزت کا واسطہ میری جان فوراً لے لے۔ مجھے اسلام کو بالکل ذلیل ہوتا ہوا نہ دکھلا۔ غیرت! غیرت! کہیں یہ نہ کہو کہ میری وجہ سے اسلام چند ملعونوں کی لسانِ استہزا کا ہدف نہ بن جائے۔

افاداتِ سلیم

ہوئے دل سے مرے جذباتِ عشق اس رنگ سے پیدا
شرارے جس طرح ہوتے ہیں قلبِ سنگ سے پیدا

مٹا دو اپنی ہستی کو اگر شہرت کے طالب ہو
نہ نام و ننگ ہوگا فکرِ نام و ننگ سے پیدا

جوانی چھائی جاتی ہے ترے رخ پر عجب کیا ہے
ہزاروں حسن کے کشمیر ہوں اس رنگ سے پیدا

سکھائی فصلِ گل کو تو نے جب طرزِ خود آرائی
نئے جلوے ہوئے گلہائے زنگا رنگ سے پیدا

حسینوں کے مرقع میں جو کی قدرت نے گلکاری
نہ ہوں گی صورتیں یہ خامۂ ارژنگ سے پیدا

عجب کیا کھینچ لے اپنی طرف جنت پرستوں کو
کہ ہلکورے ہیں کوثر کے مئے گل رنگ سے پیدا

چلو اے مے کشو! گلزار میں جام و سبو لے کر
کہ آثار ابر کے ہیں چرخ مینا رنگ سے پیدا

کہیں ہیں بے کفن لاشے کہیں ہیں خون کے چھینٹے
نشاں ہیں کوئے قاتل کے کئی فرسنگ سے پیدا

سکھاتا کون ہے یہ شعبدے اے آسماں تجھ کو
ہزاروں رنگ ہوتے ہیں ترے نیرنگ سے پیدا

مکان و لامکاں دونوں سمائے جن کی وسعت میں
فضائیں تو نے کیں وہ میرے قلبِ تنگ سے پیدا

عجب کیا طوس[1] کی بلبل ہو آ کر نغمہ خواں ان پر
ہوئے ہیں پھول خاکِ بہمن و ہوشنگ سے پیدا

حزیں[2] کی روح کو ہیں عالمِ برزخ میں تڑپاتے
وہ جلوے ہو چکے ہیں جو کنارِ گنگ سے پیدا

پسِ پردہ مغنیِ ازل کو میں نے پہچانا
صدائیں کچھ ہوئیں ایسی ربابِ چنگ سے پیدا

دئے ہیں تجھ کو قدرت نے وہ مضمون آبدار اے دل
صدف میں بھی نہ ہوں موتی اس آب و رنگ سے پیدا

---

[1] فردوسی کی طرف اشارہ ہے

[2] حزیں کے ایک مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے جو بنارس میں اس کی قبر پر لکھا ہوا ہے

کتبِ جدیدہ

رسائل

مکاتیبِ امیر مینائی مرتبہ مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہی۔ منشی امیر احمد صاحب مینائی قادر الکلام شاعر اور زبانِ اردو کے محقق کامل کی حیثیت سے دور گزشتہ کے اساتذہ میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ شدید ضرورت تھی کہ منشی صاحب مرحوم کی مفصل سوانح اور تصانیف شایع کی جائیں۔

"مکاتیب" کے ابتدا میں جو حالات درج ہیں اگرچہ ناکافی ہیں تاہم بڑی حد تک ایسی کمی کو پورا کرتے ہیں۔ منشی صاحب مرحوم کے مشہور تلامذہ کے تذکرہ کے ساتھ نمونتاً کچھ اشعار مع اصلاح درج ہیں جو در اصل حضرت امیر مرحوم کے شجرِ کمال کے برگ و بار ہیں۔

یہ مکتوبات ادبی محاسن کے اعتبار سے نہایت قابلِ قدر ہیں۔ زبان کی صفائی اور متانت کے علاوہ فنِ شاعری کے بعض اہم مسائل کی تحقیق کے جواہر بھی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔ جو طالبانِ فن کے لئے ازبس مفید ہیں۔

اکثر تذکرہ نویسوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم عصر اساتذہ کے کلام کا موازنہ کر کے ایک کو دوسرے پر فوقیت دینی چاہیئے۔ ہم اصولاً اس طرزِ استدلال سے متفق نہیں ہیں۔ ہر استاد کا رنگِ طبیعت اور مذاقِ سخن جداگانہ ہوتا ہی۔ یہاں مقابلہ اور موازنہ بالکل بے محل ہی ؎

ہر گلے را رنگ و بوے دیگر ست

افسوس ہی کہ ہمارے فاضل دوست مولوی ثاقب صاحب بھی اس تقلید سے محفوظ نہ رہ سکے

داغ مرحوم کے چند ہم قافیہ اشعار پیش کر کے منشی صاحب مرحوم کو اعلیٰ اور افضل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ داغ مرحوم غزل گوئی کے ایک طرز خاص کے موجد و بانی ہوئے ہیں اور اس کی قبولیت عام کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوگا کہ خود منشی صاحب مرحوم بھی تقلید کرنے پر مجبور ہوئے چنانچہ "صنم خانۂ عشق" داغ مرحوم کے رنگ میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ مراۃ الغیب سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔ غرض چند اشعار کے موازنہ کے بعد کوئی محتتم رائے قائم کرنا یا فیصلہ دے دینا، نہایت خطرناک اور موجب جرح اور قدح ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ ثاقب صاحب نے حضرت منشی امیر احمد صاحب کے کلام پر نہایت آزادی سے نقد و تبصرہ کیا ہے جو ایک خوش اعتقاد شاگرد کے قلم سے کافی دشوار ہے۔ باین ہمہ ہمارے مکرم دوست نے جس کاوش و جستجو کے بعد خطوط فراہم کئے اور زبان اردو میں ایک مایۂ ناز اضافہ کیا وہ قابل تحسین ہے اور ہم تہ دل سے ہدیہ مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ :- مطبع ادبیہ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

تذکرۂ امام الاحرار مولانا ابوالکلام آزاد کے علمی اور سیاسی کارنامے محتاج بیان نہیں زبردست خطیب، بے نظیر انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کے ماہر سیاست ہونے کی خصوصیات ایک ذات میں جمع ہو جانا محض قدرت خداوندی کا ایک نمونہ ہے۔ عرصہ سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ حضرت موصوف کے حالات و سوانح جمع کر کے پبلک کے سامنے پیش کئے جائیں۔ خود مولانا سے درخواست کی گئی اور آپ نے احباب کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر چند اوراق لکھے بھی مگر وہ اس قدر کم اور واقعات و حالات سے خالی ہیں کہ عدم وجود برابر ہے۔ محض "شاعرانہ پیرائے میں بات ٹال دی ہے"۔ بارے شکر ہے کہ عصر جدید بک ایجنسی نے اس فرض سے سبکدوش ہونے کی اس "تذکرہ" کی صورت میں کوشش کی ہے۔ اولاً مولانا کے خاندانی حالات و سلسلۂ نسب نہایت صحت کے ساتھ جمع کئے ہیں۔ مولانا کے سیاسی کارنامے اور الہلال کی خدمات نہایت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ دکھائے

گئے ہیں۔ حضرت موصوف کے تقریر کے بعض حصے نقل کرکے تذکرہ کے حسن و خوبی میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ سب سے زیادہ سبق آموز اور مفید وہ حصہ ہے کہ جس میں مولانا موصوف کے منازل ارتقاے کمال کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ آپ کے خیالات عقائد میں بتدریج ترقی اور تغیر کا افسانہ آپ ہی کے قلم سے لکھا گیا ہے۔ یہ معلوم کرکے اکثر حضرات نہایت متعجب ہونگے کہ ایک دَور مولانا پر جو آج کتاب و سنت کے زبردست حامی اور موئد ہیں ایسا گزرا ہے کہ آپ اسلامی عقائد اور مسلمات کے بالکل قائل نہ تھے۔ اس امر کا نہایت صفائی کے ساتھ خود بھی اعتراف کیا ہے۔ بالآخر طلب صادق نے آپ کی فطرت سلیمہ کی بدولت آپ کو مولانا ابوالکلام آزاد بنا دیا۔

آخر میں مولانا کی ابتدائی تصانیف کی فہرست دی گئی ہے۔ جس کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ ایسی معرکۃ الآرا تصانیف اور آغاز شباب میں کیوں کر ممکن ہیں ذَالِكَ فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ آپ کے نظربندی کے حالات درج کرکے تذکرہ ختم کیا ہے۔

بہرکیف "تذکرہ" ایسی عجیب و غریب ہستی کے حالات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایک اچھی چیز ہے اور مطالعہ کے قابل ہے۔

نوائے رنجور مولوی بشیر احمد صاحب مسرور نے اپنے والد ماجد مولوی احمد بخش صاحب رنجور کیور تھلوی کی غزلیں ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کی ہیں۔ مولوی رنجور صاحب کا کلام اس سے بیشتر کسی اخبار یا رسالے میں نظر سے نہیں گزرا۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آپ کہنہ مشق شاعر تھے۔ زبان کی فصاحت تخیل کی شوخی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ داغ مرحوم کے شاگرد ہونے کا حق تقلید خوب ادا کیا ہے۔ چنانچہ اشعار ذیل سے اندازہ ہوگا کہ استاد کے رنگ کا کس قدر تتبع ہے۔

اٹھیں نہ مر کے خاک نشیں تیری راہ کے — کہتا ہے صاف یہ لب خاموش نقش پا

دل کو سینے سے خیال یار آ کر لے چلا — دیکھئے خانہ بدوشی گھر اٹھا کر لے چلا

حسرت یہ ہے جب گلے سے لگے یہ تو جاں دے — بسمل کی چشم شوق ہے تلوار کی طرف

تصوف کے مسائل کو بھی بعض اشعار میں بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔ مثلاً :-

آیا نظر وہ دل میں دمِ بے خودی ہمیں — اس آئینے پہ اپنی ہی ہستی کا رنگ تھا

خود رفتہ ہو کے کرتے ہیں ہم سیرِ دو جہاں — قبلہ نما کی طرح سے گوشہ نشیں نہیں

تاہم کلام متروکاتِ داغ مرحوم اور تعقید سے پاک بھی نہیں ہے۔ بجز غزل دوسری اصنافِ سخن سے مجموعہ خالی ہے۔ افسوس ہے بہت سے غیر معروف حضرات کا کلام جو اپنے محاسن کے لحاظ سے مشاہیر کے کلام سے کم نہیں مگر دستبردِ حوادث یا پس ماندگان کی ناقدردانی اور بے پروائی کا شکار ہو کر پردۂ عدم ہی میں مستور رہا۔ مولوی بشیر احمد مسرور اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ اپنی مساعی جمیلہ پر قابلِ مبارکباد ہیں۔ شروع میں حضرات رنجور کے کلام پر مفصل تبصرہ ہے جو مولوی فیاض صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ مگر طباعت اور کاغذ اس قدر معمولی ہیں کہ بعض طبائع جو نمود و نمائش کے دلدادہ ہیں شاید اس طرف مائل نہ ہوں۔ معلوم نہیں کہ مولوی بشیر احمدؐ صاحب نے اس طرف کیوں توجہ نہ فرمائی۔

نوبہار یہ ماہوار ادبی رسالہ زیرِ ادارت احسان علی کوثر و بہ نگرانی حامد اللہ صاحب افسر علی گڑھ سے شائع ہوتا ہے۔ افسر صاحب دنیائے صحافت کے ایک مشہور معروف رکن ہیں۔ آپ کے تعارف کے متعلق کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ یہ رسالہ بڑی آب و تاب کے ساتھ زبان اردو کی خدمت کے واسطے نکلا ہے۔ ترتیب و تنظیم میں جدت سے کام لیا گیا ہے۔ مضامین نثر و نظم مسلم اور مقتدر صحافی کے فراہم کئے گئے ہیں خصوصاً خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتحپوری صاحبان کے مضامین نہایت دلچسپ ہیں۔ آخر میں چند ظرافت آمیز کارٹون بھی ہیں۔ غرض ہر طرح کوشش کی گئی۔ ہر مذاق کے لئے سامانِ ضیافت سے رسالہ کو آراستہ کیا گیا ہے۔

ہم دلی مسرت کے ساتھ "نوبہار" کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس کو مفید اور موقت الشیوع بنانے میں ہمارے دوست کوثر صاحب و افسر صاحب کوئی دقیقہ فروگزاشت

نہ فرمائیں گے۔ ٹائیٹل ورق رسالہ کو اسم بامسمیٰ بنا رہا ہے۔

محسن الملک یہ علمی پرچہ زیر ادارت حامد سعید صاحب بھوپالی و زیر نگرانی صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب بہادر کچھ عرصہ سے نکل رہا ہے۔ مضامین نظم و نثر علمی اعتبار سے بلند پایہ ہیں اور بڑی خصوصیت اس رسالہ کی یہ ہے کہ نہایت پابندی سے مقررہ وقت پر شائع ہوتا ہے۔ کاش ہمارے دیگر معاصرین بھی اس طرف توجہ فرمائیں جو ادبی رسائل سے سوء ظن ہے اُس کا بھی اس طرح سے انسداد ہو جائے۔ مضامین کا غالب حصہ تاریخی اور علمی ہے۔ "اصحاب کہف" کے عنوان سے ایک مضمون جو مشہور مورخ مولوی عبدالرزاق کا نپوری کے زور قلم کا نتیجہ ہے خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔ کاغذ کی نفاست اور ٹائیٹل ورق کے عمدگی کے مقابلہ میں کتابت اعلیٰ درجہ کی نہیں۔

پتہ:۔ منیجر صاحب رسالہ "محسن الملک" بھوپال

درویش یہ پندرہ روزہ رسالہ دہلی سے درگاہ نظام المشائخ سے زیر ادارت ملا محمد الواحدی صاحب اور زیر نگرانی حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نکلتا ہے۔ زیادہ تر مذہبی اور اخلاقی مضامین شائع ہوتے ہیں جیسا کہ نام ہی سے واضح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ "درویش" جن مقاصد کی تحصیل کے لئے نکلا اُن میں بڑی حد تک کامیاب ہے اور آئندہ کامیابی کے لئے ان دو بزرگوار کے اسماء کافی ضمانت ہیں۔ آخر میں خواجہ صاحب کا روزنامچہ نہایت پُرلطف ہے۔ اس قسم کے اخبار و رسائل کی فی زمانا شدید ضرورت ہے۔ رسالہ کو مجموعی حیثیت سے دیکھتے ہوئے قیمت بھی واجبی ہے یعنی سالانہ صرف عہ

ملنے کا پتہ:۔ منیجر رسالہ درویش دہلی

ستارہ | یہ علمی ادبی رسالہ ہمارے مکرم دوست میناؔ زبیری مارہروی کے زیر ادارت علی گڑھ سے طلوع ہو رہا ہے۔ میناؔ صاحب اُس نئی تعلیم یافتہ جماعت کے جو ادب اُردو کی حامی اور دلدادہ ہے خاص رکن ہیں۔ چنانچہ انہی مقاصد کی تکمیل کے لئے یہ رسالہ آپ شائع کر رہے ہیں اب تک جس قدر نمبر اس کے ہماری نظر سے گزرے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلحاظ اپنی ادبی خوبیوں اور کیا بلحاظ طباعت وغیرہ رسالہ نہایت عمدہ اور کامیاب ہے۔ مضامین زیادہ تر تحقیقی اور علمی ہوتے ہیں۔ کمی ضخامت میناؔ صاحب کے دیگر مشاغل میں مصروفیت کا کافی ثبوت ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ کی ہمت افزائی کی جائے اور ادبی ذوق رکھنے والے حضرات اس کی توسیع اشاعت میں سعی فرمائیں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ "ستارہ" اپنی ضیاپاشیوں سے دنیائے ادب کو منور کر دیگا ہماری خاص استدعا یہ ہے کہ میناؔ صاحب اُردو کو اُن زہریلے جراثیم سے محفوظ رکھیں جو بعض معاصر بدقسمتی سے اپنی جدید طرز انشا کے ذریعے سے پھیلا رہے ہیں۔ قیمت سالانہ عہ

پتہ: مینجر دار الشعور، علی گڑھ

ہزار داستان | بڑی شان کے ساتھ حکیم احمد شجاع صاحب کے زیر ادارت لاہور سے ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ مضامین علمی و ادبی ہوتے ہیں نظم کا حصہ بھی عمدہ ہے۔ مشاہیر شعرا کے کلام سے آراستہ ہے۔ شروع میں اساتذہ کے فوٹو بھی ہوتے ہیں حسن کتابت و طباعت خاص طور پر نمایاں ہیں ضرورت ہے کہ مضامین زیادہ مفید اور دلچسپ جمع کئے جائیں۔ زیادہ طویل مضامین جو بالاقساط شائع ہوتے ہیں وہ رسالہ کے پُر لطف بنانے میں معین ہوتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے ہزار داستان بہت خوب ہے۔

ملنے کا پتہ: ہزار داستان لاہور

اُردوے معلیٰ | ایک ماہوار رسالہ ہے جو قربان علی صاحب بسملؔ کی ادارت میں دہلی سے نکلتا ہے۔ نظم و نثر کا مختصر سا مگر پر لطف مجموعۂ مضامین ہے "مرشد کی مصلحت" کے عنوان سے

جو مضمون درج ہی تصوف سے مذاق رکھنے والے اصحاب کے لئے مفید ہی۔ آخر میں غزلیں درج ہیں جو نہایت پُرلطف ہیں۔

ملنے کا پتہ: دفتر اُردوے معلےٰ دہلی

نوید زیر سرپرستی انجمن ترقی اُردو پٹنہ شائع ہوتا ہی۔ مضامین فلسفیانہ، اخلاقی اور نہایت پرلطف ہوتے ہیں۔ نظم کا حصہ نسبتاً کم ہی اور وہ بھی بہ مقابلہ نثر رو کھا پھیکا ہی۔ اخلاقی اعتبار سے یہ رسالہ نہایت قابل قدر ہی اور سنجیدہ اور متین مضامین کا حامل ہی نظم کی کمی "مکتوباتِ محبت" کے زیر عنوان جو مضامین شائع ہوئے اُن سے پوری کردی گئی ہی۔ اُمید ہے کہ ذی علم اصحاب میں مقبول ہوگا۔

ملنے کا پتہ دفتر انجمن ترقی اُردو پٹنہ

الایمان نوشتہ مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی۔ مسلمان حرف شناس بچوں کی تعلیم عقائد کے لئے نہایت کارآمد اور مفید رسالہ ہی۔ مولوی صاحب موصوف نے نہایت سادہ اور سہل طریقے پر بچوں کو اسلامی عقائد ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔ اسلوب بیان نہایت مناسب ہی۔ زبان سلیس اور عام فہم ہی۔ ضرور یہ رسالہ ہر مسلمان کے گھر میں موجود ہونا چاہئیے اور بچوں کو ابتدا سے مذہبی تعلیم دی جائے تاکہ آیندہ مذہب سے بیگانگی پیدا نہ ہو۔

ملنے کا پتہ مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

علی گڑھ میگزین

جلد (۳)	بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء	قیمت سالانہ مع محصول ڈاک للعہ
نمبر (۷)		قیمت فی رسالہ مرادی ۸ر

فہرست مضامین

مرتبہ: محمد اشفاق حسین صدیقی مجنوں

پرنٹر و پبلشر محمد مقتدیٰ خاں شروانی مینیجر مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ

علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر ایٹ لا
کے
اردو کلام کا مجموعہ موسومہ
"بانگِ درا"
چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ جلد منگوائیے ورنہ
دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔
قیمت چار روپیہ (للعہ) - محصولڈاک بذمہ خریدار
المشتہر
شیخ طاہرالدین بازار انارکلی لاہور
سیرۃ المصنفین
از
مولوی محمد یحییٰ تنہا۔ بی اے (علیگ)
خدا کا شکر ہے کہ اردو زبان عمدہ اور ضروری کتابوں سے روز بروز مالامال ہوتی جاتی ہے ملک کے اہل قلم اس کو درجہ تکمیل تک پہنچانے
میں ہمہ کوشاں ہیں لیکن ان کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہونگی اگر اہل ملک ان کی کتابوں کو خریدنے میں دریغ فرمائینگے آج تک نثاران اردو کا تذکرہ لکھنے
کے لئے کسی صاحب نے زحمت گوارا نہ کی تھی اگرچہ شعرا کے تذکرے ایک نہیں بیس ہماری زبان میں موجود ہیں پس حضرت تنہا کی یہ طرف خاطر رسائی زبر
تاریخ اردو کو مکمل کرتی ہے بلکہ اہل ملک کو اردو زبان سے ہمدردی سکھاتی ہے اور اردو لٹریچر سے کامل طور پر واقف بناتی ہے اس کتاب میں ابتدا سے کر
۱۹۱۲ء تک تین دور قائم کئے ہیں ہر دور کے مصنفین کے حالات شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں ان کے انداز تحریر پر نقادانہ نظر ڈالی گئی ہے زبان
کی ترقی و تبدیلی کو ساتھ ساتھ دکھایا گیا ہے مصنفین کی کتابوں سے دلچسپ و عمدہ اقتباسات قلمبند کئے گئے ہیں خریدنے اور پڑھنے کے لائق کتاب ہے کم جلدیں
چھپوائی گئی ہیں جلد منگائیے ورنہ طبع دوم کا انتظار کرنا ہوگا۔ قیمت جلد اول دو روپیہ علاوہ محصول ڈاک جلد دوم زیر طبع ہے۔
ملنے کا پتہ: مینیجر دارالاشاعت غازی آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علی گڈھ میگزین

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک للعہ قیمت فی رسالہ مرادی ۸ر	بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء	جلد (۳) نمبر (۷)

ادبی مساحت

"الناظر" کی یہ تجویز کہ مختلف مصنفوں کے درمیان محاکمہ کیا جائے. موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔ اس سے اُردو کے دورِ جدید کے پہلے حصے کی مساحت ہو جائیگی۔ اہلِ مغرب جب ذہنی اور دماغی پیمائش کر رہے ہیں تو ہم کم از کم اُردو زبان اور لٹریچر کی جزئی پیمائش کیوں نہ کرلیں یہی وجہ ہے کہ معاصرین نے "الناظر" کے معقول اشتہار کو بڑے شوق سے جگہ دی۔ لیکن اب تک کسی نے نفس تجویز کے متعلق شمہ بھر بھی رائے نہیں دی، غالباً اس لئے کہ یہ ایک مقتدر پرچہ کی تجویز ہے، میں خود بھی اسی وجہ سے خاموش رہا اور اس موضوع پر کچھ نہ لکھ سکا مگر اب کہ ۳۱ دسمبر یوم آخر

قریب ہے۔ میں اپنے خیالات کو چھپائے رکھنے کا زیادہ موقع نہیں دیکھتا۔

اصلیت یہ ہے کہ چند اجناس کا مقابلہ کرنے میں ایک خاص نسبت جسے صفتِ مشترکہ کہنا زیبا ہوگا، لازمی امر ہے۔ کبھی ان میں مقدار یا حسن کی، کبھی قیمت یا حجم کی نسبت ہوتی ہے۔ آزاد، حالی نذیر، شبلی چاروں نہ ایک سطح پر ہیں نہ ایک میدان پر۔ ہمیں تسلیم ہے کہ یہ سب تقریباً معاصر اور آسمانِ ادب کے سیّارے ہیں، لیکن برج جدا جدا ہیں۔ یہ شاعرانہ تشبیہ نہیں بلکہ اصلیت ہے۔ جس طرح لٹریچر کے تین بڑے شعبے ہیں (۱) واقعات و حقائق (۲) تخیلات (۳) مفروضات، اسی طرح مصنفوں کے بھی تین منطقے یا برج ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، یہ تفاوت صرف اکتساب اور مشق ہی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ دماغ کے نظامِ عصبی کی نوعیت کو بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے۔ کلام نثر میں ہو کہ نظم میں، اس پر ویسا ہی رنگ ہوگا جیسی سخنور کے دماغ کی نظامِ عصبی کی نوعیت ہوگی۔ عمر خیام نے گو رباعیات لکھیں اور آج صدیوں بعد اُسے انھیں کی وجہ سے مشرق و مغرب میں درجۂ قبول ملا۔ مگر شعبۂ اول کے مصنفوں میں شمار ہونا چاہیئے۔ وجہ یہ کہ وہ مہندس اور ریاضیات کا ماہر تھا اور سائنس کی یہ شاخ حقائق کے ذیل میں آتی ہے، نہ کہ تخیل (منطق فلسفہ وغیرہ) کے یا مفروضات کے (مثنوی و افسانہ شعر و سخن وغیرہ) اور غور سے دیکھئے تو رباعیات ہی میں فطرتِ انسانی کے مرقعوں کے سوا کون سے حسن و عشق کے جذبات ہیں، بلکہ یہ عمر خیام کا حال ہے۔ جیسے مثنوی معنوی۔ مولانا روم کا حال ہے۔ لیکن ہم اس وقت شعرا کے قال سے بحث کر رہے ہیں نہ کہ حال سے۔ ہمیں اس سے کیا بحث کہ شاعر کے مخفی جذباتِ قلب کیا تھے۔ صرف اس کے مقالات سے واسطہ ہے۔ فطرت انسانی کی تصویریں نظم میں ہوں کہ نثر میں۔ سائنس داں ہی کے قلم سے نکل سکتی ہیں۔ فطرت انسانی کے متعلقہ مسائل بجائے خود فلسفۂ حیات کی ایک شاخ یا علم النفس ہے۔ ہم انھیں خالص مفروضات میں جگہ نہیں دے سکتے۔ شعبۂ اول یعنی واقعات و حقائق کا دوسرا صنف۔ سیر و تواریخ اور حیات و سفر ہے۔ اس میں بھی یہی کلیہ ہے۔ مورخ کے قلم سے کبھی کوئی پھڑکتا ہوا افسانہ شاعرانہ نظم و نثر میں نکل نہیں سکتا جس طرح ریاضیات اور علوم الطبعیہ کا ماہر شعر و سخن میں

ممتاز ہو نہیں سکتا۔ کیا اخلاقِ ناصری کے مصنف سے جس کا قلم فلسفۂ حیات کی کٹھن منزلیں سبک روی سے طے کرتا چلا جاتا ہے آپ یہ توقع کرسکتے ہیں کہ وہ مثنوی گلزار نسیم پر طبع آزمائی کرتا! یہ سب امتیازاتِ اوّل نظامِ عصبی اور پھر مشق واکتساب کے کرشمے ہیں۔ بعض وقت ایک ہی نوعیت کے اعصاب میں باہم اس درجہ کا نمایاں فرق ہوتا ہے کہ ایک قلم سے دو ہم مخرج شعبوں پر ایک ہی قسم کی تصنیف نکل ہی نہیں سکتی۔ مثلاً خلد آشیاں مولوی ذکاء اللہ کا دماغ ریاضیات کے لئے اتنا موزوں تھا کہ تاریخ ہند لکھکر خود انھیں بھی مزا نہ آیا۔ حالانکہ ریاضی اور تاریخ دونوں واقعات وحقائق کے مد میں آتے ہیں اور پھر ذکاء اللہ کے زمانے تک اُردو میں فن تاریخ نویسی نے واقدی[1] کا پیراہن اوتار کر نیا چولہ نہ بدلا تھا۔

اتنی قلم فرسائی اور سمع خراشی کے بعد اب غور سے دیکھئے۔ اُردو کا قدیم دَور انیس و دبیر پر ختم ہو رہا ہے اور اسی کے ساتھ نیا دَور پنجاب میں آزاد اور اس طرف سرسید، اپنے دائیں بائیں ذکاء اللہ، حالی، نذیر احمد کو لے کر شروع کر رہے ہیں۔ شبلی اسی دَور کا ثمر ہے۔ اس لئے کہ سرسید اور اُن کے رفقا نے اپنی عظیم الشان شخصیت اور بالاتر قوت سے اُردو کی رفتار ترقی میں اتنی سرعت پیدا کردی تھی کہ شبلی کے جیتے جی وہ پہلا دور بھی بدل گیا اور بیسویں صدی کے ساتھ شبلی کی امامت میں دورِ دوم شروع ہوا یا یوں کہئے کہ جب شبلی، پہ پہنچے تو اُردو سرسید کے زمانے سے کئی فرسنگ آگے بڑھ چکی تھی۔ اُردو لٹریچر کے ہر صنف میں جیسا کہ تہذیب کی ہر منزل میں نئے مسلمات، نئے اصول اور نئے کلیے اور نظریے قائم ہو چکے تھے جدید تعلیم کی اشاعت نے امور وفضائل انسانی سے پبلک کو آشنا کیا ہو یا ناآشنا۔ مگر ایک فضیلت یعنی حریت خیال ہر فرد کے رگ وپے میں سرایت کرچکی تھی۔

'آب حیات' اور 'شعر العجم' کو پڑھکر دیکھ لیجئے۔ دونوں میں بیّن فرق ہے۔ گویا یہ پہلا آسمان ہے اور وہ دوسرا۔ دونوں کا صنف ایک ہی ہے۔ یہ بھی تذکرۃ الشعرا ہے اور وہ بھی۔ مگر طرز

---

[1] واقدی نے رطب و یابس روایات اور سماعی واقعات کو تاریخ میں بے تکلف جگہ دی ہے ان کی تاریخ اس میں خاص شہرت رکھتی ہے ۱۲

ادا اور اسلوب بیان کی صفائی۔ لفظوں کی متانت۔ واقعات کی چھان بین ادوار اور سنین کی ترتیب اور مورخانہ شان و شوکت کے لحاظ سے شعرالعجم ایک مستند تاریخ ہے۔ اس میں اور آبحیات میں وہی فرق ہے جو قصص ہند (مصنفہ آزاد) اور تاریخ ہند میں ہے (مروجہ درسی تاریخ ہند نہیں بلکہ وہ تاریخ ہند جو ابھی کسی خافی خاں کو لکھنی باقی ہے) ہمیں اس سے انکار نہیں کہ آزاد کا دماغ شبلی کے دماغ سے زیادہ مرصع تھا مگر جدید دور (دوم) کی خصوصیات کا کیا علاج؟ یہ تو زمانہ کی بخشائشیں ہیں۔ اُنیسویں صدی کے ربع آخر میں بیسویں صدی کے ربع اول کی تاثیرات کیونکر رونما ہوسکتی تھیں۔ شاہراہِ ادب ہر قدم پر بلند ہوتا جاتا ہے اور جتنا بلند ہوگا اُتنا ہی نظارہ وسیع اور صاف ہوگا۔

شبلی محض مورخ یا وقائع نگار تھے یعنی لٹریچر کے مداول میں تھے۔ اگرچہ الکلام میں اُنھوں نے فلسفہ پیش کیا جو لٹریچر کے مردوم یعنی تخیلات میں آتا ہے۔ پھر بھی جن مباحث پر الکلام میں اظہار خیال کیا وہ آج سائنس کے شعبے ہیں اور سائنس مداول میں آتا ہے۔ اس لئے کہ سائنس میں حقائق الموجودات سے بحث ہوتی ہے۔ چاہے مادّہ موجود فی الخارج ہو یا غیر مادہ غیر موجود فی الخارج شبلی نے نظمیں بھی لکھیں۔ اس لئے کہ دماغ میں جامعیت اور ہمہ گیری تھی اور مطالعہ وسیع تھا اور طبیعت میں ذکاوت۔ مگر وہ شاعر اور غزال نہ تھے اور اگر تھے تو حقیقت نگاری سے تجاوز نہ کرتے تھے۔ آخر زمانے کی نظمیں اس کی شاہد ہیں۔ بایں ہمہ شبلی مورخ اور وقائع نگاری کی وجہ سے بزم ادب میں صدر و بدر رہتے نہ کہ ناظم اور فلسفی ہونے کی حیثیت سے۔

آزاد کی تصانیف مفروضات کے مد میں آسکتی ہیں اُن کا ایک صفحہ بھی شاعرانہ رنگ و مبالغہ سے خالی نہیں۔ جب شاعرانہ نثر لکھتے لکھتے طبیعت زیادہ جولانی پر آتی تھی اور جذبات اُبھرتے تھے تو رشحات قلم منظوم ہوکر نکلتے تھے مگر شاعری کی بدولت نہیں۔ آب حیات کی بدولت انھیں درجۂ قبول بلکہ رتبۂ امامت ملا۔

شبلی اگر شعرالعجم میں جدید ترین طرز تاریخ نویسی اختیار نہ کرتے تو تذکرہ نویسی میں مقتدی ہوتے

حالی نے دیوان بھی لکھا۔ کئی مرثیے اور مناجاتیں بھی لکھیں۔ نثر میں بہت سا کلام ہے حالانکہ یادگار غالب بجواب آب حیات اور حیات جاوید ابھی تک بے مثل کتابیں ہیں اُن کے نمونے پر اور کسی نے قلم نہیں اُٹھایا۔ مگر درجۂ قبول مسدس کی بدولت ملا جس میں ایک از یاد افتادہ قوم کی حالت کی ہو بہو تصویریں دکھائی ہیں۔ حالی نے حقیقی (نہ کہ برائے نام) مصورِ فطرت کا کام کیا پھر بھی وہ مفروضات سے باہر نہیں نکلتے۔ یہی حال نذیر احمد کا ہے یہ بھی مفروضات کے کوچے میں رہے اور معاشرت اور خانہ داری کے فن میں فرضی افسانوں کی بدولت مقبول ہوئے۔ زبان کی لحاظ سے یہ اور حالی دونوں میدانِ ادب میں پہلو بہ پہلو کھڑے ہیں۔ حالی سخت ترین موقعوں پر بھی متانت اور ثقاہت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ حیات سعدی میں اول سے آخر تک ناظرین کو مولانا مصلح الدین شیرازی ہی طرح طرح کے بھیس میں ملتے ہیں۔ شوخ طبع رنگین مزاج سعدی سے ایک دوبار ہی ملاقات ہوتی ہے وہ بھی اصلی شان میں نہیں بلکہ محض کلام کے پردے میں۔ یہ دراصل حیات نگار کی پختہ ثقاہت کا پرتو ہے۔ اس کے خلاف نذیر احمد کے ہاتھ سے (تعزیرات ہند کے مترجم ہونے کے باوجود) متانت کا دامن کبھی چھوٹ جاتا ہے اور کبھی تالیف قلوب کے لئے وہ خود چھوڑ دیتے ہیں۔ طرز ادا میں اگر حالی کی طرح یہ بھی سرسید کی شاگردی پسند کرتے تو دونوں کی انشاپردازی پر محاکمہ کرنا سخت دشوار ہو جاتا۔

میں محاکمہ نہیں لکھ رہا۔ وہ کام زیادہ غور و فکر اور کافی مواد کی مدد بغیر ممکن نہیں یہ محاکمہ کی تجویز پر محض سرسری نظر ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ دور یا صنف یا مد کے لحاظ سے شبلی کو اس زمرہ سے خارج رکھا جائے گا تو موازنہ یا محاکمہ میں آسانی ہو گی ورنہ خلط مبحث کا اندیشہ ہے۔ یوں تو چاروں بلکہ پانچویں سرسید مل کر اُردو کے اقلیم ادب پر سلطانی کرتے ہیں مگر ان چاروں کا مقابلہ کرنے کے لئے۔ معیار اتنا بلند کرنا پڑے گا کہ لطف موازنہ کم ہو جائیگا۔ سادہ زبان کے سوا اور کوئی مدعائے اعظم باقی نہ رہے گا۔ نیز ہر ایک کے کلام سے ہم پلہ انتخاب کرکے بطور شواہد پیش کرنا بھی مشکل ہو گا۔ میں نے یہ چند خیالات الناظر (صحیفہ اور صحیفہ نگار)

کی عظمت اور اس تجویز کی اہمیت دیکھکر ظاہر کئے نہ کہ اصلاحاً حاشاک اللہ
الناظر کا تجویز کردہ محاکمہ اگر کسی کہنہ مشق ادیب کے قلم سے نکل گیا تو وہ آنے والی
نسل کے ادیبوں اور مورخوں کے لئے زیادہ مفید ہوگا اور جب وہ اردو ادبیات کی تاریخ
لکھنے کے لئے قلم اٹھائیں گے تو شبلی کی شعرالعجم سے نسبتاً زیادہ اعلیٰ اور ارفع تالیف پیش
کریں گے۔ موازنہ کے ادیبوں کا سارا کلام اور ان کی تمام چھوٹی بڑی تصانیف نظم و نثر غالباً
الناظر کے دفتر میں یکجا ہونگی تاکہ اگر کوئی شخص اس تمام مواد کے فراہم کرنے پر قادر نہ ہو تو اسے
باسانی دفتر مذکور میں مل جائیں ؟

بیخود (علیگ) اڈیٹر

متنازعات

خط و خال و خد و خال

بعض الفاظ تحریر و تقریر میں اس طرح مستعمل ہوتے ہیں۔ مگر اُن کی صحتِ لفظی اور معنوی میں متنازعٌ فیہ چلی آتی ہے۔ مثلاً "خط و خال" کہ اس کو بعض "خد و خال" کرکے لکھتے اور بولتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مرکب خواہ کسی طرح مستعمل ہو حقیقی ضرورت کے لئے ایجاد نہیں ہوا نہ یہ اس شکل میں حقیقی معنی دیتا ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم اور یہ خود مجازیات میں سے ہے۔ مجازیات کے مدمیں معنی آفرینی اور لفظ آفرینی ہر زماں میں ہمیشہ سے شعرا کا حصہ ہے۔ لہذا یہ دونوں مرکب بھی لفظی اور معنوی دونوں طرح انہی کے آفریدہ ہیں تحقیق طلب صرف یہ ہے کہ "خد و خال" صحیح ہے کہ "خط و خال"۔ شعرا کی فرہنگ میں۔ خط بمعنی سبزۂ خط۔ آغازِ ریش و بروت۔ خد بمعنی رخسارِ محبوب۔ خال بمعنی تل۔ مگر ان میں ہر ایک لفظ اور اس کا مفہوم قوتِ متخیلہ کی گرفت سے چھوٹ کر حقائق الاشیا کی حد میں بھی داخل ہوتا ہے۔ چنانچہ نثر میں عموماً "خد و خال" اور "خط و خال" نشانِ معروف یا ابھرے ہوئے نشانات کے معنی بھی دیتا ہے اور انگریزی کے بالمقابل الفاظ Striking features کا ترجمہ کرکے بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں خد کا مفہوم گویا محبوب کے چہرہ کی روشن اور گلگوں جلد کی حد سے گزر کر۔ ہر ایک چہرہ کی ہڈی تک پہنچتا ہے۔ غالباً یہ معنی سائنس کی اس شاخ کے تقاضہ سے ایجاد ہوئے ہیں جو Anthropology یا نسلِ انسانی کا پتا لگانے کا علم کہتے ہیں۔ ہر فرد کو بجائے خود معرف کرتے ہیں تو یہی رخسار کی ہڈی نسل و قومیت کا پتا لگانے میں بہت بڑا نشان معرّف ہے۔ جہاں ہاتھ پیروں کی انگلیوں کے اور ہتیلیوں کے بعض مخطط حصوں کے نشانات سے مدد لیتے ہیں، وہاں رخسار کی ہڈی، پیشانی کاسۂ سر وغیرہ کی پیمائش بھی کرتے ہیں۔ مغربی ممالک میں تو اس شاخ کے بہت سے عالم ہوئے

ہیں جنھوں نے اس کی تدوین میں ہزاروں صفحے لکھ ڈالے۔ ہندوستان میں محض اس کے ابتدائی اصول پولیس کے محکمۂ سراغ رسانی میں رائج ہیں۔ مرکزی تعلیم گاہ الہ آباد اور فلور میں ہے جہاں اس شاخ علم کے بعض آلات اور مکمل جریدہ بھی موجود ہے۔ اس کی مدد سے عادی جرائم پیشہ افراد کا پتا جلد مل جاتا ہے۔ خد کی طرح "خط" بھی حسن و عشق کے کوچے سے نکل کر دنیائے حقائق میں داخل ہوا ہے۔ اور مصوروں اور نقاشوں کی عنایت سے "نشانِ معروف" کے معنی دیتا ہے۔ تصویر خصوصاً چہرہ کی تصویر کھینچنے میں اول خطوط حد بند کھینچتے ہیں۔ یہ آوٹ لائنز کہلاتے ہیں فیچرز یا نشانات معروف ان ہی خطوط کے ابھارنے اور جوف و خلا کے بھرنے سے قائم ہوتے ہیں۔ تصویر اسی سے پہچانی جاتی ہے۔ اور مصور کا کمال بھی اوٹ لائنز اور فیچرز میں یعنی پہلے ہی قلم میں صحیح خطوطِ حد بند کھینچکر چہرہ کے نشانات معروف قائم کر لینے میں دیکھا جاتا ہے خد کی طرح خال بھی اسبابِ حسن کی فہرست سے نکل کر جریدۂ حقائق میں داخل ہوتا ہے تل بھی بہت بڑا نشانِ معروف ہے اور انفرادی تعریف و تعین میں معتدبہ مدد دیتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر جب کسی کا معائنہ کرکے سارٹیفکٹ دیتا ہے تو اُس شخص کو معرّف کرنے کے لئے اُس کے چہرہ یا نمایاں حصۂ جسم کے بعض اُبھرے ہوئے خط و خال یا نشاناتِ معروف لے کر سارٹیفکیٹ میں درج کرتا ہے۔ ان سب میں جسم کے حصۂ اعلیٰ کے کسی مقام پر اگر کوئی نمایاں تل یا مسا مل جائے تو ضرور درج کیا جاتا ہے۔ بہرحال خد یا رخسار کی ہڈی ہو یا اُس کے نورانی جلد کے اوپر کا حسن افزا خال ہو یا وہ خطوط ہوں out lines جن سے چہرہ کی قطع برید معرف ہوتی ہے، یہ سب نشانات معروف ہیں اور اس قدر مستقل کہ چہرہ سوکھ کر اچور ہو جائے یا کسی وجہ سے پھول جائے یا جلد سیاہ پڑجائے مگر یہ نشانات کبھی نہیں مٹتے۔ اس لئے دنیائے حقائق میں "خد و خال" اور "خط و خال" ایک سے معنی دیتے ہیں۔ بلکہ اگر وہ تعلید کنہ جو ادبی غلامی کی حد سے بھی گزر گئی ہے چھوڑ دی جائے اور موزونیت کے ساتھ توسیع زبان کی ضرورت ہی کو پیش نظر رکھ لیں تو اساتذہ کی سند کا دامن پکڑنا فریضہ نہیں رہتا۔ شعرا بھی دونوں مرکب کو کلام میں باندھ سکتے

ہیں۔ خط و خال میں تو باہم دُور کی نسبت ہے۔ خد و خال میں باہم قریبی نسبت ہے۔ اس لئے کہ چہرہ پر عارضِ رُخ سے موزوں تر مقام خال کے لئے ہو نہیں سکتا۔ خال کے ساتھ خط کو باندھنا ایسی ہی اٹل بے جوڑ ترکیب ہے جیسے ہر موئے تن کو زبانِ شکر بنانا۔ یا رونگٹے رونگٹے سے دعائی زبان کھولنا۔ شکر اور دعا اعلیٰ اور بہترین جذبات ہیں اور جذبات کا مبدا قلب ہے اس لئے اِن جذبات کے وفور کو موئے تن جیسے فضولِ جسم سے ثابت کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا " ہر ذرّۂ دل" یا "ریشۂ دل" یا " دل کے ذرّہ ذرّہ" یا " ریشہ ریشہ" کو وفورِ تشکر کی شہادت میں پیش کرنا زیادہ موزوں ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ معاصرین اس مسئلے کی نسبت اپنی اپنی رائے اسی بے تکلفی سے ظاہر کریں گے۔

جمع الجمع اس سلسلہ میں بعض اور الفاظ کا استعمال بھی متنازعہ فیہ ہے۔ مثلاً جمع الجمع قواعد میں اگرچہ یہ جائز ہے مگر چونکہ بعض الفاظ۔ مثلاً " انبیاؤں اولیاؤں عامیانہ طبقے میں پھیل کر ادب میں داخل ہو گئے تھے اور چند سخنوروں نے انھیں بجنسہ کلام میں باندھ لیا تھا اس لئے قواعدِ اردو کے مدوّنوں کو بجز اس کے چارہ نہ رہا کہ تواریخ محل کی طرح جمع الجمع کا ایک قالب بھی گھڑ دیں۔ پھر بھی باذاق اصحاب اور مسلّمہ و مستند ادیبوں کی اغلاط کو اس قالب میں پناہ نہیں مل سکتی۔

احیائے علوم رینائسنس جس کے لئے اُردو میں ابھی تک کوئی لفظ معین اور مروج نہیں ہوا۔ ......

غیر زبان کے الفاظ کا ترجمہ کرنے کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اول کسی لفظ کا مفہوم ذہن نشین کرلیں اور پھر اپنے ذخیرۂ الفاظ میں ہم معنی لفظ تلاش کریں۔ بسا اوقات غیر لفظ کی سرگزشت کا غائر نظر سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے تب اس کا صحیح مفہوم دل نشین ہوتا ہے۔ رینائسنس بھی ایسا ہی لفظ ہے۔ یورپ کی تاریخ ادبیات پڑھنے سے واضح ہوگا کہ اس خطہ کے بزم علوم و فنون میں

کم و بیش پندرھویں صدی سے اختتام سولھویں صدی تک تقریباً ڈیڑھ دو سو برس ایک انقلاب عظیم برپا رہا جس نے علمی اصول اور ادبی مسلمات کو تہ و بالا کردیا۔ یہ وہ دَور تھا جب کہ یورپ کے چپہ چپہ سے مستشرق سربلند ہوکر علوم و فنونِ مشرقیہ کو جلد جلد اپنی مروجہ زبانوں میں منتقل کر رہے تھے۔ پھر ایک اور جماعت ترقی کی دل دادہ اٹھی۔ اس نے ان تراجم سے جدید اصول مستخرج کرنے کے لئے شرقی ذخائر کا نکتہ چیں نگاہوں سے معائنہ کیا۔ مثلاً جالینوس کے قائم کئے ہوئے کلیات اور اصول کی تصدیق عملی تشریحات سے کی۔ اس دَورنے زمانۂ مابعد میں علماء و فضلا کی وہ جماعت تیار کی جو تہذیب انسانی کی ترقی کا سررشتہ ہے جس کو مسلمانوں نے یونانیوں اور رومیوں سے لیا تھا اُس کو اب مسلمانوں سے آگے لے کر چلی اور آج تک چلی آرہی ہے۔

یہی وہ متوجی حرکت ہے جسے رینائسنس سے موسوم کرتے ہیں۔ اہل مغرب میں اسی نے علوم صحیحہ کو زندہ کرکے جدید تحقیق و تدقیق کا ذوق پیدا کیا۔ اگر اس لفظ کا ترجمہ "احیائے علوم" سے کیا جائے تو جب تک کسی بہتر لفظ سے کان اور دماغ آشنا ہوں یہ ترجمہ ناموزوں نہ ہوگا۔

(اڈیٹر)

تاریخ المستشرقین

مسلمانوں نے جو کچھ علوم و حکمت رومیوں اور یونانیوں سے سئے چاہے انھیں ذرّہ سے آفتاب یا آفتاب سے ذرّہ کرکے دنیا کو دکھایا ہو، اس سے کچھ بحث نہیں۔ بحث صرف اتنی سی ہی کہ جس فیاضی اور روشن ضمیری سے مسلمانوں نے اپنی متقدم قوموں کے علمی احسانات کو تسلیم کیا، اُس سے کہیں زیادہ غلو کے ساتھ اہل مغرب اُن کی علمی ترقیات پر پردہ ڈالتے ہیں اور دَور جدید کے ہر شعبۂ علمیہ کو چاہے وہ طبیعہ سے متعلق ہو یا مابعد الطبیعیہ سے ازاول تا آخر، اپنی ہی انفرادی اور اجتماعی جد وجہد کا نتیجہ باور کراتے ہیں۔ کسی انگریزی کی تاریخ التعلیم کو اُٹھا کر دیکھئے۔ اگر دو مجلد ہیں تو دونوں میں اور چار ہیں تو چاروں میں اپنے آپ ہی کو فن تعلیم کے تمام شعبوں کا اور علوم و معارف کا سرچشمہ ثابت کرتے ہیں۔ اہل مشرق کا مفصل کارنامہ تو کجا جہاں اُس کا اجمالی حوالہ دینا سلسلۂ بیان میں ناگزیر ہو جاتا ہے وہاں بھی چند سطور میں اس طرح عجلت سے ذکر کرتے ہیں کہ گویا صبح کی گلگشت میں اتفاقاً خس و خاشاک کا انبار سدراہ ہوگیا اور یہ اسے تیز قدمی سے طے کرکے دو منٹ میں ادھر سے اُدھر پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ ابن رشد قرشی اندلسی نے فلسفے میں دَور بدل دیا تھا۔ مگر اس غریب کا سرسری حوالہ نہایت ہوشیاری اور پردہ داری سے دیا جاتا ہے۔ جالینوس کے احسانات تو کسی قدر تسلیم ہیں اس لئے کہ لصابیس نامی ایک عالم تشریحات نے بلجیم میں اس فن میں جدید کلیات عملیات کی بنا پر قائم کئے تھے مگر بوعلی سینا کی دماغ سوزیوں کا ذکر تک نہیں۔ ہم تو ان تصانیف کو پڑھنے کے بعد بسہولت نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ یہ "تاریخ التعلیم" تو ہے مگر "فی المغارب" ہے۔ پہلا حصہ "فی المشارق" ابھی نہیں لکھا گیا ہے۔ یہ دوسرا حصہ بھی چاہے اس کی دس مجلدہوں بالکل ناقص ہے علمی ترقیات کو تسلسل

کے ساتھ نہیں دکھایا گیا اور مغالطوں سے پاک نہیں اس لئے مستند بھی نہیں یہ کیا کم عیب ہو کہ
ساری کتاب میں ایک باب بھی ایسا نہیں جس سے تاریخی پیرائے میں یہ معلوم ہو کہ اہل مشرق
کی علمی ترقی کا سلسلہ کہاں تک پہنچنے پایا تھا کہ کوس رحلت بج گیا اور قافلہ آخری منزل کی
کائنات دوسروں کے سپرد کرکے چل لیا۔ مورخ کی شان یہ ہو کہ اگر ایران میں اسلامی تہذیب
تمدن کی یا حکومت اور سیاست کی تاریخ لکھے تو شروع میں ساسانیوں کے دور تہذیب کے
نشانات معروف بھی اجمالاً دکھلائے یا اسلامی لشکر ہی کی قوت بازو کی جانب ساری فتح و نصرت
کو منسوب نہ کرے بلکہ پارسیوں کی ملک داری اور حکومت نے یزدجرد تک، تنزل کے جتنے
مدارج طے کئے تھے انھیں بھی دکھلائے۔

بہرحال اس قسم کی 'تاریخ التعلیم' پڑھنے سے اصلیت کا پتا نہیں چلتا۔ اصلی راز ہمیں
اچھی طرح معلوم ہو۔ وہ یہ ہو کہ مغرب کے ہر ایک عالم نے جس خاص شعبۂ علمیہ کو جدید ترین پیرایہ
میں دنیا کے روبرو پیش کیا وہ کلیتۂ ہرگز اس کے دل و دماغ سے اُبل کر نہیں نکلا۔ بلکہ ہمارے
علمائے مشرق کی تصانیف کے تراجم کا مطالعہ کرکے اُسے تحریک ہوئی اور اس نے قدیم اور جدید
مسلمات کو ملاکر بغیر اس کے کہ قدما کے قائم کردہ اصول کا حوالہ دے اپنی طرف سے ایک
جدید تصنیف پیش کردی۔ آج اُردو لٹریچر کے اکثر اصناف میں یہی عمل ہو رہا ہو جس طرح آج
اُردو داں پبلک کو پتا نہیں چلتا اسی طرح اُس وقت بلکہ اب تک عربی و فارسی سے ناواقف
یورپین پبلک کو پتا نہ ملا کہ جدید تصنیف میں خود مصنف کے دماغ کا کتنا حصہ ہو اور وہ فن یا
شعبہ کلیتۂ اُسی کی جانب منسوب ہو گیا۔

اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہو کہ مغرب کے محققوں نے محض اپنے بل پر میدان نہیں لیا۔ بلکہ ایک
اور زبردست جماعت نے بھی ان کے پہلو بہ پہلو زور آزمائی کی ہو یعنی مستشرقین انھوں نے
السنۂ مشرقیہ کا ٹھوس علم حاصل کرکے۔ مشرقی ذخائر علمیہ کے ترجمے کئے۔ پھر جدید تحقیق کی دلدادہ
جماعت نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق خاص خاص شعبہ ہائے علمیہ کے ترجمے منتخب کرلئے اور

اہل مشرق سے علمی ترقی کا سلسلہ لے کر آگے چلے۔ انگریزی میں اب تک کوئی مکمل تاریخ المستشرقین نہیں لکھی گئی جس سے تفصیل کے ساتھ یہ معلوم ہو سکے کہ علمائے مغرب میں سے کس کس نے کس مشرقی کتاب کا ترجمہ کب کب، کس زبان میں کیا۔ کہتے ہیں کہ مصر سے ایک تاریخ المستشرقین شائع ہوئی ہے۔ مگر جو حضرات اُس سے مستفید ہو سکتے ہیں ان کی تعداد یہاں زیادہ نہیں۔ اصلی جماعت وہ ہے جو جدید تعلیم سے مرعوب ہو کر اہل مغرب کے حق میں فیصلہ کر چکی ہے اور اپنے عقائد کو طوعاً کرہاً اوروں سے بھی منوانا چاہتی ہے۔

اس موقعے پر عمر خیام کی تصانیف کا اجمالی تذکرہ کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ یہ شخص آجکل مغرب میں منظر عام پر بھی ہے اور مطالعہ کتب کے سلسلہ میں اتفاقاً اسی کی تصانیف کے متعلق کچھ مواد بھی جمع ہو گیا ہے۔ جو ریسرچ (علمی تحقیق و تدقیق) شروع کرنے میں کسی قدر مدد دیگا۔

عمر خیام نام غیاث الدین ابوالفتح عمر بن الخیامی نیشاپوری عصر ۵۱۷ھ مطابق ۱۱۲۳ء

ہمعصر ۔ ملک شاہ سلجوقی الب ارسلان۔ حسن بن علی نظام الملک وزیر

" حسن بن صباح بانیٔ فرقہ باطنیہ

" امام موفق نیشاپوری

رباعیات، مسائل جبر والمقابلہ پر ایک مبسوط رسالہ۔ اقلیدس کی حدود و تعریفات پر تنقید۔ زائچہ ملک شاہی۔ علوم الطبیعیہ پر ایک رسالہ۔ الکون والتکلیف۔ الوجود۔ میزان الحکم۔ لوازم الامکنہ۔ ہندوؤں کے قاعدہ مربع و مکعب روٹ کی صحت پر ایک رسالہ

عمر خیام کے مورخ اور تذکرہ نویس:۔

۱. حبیب السیر جلد ۲ جز ۲ صفحہ ۶۹

۲. تاریخ دولت شاہ سمرقندی " ۱۳۸

	صفحہ
ہفت اقلیم	۲۲۲
تذکرۂ تقی اوحدی	۲۱۲
ریاض الشعرا	۱۲۵
مجمع الفصحا جلدا	۲۰۰
مجمع النفائس جلدا	۱۳۱
مخزن الغرائب جلدا	۲۳۹
صحف ابراہیم / حاجی خلیفہ جلد۳ ..	۲۸۸

مشرقی

(فرانسیسی) ماہوار رسالہ - سی ڈی ساسی جلد ۹ صفحہ ۱۴۳
ہائیڈ وی لی رم ۱۷۰۰ء " ۴۹۸
(انگریزی) ترجمہ تاریخ حاجی خلیفہ ۵۷۰
" مقدمہ - ترجمہ رباعیات ازفیکفیلڈ
رسالہ نیشنل ریویو ستمبر ۱۸۹۰ء
رسالہ ڈی گڈس ۱۸۹۱ء جلد ۳ صفحہ ۵۰۴
تبصرہ از آرتھر کرسٹن سن
کےٹے لاگ مرتبہ ریو صفحہ ۵۴۶
" اتھی ۵۲۴ء - ۵۲۵
" انڈیا آفس ۹۰۶ء - ۹۰۷
" سپرنگر روڈ صفحہ ۴۶۴
ڈبلیو برٹش - گوتھا صفحہ ۲۵
ڈبلیو برٹش - برلن صفحہ ۸۶
جی فلوجل جلد - صفحہ ۴۹۶
ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۵۴۸ء
ایشیاٹک جرنل سلسلہ پنجم جلد ۹ صفحہ ۵۴۸

مغربی

تراجم رباعیات

ملک کے اکثر مرکزی کتب خانے بھی ریسرچ کے ذرائع سے خالی ہیں اس لئے موجودہ حالت میں پتا نہیں چلتا کہ عمر خیام کی تصانیف مندرجۂ بالا میں سے کس کا کب کس نے یورپ کی کسی زبان میں ترجمہ کیا جبر والمقابلہ کا ترجمہ فرانس میں ۱۸۵۱ء میں شائع ہوا مگر پھر یہ معلوم نہیں کہ ریاضی کی اس زبردست شاخ پر اس سن کے قریب کس فرانسیسی عالم نے جدید تحقیق کے پیرائے میں پبلک کے روبرو اپنی تصنیف پیش کی بغیر اس کے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ عمر خیام کے دماغ سے فرانس کے ریاضی دالوں نے کیا استفادہ کیا۔ اور اس شاخ علم کو لے کر وہ کیوں کر آگے چلے۔

البتہ رباعیات کے ترجمے بکثرت ہوئے اور بار بار ہوئے۔ ہر بار نئی شان سے ہوئے۔ یورپ میں استشراق کا پورا آغاز ہندوستان سے تعلق ہونے پر ہوا۔ چنانچہ (شاید) اول مرتبہ رباعیات اور ترجمہ انگریزی کلکتہ سے ۱۲۵۲ھ میں شائع ہوئیں جسے آج ۸۰ - ۹۰ برس ہوئے۔ پھر ۱۸۵۹ء میں فٹز جیرالڈ نے صرف ترجمہ بلا اصل رباعیات لندن سے شائع کیا۔ پھر مشن پریس مدراس سے ایک ترجمہ مع اصل ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ پھر جی بی نکولس کا ترجمہ فرانسیسی مع اصل پیرس سے ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔ ایچ بلاکمین کی ۶۰ چیدہ رباعیات مع ترجمہ معلوم نہیں کب لندن سے شائع ہوئیں۔ اس میں تبصرہ اور مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس کے بعد ۱۸۶۸ء و ۱۸۷۲ء۔ ۱۸۷۹ء ۱۸۹۰ء میں مزید انگریزی تراجم لندن سے نکلے۔ ای ایچ ون فیلڈ نے ۱۸۸۲ء میں اور ای ہیرن ایلن نے ۱۸۹۸ء میں اپنے اپنے ترجمے شائع کئے۔ عمر خیام جیسے مے پرستوں کی قلقل مینا ایک آواز بازگشت تھی جس سے انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے تمام یورپ گونج اٹھا۔ سنٹ پیٹرز برگ اور اپسالا کی یونیورسٹیوں نے بھی تراجم شائع کئے جن کے قلمبند کرنے سے اس وقت معذور ہوں۔ جرمن میں لندن سے تراجم شائع ہوئے۔ مثلاً جے لزلی، گارنر، ملواکی، میکارتلی نے ۱۸۵۹ء میں۔ اے ایف سٹاک نے اصل رباعیات مع ترجمہ منظوم ۱۸۷۸ء میں سینٹ گارٹ سے شائع کیا۔ جرمنی کے مشہور شاعر بوڈن سٹڈ کو نثر و نظم کے ترجموں سے تسلی نہ ہوئی تو اس نے اپنا ترجمہ برسیلا سے ۱۸۸۲ء میں شائع کیا۔

ان تراجم نے مغرب کی بزم شعر و سخن میں کیا انقلاب پیدا کیا، ایک بہت بڑے مجلد کا مضمون ہے جس کا ذہنی نقشہ کھینچنے سے پہلے ہی میں اپنے محدود اور ناکافی مطالعہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر اساتذۂ مشرق کے خیالات سے مستفید نہ ہوتے تو شعرائے مغرب کا کلام نزاکت سے خالی ہوتا۔

(باقی)

(ایک تصویر دیکھکر)

حسنِ غم نواز

دل کی سلطنت میں آہ! انقلاب ہو گیا
تیرا حسنِ غم نواز بے حجاب ہو گیا

آسماں کی سمت ہے، ٹکٹکی بندھی ہوئی
ہیں خمارِ یاس میں انکھڑیاں چڑھی ہوئی

غرقِ بحرِ یاس ہے، بے نیازِ ہوش ہے
تیری ہر ادا سے آج احترازِ ہوش ہے

یہ تری جوانیاں اور یہ فسردگی
انتقام صد ہلاک اور پھر یہ سادگی

کچھ بتا تجھے قسم، میری جان کی قسم
اپنے حال کی قسم، اپنی جان کی قسم

کیوں نصیب دشمناں غرقِ بحرِ یاس ہے
کیوں نصیب دشمناں، آج تو اداس ہے

کیوں چڑھی ہیں انکھڑیاں ہوش ہیں اڑے ہوئے
کیوں پڑے ہیں بازوؤں پہ بال یوں کھلے ہوئے

مضمحل ہیں حسن کی کیفیاتِ احمریں
یہ جھلک رہی ہیں رخ پہ کچھ رگیں سی نیلگیں

میرے اضطراب کا کچھ تجھے بھی ہوش ہے
اپنے اجتناب کا کچھ تجھے بھی ہوش ہے

نشۂ شباب کی جب تجھے خبر نہیں
میری بیکسی پہ کیوں پھر تری نظر نہیں

منتقل ہے کس طرف تیرے دل کی کائنات
میں بہت ہوں مضطرب "اک نگاہِ التفات؟"

مینا زبیری مارہروی (علیگ)

پھول

تجھے کیوں فکر ہے اے گُل! دلِ صد چاکِ بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

تمنّا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے، پا بگل بھی ہے
انھیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

تنک بخشی کو استغنا سے پیغامِ خجالت دے
نہ رہ منّت کشِ شبنم، نگوں جام و سبو کر لے

نہیں یہ شانِ خودداری، چمن سے توڑ کر تجھکو
کوئی دستار میں رکھ لے، کوئی زیبِ گلو کر لے

چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اُڑ گئی شبنم
مذاقِ جورِ گلچیں ہو، تو پیدا رنگ و بو کر لے

اگر منظور ہو تجھکو خزاں نا آشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے

اسی میں دیکھ! مضمر ہے کمالِ زندگی تیرا
جو تجھکو زینتِ دامن کوئی آئینہ رو کر لے!

(علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال)

ہمایوں کی شاعری

ہمایوں نے جب سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تو وہ بھی اپنے باپ کے قدم بہ قدم چلا اور سلطنت کی اہم ذمہ داریوں اور سیاسی معاملات کی گوناگوں مصروفیتوں سے جو کچھ وقت اسے ملتا تھا وہ ہمیشہ بزمہائے احباب میں یا مطالعۂ کتب میں صرف کرتا تھا۔ ہمایوں علماء وفضلائ اور شعراوفلاسفہ کی صحبت بے حد پسند کرتا تھا اور اسے علمی مباحث سے ہمیشہ انتہا درجے کی دلچسپی رہی ہے۔

ہمایوں کو شجاعت وجواں مردی، مہر والطاف اور عدل والنصاف کے اوصافِ جلیلہ کے علاوہ حقیقی ادبی مذاق وموزونی طبع اور سوز وگداز سے بھرا ہوا دل اپنے جلیل القدر باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔

مولانا نظام الدین احمدؒ، صاحبِ "طبقاتِ اکبری" ہمایوں کی نسبت تحریر فرماتے ہیں:—

"ذات ملکی صفاتش بکمالاتِ انسانی آراستہ بود و در شجاعت و مردانگی از سلاطینِ آفاق امتیاز داشت و در علم نجوم وریاضی بے بدل بود وشعر نیکو گفتے و در صحبتِ آں مقتدائے جہاں ہمہ فضلا و علما و اکابر می بودند وہمیشہ از اول شب تا صبح بہ صحبت می گزشت و نہایت آداب در مجلس آنحضرت مرعی بود، ہمہ وقت بحث علمی در عہدش رونق پزیر آمد"

ہمایوں کو علم ہئیت ونجوم سے خاص شغف تھا وہ علامہ الیاس اردبیلی کا شاگرد تھا، اس سے یہ فن سیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے آتے تھے اور اس نے کرۂ ارض و کراتِ

عناصر و افلاک مع کواکب مجسم صورت میں بنائے تھے اور اصطرلاب کی بھی اصلاح کی تھی۔
اگرچہ ہمایوں کی متلون مزاجی نے اُسے ہمیشہ گوناگوں مصیبتوں کا شکار بنائے رکھا لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ متواتر استحکام سلطنت اور قیام امن و امان کے لئے حتی الامکان کوشش کرتا رہا۔

ابوالفضل اس کے عہدِ حکومت کی چند خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"جمیع ملازمانِ عتبہ اقبال بلکہ تمام متوطنانِ ممالک محروسہ را بہ سہ قسم منقسم ساخت :-

(۱) اخوان و اقربا و امرا و وزرا و کافہ سپاہیان را کہ اہل دولت گفتند۔

(۲) حکما و علماء و صدور و سادات و مشائخ و قضات و سائر فضلا و حوالی اشراف و اہالی را اہل سعادت خواندند۔

(۳) و ارباب بیوتات و اصحاب حسن صوری و اہل نغمہ و ساز را اہل مراد نام نہادند۔"

اس تقسیم سے معلوم ہوسکتا ہے کہ صاحبانِ علوم و فنون کو ہمایوں نے کیا درجہ عطا کیا تھا اور ان کی کتنی قدر و منزلت کرتا تھا۔

ہمایوں ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا، اس کا اندازِ بیان کچھ ایسا دل پزیر ہے کہ پڑھنے والے اور سننے والے دل پکڑ کر رہ جاتے ہیں، اس کے اشعار میں واقعات کی تصریح، سلاستِ بیان نشستِ الفاظ، بلندیِ خیال اور مضموں آفرینی سب ہی کچھ موجود ہے۔
جذبات و حسیات کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں اُسے کمال حاصل تھا اور ہر خیال کو ایسے لطیف اور پاکیزہ طرز میں ادا کرتا تھا کہ سننے والے کی نظر میں تصویر کھنچ جاتی تھی۔
ہمایوں کی ظرافت و خوش طبعی صرف مجالس احباب اور بزمہائے عیش و طرب ہی تک

محدود نہ تھی بلکہ جب مصائب و آلام کی تاریکیوں نے اُسے ہر طرف سے گھیر لیا اور جب بے کسی اور ناچاری کی دشوار گزار وادیوں نے اپنی خار دار جھاڑیوں میں اس برگشتہ بخت شہریار کے دامن اُلجھائے تو محض یہی اوصاف و خصائل تھے جو اس کے حقیقی غمخوار ثابت ہوئے۔

جب ہر طرف ناامیدیوں کا ہجوم نظر آتا تھا اور جب مایوسیاں اُس کے دل و دماغ کو گھیر لیتی تھیں تو ہمایوں اپنی موزونی طبع کے طفیل درد بھرے الفاظ میں اپنے دلی جذبات کا عکس اُتارا کرتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام درد و حسرت سے بھرا ہوا ہے۔

ہمایوں ایک ادیب و شاعر کی حیثیت سے وہ بلند درجہ رکھتا ہے جو کم سے کم سلاطین مغلیہ میں سوائے اس کے جلیل القدر باپ کے اور کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔

ہمایوں کے کلام کا بیشتر حصّہ اس کے ذاتی حالات سے متعلق ہے اور اس کی زندگی کے ہر پہلو پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

جب ہمایوں نے ۹۴۰ھ میں بہادر شاہ والی گجرات پر فوج کشی کی تو موخر الذکر اس وقت چتوڑ کے محاصرہ میں مشغول تھا، ہمایوں نے سارنگ پور میں قیام کیا اور یہ قطعہ لکھکر بہادر شاہ گجراتی کے پاس بھیجا ؎

اے کہ ہستی غنیم شہر چتور ۔۔۔ کافراں را چہ طور می گیری
بادشاہے رسید بر سر تو ۔۔۔ تو نشستہ چتور می گیری

بہادر شاہ نے جواب میں ذیل کا قطعہ لکھا ؎

من کہ ہستم غنیم شہر چتور ۔۔۔ کافراں را بجور می گیرم
ہر کہ نکند حمایتِ چتور ۔۔۔ تو بہ بیں کش چہ طور می گیرم

۱۵۴۰ء میں ہمایوں کو شیر شاہ سور نے شکست دی اور یہیں سے اس کی مصیبتوں کا دَور شروع ہوا۔ دوست احباب نے منہ موڑ لیا، اعزا و اقربا نے ساتھ چھوڑ دیا، متواتر تین سال تک سندھ کے ریگستانوں میں سرگردان و پریشان پھرتا رہا اور آخر جب کوئی صورت نہ نکل سکی

تو ایران کی طرف رُخ کیا اور شاہ طہماسپ بادشاہِ ایران کو یہ قطعہ تحریر کیا ؎

خسروا عمر لیست تا عنقائے عالی ہمتم | قلۂ قافِ قناعت را نشیمن کردہ است
روزگار سفلہ وگندم نما و جو فروش | طوطیِ طبع مرا قانع بارزن کردہ است
دشمنم شیرست و عمرے پشت برمن کردہ است | جائے از کین عداوت روئے با من کردہ است
التماس از شاہ آں دارم کہ با من آں کند | آنچہ با سلما علی در دشت ارزن کردہ است

شاہ طہماسپ اس مکتوب سے بے حد متاثر ہوا اور جواب میں یہ بیت زیب عنوان کی ؎

ہمائے اوج سعادت بدام ما افتد
اگر ترا گزرے بر مقام ما افتد

ہمایوں نے ۹۵۰ھ میں باغِ جہاں آرا واقع ہرات میں نزول اجلال فرمایا، محمد خاں نے جشن شاہانہ ترتیب دیا، مجلس سماع میں اتفاقاً یہ غزل گائی ؎

مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد | ہمایوں کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

تمام غزل مرصع تھی، جب صابر قاق نے یہ شعر پڑھا ؎

زرنج و راحتِ گیتی مرنجاں دل مشو خرم | کہ آئینِ جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد

تو ہمایوں پر رقت طاری ہوگئی اور قوال کو دل کھول کر انعام دیا۔

جب ہمایوں ایران سے بارہ ہزار سواروں کا دستۂ فوج لے کر واپس ہوا اور کابل فتح کیا تو ذیل کے اشعار کہے اور اپنے قلم سے فتح نامہ کے حاشیہ پر لکھکر بیرم خاں ترکمان کے پاس قندھار کو روانہ کیا ؎

باز فتحے زغیب روئے نمود | کہ دلِ دوستاں از و بکشود
شکر اللہ کہ باز شادانیم | بررخِ یار و دوست خندانیم
روز نوروز بیرم ست امروز | دلِ احباب بے غم ست امروز
ہمہ اسباب عیش آمادہ است | دل بفکرِ وصالت افتادہ است

کہ جمالِ حبیب کے بینم ——— گل ز باغ وصال کے چینم
گوش خرّم شود ز گفتارت ——— دیدہ روشن شود ز دیدارت
در حریم حضور شاد بہم ——— بنشینیم خرّم و بے غم
بعد ازاں فکر کار ہند کنیم ——— عزم تسخیر ملک سند کنیم
ہر دو را بستہ راکشادہ شود ——— ہرچہ خواہیم ازاں زیادہ شود
آنچہ خواہیم از زمان و زمیں ——— گو بدآمیں چو جبرئیل امیں
یا الٰہی مُیَسّرم گرداں ——— دو جہاں را مسخرم گرداں

اور ذیل کی رباعی بھی فی البدیہ کہکر اُس کے حاشیہ پر لکھ بھیجی :

اے آنکہ انیسِ خاطر محزونی ——— چوں طبع لطیف خویشتن موزونی
بے یادِ تو نیستم زمانے ہرگز ——— آیا تو بیادِ منِ محزوں چونی ؟

بیرم خاں ترکمان نے جواب میں یہ رباعی لکھی

اے آنکہ بذاتِ سایۂ بیچونی ——— از ہرچہ ترا وصف کنم افزونی
چوں میدانی کہ بے تو چوں میگزرد ——— چوں می پرسی کہ در فراقم چونی

ہمایوں تمام اصنافِ سخن پر قادر تھا، اس کے دیوان میں قصاید، غزلیات، رباعیات اور قطعات وغیرہ سب ہی موجود ہیں، لیکن غزل اور رباعی کا مردِ میدان تھا۔ مرزا عبدالرحیم خانخانان کہتے ہیں کہ ہمایوں کی اکثر غزلیں ایسی موثر اور دل پزیر ہیں کہ میرے دل میں گھر کر گئیں ہیں اور ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے انھیں کا ورد رکھتا ہوں۔

ہمایون کا مکمل دیوان اکبر کے کتب خانے میں موجود تھا، چند غزلوں کا انتخاب حسب ذیل ہی :

گزشت از دلِ سرگشتہ ناوکِ ستمش ——— نماند بر منِ دلدادہ لذّتِ المش
بقصد کشتنِ عشاق گر کند میلے ——— عجب نباشد از اخلاق و شیوۂ کرمش

کراست زہرۂ قربِ حریمِ حرمت او | کہ جبرئیل امین نیست محرمِ حرمش
اگر بہ پرسش عشاق می نہد قدمے | ہزار جانِ گرامی فدائے ہر قدمش

خوش آنکہ با خیالت عمرے نشستہ بودم | وز شوق سرو قدت از جائے جستہ بودم
عیبم مکن کہ گفتم موئے ترا پریشاں | در شرحِ جعدِ زلفت چوں دل شکستہ بودم
در شرحِ غنچۂ او ہرگز نگفتہ حرفے | لب را دراں حکایت پیوستہ بستہ بودم
حقا کہ چوں ہمایوں درحالِ وصل بیخود | با دوست در حکایت از خویش رستہ بودم

داغِ عشقِ تو بر جبینِ من ست | خاتمِ لعلِ تو نگینِ من ست
تا نشستم چو خاک بر درِ تو | پشتِ بامِ فلک زمینِ من ست
ہر کجا شاہ و شہریارے بود | ایں زماں بندۂ کمینِ من ست
خطِ مشکیں بہ صفحۂ گلفام | آیتِ رحمتِ مبینِ من ست

ذیل کی رباعیاں بھی قابلِ داد ہیں: ؎

اے دل ز حضورِ یار فیروزی کن | در خدمتِ او بصدق دل سوزی کن
ہر شب بخیالِ دوست دل خوش بنشیں | ہر روز بوصلِ یار نوروزی کن

اے آنکہ جہانے تو بعالم علم ست | روزے کہ ستم نہ بینم از تو ستم ست
ہر غم کہ رسد از ستمِ چرخ بدل | مارا چو غمِ عشقِ تو باشد چہ غم ست

ہمایوں کو مطالعۂ کتب کا بہت شوق تھا، اکثر مہمات پر بھی ایک منتخب اور مختصر کتب خانہ اپنے ہمراہ لے جاتا تھا، نظام الملقب بہ بازبہادر اس کے کتب خانہ کا داروغہ تھا۔

شیر شاہ نے قلعۂ دیں پناہ میں انعقادِ مجالسِ عیش ونشاط کے لئے ایک عمارت بنوائی

تھی اس کا نام اس نے 'شیر منڈل' رکھا تھا۔ جب ہمایوں نے دوسری بار سلطنتِ ہند کی باگ سنبھالی تو اس دارالطرب کو دارالکتب میں تبدیل کردیا اور یہی وہ کتب خانہ تھا جس پر ہمایوں نے اپنی جان نثار کردی۔

صاحب تاریخ فرشتہ لکھتے ہیں کہ ایک روز ہمایوں غروبِ آفتاب کے وقت اپنے کتب خانے کی چھت پر مریخ کا مشاہدہ کرنے کے لئے گیا، اترتے وقت اذان کی آواز کانوں میں آئی تعظیماً بیٹھ گیا جب اذان ختم ہوگئی عصا کے سہارے اٹھتا تھا کہ عصا پھسل گیا اور نیچے فرش پر آپڑا اور ۵۱ برس کی عمر میں دارالبقا کو سدھارا۔ مولانا قاسم نے یہ تاریخ کہی

ہمایوں بادشاہِ ملک و معنی — ندارد کس چو او شاہنشہے بود
زبامِ قصر خود افتاد ناگہ — وزاں عمرِ عزیزش رفت بر باد
پئے تاریخِ او کاہی رقم زد — ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

۹۶۲ھ

ہمایوں کا عالی شان مقبرہ مدتوں ایک تعلیم گاہ کی طرح استعمال کیا گیا۔ اس مدرسہ میں عوام کی اعلیٰ تعلیم کے لئے معقول انتظام تھا یہ مدرسہ ۱۵۰ برس تک قائم رہا۔

ابوالفضل کا بیان ہے کہ ہمایوں نے دہلی میں ایک عظیم الشان مدرسہ بنوایا، شیخ حسین بھی مدرسہ کے مدرس تھے۔

علوم و فنون کی قدردانی نے ہمایوں کے عہد کو علماء و فضلا و دیگر مشاہیرِ وقت کی موجودگی سے ممتاز کردیا تھا، شیخ زین الدین وفائی جو بڑے پائے کے ادیب اور شاعر تھے اور چیستان اور معما وغیرہ حل کرنے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے ہمایوں کے خاص مشیروں میں سمجھے جاتے تھے۔ آپ نے ۱۵۳۴ء میں چنار کے قریب وفات پائی اور اس مدرسہ کے احاطہ میں دفن کئے گئے جس کو خود آپ نے قائم کیا تھا اور نیا مدرسہ مولانا مرحوم کی یادگار کے طور پر آگرہ میں جمنا کے کنارے کھولا گیا۔

حامد اللہ افسر

مولانا نادری سمرقندی، شیخ ابوالواحد فارغی، حیدر توتیائی، طاہر خواندی اور خواجہ ایوب بن خواجہ ابوالبرکات جیسے مقتدر و معزز علمائے روزگار نے ہمایوں کے علم دوست دربار کی زیب و زینت کو جس درجہ تک پہنچا دیا تھا وہ دنیا کے بہت کم درباروں کو نصیب ہو سکا ہے ۔

غزل

سرِ اوج فلک پہنچا مگر حیرت ہے حیرت پر
کہ ہر ذرّہ بجائے خود ہے صحرا بام رفعت پر

مری خود رفتگی تا منزلِ مقصد مجھے لائی
کہ تھا عشق و محبت کا مدار آئینِ غفلت پر

ہماری نیستی پر ہیں ہزاروں ہستیاں قائم
پھلی پھولی زراعت دیکھ ہر دانے کی تربت پر

بقدرِ شوق دل کی خواہشیں پوری نہیں ہوتیں
نظر آتے ہیں پتھر بے بسی کے بابِ حاجت پر

مصائب کا محل ہے آشیاں تو غم نہیں اے دل
وہی آرام کا گھر ہے بنا ہو جس کی راحت پر

بدلنا دہر کا اے آرزوے کار آساں ہے
جو غفلت کیش ہیں سمجھیں جہاں کو ایک حالت پر

نمایاں ہوں اگر رنگِ سیہ بختی اُبھرنے دے
میں اک نقشِ محبت ہوں مگر دامانِ ظلمت پر

تماشا گاہِ عالم ہو گیا جلنا نشیمن کا
فلک بگڑا تو دنیا نے نظر کی میری حالت پر

مجھے کیا چارہ گر سے کام نازک طبع ہوں جعفرؔ
گراں ہے منتِ مرہم دلِ مجروحِ الفت پر

جعفر

حسیاتِ آرزو

(غزل)

غم ناگوار اے دلِ درد آشنا نہ ہو — پی اس مزہ سے زہر کہ منھ بد مزا نہ ہو

مجھکو زبانِ حال سے کہنا ہی رازِ عشق — بیٹھوں نہ گر خموش تو مطلب ادا نہ ہو

اُس بت کے دل میں رہ کے سہیں میں نے سختیاں — اور ایسی جا نہ تھی کوئی جس جا خدا نہ ہو

کیا لطفِ دید اُٹھائے وہ مشتاقِ برقِ حسن — دیکھا کرے جو یہ کہ کوئی دیکھتا نہ ہو

ہاں ہاں یہی ہی شانِ حجاب اے کلیم طور — پردے اُٹھیں ہزار مگر سامنا نہ ہو

بے چشم امتیاز نہ ہر شعلہ خو کو چھیڑ — بدلے ہوئے یہ بھیس کوئی دل جلا نہ ہو

طے کر رہا ہوں راہِ عدم لیکے اُلٹی سانس — جانا اُسی طرف ہی جدھر کی ہوا نہ ہو

جو کہہ گئی سکوت میں حسرت بھری نگاہ — سَو سَو زبانیں ہوں تو وہ مطلب ادا نہ ہو

ہی دل کو شوق چوٹ بھی کھانیکی آرزو
ڈر یہ بھی ہی کہ دردِ محبت سوا نہ ہو

آرزو

امام غزالیؒ اور مجدد الف ثانیؒ

مجدد الف ثانی کی طرح امام غزالیؒ بھی اپنے وقت کے مجدد تھے۔ یہ پانچویں صدی کے مجدد تھے۔ اور وہ گیارہویں صدی کے مجدد تھے۔ ان دونوں کے مدارج کا مقابلہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف خیالات کا تطابق مدنظر ہے۔

مرورِ زمانہ ہر چیز میں تغیر پیدا کرتا ہے۔ مسلمان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ رہے۔ پیغمبرِ خدا کے بعد مسلمانوں کے خیالات میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ان سے اسلام ایک نئی صورت میں نمایاں ہوا۔ "بنیادِ ظلم درجہاں اندک بود ہر کہ آمد برآں مزید کرد"۔ اگر ہر قرن میں مصلحانِ دینِ اسلام بدعات کی روک تھام نہ کرتے، تو آج مسلمانوں کی معلوم نہیں کیا حالت ہوتی۔ ان مصلحوں کو مجددِ دینِ محمدی کہنا بجا ہے۔ تمام مجددوں کی فہرست مرتب کرنا کارِ دشوار ہے لیکن میں اپنے مختصر معلومات پر امام غزالیؒ اور شیخ احمد سرہندی (ملقب بہ مجدد الف ثانی) کو مجدد ماننے کے لئے تیار ہوں۔ اور جن معنوں میں ان دونوں کو میں مجدد کہتا ہوں ان کا سمجھنا بہت آسان ہے۔

فلسفۂ یونان کے پڑھنے پڑھانے سے بلادِ اسلام میں دہریت کے پھیلنے کا خطرہ ہوا تو اصلاحِ خیالات کے لئے متکلمین کا ایک گروہ پیدا ہوا، اور متکلمین کے استدلال کے ساتھ مکاشفاتِ اہلِ باطن کے ملنے سے صوفیائے کرام کی ایک جماعت الگ قائم ہوگئی اور پھر اختلافاتِ آرا کی وجہ سے متکلمین کے بہت سے فرقے ہوگئے جن میں زیادہ تر مشہور اشعریہ، ماتریدیہ اور معتزلہ ہیں۔ اس وقت تک علماءِ شیعہ کا کوئی طبقہ جداگانہ نہ تھا۔ صرف اہلِ بیت کے ذریعے سے حدیثوں کے ماننے والے اپنے آپ کو شیعہ کہتے تھے اور بظاہر ان کی تعداد بہت کم تھی۔ بہت

ممکن ہو کہ شیعوں کے فرقے کو باطنیہ کہتے ہوں۔ اہل سنت وجماعت زیادہ تر اشعریہ یا ماتریدیہ تھے۔ معتزلہ کی طرف شیعوں کا رجحان تھا۔ ان تینوں کے سوا ایک فرقہ حنبلیہ کہلاتا تھا جو اپنے آپ کو امام احمد حنبل کے خیالات کا پیرو کہتا تھا اور امور دین میں عقل اور استدلال کی مداخلت پسند نہیں کرتا تھا۔ سب سے بہتر تو حنبلیوں کا فرقہ تھا لیکن ضرورت نے مجبور کر دیا تھا کہ اہل استدلال کو ان پر ترجیح دی جائے اور یہی خیال امام غزالی کا بھی تھا۔ امام صاحب کا مقولہ تھا کہ "عقل بجائے غذا ہے اور مذہب دوا ہے" یعنی بغیر غذا کے دوا جیسی طرح کام نہیں دے سکتی اسی طرح عقل کو معطل کر کے مذہب کی پیروی بھی نہیں ہو سکتی۔ امام غزالی کے زمانے میں علما اور صوفیا اکثر اشعریہ یا ماتریدیہ تھے۔ تصانیف امام غزالی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا رجحان اشاعرہ کی طرف تھا۔ اور معارفِ لدنیہ، مبدا و معاد اور مکتوبات کے پڑھنے سے پتا لگتا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی اشاعرہ پر ماتریدیہ کو ترجیح دیتے تھے۔

متکلمین نے دہریت کو تو روکا تھا، لیکن خود ان کے باہمی اختلافات نے بڑا جھگڑا پیدا کر رکھا تھا۔ بغداد میں تو گویا ان جھگڑوں کا اکھاڑا تھا۔ اُس زمانے میں سلجوقیوں کا اثر خلفائے بغداد پر تھا اور بغداد سے زائد تر نیشاپور میں رونق تھی۔ یہاں ظاہری فسادات کم تھے مگر مجموعی حالت بدتر تھی۔ وجہ یہ کہ الپ ارسلان اور اس کے پسر ملک شاہ کے عہد میں کسی مسلمان کی مجال نہ تھی کہ حنبلیوں کے خلاف زبان ہلائے۔ لیکن علماء کے دلوں میں جو متکلمین کی عظمت تھی اُس پر سلجوقیوں کا اثر بے نتیجہ تھا۔ طبیعتوں میں بڑا اختلاف تھا، ایک عالم کا دوسرے عالم کو کافر کہنا غیر معمولی بات نہ تھی۔ امام غزالی نے اس پرآشوب زمانے میں نہایت مردانگی سے تمام فرقوں سے تلطف قائم رکھنا چاہا اور اختلافِ آرا کو مہتم بالشان نہیں تصور کیا اور شہنشاہ وقت کا ذرا خوف نہیں کیا۔ اور بالآخر شاہ سنجر کو امام صاحب کے علو مرتبہ کا اعتراف کرنا پڑا۔ اسی طرح حضرت مجدد الف ثانی کے عہد میں ہندوؤں کے خیالات کی تقلید ہندوستان کے بااثر لوگ

کرتے تھے، بدعتوں کا بڑا زور تھا اور دیگر بلادِ اسلام میں بھی شرک کا زور تھا، مکاشفات مشائخ کے مقابلہ میں عوام کتاب و سنت سے بے نیاز تھے۔ ان سب پر طرہ یہ تھا کہ ایک عالم کا خیال دوسرے عالم سے متضاد تھا اور صوفیوں کا ایک سلسلہ دوسرے سلسلے سے جدا تھا۔ آپس میں گو یہ لڑتے نہ تھے لیکن علٰحدہ علٰحدہ جماعتیں قائم تھیں۔ مثل امام غزالی کے حضرت مجدد الف ثانی نے بھی سلطان اور ارکین سلطنت پر اپنا اثر ڈالا، مسلمانوں کے اختلافات باہمی کے مٹانے میں اور سنت نبوی کے احیا میں بڑی کوشش کی۔ البتہ شیعوں کے مقابلے میں حضرت مجدد ذرا سخت تھے اور اس کی دو وجہیں تھیں، ایک یہ کہ حضرت مجدد کا انتساب حضرت ابوبکرؓ سے تھا اور بعض شیعہ تبرا کہتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ شاہانِ صفویہ کے عہد میں شیعوں نے اہل سنت و جماعت سے اپنے آپ کو بالکل جدا کر کے اسلام کی قوتِ اتحادی کمزور کرنا چاہی تھی اور حضرت مجدد نے چاہا کہ خلیج نفاق وسیع نہ ہونے پائے ؏

سرِ چشمہ باید گرفتن بہ میل

بہرحال وجوہ سے مجھے بحث نہیں ہے میرا ذاتی خیال امام صاحب کی تصانیف دیکھ کر اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ امام غزالی شیعوں سے اتنا متنفر نہ تھے جتنا کہ مجدد الف ثانی متنفر تھے۔ بہرحال حضرت مجدد کا بس نہ چلا۔ جو ہونا تھا ہوا۔ مسلمانوں کی جماعت متفرق ہو گئی۔ اب یہ کوشش ہونا چاہیئے کہ اس تفریق سے بے للطغیان نہ بڑھیں۔ میرے نزدیک امام غزالی کے خیالات کی تقلید اس بارے میں قرین صواب ہے۔

امام غزالی اور حضرت مجدد میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حضرت مجدد شروع ہی سے مشائخ کے سلسلے میں تھے اور امام غزالی نے اخیر وقت میں ادھر توجہ کی، ورنہ علم ظاہری معقول و منقول کے یہ دونوں منتہی تھے۔ اور یہ دونوں علم باطن رکھنے کے علاوہ متکلم وقت اور مجتہدِ وقت بھی تھے۔ مقلد دونوں تھے، امام غزالی شافعی تھے اور حضرت مجدد حنفی تھے مگر علمائے ہم عصر کے برخلاف ان میں سے ایک بھی تقلید شخصی کو اچھا نہیں جانتا تھا۔

دنیائے اسلام میں امام غزالی کی شہرت مجدد الف ثانی سے زیادہ ہے۔ علاوہ سابقینِ کے
اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ امام غزالی مدرسۂ نظامیہ نیشاپور میں مدرسِ اعظم ہونے کی وجہ سے سیکڑوں
علما کے استاد تھے اور نیشاپور کے علاوہ بھی جہاں کہیں یہ رہے سیکڑوں شاگردان کے حلقۂ درس
میں حاضر رہتے تھے۔ ان شاگردوں کی وجہ سے علما کے گروہ میں امام صاحب نے بڑی شہرت
پائی تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ امام غزالی کے تلامذہ صدیوں تک بلادِ اسلام میں ذی حکومت
رہے اور مجدد صاحب کی وفات کے سو برس کے اندر ہی سلطنتِ اسلامی میں عام ضعف شروع ہوا
اور علما بے اختیار ہو گئے۔ مشائخ کے گروہ میں عوام کی حاضری سے کچھ رونق تھی لیکن سماع سے
پرہیز کرنے کی وجہ سے سلسلۂ مجددیہ کے مشائخ عوام کا مرجع نہ ہو سکتے تھے۔

ہندوستان کے لوگ امام غزالی کے کارناموں سے (یعنی
احیاء العلوم کے ترجمۂ اردو کی اشاعت سے پہلے) لوگ چنداں واقف نہ تھے
سرسیدِ احمد خاں بانیِ مدرسۃ العلوم علی گڑھ بھی قوم کے مصلح تھے۔ ان میں چند باتوں کی کمی ہوتی
تو میں انھیں بھی مجدد مانتا۔ ان پر علماء ہم عصر نے کفر کے فتوے دیئے تو انھوں نے امام غزالی کو
اپنی تائید میں پیش کر کے دکھایا کہ ان پر بھی کفر کے فتوے ہوئے تھے۔ اسی سلسلے میں رسالوں اور
اخباروں کے ذریعے سے امام غزالی کا نام ہندوستان میں مشہور ہوا اگر میری یادداشت غلطی
نہیں کرتی تو احیاء العلوم کے ترجمہ اردو کی اشاعت سے پہلے سرسید نے قوم کو امام صاحب سے
روشناس کیا تھا اور اب احیاء العلوم کے ترجمے نے تو ہر کہ و مہ کو امام صاحب کا شیدا بنا دیا۔
امام صاحب کو عوام بھی سن سنا کر اب ماننے لگے لیکن افسوس یہ ہے کہ امام صاحب کے نام کی
عزت تو سب کرتے ہیں لیکن ناواقفیت کی وجہ سے امام صاحب کے معقولات سے واسطہ نہیں رکھتے
حضرت مجددِ الف ثانی اور امام صاحب کے معتقدات اور حالات باہم مناسبت رکھتے ہیں
ایک سرسری نظر ان پر کرنا چاہیئے۔
نیشاپور کے مدرسۂ بیہقیہ میں امام غزالی کے استاد امام الحرمین نے تعلیم پائی تھی اور

پھر مدرسۂ نظامیہ نیشاپور جب قائم ہوا تو اس میں وہ مدرسِ اعلیٰ ہو گئے تھے۔ اسی مدرسہ میں امام غزالی نے بھی تعلیم پائی اور پھر بغداد میں جاکر بہت سے علماء کی صحبت سے مستفید ہوئے یہ زمانہ علماء کے اختلاف کا تھا ابوالحسن اشعری پر خطبے میں اسی زمانہ میں لعنت بھیجنے کا الپ سلان نے حکم دیا تو امام الحرمین جو ان کے معتقد تھے نیشاپور سے چلے گئے۔ نظام الملک وزیر الپ ارسلانی نیشاپور میں مدرسہ نظامیہ قائم کرکے امام الحرمین کو بلایا۔ امام الحرمین مدرس اعلیٰ ہوئے اور امام غزالی ان کے نائب ہوئے۔ لیکن امام الحرمین کے مرنے پر امام غزالی نے نیشاپور چھوڑ دیا۔ الپ ارسلان کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ سلجوقی باپ سے زیادہ نامور ہوا اور نظام الملک کے اختیارات اس کے عہد میں اور بھی وسیع ہوئے۔ نظام الملک نے چونتیس سال کی عمر میں امام صاحب کو مدرسہ نظامیہ کا مدرس اعظم مقرر کیا اور دربار شاہی میں امام صاحب کا بڑا رسوخ ہوا۔ اُس وقت سیاسیات میں بھی امام صاحب سے مدد لی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں امام صاحب کے خیالات میں تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ سب کے پہلے انھوں نے تقلید کو خیرباد کہا۔ متکلمین کے استدلال سے آپ گھبرائے۔ فلسفہ کے علمِ الہیات کو غیر یقینی سمجھے۔ فرقہ باطنیہ کے عقائد جو از سرتا پا امام وقت کی تقلید پر مبنی تھے غیر یقینی معلوم ہوئے۔ بالآخر آپ نے مشائخ کے ملفوظات اور تصانیف کو دیکھکر تصوف کو پسند کیا اور آخرکار سب چھوڑ چھاڑ ملک شام کی راہ لی۔ یہ حالتیں خود امام صاحب نے اپنی کتاب "منقذ من الضلال" میں لکھی ہیں نیشاپور میں موقع نہ تھا بغداد آزاد خیالی کا مرکز تھا۔ یہیں پر امام غزالی کے خیالات بدلے تھے اور مختلف فرقوں کے میل جول سے یہ تبدیلی پیدا ہوئی تھی۔ بغداد سے آپ نے دفعتاً شام کی راہ لی اور یہ سفر حالتِ بیخودی میں ہوا۔ دمشق میں رہ کر آپ مراقبہ اور مجاہدہ کرتے تھے آپ کے پیر طریقت شیخ ابوعلی فارمدی تھے جو غالباً سلسلۂ نقشبندیہ کے چھٹے درجے میں ہیں۔

شیخ ابوعلی کا سال وفات ۴۷۷ھ اور ابن خلکان نے امام صاحب کا سال وفات ۵۰۵ھ لکھا ہے۔ یہ بات بھی مورخوں نے لکھی ہے کہ نظام الملک و دیگر مشائخ سے زیادہ تر شیخ ابوعلی

فارمدی کی عزت کرتا تھا۔ ابوعلی فارمدی کا زمانۂ وفات ایک کتاب میں ۴۷۷ھ اور ایک میں ۵۱۱ھ درج ہے۔ اگر ۴۷۷ھ صحیح ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ امام غزالی نے طالب علمی کے زمانہ میں شیخ ابوعلی فارمدی سے فقر کی نسبت حاصل کی لیکن اس نسبت کا اثر آخیر وقت میں ظاہر ہوا شام سے بیت المقدس اور پھر وہاں سے حرمین شریفین کی طرف امام صاحب گئے۔ اثناء سفر میں ۴۸۹ھ میں بمقام خلیل حضرت ابراہیم کی مزار پر حاضر ہوکر آپ نے عہد کیا کہ "کسی بادشاہ کے دربار میں نہ جاؤں گا اور نہ کسی بادشاہ کا عطیہ لوں گا" اور یہ بھی عہد کیا کہ کسی سے مناظرہ اور مباحثہ نہ کروں گا۔ احیاء العلوم اسی سفر میں تصنیف ہوئی تھی۔

شاہ سنجر پسر ملک شاہ کے وقت میں امام صاحب پھر مدرسۂ نظامیہ نیشاپور کے مدرس ہوئے۔ لیکن جلد اس سے پھر الگ ہوئے۔ مثل مجدد الف ثانی کے امام صاحب بھی ریاکار علماء و مشائخ کے مخالف تھے۔ اس لئے ان کے دشمن بہت تھے اور کفر کے فتوے امام صاحب کے لئے شائع ہوئے تھے۔ سلطان سنجر بھی آپ سے بدگمان ہوا، لیکن آپ کی تقریر نے اس پر اثر کیا۔

سب کے آخر میں امام صاحب نے فن حدیث کی تکمیل کی اور یہاں بھی حضرت مجدد کے خیالات سے امام صاحب کے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ کہ علم حدیث کا پڑھنا اتباع سنت نبوی کے لئے بہت ضروری ہے اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مجدد الف ثانی کے زمانہ میں علم حدیث کا پڑھنا پڑھانا از سر نو زندہ ہوا۔ اسی طرح امام صاحب نے بھی اپنے آخر زمانہ میں علم حدیث کی ترویج ضروری خیال کی اور بہت سچ ہے کہ بغیر حدیث کی کتابوں کے پڑھے ہوئے اخلاق محمدی کی پیروی پورے طور سے نہیں ہو سکتی۔ امام غزالی کی تاریخ وفات ۱۲ جمادی الثانی ۵۰۵ھ اور حضرت مجدد کا سال وفات ۱۰۳۴ھ۔ دونوں میں تقریباً پانچ صدی کا فرق ہے مثل حضرت مجدد الف ثانی کے امام صاحب کے تصانیف کا ذخیرہ بہت ہے بلکہ حضرت مجدد سے زائد تر ہے۔ اور اس زیادتی کی وجہ امام کا مشغلۂ درس تھا۔ اگر امام غزالی کی طرح حضرت مجدد کو شغل باطنی اخیر عمر میں پیدا ہوتا تو شاید تصانیف حضرت مجدد الف ثانی کی

تعداد تصانیف امام غزالی سے کم نہ ہوتی حضرت مجدد الف ثانی کی تصانیف یورپ میں نہیں گئیں اور امام غزالی کا نام اُن کی تصانیف کی وجہ سے علماء ایشیا سے کم علماء یورپ میں روشن نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ علوم یورپ کو مع شئے زائد جب اہل یورپ کو مسلمانوں نے واپس کیا تو قریب قریب ان میں سے بہت سے علوم پر امام غزالی کی تصانیف تھے اور علماء یورپ نے علوم سیکھنے میں ان کتابوں سے بھی مدد لی۔ ماموں رشید کے بعد ملک شاہ سلجوقی کا زمانہ بھی باعتبار علم ممتاز ہے۔ عمر خیام ہم عصر امام کا تھا۔ نہ صرف امام صاحب کی بلکہ اس زمانہ کی بہت سی علمی کتابیں عربی سے زبان یورپ میں ترجمہ ہوئیں۔ امام صاحب کی نہایت مشہور اور مقبول کتاب احیاء العلوم ہے۔ علماء وقت نے تو اس کے جلانے کا حکم دیا تھا کیوں کہ اس میں نہایت آزادی سے مذہب اسلام پر متکلمانہ فلسفیانہ اور صوفیانہ نظر کی گئی ہے لیکن بالآخر تمام ایشیا اور یورپ میں یہ کتاب مقبول عام ہوئی اس کے تصنیف کا زمانہ وہ تھا کہ امام صاحب ایک کملی پہن کر بغداد سے نکلے تھے اور ترکِ دنیا کا ارادہ کیا تھا لیکن قوم کی حالت تباہ دیکھکر امام صاحب نے پھر اہل دنیا کی طرف توجہ کی اور اس کتاب کے تصنیف کی ضرورت محسوس کی۔

امام صاحب نے نہ صرف اسلام کو فلسفہ کے موافق ثابت کیا بلکہ اُن مسائل فلسفہ کا بطلان ثابت کیا جن کے ساتھ تطابق مسئلہ اسلام کا نہ ہو سکا۔ جب ایک شخص بہت سی کتابیں لکھتا ہے تو کبھی کبھی بعض مضامین باہم متناقض ہو جاتے ہیں۔ فکر انسانی ضرور نہیں کہ یکساں رہے۔ امام غزالی کی تصانیف میں اسی اصول پر کچھ کچھ باتیں متضاد پائی جاتی ہیں مگر بہت کم۔ حضرت مجدد الف ثانی پر بھی ایک وقت وہ آیا تھا کہ اپنی سابق روی انھوں نے تبدیل کی۔ مجدد صاحب جب کوئی رائے بدلتے تھے تو کوشش کرتے تھے کہ سابق روی کی غلطی پورے طور پر مشتہر ہو جائے۔ جب دو رائیں باہم متضاد یا متناقض ہوں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ مصنف نے آخر میں اپنی رائے بدل دی تھی۔

غرض کہ امام غزالی عہدِ سلجوقیہ کے امام (رہبر) تھے اور حضرت مجدد عہد مغلیہ کے۔

ابو الفضائل محمد احسان اللہ

افاداتِ ثاقب

مرے لہو سے اگر ہو کے سُرخرو آئے | ملو تو برگِ حنا میں وفا کی بو آئے
بلا سے درد ہو یا جوشش میں لہو آئے | سُنا کروں جو محبّت کی گفتگو آئے
عجب ہے اُترے دمِ ذبح اُن کی آنکھ میں خوں | کہیں کہاں کی رگیں اور کہاں لہو آئے
شبِ وصال بھی تا صبح مطمئن نہ رہا | ابھی تھی رات کہ پیغامِ آرزو آئے
وصال و ہجر میں چھپتا ہے دل کا حال کہیں | تجھے تو پیاس سوا ہو جلے تو لو آئے
بیانِ برق و تجلّے چھڑا ہے اب سرِ طور | عجب نہیں مرے دل کی بھی گفتگو آئے
کیا سوال تو اس در سے یہ صدا آئی | اُسے جواب ہے جو لے کے آرزو آئے
جہاں میں ہیں سبک بار کب شگفتہ مزاج | چمن کے پھول لئے بارِ رنگ و بو آئے
بھر گئے کہنیوں تک ہاتھ قتل کر کے مجھے | وضو وہ کر کے اُٹھینگے جو بے وضو آئے
مدد دے اتنی تڑپنے میں انقلابِ جہاں | جو میرے دل میں نہاں ہے وہ روبرو آئے
جھلک رہی ہے مرا خون اپنے دامن سے | تمھاری تیغ ہے پھر کیا وفا کی بو آئے
بڑھا بڑھا کے مرا دل لگائیے تلوار | جگہ جفا کی سوا ہو اگر نمو آئے

اُدھر کے پھولوں سے دل ہے بسا ہوا ثاقبؔ
جہاں رہوں میں وہیں بوئے لکھنؤ آئے

میرزا ثاقب قزلباش لکھنوی

روشن اختر فردوس آرامگاہ ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ

یہ خجستہ اختر المخاطب بہ جہان شاہ کے صاحبزادے ہیں اور حضرت نواب قدسیہ بیگم صاحبہ کے بطن سے ۲۴ر بارہ وفات ۱۱۱۴ھ میں غزنی میں پیدا ہوئے۔ یہ زمانہ خلد مکانی محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر شہنشاہ کا ڈھلتی کا تھا۔ خلد مکانی کے بڑے شہزادے خلد منزل ابوالنصر قطب الدین محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ کابل کے صوبے دار تھے۔ ان کی والدہ نواب بائی بیگم راجہ کشمیر کی نواسی اور سید میر کی صاحبزادی تھیں۔ روشن اختر کی بسم اللہ بردادا خلد مکانی کے زمانے میں ہو چکی تھی۔ دادا حضرت خلد منزل کی شہنشاہی میں ہوش سنبھالا۔ جب شاہ عالم بہادر شاہ نے بمقام لاہور ۱۸ محرم ۱۱۲۴ھ میں عالم بالا کی حکومت سنبھالی تو سلطنت کے لئے ان کے چاروں شاہزادوں میں جنگ ہوئی۔ سب سے بڑے شاہزادے محمد معز الدین جہاندار شاہ تھے۔ دوسرے محمد عظیم المخاطب بہ عظیم الشان۔ تیسرے رفیع القدر المخاطب بہ رفیع الشان اور چوتھے خجستہ اختر المخاطب بہ جہان شاہ تھے۔ عظیم الشان چونکہ شاہ عالم کے زمانے میں مدار المہام رہ چکے تھے اور بنگالے کے صوبے دار تھے اس لئے خزانہ بھی خوب پاس تھا۔ تینوں بھائی مل کر منجھلے بھائی سے لڑنے چلے۔ لاہور کے پاس لڑائی ہوئی عظیم الشان کے ہاتھی کے توپ کا گولہ لگا۔ سونڈ اڑ گئی۔ ہاتھی بپھر کے بھاگا اور دریائے راوی میں لے جا ڈوبا۔ عظیم الشان کا بیٹا محمد کریم زندہ گرفتار ہوا اور بڑے چچا جہاندار شاہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ لوٹ میں سب خزانہ آیا۔ تقسیم میں تینوں بھائیوں میں جھگڑا ہوا۔ جہان شاہ میں اور جہاندار میں چلی۔ عین معرکے میں جہاندار شاہ کی محبوبہ لال کنور کا ہاتھی جدا ہوا۔ جہاندار شاہ یار جانی سے جو بچھڑا گھبرا کے بھاگا اور رانیٹوں کے پڑاووں میں جا چھپا۔ اثنائے دار و گیر میں جہان شاہ کے بڑے بیٹے

فرخندہ اختر کے گولا لگا اور جہاں شاہ بہت مضطرب ہوئے۔ امرانے بہت کچھ سمجھایا بجھایا نمانے اور فرمایا کہ میں تو فرخندہ اختر کے لئے سلطنت چاہتا تھا اب مجھے درکار نہیں۔ آخر ایک توپ کا گولہ ان کے بھی لگا اور یہ بھی شہید ہوئے۔ روشن اختر مع اپنے چھوٹے بھائی کے بندیوانوں میں آئے۔ منجھلے شہزادے رفیع الشان نے بھی بہادری سے لڑکر جان دی۔ اور ان کے تین صاحبزادے محمد ابراہیم۔ رفیع الدولہ اور رفیع الدرجات قید ہوکر دلّی میں آئے۔ ذوالفقار خاں کی بدولت جہاندار شاہ کو سلطنت نصیب ہوئی۔ عظیم الشان کا بیٹا فرخ سیر بہار میں تھا۔ نجومیوں نے کہدیا تھا کہ اس سرزمین میں تاج شاہی نصیب ہوگا۔ یہاں سے نہ ہلنا۔ اس لئے یہیں جما رہا۔ جب باپ کی سناؤنی سنی۔ تو چچا سے لڑنے چلا۔ سید حسین علی بہار کے صوبے دار کو اپنے موافق کیا۔ اس کے توسط سے سید عبداللہ خاں صوبے دار الہ آباد کو بھی ہموار کیا۔ یہ دونوں بھائی بھائی تھے اور بارہہ کے صحیح النسب سادات سے تھے۔ جہاندار شاہ کو خبر ہوئی تو اس نے اپنے بڑے بیٹے عزالدین کو جو بیگم کے بطن سے تھا۔ مقابلے پر روانہ کیا۔ لیکن شاہزادہ عالمگیری آنکھیں دیکھے ہوئے تھا باپ کی بے عنوانیوں اور سوتیلی ماں لال کنور کی ریشہ دوانیوں سے تنگ تھا۔ عزالدین نے بددلی سے مقابلہ کیا اور رات کو لشکر چھوڑ چھاڑ بھاگ گیا۔ اور کھجوہ سے آگرہ میں آٹھیرا فرخ سیر کے خوب لوٹ ہاتھ لگی۔ جہاندار شاہ کو جب بیٹے کی ناکامی کی خبر ہوئی تو دلّی سے آگرہ کی طرف بڑھا اور سموگڈھ پر دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ جہاندار شاہ مع عزالدین ذوالفقار خاں کو چھوڑکر دلّی واپس بھاگے۔ فرخ سیر کی فتح ہوئی۔ آصف الدولہ اسد خاں نے جہاندار شاہ کو لال قلعہ کے ترپولیہ میں قید کیا۔ جب فرخ سیر کا کامل عمل دخل ہوگیا تو جہاندار شاہ کے گلے میں تسمہ ڈال کر مار ڈالا گیا۔ فرخ سیر آگرہ کے قریب بروز جمعہ ۲۳ ربیع عید ۱۱۲۴ھ میں تخت نشین ہوا۔ ایک قدیم بیاض میں میں نے ایک غزل تحریر دیکھی جو اس بادشاہ سے منسوب کی گئی تھی۔ لیکن کسی تذکرہ سے یہ پتا نہ چلا یہ بادشاہ شاعر تھا۔ سید عبداللہ خاں صوبے دار الہ آباد کو جلال الدین محمد فرخ سیر نے قطب الملک یار وفادار ظفر جنگ کا خطاب اور ہفت ہزاری

ہفت ہزار سوار دوالیہ وسہ اسپہ کا منصب عطا کیا اور قلمدان وزارت حوالہ کیا سید حسین علی خاں صوبے دار بہار کو امیرالامرا بہادر فیروز جنگ کا خطاب اور ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب مرحمت فرمایا اور میر بخشی کی خدمت پر مامور کیا۔ یہاں سے ان دونوں سیدوں کی اوج سورج شروع ہوتی ہے۔ انھوں نے قوت حاصل کرکے وہ وہ نالائق نمک حرامی کی حرکات کیں کہ جن کی سیاہی کا داغ ان کی سیادت کے ساتھ ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ فرخ سیر ان کے ہاتھوں ایسا تنگ آیا کہ ہر طرح اپنے گلوخلاصی کی کوشش کرنے لگا۔ ان دونوں سید بھائیوں کی ہوس یہ تھی کہ تیموریہ خاندان میں کوئی اولوالعزم بادشاہ نہ ہو۔ جو ہو ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح رہے۔ فرخ سیر جس نے تیئیس برس اپنے پردادا کی سلطنت کے دیکھے تھے۔ وہ بھلا کب اپنی باگ اوروں کے ہاتھ میں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اس سیدھے پن نے۔ ان فتنے کی جڑوں سے مات کھائی بصد ذلت وخواری نو برس کی نام نہاد حکومت کے بعد جان گنوائی۔ فرخ سیر کی تباہی میں اس کے خسر اجیت سنگھ مہاراجہ جودھپور کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ فرخ سیر کے بعد سیدوں نے رفیع الدرجات کو بعد ازاں رفیع الدولہ کو بادشاہ بنایا۔ لیکن یہ دونوں بھائی تھوڑے تھوڑے دنوں بعد چل بسے سید اپنے ڈھب کے شہزادوں کو کونے کونے ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی اوروں کو بھی بادشاہ گری کی چوپٹ ہوئی۔ آگرے میں نیکو سیر کو بادشاہ بنایا گیا۔ دونوں سید بھائی اس فتنے کو دبانے کی طرف لپکے۔ فتح پائی اور لوٹ میں صدیوں کے دفینے پائے۔ نواب ممتاز محل کی قبر کی موتیوں کی چادر جو حضرت شاہ جہاں نے بنوائی تھی اور نورجہاں بیگم کی ایجاد کردہ چوق کا جوڑا اور ایک بیش بہا ٹیکا سید علی حسین کے ہتھے چڑھے ان نمک حراموں نے شاہی خزانوں کو برباد کردیا۔ ہفت کا مال تھا۔ خوب بیدردی سے لٹاتے تھے جب رفیع الدولہ مرگیا تو ان کو اور شہزادے کی ضرورت ہوئی۔ جہان شاہ کا منجھلا میاں شہزادہ روشن اختر سلیم گڈھ کے قلعہ میں قید پڑا تھا۔ حضرت نواب قدسیہ بیگم اپنے بچے کو اپنے پلّو سے تلے، دبائے بیٹھی تھیں اور آنکھوں سے اوجھل ہونے دیتی تھیں۔ یہ بیگم بہت دوراندیش

نیم و فرزانہ تھی۔ ددیا خسر کی حکومت دیکھی تھی۔ پانچ برس خسر کی بھی شاہی دیکھی۔ سات برس سے
جیٹھ اور جیٹھوں کی اولاد کو تخت پہ بیٹھتے اور تختے پہ سوتے دیکھ رہی تھی۔ جب امیروں نے
مرزا روشن اختر سے التماس کی کہ تاج حاضر ہے تو بیگم نے صاف بگڑ کر کہدیا کہ میرے بچے کا سر
سلامت رہے۔ اللہ اسے معاف رکھو۔ جان ہے تو جہان ہے۔ اسے تاج نہیں چاہیئے۔ لیکن جب امیروں
نے بہت منت سماجت کی تو بیگم نے بھی منظور کر لیا۔ کہتے ہیں کہ روشن اختر نے خواب میں حضرت
سلطان جی محبوب الٰہی کو دیکھا کہ سب کو روٹیاں تقسیم کر رہے ہیں۔ ایک طرف روشن اختر بھی
بیٹھے تھے۔ ان کو ایک بھورا دیا۔ ان کی آنکھ کھلی تو انھوں نے اپنی مٹھی میں ایک روٹی کا بھورا
دیکھا اور اس خواب کو ماں سے بیان کیا۔ ماں نے کہا۔ بیٹا یہ ہندوستان کی شہنشاہی ہے جو
تجکو محبوب الٰہی نے دی۔ تو اس بھورے کو کھالے۔ مرزا روشن اختر نے وہ بھورا کھالیا۔ اسی
خواب کی برکت سے ہند کی حکومت ملی۔ غرض ابھی سلیم گڈھ کی سیاہ افق میں یہ رنگیلا ستارہ نہ دمکا
تھا کہ رفیع الدولہ کی شمع حیات معمور ہو کے رہ گئی۔ روشن اختر کے پہنچنے تک گھی کے کپّے کے
لنڈھنے کو بستم بستم کر کے رکھا۔ خالی کی سترہویں کو ۱۱۳۱ھ میں فتحپور سیکری کے پاس موضع
کرواں میں مرزا روشن اختر تخت نشین ہوئے۔ ابوالفتح ناصرالدین محمد شاہ لقب اختیار کیا۔ رنگیلے
کا خطاب دنیا نے دیا۔ سید بھائیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ تین تیموریوں پہ جنو ڈھلوا چکے
تھے۔ بھلا اس سترہ سالہ لڑکے کو کیوں خاطر میں لاتے۔ اندر باہر ان کے اپنے آدمی بھرے پڑے
تھے۔ کسی امیر کی کیا مجال تھی کہ خلاف کر سکے۔ محمد شاہ کے ہر وقت دائیں بائیں کراماً کاتبین
کی طرح تعینات رہتے۔ بادشاہ کی حیثیت قیدی کی سی تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جی کی بات تو
رانیوں سے ترکی میں کر لیتا اور بارہہ کے گنوار منہ دیکھا کرتے۔ نظام الملک آصف جاہ جس کی
بوٹی بوٹی میں بابری نمک بندھا پڑا تھا۔ اس سے بادشاہ کی بے بسی و بےکسی نہ دیکھی گئی اور
اس نے حسین علی خاں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ حسین علی خاں بادشاہ کو مع دیگر درباری امرا کے
ساتھ سے نظام الملک کے مقابلے کے لئے دکن کی طرف چلا اور سید عبداللہ دلی کے انتظام کو

روانہ ہوا۔ فتح پور سے بتیس کوس پر ڈیرے ڈلے۔ بادشاہ حرم سرا میں داخل ہوا۔ اور سید حسین
بادشاہ سے رخصت ہو کر گلال بار کے قریب جب آیا تو میر حیدر خاں کاشغری جو مرزا حیدر فرمانروا
کشمیر مصنف تاریخ رشیدی کی اولاد سے تھا اور جو دل ہی دل میں بادشاہ کی بے حرمتی اور
بے وقری سے کھولتا تھا۔ سید حسین علی سے راہ میں دوچار ہوا۔ پالکی پاس جا ایک عرضی دی سید
پڑھنے میں لگا۔ میر حیدر خاں نے خنجر نکال سید کی آقا کشیوں اور نمک حرامیوں کے گناہوں کو
شہادت کے دامن تلے چھپا دیا۔ اس کی جزا میں سید حسین علی کے عزیزوں نے وہیں اس کے
تکے بوٹی کر ڈالے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہڑبڑ مچ گئی۔ مرزا نصیب کے بیٹے میر محمد امین سعادت
خاں برہان الملک نے دیکھا کہ سادات بارہہ کے بادشاہ کی طرف سے برے ارادے ہیں اور
نرغہ کر رہے ہیں۔ منہ پر چادر ڈال محلسرا میں گھس گیا۔ نواب قدسیہ بیگم ہائیں ہائیں کرتی رہیں
اور بادشاہ کے باہر لے جانے پر مانع ہوئیں۔ لیکن سعادت خاں منت سماجت کر بادشاہ کا ہاتھ پکڑ
باہر لایا۔ اور بادشاہ کو اعتماد الدولہ کے ہاتھی پر سوار کیا اور اپنے آدمیوں کو سمیٹنا شروع
کیا۔ سیدوں نے ہجوم کیا۔ دست بدست لڑائی ہوئی۔ بادشاہ سلامت خود دستِ مبارک سے
تیر پھینکتے جاتے تھے۔ خدا خدا کر کے سیدوں کا دم ٹوٹا اور وہ بھاگے۔ محمد شاہ نے مراجعت کی
سید عبداللہ خاں دلی کے رستے میں تھا جو بھائی کی کڑوی خبر سنی اور اب سمجھا کہ جگ ٹوٹی نرد
ماری گئی۔ بھاگا بھاگ دلی آیا اور لگا چھابے چھابے لڑائی کے مرغ ٹٹولنے جس شہزادے کو
شاہی کی دعوت دیتا وہ نام سے ابکائیاں لیتا۔ آخر سلطان محمد ابراہیم کو جو رفیع القدر کا بیٹا تھا
ٹھوں میں لیا۔ اور اس کٹھ پتلی کو لیکے رن کا سنجوگ کیا۔ حسن پور کے میدان پر محرم میں تیجے کے دن
معرکہ پڑا۔ سیدوں کی کور نمکی آگے آئی۔ منہ کی کھائی۔ سید عبداللہ خاں قید ہوا۔ بادشاہ نے
سیادت کا پاس کر کے اس کی عزت حرمت میں رزمہ برابر کمی نہ کی۔ کیونکہ محمد شاہ نے اللہ سے
عہد کیا تھا کہ اگر ان نمک حراموں پر فتح پائی اور سلطنت مستقل قبضے میں آئی تو کسی سید کے
خون سے خواہ اس نے کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ کیا ہو۔ اپنے ہاتھ لال نہ کروں گا۔ آخر

سید عبداللہ خاں ایک برس قید میں تیر کر اور اپنے کئے پر پچھتا قبر کے کونے میں جا سویا۔ محمد شاہ کا عین عالم جوانی۔ قرنوں کی دولت بھری پڑی۔ کوکب طالع اشرفیوں۔ غریب نواز روپیوں کی کوئی گنتی نہ تھی۔ لاکھوں کروڑوں روپے روز صدقے ستے میں غریب غربا کو ملتے۔ دلی میں اچھی کا پیرا تھا۔ گھر گھر روپے جواہر کی وہ ریل پیل تھی کہ غریب محتاج کانے کو سوں ڈھونڈے نہ ملتا تھا۔ دو روپے کا خدمت گار چاندی کے برتن بیٹی کے جہیز میں دیتا۔ بیلدار نیاں مزدورنیاں تک سوتے میں پیلی اور موتیوں میں سفید نظر آتی تھیں۔ گھر گھر ناچ گانا۔ طبلے اور مردنگ پر تھاپ گلی گلی سے چھم چھم کی آواز آتی تھی۔ لال حویلی کا تو کیا کہنا۔ وہاں رنگیلے پیا براج مان تھے۔ گلاب کیوڑے کی نہریں بہتی۔ عطر کے فوارے چھٹتے۔ جواہرات کا مینہ برستا۔ دیوان عام اور دیوانِ خاص کی سجاوٹیں۔ رنگ محل کی آرائشیں۔ ہندوستان کے مشہور کلاونت وقت وقت کی راگنیاں گاتے۔ محلسرائے میں وہ وہ صورت دار طرحدار حرمیں بادشاہ نے جمع کی تھیں کہ لال قلعہ پرستان کا نمونہ ہو گیا۔ اس زمانے میں بہت سی کتابیں موسیقی پر لکھی گئیں۔ نئے نئے پتر اور بھار جائیں ایجاد ہوئیں۔ کہتے ہیں کہ اٹھارہ دن تک صرف "نیناں گلابی رنگ ہو گئے۔ نیناں کسومی رنگ ہو گئے ایک تو میں راجہ کی بیٹی میں راجہ کی بیٹی دوجے بھئی بدنام۔ نیناں گلابی رنگ ہو گئے"

گایا گیا اور لاکھوں طرح کے نرت کر کر کے کلاونت گاتے اور کتھک بتاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ لال پانی کو بھی منہ لگاتے تھے۔ نماز روزے کی بھی پابند تھے۔ سلطان جی میں بھی حاضری دیتے تھے۔ ان کے زمانے میں شاہ بھیکا روشن الدولہ کے پیر کی بہت سی کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ میر محمد حسن نے پیغمبری کا دعویٰ کیا اور بھوری بھٹیاری کے محلوں میں ان پر آجورہ مقدسہ نامی کتاب اتری اور ایک مذہب بیگوگی ایجاد کیا۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ سے بھی تبرکات آتے تھے اور یہاں سے لاکھوں روپیہ ہر سال وہاں بھیجا جاتا تھا۔ سلطان روم کے سفیر بھی آتے تعظیم تکریم پاتے اور لاکھوں کے رخصتانے لیجاتے۔ لاکھوں کروڑوں روپیہ نذر و نیاز میں خرچ ہو جاتا۔ غرض دن عید رات شبرات تھی۔ بیس برس بھی اس عیش و عشرت میں دلی والوں کو

نصیب نہ ہوئے ہونگے کہ نادری بلا نازل ہوئی۔ اس کے بعد محمد شاہ کوئی دس برس اور جیتا رہا سلطنت کے کاموں میں سستی ہوتی چلی تھی۔ آخر میرانجی کی ستائیسویں کو ۱۱۶۱ھ میں فردوس آرام گاہ ہوئے۔ اور سلطان جی میں حضرت امیر خسرو اور حضرت محبوب الٰہی کے درمیان بڑی بیگم صاحب کے مجر کے قریب آسودہ ہوئے۔ ان کے زمانے میں دلّی میں اردو شاعری کا اچھا خاصا چرچا ہو گیا تھا۔ اکثر امرا شاہی اردو میں کہنے لگے تھے۔ حضرت فردوس آرام گاہ خود بھی فرماتے تھے۔ ان کے یہ اشعار میں نے چمنستان شعرا مولفہ لچھمی نرائن شفیق سے نقل کئے ہیں۔ فردوس آرام گاہ محمد شاہ کا تخلص محمد تھا۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔ میں نے املا حرف بحرف مطابق نسخے کے نقل کی کوشش کی ہے

خوف سے یار کے یاراں آسے لرزاں نہ کرو ‌ ‌ ‌ زلف کا کام نہ لو دل کو پریشاں نہ کرو
سرخ چہرہ نہیں ہے خون کسی کا یارو ‌ ‌ ‌ باندتو باندھ کے اس شوخ کو پہچاں نہ کرو

میں نے یہ دل کی جگری جڑ کے بھیجا ہوں تیری خاطر
اگر پہونچی تمھارے ہاتھ لکھ بھیجو کہ پہونچی ہے

ملاحت ہے تمھارے حسن میں جاوید روز افزوں ‌ ‌ ‌ اگر شوخی کی خو جاوے ہوئے ہر ذرہ عاشق کا
دھوبن کی چھوکری نے کیا ہے قِران آج ‌ ‌ ‌ کپڑوں میں لے گئی ہے میرے تین تھان آج
کھول کر بند قبا مجھ دل کے تیئں غارت کیا ‌ ‌ ‌ کیا حصار قلب دلبر نے کھلے بندوں لیا

ان اشعار میں صنائع بدائع لفظی و معنوی اس زمانے کے رنگ کے مطابق زیادہ نمایاں ہیں
نظام الدولہ ناصر جنگ شہید ابن نظام الملک آصف جاہ کا بھی ایک شعر ایک قدیم بیاض میں نظر پڑا جو ہدیہ ناظرین ہے

روز بد میں کیا کسی سیں ہے رفاقت کی امید ‌ ‌ ‌ جب زوال آتا ہے ٹل جاتا ہے سایہ سا رفیق

ناصر جنگ فارسی میں تو صاحب دیوان ہیں لیکن ان کی اردو گوئی کا کسی تذکرہ نویس نے ذکر نہیں کیا۔

آغا حیدر حسن دہلوی (علیگ)

رباعیاتِ گرامی

(۱)

خونیں جگراں گردشِ تقدیریم — دل سوختگانِ عشوۂ تدبیریم
مجبورکشاکش وجود وعدمیم — فریاد کہ خوابِ مرگ راتعبیریم

(۲)

فریاد کہ عمرم ہمہ برباد آمد — ناکردنی وکردنیم یاد آمد
کارے کہ نکردنی ست کردم چہ کنم — فریاد کہ فریاد بفریاد آمد

گرامی

خاک

(از مولوی عبدالباسط صاحب بی اے (علیگ))

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ارسطو کا قول ہے کہ تمام اشیاء کی ہستی چار عناصر یعنی ہوا، آتش، آب اور خاک پر منحصر ہے گویا آفرینش عالم کا علم انھیں چار عناصر کے علم پر مبنی ہے۔ ہوا کو لیجئے کہ کبھی تو وہ نسیم دل نواز ہے اور کبھی سموم جاں گداز۔ آتش ہے کہ وہ دل افروز اور دشمن سوز ہے۔ آبِ صاف اگر شفاف ہے تو تکدر و اضمحلال کو دل سے دُور کردیتا ہے اور چمنستانِ عالم اُس سے سرسبز و شاداب ہوتا ہے اور اگر کبھی حدِ اعتدال سے تجاوز کرجائے تو خلقت کو طوفانِ بلا میں غرق کردیتا ہے اور کائنات امواج حوادث سے سیلِ فنا میں داخل ہوجاتی ہے۔ لہلہاتی کھیتی کو آنِ واحد میں فنا کردیتا ہے اور مخلوق پکار اٹھتی ہے کہ ع

ابرِ رحمت اس قدر برسا کہ طوفاں ہوگیا

حکیم مطلق نے پانی کی خلقت میں فطرت کا یہ معجزہ دکھایا ہے کہ اس کی ساخت میں اجزائے آتش کو شامل کیا ہے۔ چنانچہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آتش کو آب کی ساخت میں باوجود تضاد بڑا دخل ہے۔ جب انسان اپنے ذاتی تجربہ کے لئے تھوڑی دیر کو آگ سے قربت حاصل کرلیتا ہے تو پسینہ پسینہ ہوجاتا ہے اور اس پر یہ رمز کھل جاتا ہے کہ آگ کس طرح پانی بناتی ہے۔ دوسرے بخارات جو آگ کا ہی ایک جزو پانی کی ہیں ساخت کے لئے رکن اعظم ہیں اور وہی پھر ابر محیط ہوکر بارانِ رحمت ہوتے ہیں۔ گویا کہ پانی مع حرارت بخار کہلاتا ہے اور بخار بغیر حرارت پانی ہوتا ہے۔

چوتھا عنصر خاک ہے جو بظاہر ادنیٰ و ناپاک ہے اور ہر شخص کو اس سے احتراز ہے لیکن اپنی

صفات کے بیان کرنے میں ویسی ہی بے باک ہے چنانچہ زبانِ حال سے اس طرح گویا ہے کہ :-

"میں خاموش بیٹھی ہوئی، ذرّوں، دریاؤں، درختوں اور جانوروں کی زبانوں میں اس طرح شیریں مقال ہوں کہ دنیا میری خوش الحانی پر وجد کرتی ہے اور ہر کہ ومہ گوش بر آواز ہے۔ آفتاب عالمتاب پر یہ نوازش وعنایت کرتی ہوں کہ اپنے ذرّوں کے ذریعے سے اس کے نور کا ظہور زمین پر کرتی ہوں۔ اگر میں اپنے ناچیز ذرّوں کو اس کی درخشاں شعاعوں سے دور کردوں تو وہ سب نور سے بے نور ہو جائیں۔ چنانچہ اہل سائنس جانتے ہیں کہ پروفیسر ٹنڈل صاحب کے تجربات نے ثابت کردیا ہے کہ جو مکان ذرّات سے خالی ہو جاتا ہے وہاں روشنی کا وجود ناممکن ہوتا ہے اور وہاں مشعل آفتاب فوراً گل ہو جاتی ہے۔ یہ سب انسانی مغالطہ ہے کہ یہ نور سب آفتاب کی ذرّہ نوازی کا ظہور ہے۔ ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ یہ میرے ذرات ہی آفتاب نوازی کرتے ہیں اور یہ سب میرا ہی کرشمہ ہے کہ آج آفتاب کی ہستی نمایاں ہے ورنہ ذرّہ کو آفتاب سے اور خاک کو عالم پاک سے کیا نسبت ؟

بہ نظر دقیق غور کرو کہ کائنات عالم کی پرورش میں یہ خاکسار کس قدر دخیل ہے۔ یہ میری ہی ذات ہے جو اپنے خونِ جگر سے شیرِ مادر کی طرح تمام حیوانات، نباتات اور جمادات کو نشو ونما دیتی ہے اور در اصل یہی ان کا سرمایۂ حیات ہے ورنہ سموم جاں سوز، آتش سوزندہ اور آب طوفان خیز ان کو فنا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ کیا میری جاں نوازی کی یہ بیّن دلیل نہیں ؟ یہ صرف میری ہی ہستی ہے جو برّ و بحر اور رطب و یابس کے لئے مایۂ امتیاز ہے اگر میرا دم نہ ہوتا تو سب پانی ہی پانی ہوتا اور یہ جو تہائی مسکونہ حصّۂ زمین بحری جانوروں سے پُر ہوتا اور حضرت انسان کا وجود بھی اگر ہوتا تو کسی مچھلی کے پیٹ میں ہوتا۔

میں بھی موالید ثلاثہ کے لئے مادرِ مشفقہ ہوں ان کی آفرینش کے لئے رحمت کردگار رہوں اور فنا کرنے میں بلائے روزگار رہوں۔ ایک ادنیٰ نباتات کے پودے سے لے کر اعلیٰ اشرف المخلوقات تک سب کے سب از ابتدا تا انتہا میرے محتاج ہیں جس طرح ان کی پیدائش مجھ سے وابستہ ہے اسی طرح

ان کی فنا میں بھی میرا حصہ نمایاں ہے۔ ابتدائے زمانہ سے ایک کیا صدہا عالم کو خاک کا پیوند کر دیا ہزارہا اقوام تہ خاک ہوگئیں۔ کوئی مجھے کہیں سے ایک مٹھی اٹھالے اور اس کے اجزا کی تحلیل کر کے دیکھے تو معلوم ہوگا کہ وہ مشت خاک ہزارہا بلکہ لاتعدو لاتحصیٰ مردہ حیوانات اور انسانوں کے اجزائے پراگندہ سے مرکب ہے۔ بلکہ اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ خود میری ساخت اس مردہ مخلوقات عالم پر منحصر ہے اور میرا سرمایۂ حیات انھیں موالید ثلاثہ کی فنا سے وابستہ ہے۔ اس مشت خاک میں اس قدر ذی روح اور غیر ذی روح موجود ہیں کہ ان کا وجود صرف خُردبین ہی کی آنکھ سے محسوس ہو سکتا ہے ورنہ چشم عریاں تو محض ناتوان و نابینا ہے۔ غرض یہ ہے کہ فنا و بقا میں اپنی آپ ہی نظیر ہوں یہ فخر صرف میری ہی ذات کو ہے کہ صانع قدرت نے میرا ہی پتلا بنا کر اس میں روح پھونکی اور تمام جنات و ملائک پر اس کو فوقیت دی اور اشرف المخلوقات بنایا۔ پھر اس کو وہ عقل عطا فرمائی کہ اس کے ذریعے سے اس نے جو نئی نئی معلومات بہم پہنچائیں اور ایجاد و اختراع کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہ فخر صرف اس خاک کے پتلے کو ہے کہ اس کو تمام اشیائے عالم کے ناموں سے خبر دی گئی۔ حتیٰ کہ ملائک بھی جو مقرب بارگاہ الٰہی تھے ان سے ناواقف تھے۔ خداوند عالم نے مجھے یہ عزت عطا فرمائی کہ تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ میرے سامنے سربسجود ہو کر میری تعظیم کریں۔ لیکن ابلیس نے میری قدر کو نہ پہچانا اور اپنے زعم باطل میں آکر علانیہ بکار اٹھا کہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین گویا حضرت آدم کو محض اس وجہ سے حقیر سمجھا کہ ان کا خمیر خاک سے تھا۔ چونکہ اس نے آگ کو خاک پر فوقیت دی اس لئے ہمیشہ کے واسطے مردود کر دیا گیا اور لعنت کا طوق اس کی گردن میں پڑ گیا ؎

تکبر عزازیل را خوار کرد　　بزندانِ لعنت گرفتار کرد

کیا میری بزرگی اور بڑائی کے لئے اس سے بھی زیادہ اور کوئی ثبوت ہو سکتا ہے ؟

یہ سب افتخار کس لئے ہوا ؟ محض میری انکساری اور خاکساری کی بنا پر۔

حضرت انسان کا سب سے بڑا جوہر عبدیت ہے اور وہ ایک بڑی حد تک مجھ سے ہی وابستہ ہے

چنانچہ عابد و زاہد مجھ پر ہی اپنی جبین نیاز رکھکر جبہ سائی کرتا ہے تو درگاہ الہی میں اس کی عبادت و
ریاضت قبول ہوتی ہے۔ ایک جوگی کا جوگ بھی میری ہی ہستی کا پابند ہے۔ وہ مجھکو ہی اپنے چہرے
اور جسم پر مل کر اپنا جوگ ظاہر کرتا ہے۔ ایک فقیر بے نوا اور درویش بے ریا کے لئے میں ہی بستر اور
خواب گاہ ہوں۔ اس کی درویشی کی نمایش بھی میری ہی بدولت ہے۔ رند میکش کو دیکھو تو وہ بھی
میری خاطر کرتا ہے اور اپنی مے نوشی سے قبل مجھے ایک جرعہ دیدیتا ہے اور پھر اپنے لئے اس کو
جائز قرار دے لیتا ہے۔

میری ذات میں صفات متضاد جمع ہیں۔ خاکساری کی یہ حالت کہ ہر کس و ناکس کے پاؤں
پڑتی ہوں اور ہر وقت کی ٹھوکریں کھاتی ہوں۔ نخوت و سرکشی ایسی کہ سب کے سر پر چڑھتی ہوں پھر
خواہ کوئی شاہ ہو یا گدا کسی کا مقدور نہیں کہ اپنے بے بہا تاج زریں سے مجھے ہٹا سکے اگر وہ
اپنی تمام فوج بھی میری سرکوبی کے لئے مقابلہ کو لے آئے تو بھی مجھے شکست نہیں دے سکتا۔ بلکہ
اس وقت میں ضد میں خوب ہی پاؤں پھیلا دیتی ہوں اور اس کے تمام جسم کو جا لپٹتی ہوں
آرام اور میٹھی نیند میں مدتوں ایک جگہ پڑی رہتی ہوں۔ اور اگر دل میں آیا تو کبھی تو ہوائی
جہاز پر بیٹھکر آناً فاناً میں اڑ جاتی ہوں اور کبھی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر خراماں خراماں چلتی
ہوں۔ ذرا سی دیر میں آسمان پر بادل کی طرح چھا جاتی ہوں اور خورشید عالمتاب کے چہرے پر
گرد کا نقاب ڈال کر اس کی ساری شیخیت کرکری کر دیتی ہوں اور اس روشنی کو محو کر ڈالتی
ہوں۔ کبھی بحالت غیظ و غضب پیچ و تاب میں آکر آگ بگولا بنجاتی ہوں اور اگر اس وقت
کوئی میرے درمیان میں آکر دخل دیتا ہے تو اس کو ایسا ناچ نچاتی ہوں کہ آخر گر کر فنا ہو جاتا
ہے اور مجھ میں مل کر مجھ جیسا ہی ہو جاتا ہے۔

میں انسان کی خوراک پیدا کرتی ہوں جس کو وہ بڑے بڑے ڈنروں میں آرام سے کھاتا ہے اور
اس کو اس وقت یہ خیال تک بھی نہیں ہوتا کہ ان انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں میں میرا کتنا
حصہ ہے۔ بعض اوقات اس کے اس تجزیت سے موثر ہو کر اس کو ایسا کرکرا کر دیتی ہوں کہ ایک نوالہ

بھی حلق سے نیچے اتارنا مشکل ہو جاتا ہے۔

میں ان کے لئے صرف قوت لایموت ہی نہیں مہیا کرتی بلکہ ان کی رہائش کے لئے عالی شان ایوان و محل اور کوٹھی بنگلوں کی صورت میں بھی نمایاں ہوتی ہوں۔ ایک قصر شاہی سے لے کر ایک فقیر کی جھونپڑی تک سب مکانات میرے وجود کے محتاج ہیں۔ لیکن اپنی تعیشانہ زندگی میں انسان میری ہستی سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے اور میری محافظت کو جو میں دیگر عناصر یعنی آتش۔ آب اور باد سے کرتی ہوں خیال میں بھی نہیں لاتا۔ موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔ طوفان خیز ہوائیں چلتی ہیں۔ حضرت انسان اپنی چین کی نیند سوتے ہیں۔ ان کو خبر تک نہیں ہوتی کہ ان کو ان مصائب سے بچانے کے لئے میں اپنی ہستی کو کس قدر فنا کرتی ہوں۔ لیکن جب عیش کے ساتھ غرور و تکبر شامل ہو جاتا ہے تو تمام مستحکم قلعے اور عظیم الشان محل آن واحد میں سرنگوں ہو جاتے ہیں اور تھوڑے عرصہ میں اس جگہ ایک چٹیل میدان نظر آنے لگتا ہے۔ اہل بصیرت ان انقلابات زمانہ سے اثر پذیر ہو جاتے ہیں اور خاکساری اختیار کرتے ہیں۔

مجھے لوگ حقیر اور ناپاک خیال کرتے ہیں اور اپنے صاف ستھرے کپڑوں کو مجھ سے علیحدہ رکھتے ہیں لیکن در اصل میری ذات اس قدر پاک ہے کہ میں ہر نجاست کو دور کر کے طاہر کر دیتی ہوں اور جہاں غسل اور وضو کے لئے پانی میسر نہیں ہوتا وہاں تیمم کے لئے میرا وجود موجود ہوتا ہے۔ گویا جو کام کہ پانی سے نکلتا ہے وہی ایک مشتِ خاک سے بھی انجام پا سکتا ہے۔ نجاست آلودہ ہاتھ مجھ سے ہی مل کر پاک صاف ہوتے ہیں اور آلات و حاردار تو بغیر میرے پاک ہی نہیں ہو سکتے میں صیقل گر بھی اسی قدر ہوں۔ چنانچہ تمام قلعی گر پہلے مجھ سے ہی مانجھ دھو کر برتن صاف کر لیتے ہیں اس وقت رانگ کی قلعی کارگر ہوتی ہے۔ بدبودار اشیاء کے لئے تریاق ہوں۔ جس نجاستِ غلیظہ پر پرتو فگن ہوتی ہوں اسی کو ہست سے نیست کر دکھاتی ہوں۔

کھاد جو محض بدبودار اور غلیظ چیز ہے جب میرے دامن عافیت میں پناہ گزیں ہوتا ہے تو اس سے بھی وہ رنگ برنگ کے گلزار اور عجیب و غریب نباتات پیدا کر دکھاتی ہوں کہ ہر شخص

حیران و ششدر رہجاتا ہی۔

بڑے بڑے سرکش اور متکبر انسانوں کو نیچا دکھاتی ہوں۔ وہ مجھسے دور بھاگتے ہیں مگر میں بھی ان کے پیچھے ہی پڑجاتی ہوں۔ وہ مجھسے دل میں غبار رکھتے ہیں مگر میں بھی ان سے ایسی کدورت نکالتی ہوں کہ ناک میں دم کردیتی ہوں اور اکثر ناک کے ذریعے سے دماغ تک کی خبر لیتی ہوں۔ کبھی نمناک ہوکر بڑے بڑے عقلا کو زیر کر دیتی ہوں کہ لڑکے تک ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ انجنیروں اور ٹھیکداروں سے سازکرکے شہر کی تمام سڑکوں پر اپنا سکہ جما دیتی ہوں۔ ذرا سا مینہ برسنے کے بعد کیا مجال جو کوئی میرے پاس تک تو آجائے اور اگر کسی نے ہمت بھی کی تو فوراً منھ کی کھائی۔ میں سب کو اپنے ہی رنگ میں رنگ دیتی ہوں۔ بڑے بڑے بادپا موٹر مجھپر سے گزرتے ہیں مگر میں بھی باوجود ان کی تیز رفتاری ان پر ایسا قبضہ کرتی ہوں کہ گھر تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔

میرا اصلی لباس عریانی خاکی ہی مگر موسم کے لحاظ سے میں مختلف رنگ کے جوڑے بدلتی ہوں مجھے سبز رنگ زیادہ محبوب ہی۔ جہاں جولائی کا مہینا آیا اور میں نے آب برسات سے غسل کرکے خاکی جوڑا بدل کر دھانی پوشاک زیب بدن کی۔ طرح طرح کے پھولوں اور سہروں سے آراستہ ہوکر دلھن بنجاتی ہوں۔ چنانچہ اسی زمانہ کے بارے میں مولانا روم فرماتے ہیں ؎

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ
خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

میرے مزاج میں حد سے زیادہ شوخی ہی۔ میں وہ وہ آفتیں برپا کرتی ہوں کہ حضرت انسان کو سوجھتی بھی نہیں۔ اگر چاہوں تو چنگاری کو دباکر نیست کردوں اور اگر چاہوں تو ہوا میں اڑکر سیکڑوں گھروں کو جلاکر ایک خاک کا ڈھیر کردوں۔ آب صافی کو ذرا دیر میں کیچڑ بنا ڈالوں اور شعلوں کو سمجھا بجھاکر خاموش کردوں۔ بڑے بڑے بنکوں اور مہاجنوں کے حساب کتاب منٹوں میں جانچ ڈالتی ہوں۔ بغیر میرے معائنہ کے کوئی حساب بند نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کہیں حساب

میں غلطی ہوئی ہے تو میں ضبط کو کام میں لاکر خاموش ہو جاتی ہوں۔ جاذب کی ایجاد سے قبل میرا معائنہ زیادہ تسلیم کیا جاتا تھا اور مہاجن اب بھی میرے ویسے ہی قدردان ہیں۔

یہ میرا ہی دل گردہ ہے کہ اپنے سینہ پر لاکھوں من بوجھ اُٹھاتی ہوں اور اس کو بذریعۂ ریل ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا دیتی ہوں۔ اپنے بچوں کو مادر مشفق کی طرح اپنے کندھوں پہ لئے پھرتی ہوں اور ذرا نہیں گھبراتی اور اکتاتی۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور علم و ہنر کی ترقی میں ہر طرح ممد و معاون رہتی ہوں۔ میرا شکم زر و جواہر سے پر ہے اور بے مایہ لوگوں کے لئے ذریعۂ معاش ہے۔ ڈاک، تار، ریل، ٹیلیفون۔ غرض یہ سب کرامات میرے ہی دم قدم سے ہیں۔ مگر میرے خلف ایسے ناخلف ہیں کہ مجھکو کبھی خیال میں نہیں لاتے بلکہ نظر حقارت سے دیکھتے ہیں اور یہ سب ایجادیں اپنی ہی عقل و فہم کی طرف منسوب کرتے ہیں اور میری کچھ ہستی ہی نہیں سمجھتے۔ جب حضرت انسان کا اپنے متعلق اس قدر مغالطہ بڑھ گیا تو میں نے ذرا سا جھٹکا چھوڑ دیا یعنی ۳۰ ستمبر ۱۹۲۴ء کو میں اپنے رفیق پانی کے ساتھ بعض مقام پر ریلوے لائن کے نیچے سے نکل کر چلدی۔ بس اسی وقت تمام کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔ تار الگ سرنگوں ہے۔ ڈاک الگ غائب۔ ٹرین ہر جگہ کی بند۔ مجھ بغیر ایک انچ بھی تو آگے نہ چل سکی۔ تمام ملک میں ہلچل پڑ گئی۔ جو جہاں تھا وہیں رہ گیا ہفتوں لوگ بے آب و دانہ درختوں پر بیٹھے رہے۔ غرض زندگی کا تمام پروگرام متغیر ہو گیا اور عقول انسانی رکھی رہ گئیں۔ جو تار ایک گھنٹہ میں پہنچتا تھا وہ ایک ہفتہ میں روانہ ہوا اور جو خط دوسرے روز ملتا تھا وہ ہفتوں بعد موصول ہوا۔ حتیٰ کہ مسلم یونیورسٹی کے بعض طلبا اور اساتذہ بھی میری حراست میں ہفتوں گھر سے باہر قدم نہ نکال سکے اور اسباب باندھے چشم براہ رہے۔

یہ تو میرا ذرا سا شعبدہ تھا تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ میری ذات والا صفات انسانی ضروریات کے لئے کس قدر اہم ہے اور میری ناچیز ہستی کے ایک اقل قلیل جز کی صرف ایک جنبش سے کس قدر زندگی میں تغیرات ہو جاتے ہیں اور مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور تاکہ اسی پر انسان قیاس کرے کہ جب میرے تمام اجزا پریشان ہو جائیں گے اور اذا زلزلت الارض زلزالها کا منظر پیش ہوگا

وہ کس قدر نازک وقت ہوگا۔

یہ امر مسلم ہے کہ ہر ذی روح اور غیر ذی روح آخر خاک میں ملے گا۔ خواہ وہ سرو جیسا سرکش ہو خواہ ہوائی جہاز میں بیٹھکر آسمان سے جاملے۔ لیکن ایک روز میری ہی آغوش میں آئے گا۔ جہاں سوائے میرے اس کا نہ کوئی حامی ہوگا اور نہ مددگار۔ میں ہر شخص کے لئے اس کی موجودہ زندگی کے اختتام پر بھی ایک خوابگاہ تیار رکھتی ہوں جو اس کے لئے ازل سے متعین ہوچکی ہے۔ وہاں وہ ایک معینہ مدت تک میری امانت میں رہے گا۔ پھر ایک وقت ایسا آئے گا جب مجھسے میری امانت واپس لی جائیگی اور مِنْهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ کے قول پر سب نیست سے ہست ہوجائینگے۔

میری سراپا انکساری اور میری فنا و بقا یا تی ہے کہ خاک ہونا۔ خاک میں ملنا۔ خاک کا پیوند ہونا یعنی موجودہ زندگی کو خیرباد کہنا ضروری اور لازمی ہے تو پھر بے فکری۔ تعیش۔ تبختر اور سرکشی کیسی؟ ع

خاک کا پتلا بنا تو خاکساری چاہیئے

لہذا یہ آخری معروض ہے کہ ؎

خاک شو پیش ازاں کہ خاک شوی

خاکسار

عبدالباسط بی اے

افکارِ اصغر

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی | تمام شعبدہ ہائے طلسمِ بے سببی
گزر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی | نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی
یہ زندگی ہے یہی اصلِ علم و حکمت ہے | جمالِ دوست و شبِ ماہ و بادۂ عنبی
فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے | ادا و رسمِ بلالی و طرزِ بولہبی
ہجومِ غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا | کہاں ہے آج تو اے ماہتابِ نیم شبی
سرشتِ عشق طلب بحرِ حسن بے پایاں | حصولِ تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لئے خندہ ہائے زیر لبی!

جذبات

نغمۂ سوزِ جگر میں ساز وہ پیدا کریں — ہم اگر خاموش ہو جائیں تو وہ شکوا کریں

بندۂ مجبورِ فطرت ہیں ہم آخر کیا کریں — دیدنی، نادیدنی جو بات ہو دیکھا کریں

عذرِ لنگ آتا نہیں وارفتگانِ عشق کو — شوقِ بے حد ہیں نہ کیوں حد سے گزر جایا کریں

اپنے دل پر ناز ہے اپنی وفا پر ناز ہے — حسن والوں کی قسم ہم ناز اگر بیجا کریں

دیدۂ مشتاق کا اللہ رے فرطِ اشتیاق — وہ نظر آئیں نہ ہم کو اور ہم دیکھا کریں

توڑ دیں عہدِ وفا آئینِ الفت چھوڑ دیں — جوشِ گریہ! تیری خاطر رازِ دل افشا کریں

اُن کے ذوقِ خود نمائی کی حقیقت کھل گئی — مدعا یہ ہے کہ دیکھیں اور ہم چرچا کریں

کیا اسی جذبے کا نام اہلِ ہوس میں عشق ہے — جب کوئی حسرت نہ پوری ہو سکے شکوا کریں

بیخود ایسے خواب کے قربان سو بیداریاں
وہ جگائیں آکے ہم کو اور ہم سویا کریں

بیخود

زبان اُردو کی ضروریات

(۱)

اشتراکِ عمل

(محمد شبیر احمد متعلم ایم اے۔ ایل ایل بی کلاس و سابق سکریٹری انجمن اُردو الہ آباد یونیورسٹی)

قومے بہ جد و جہد گرفتند وصل دوست
قومے دگر حوالہ بہ تقدیر مے کنند
(سعدیؒ)

اقوام و مللِ انسانی کی علمی و عملی قابلیت ان کی ترقی کا معیار ہے ہندوستان کے اکثر کو رباطن، وطن خواہ گو ترقی کو محض جمہوری حکومت تک محدود خیال کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت کوئی قوم اور اہلِ مُلک اُس وقت تک ترقی کے مدعی نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ مذہبی اور اخلاقی معاشرتی، اور تمدنی حیثیات سے علماً و عملاً مختص بالفضیلت نہ ہوں، گو ترقی کے خمیر کے لیے یہ تمام اجزا اور عناصر لازمی ہیں۔ لیکن کسی قدر غور کرنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عملی ترقی، علمی ترقی کے ماتحت ہے، اور علمی ترقی، عملی ترقی کے وجود کو مستلزم ہے۔ تاریخ اقوام پر ایک تنقیداً نگاہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوم اُس وقت تک حقیقی معنی میں ترقی یافتہ کہلانے کی مستحق نہیں، ہوئی، جب تک کہ علم و عمل میں اس نے ایک امتیازی شان نہیں پیدا کی۔

اس نظریہ کی رو سے کسی قوم کے علم و حکمت اور عمل فقدان، اُس قوم کے فقدانِ وجود کے مرادف ہے۔ اور وجدانِ علم، وجدانِ قومی کے ہم معنی ہے۔ اقوامِ مغرب کے

عظیم الشان ارتقا اور ملل مشرق کے افسوسناک انحطاط کے راز فلسفۂ ترقی کے ان مبادی عالیہ میں پوشیدہ ہیں، اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مغربی ترقی، من حیث المجموع اخلاقی اور مذہبی عناصر کی تفریط کو مدِنظر رکھنے کے ساتھ ترقی کے حقیقی معیار تک نہیں پہنچتی، تاہم اس سے کوئی منکر نہیں ہو سکتا کہ مشرق اپنی عظیم الشان روحانیت کے باوجود بھی عرصۂ ترقی میں "گردِ راہِ کارواں" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا؛ ہم روحانیت کے مدعی ہیں، لیکن جو لوگ اس "رازِ درونِ پردہ" کے حاملِ حقیقت ہیں، ان پر ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کس حد تک صحیح ہے، مجموعی طور پر اہلِ مشرق کی روحانی حیثیت کیا ہے؟ اس کے حامیوں نے عرصۂ ترقی میں کیا کیا کرشمہ پردازیاں کیں اور یہ نازش بیجا کس حد تک جائز ہے۔ وائے بر ما و بر تفخرِ ما۔

مشرق کی مجموعی حالت سے قطع نظر کر کے ہم ہندوستان کی حالت کو دیکھتے ہیں تو بے ساختہ "اے اہلِ ہوش وقتِ گریباں دریدن است" زبان پر آتا ہے غالباً تاریخ اس "بے بادہ بدمستی" کی بہت کم نظائر پیش کر سکتی ہے، جس سے ہم مدہوش ہیں، علمی ترقی میں تو شاید ہی کسی ملک یا قوم نے یہ شانِ استغنا پیدا کی ہو، لیکن متقدمین اور متوسطین سے قطع نظر کر کے بحالتِ موجودہ ہماری علمی حیثیت بھی ہماری اس علمی صلاحیت سے کچھ زیادہ قابلِ وقعت نہیں یہاں پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغرب کے عظیم الشان ذہنی اور علمی ارتقا، اور السنۂ غربیہ کے وسعتِ ترویج کے مقابلے میں ہندوستان کے عبرت انگیز ذہنی اور علمی تنزل اور السنۂ شرقیہ علی الخصوص ہندوستانی زبانوں کے تنگ اور محدود ہو جانے کے اسباب کیا ہیں در آنحالیکہ بیشتر مغربی علوم کی تاسیس محض مشرقی اور ہندوستانی علوم سے ہوئی اس کا جواب یا تو ہمارا وہ طرزِ تغافل اور ہماری وہ خود فراموشی دے سکتے ہیں جن کے ہاتھوں ہم نے اپنے علوم و فنون اور اپنی زبانوں کو زیبِ طاقِ نسیان کرا دیا ہے، یا پھر موجودہ نظامِ تعلیم کے وہ مجددین جن کی ستم ظریفیوں نے پیراہنِ مشرق کے چاک کو رشتۂ مغرب سے رفو کرنے کی جدت طرازی کی، اور جن کی ستم شنفیوں سے بقول اکبر۔

وہ حافظ جو مناسب تھا ایشیا کے لئے
خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کے علمی اور ذہنی فقدان کی ذمہ داری جس قدر خود اُس قوم کے سر عائد ہوتی ہے اس قدر اغیار اُس کے متہم قرار نہیں دیئے جا سکتے، ہندستانی زبانیں اُن حضرات کی مشق خرام کی نذر ہو گئیں جو مغربی خضر طریقت کے نقش کف پا کے پیرو رہے، اور جنہوں نے خدا معلوم کس مذہب اور قانون کی رو سے اپنی قومی بہبودی اور ترقی کو، بہر عنوان، دوسری اقوام کی، کورانہ تقلید، میں مضمر خیال کیا، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ترقی یافتہ اقوام سے کسب علوم و فنون کرنا، جلب منفعت ہے، لیکن اس اکتساب سے اپنی قومی علوم و فنون کی ترقی اور اپنی زبان کی توسیع و ترویج، مراد ہوتی ہے نہ کہ ریزہ چینی گردوں و آتش بہ خرمن داشتن۔

اگر اکتساب و تحصیل کے اس نظریہ کو مدنظر رکھا جائے تو غالباً شیدایان مغرب کو ہندوستانی زبانوں کی تنگ ظرفی کی شکایت کی بجائے اپنی تنگ نگاہی پر ندامت ہوگی۔

قدماء کے جمع کردہ سرمایہ سے قطع نظر کر کے ہندوستانی زبانوں کے مبلغ علم کو اگر دیکھا جائے تو اُردو کی کم مائگی خاص طور پر، تاسف انگیز اور عبرت خیز ہے، علوم متداولہ میں سے کم علوم ایسے ہیں، جن پر اُردو زبان میں مستند اور مبسوط کتابوں کا ایک معتد بہ ذخیرہ موجود ہو۔ اور غالباً ادب اُردو کی تاریخ سے اگر عہد موجودہ کے چند گزشتہ سالوں کی تفریق کر دیجائے تو اُردو کے ادبی سرمائے میں محض چند دواوین، اور قصص و حکایات کی کتب رہجاتی ہیں۔ ایک ایسی وسیع التفہیم زبان کی جس کے خمیر میں قریب قریب ہندوستان کی تمام اور اکثر بیرونی ممالک کی، زبانوں کے اجزائے متبائن الاصل شامل ہیں اور جس کو اُن تمام زبانوں کے خزائن علم سے جن سے اس کی ساخت و پرداخت ہوئی ہے قدرتی طور پر اثر پذیر ہونا چاہیے تھا۔ یہ علمی حیثیت حقیقتاً اُس قوم کے علمی اور ادبی ذوق پر نوحہ خواں

ہے جس کے خیالات کی وہ ترجمان ہے زبان خس وخاشاک کی خودرو نہیں ہوتی، بلکہ تدوین کے لیے اہلِ زبان کی محتاج ہوتی ہے ۔۔ دنیا کی کوئی زبان غیب سے علوم وفنون کے خزائن لے کر عالمِ ظہور میں نہیں آئی، اس کی ترقی علی الدوام اہلِ زبان کے علمی اور ادبی ذوق پر منحصر ہوتی ہے۔

اُردو زبان کی اس کم مائگی اور مفلوک الحالی کا احساس غالباً سب سے پہلے سرسید احمد خاں مرحوم کو ہوا، اس فدائی ملک وملت کی عاقبت اندیش اور دوربین نگاہوں نے اس باریک لیکن قوی رشتۂ تعلق کو دیکھ لیا تھا، جو ارتقاءِ علم ولسان کو ارتقاءِ قومی وملی سے وابستہ کرتا ہے، ان خیالات کی عملی تشکیل، سائنٹفک سوسائٹی کی صورت میں کی گئی، جو سرسید مرحوم کی نقل وحرکت کے مطابق اولاً آ باد غازیپور، اور آخر میں علیگڑھ کی سرزمین پر قائم ہوئی ۔ یہ سوسائٹی مغربی علوم وفنون کی کتب کا دار الترجمہ تھی اور گو اپنے بانی کی عدیم الفرصتی کے باعث اس نے اس قدر کام نہیں کیا جس قدر کہ سرسید احمد خاں کی قایم کردہ ایک انجمن کو کرنا چاہیے تھا، تاہم اس کے وجود کے ساتھ اُردو علم وادب میں ایک دورِ جدید کا آغاز ہو گیا، اور تعلیم یافتہ طبقہ نے زبانِ اُردو کی کم مائگی اور اس کم مائگی کے خوفناک نتائج کو محسوس کر کے اس کے دفعیہ کی تدابیر پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سرسید زبانِ اُردو کی ترویج کو اس قدر اہم خیال کرتے تھے، تو انھوں نے علی گڑھ کالج کے نصابِ تعلیم میں اس کو کیوں شامل نہ کیا؟ جواب اظہر من الشمس ہے کالج کی تاسیس سے سرسید مرحوم کا اصلی منشا مغربی علوم وفنون کی ترویج تھی، انگریزی زبان کی تعلیم، ان گنجہائے گرانمایہ کی حامل ہونے کی حیثیت سے ضروری اور لابدی تھی؛ عربی اور فارسی مسلمانوں کی السنۂ ملی ہونے کی علاوہ مادی حیثیت سے، علوم قدیمہ کے جواہرات سے مالا مال تھیں، اور اعلیٰ تعلیم کی متحمل ہو سکتی تھیں؛ لیکن اُردو اس وقت علوم قدیمہ وجدیدہ سے بے بہرہ ہونے کے علاوہ ادبی لحاظ سے اس قدر پست حیثیت تھی کہ اس کے ذریعہ

اعلیٰ تعلیم کا خیال کرنا نقش برآب کشیدن کے مرادف تھا۔ اسی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے سائنٹفک سوسائٹی کی تکوین ہوئی اور بلاشبہ اگر علمی حیثیت سے یہ سوسائٹی کچھ کامیابی حاصل کر لیتی، اور مغربی علوم کی مترجمہ کتب کا ایک مختصر ذخیرہ بھی مہیا کر لیتی، تو سرسید اُردو کو علیگڑھ کالج کے نصاب تعلیم میں ضرور داخل کر دیتے۔

سرسید اور ان کے ہم مشرب احباب اور ان کے اکثر معاصر مصنفین و مؤلفین نے گو اُردو زبان کے پیرہن پارینہ کو چاک کر کے اُس کو ایک نیا جامہ پہنا دیا اور یہ دکھا دیا کہ اس کی اہلیت و صلاحیت علمی اور ادبی کسی رنگ سے معذور نہیں، لیکن ان بزرگوں کا طرز تحریر اور اسلوب نگارش قدیمی اثرات سے کماینبغی، قطعی طور پر مبرّا و مصفّا نہ ہوا تھا، جدید خیالات کے لیے ایک خاص پیرایۂ تحریر کی ضرورت تھی، فلسفیانہ تخیل کے لیے اُردو نامناسب بعد ناموزوں معلوم ہوتی تھی۔ اس نقص زبان کا احساس سب سے پہلے دائرۃ المعارف کے بانی کو ہوا، علامہ شبلیؒ نے اعلیٰ پیمانہ پر اُردو انشار پردازی کی تہذیب و تذئین کی، اور اس کو ایک ایسے درجے پر پہونچا دیا جو موجودہ اور ایک حد تک آیندہ انشار پردازی کا معیار صحیح کہلا سکتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ان کو زبان کی مادی ترقی کی فکر تھی، جو دار المصنفین کی تشئید کا باعث ہوئی۔ غالباً یہ سب سے پہلی انجمن ہے جس نے اُردو کے علمی اور ادبی سرمایے میں ایک معتد بہ اور قابل قدر اضافہ کیا اور جس سے اُردو کی اور بہت سی آیندہ امیدیں وابستہ ہیں۔ ادام اللہ وجودہٗ۔

زبان اُردو کے اس محسن و مربی (علامہ شبلیؒ) کی جس کے بار احسان سے اُردو اور قدردانانِ اُردو، سبکدوش نہیں ہو سکتے اور جن کے تشکرِ امتناں سے زبان و قلم قاصر ہیں، دستگیری نے گو اُردو کو قعر مذلت سے نکال کر علمی زبانوں کی صف تک پہونچا دیا، لیکن اس کی باقاعدہ اشاعت و تبلیغ کے لیے محض اس کی دماغ سوزی اور سینہ ساوی ایک ناکافی ضمانت تھی۔ ان امور کی انجام دہی کے لیے ملک کے مختلف حصص میں، مرتب دار الاشاعات،

اور منتظم دار العلوم قایم کرنے کی ضرورت تھی ۔
اعلیٰ حضرات ممتاز الامر ہز اگزالٹیڈ ہائینس حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہٗ و دولتہٗ اور علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ دام اللہ فیوضہا، و اقبالہا، والیہ دولت عالیہ بھوپال کی وہ حوصلہ افزائیاں اور علمی فیاضیاں مستحق صد تحسین و ہزار آفریں ہیں، جنہوں نے اُردو کے جسد مردہ میں ایک نئی روح پھونکدی اور عین اُس وقت جبکہ کشاکشِ طوفانِ حوادث سے اُردو کا صفحۂ حیات نذر خاک و باد ہونیوالا تھا، اُس کی دستگیری فرمائی ۔ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس اور انجمن اُردو کی تکوین، اس زبان کے ایک شاندار مستقبل کی شاہد و ضامن ہیں، معرکۂ ترقی میں اعلیٰ حضرت کی یہ گافردگی حقیقتاً فرمانروایانِ ہند کے لئے ایک قابل تقلید مثال ہے علیا حضرت کی قدر شناسی علم و اہل علم پر جو اُردو کے دامن کو جواہراتِ ادبی سے مالا مال کر رہی ہے ہم جہاں تک ناز کریں بجا ہے ۔ ہماری دعا ہے کہ مرکز الحکومت حیدر آباد، اور دار الریاست بھوپال سرزمین علم پر ایک نیا قرطبہ اور نیا بغداد بنکر آوازۂ حکمت بلند کریں ۔ وقس علیٰ ہذا ہندوستان کی سرزمین پر ٹیکسیلا، اور کارڈووا کی ایسی درسگاہوں کی بنیادیں از سرِ نو قائم ہوں اور اِس جامع الجوامع سرزمین کو ایک مرتبہ اور یونستانِ علوم و فنون کہلانے کا حق حاصل ہو ۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد ۔

اُردو کی مجموعی حالت پر ایک اجمالی اور سطحی تبصرہ کرنے کے بعد ہم نفس مطلب پر آتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ بہی خواہانِ اُردو ترقی زبان کے لیے اب تک جو مساعی کر چکے ہیں اور فی الحال کر رہے ہیں، ان سے ایک قلیل مدت میں کافی و وافی نتائج مترتب ہوئے ہیں ۔ اُردو علم ادب کے ذخیرے میں ایک تدریجی اضافہ ہو رہا ہے، علمی اور ادبی رسائل کی تعداد روز بروز ترقی پذیر ہے، یہاں تک کہ اِس بانگ ترقی کی بازگشت کچھ عرصہ ہوا مدراس کے تیرہ و تار احاطہ سے بھی پیدا ہوئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجز خاص خاص انفرادی مستثنیات کے یہ غیر منتظم کوششیں سست رفتار ہونے کے علاوہ ایک حد تک زبان کی

علمی اور عملی ترقی کی سدِراہ ہیں - ہر شخص جداگانہ نقشہائے خیال اور مختلف مطامحِ نظر سے مصروفِ کار ہے، جس سے بحیثیت مجموعی، مفید المطلب نتائج کا مرتب ہونا، ایک دشوار امر ہے، یہ نگو دمیرس زبان کے، مجموعی ادبی حالت، اور اُردو داں اصحاب کے صحتِ ذوق کے لیے تباہ کن ہے'- اعلیٰ علمی و ادبی صُحُف، کے ساتھ ساتھ مغربِ اخلاق و زبان کتب کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی جاتی ہے'- اور سیرۃ النبیؐ کے پہلو بہ پہلو ہم ادنےٰ درجہ کے ناولوں کو بھی اُردو کے مطبوعات میں شامل پاتے ہیں - ان مساعی متفرقہ کو مجاہدہ متحدہ میں تبدیل کردینا، اور ایک خاص ضابطۂ عمل کے بموجب کام کرنا ایک، ساز کے مختلف الصوت پردوں کو یکسر ہم آہنگ کردینا، ایک کتاب کے پریشان اجزا کی شیرازہ بندی کے مرادف ہے'-

کمالاتِ موجودہ اُردو کی اجتماعی ترقی ایک مشترکہ دعوتِ عمل پر موقوف ہے اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبجات کی تعلیم گاہوں اور کالجوں میں اُردو انجمنیں قایم کی جائیں، جن کا نصب العین اُردو کو اپنے اپنے صوبے کی یونیورسٹیوں کے نصابِ تعلیم میں داخل کرانا ہو اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہر انجمن وقتاً فوقتاً جلسوں کے انعقاد اور رسائل کی اشاعت کے ذریعہ، متعلقہ یونیورسٹیوں پر نصابِ تعلیم میں اشتمال اُردو کی ضرورت پر زور دیتی رہے - اور عند الضرورت ان صوبجات کی ایجوکیشنل کانفرنسوں سے استمداد کرتی رہے - اگر ممکن ہو تو زبان کی مادّی ترقی کے لیے علمی تحقیق اور تدقیق کا سلسلہ بھی جاری رکھا جائے - اشتراکِ عمل کے ان اصول کو مدِنظر رکھ کر، اگر کسی قدر سرگرمی اور تن دہی سے کام لیا جائے تو اُردو کی ترقی کے لیے ایک قلیل مدت میں بہت کچھ کیا جاسکتا ہے'.....

(باقی آئندہ)

جذباتِ جگر

(۱)

ہر دم ز نازِ تازہ با عاشقاں بہ بازی — گاہے ز دل گدازی گاہے ز جاں نوازی

ہر چند فکر کردم دیدم ہمیں قدر بس — تو وصلائے رحمت مائیم وحیلہ سازی

آنجا کہ جلوۂ اوست مستغرق اند ذرات — حالے بود کہ قالے رقصے بود کہ زاری

دربارگاہِ سلطاں اہلِ نیاز باید — زنہار او نہ بیند ہندی است یا حجازی

صوفی است وصلِ حق لیکن حقیقت این است — ہم بر رخِ مجاز است صد پردۂ مجازی

اے آنکہ یک نگاہش صد عقدہ ہا کشاد — رحمے بہ حالِ ما ہم شاہنشہِ حجازی

برخیز واز سرِ صدق در راہِ اُو قدم زن
تا کے جگر بہ مستی تا کے بہ عشقِ آزی

گمشدہ جواہرات

مسٹر گریٹرکس سکوٹ لینڈیارڈ کے انسپکٹر حال ہی میں پنشن لیکر ہمارے گاؤں میں آئے ہیں جہاں وہ اپنی باغبانی کا شوق پورا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کام میں اتنی شہرت حاصل کرلی ہے کہ تمام دنیا میں اُن کا نام روشن ہے۔ خصوصاً ڈاکو تو ان کے نام اور ان کی عقل و فراست سے کانپتے ہیں۔ لوگ ان کی شہرت کے باعث ان سے حسد کرتے ہیں۔ امیر و کبیر، بادشاہ و شہزادے ان کی محنت اور جانفشانی سے خوش ہوکر تحفے تحائف بھیجا کرتے ہیں۔ اخبارات ان کی تعریف میں کالم کے کالم بھر دیتے ہیں۔ اور جب کبھی کسی ملزم کی تلاش میں جاتے ہیں تو ان کے دوست اُنکی ہوشیاری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، یہ سمجھ لیتے ہیں کہ شکار ضرور ہاتھ آجائیگا۔ وہ بہت پھرتیلے تھے اور ان کی قوتِ متخیلہ بھی بہت تیز تھی۔ کسی نے ان کے لیے کیسی اچھی تشبیہ دی ہے کہ وہ ملزم کا کھوج اس طرح لگالیتے تھے جیسے بجو خرگوش کو بلوں سے نکال لاتا ہے۔

ظاہراً اُن کا قد درمیانہ اور سینہ چوڑا تھا جو بہادری کی نشانی ہے ان کا دل بہت قوی تھا اور اہل نظر کی نگاہ میں وہ بہت طاقتور متصور ہوتے تھے۔ حقیقت میں وہ بڑے سمجھدار آدمی تھے اور ان کا چہرہ مُہرہ ہشاش بشاش، آنکھیں روشن، ڈاڑھی مونچھیں لمبی اور گھنی تھیں۔ درحقیقت وہ بجائے خفیہ پولیس کے افسر ہونے کے ایک امیر زمیندار معلوم ہوتے تھے۔

ان کے ساتھ ایک عرصہ سے میرے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے لیکن جب سے وہ ہمارے گاؤں میں آئے ہیں اس دوستی کو روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔

بہت سے شائقین چاہتے تھے کہ ان کے زمانہ ملازمت کے حالات وواقعات قلمبند کر دیئے جائیں اور چونکہ مجھے تصانیف کا شوق ہے اُنھوں نے مجھے ہی اپنی مدد کے لیے پسند کیا۔

مجھے تعجب ہے کہ اتنی دلیرانہ زندگی گزارنے کے بعد وہ کس طرح اس گاؤں میں خاموشی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گے۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنے باغ، مرغیوں، اور چھوٹے چھوٹے کتے قلین کے ساتھ دل بہلایا کریں ان کو اور کوئی کام نہ تھا۔ اُن کی ملازمہ (جو بہری تھی) اُن کا ہر طرح کا خیال رکھتی تھی۔

ایک دفعہ اُنھوں نے مجھ سے کہا: "یہ بڑھیا بہت نیک ہے اور میں خصوصاً اس لیے پسند کرتا ہوں کہ یہ بہری ہے۔"

یہ بات مجھے بہت ہی عجیب معلوم ہوئی اور میں نے اس کا سبب دریافت کیا وہ کہنے لگے کہ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ وہ چونکہ ہماری گفتگو سن ہی نہیں سکتی اس لیے کسی کے آگے دہرا بھی نہیں سکتی۔ ایک زمانہ میں جب میں فوج میں تھا اور اپنے محکمہ کے اہم اور ضروری باتیں پوشیدہ رکھنی میرا فرض تھا میں نے ایک دفعہ دیکھا کہ مسز گیمج (ملازمہ) کمرہ کے دروازہ میں کنجی کے سوراخ پر کان لگائے کھڑی تھی اور میری گفتگو کو بغور سننے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اور ایک دفعہ یہ ہوا کہ میں ڈیلفورڈ کے قتل کے مقدمہ کی تفتیش میں مصروف تھا اور اپنے کام پر جانے کے لیے کمرے میں کھڑا ہوا کپڑے بدل رہا تھا کمرہ کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور باہر میدان کی ہر ایک چیز اور ہر ایک بات دیکھی اور سنی جا سکتی تھی۔ میری ماما، مسز گیمج، پائیں باغ میں میرے کپڑے سکھا رہی تھی کہ یکایک میری پڑوسن مسز سینتھیر زا اپنی بنگلہ سے باہر آئیں اور اپنے احاطہ کی دیوار پر ہاتھ ٹیک کر میری ماما سے گفتگو کرنے لگیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح میری ملازمہ سے اُس مقدمہ کی بابت پوچھ گچھ کریں لیکن اُس کے بہرہ پن نے اُن کی تمام کوششیں بے سود ثابت کر دیں۔ اُنھوں نے ہر طریقہ سے پوچھنا چاہا لیکن بیچاری مسز گیمج ایک نہ سُن سکی اور

اپنی دہن میں کبھی میری پڑوسن سے آلوؤں کا ذکر کرتی کبھی موسمی بیماریوں وغیرہ کا۔
آخر نتیجہ یہ ہوا کہ مسز سٹیفنز اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں ناکام رہیں تو کچھ ناراض
سی ہوکر اپنے گھر واپس چلی گئیں کیونکہ اتنی دیر مغز کھانے کے بعد اُن پر یہ بات واضح ہوگئی
کہ بڑھیا سے اپنا مطلب نکالنا کارِ عبث ہے۔
گریٹرکس نے مجھے یہ قصہ سنایا اور میں نے بڑی دلچسپی سے سنا کیونکہ یہ ہنسی کی بات
تھی۔ اس کے بعد ہم دونوں سگار پیتے ہوئے ان کے پائیں باغ میں گلاب کے پودوں
کو دیکھنے چلے گئے۔ یہ پودے اُنہوں نے حال ہی میں منگائے تھے اور اُن کو ان پر
بہت ناز تھا۔

ہم نے کتاب کا بہت سا قصہ ختم کر لیا تھا کہ یکایک مجھے ایک ضروری کام سے
جنوبی فرانس جانا پڑا تاکہ ایک مریض رشتہ دار کو جس کی حالت بہت نازک بتائی گئی
تھی دیکھ آؤں۔ لیکن بعد میں یہ خبر غلط ثابت ہوئی اور میں واپس انگلستان چلا آیا۔
اپنی واپسی کے دوسرے دن شام کو میں گلی میں سے گزر کر اپنے دوست سابق انسپکٹر
کے مکان پر پہنچا۔ میں نے اُن کو مکان کے عقبی میدان میں سگار پیتے ہوئے پایا۔ وہ
مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اصرار کیا کہ میں اُن کے ساتھ ناشتہ کروں بہت دیر
باتیں کرنے کے بعد ہم نے کتاب کا تذکرہ چھیڑا۔
میں:۔ "میں نے اپنے سفر کے دوران میں آپ کے اِن کارناموں میں ایک
غلطی محسوس کی شاید آپ کو بھی کچھ خیال آیا ہو"۔
وہ:۔ "وہ کیا؟"
میں:۔ "وہ یہ کہ یہ کتاب تمامتر آپ کی کامیابی کے افسانوں سے بھری پڑی ہے
اور اس میں کسی ناکامی کا ذکر تک نہیں۔ کیا آپ کو کوئی ایسی واردات پیش نہیں آئی

کہ جس میں آپ کامیاب تو نہوئے ہوں مگر کامیابی کے زینہ تک پہنچ گئے ہوں "

مسٹر گریٹرکس :۔ " اوہ! میں اب آپ کا مطلب سمجھا۔ مجھے ذرا اپنی کتابیں دیکھ لینے دیجیے۔ پھر میں بتا سکونگا کہ میرے پاس آپ کے حسب منشا کوئی مصالحہ موجود بھی ہے یا نہیں ؟ "

میں ان کے ہمراہ کھانے کے کمرہ میں گیا جہاں اُنہوں نے الماری کھول کر تین ضخیم کتابیں نکال کر میز پر رکھدیں اور ورق گردانی شروع کی یہ کتابیں ان کی تمام کارفرمائیوں کا ذخیرہ اور یقیناً قابل اشاعت تھیں۔

گریٹرکس : " لیجیے یہ کتاب شاید آپ کی پسند آجائے۔ آپ باہر گئے ہوئے تھے اس لیے آپ کو یہ نئی نئی باتیں معلوم ہونگیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ قصہ دنیا کی اپنی مثال نہیں رکھتا "

میں :۔ (اپنا پائپ بھرتے ہوئے) " آپ کو یہ واقعہ کب پیش آیا تھا " ؟

وہ :۔ ۳ مارچ ۱۹۰۳ء کو چلئے باغ میں چلیں میں وہاں سارا قصہ سناؤنگا "

جب ہم باغ میں دوبارہ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو اُنہوں نے یوں کہنا شروع کیا۔ " ۱۹۰۳ء فروری کے اوائل میں ایک مشہور امریکن کروڑ پتی معہ اپنی حسین زوجہ کے ٹیٹنی سی جہاز میں انگلستان تشریف لائے۔ وہ دونوں ولایتی سوسائٹی میں بہت مشہور تھے۔ اور اُنہوں نے ایک عالیشان مکان مناسب موقعہ پر پارک لین میں کرایہ پر لیا۔ خاوند، عیش و تعیش سے زیادہ تجارتی کاروبار میں مصروف رہتا تھا اور ویسٹ اینڈ (جو خوش باش و متمول لوگوں کا مرکز ہے) کی نسبت شہر میں، جہاں کاروباری لوگ مسکون ہیں، رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ برخلاف اِس کے اُس کی بیوی شہد کی مکھی کی طرح وہاں بے چین تھی اور جب تک کوئی عمدہ سوسائٹی نہ ملے چین سے نہ رہتی تھی۔ صاحب اپنی بیگم صاحبہ پر زر کثیر صرف کیا کرتے تھے اور بیگم کے جواہرات کا مجموعہ ملک میں سب سے زیادہ

انمول تھا۔ تین مارچ کو وہ کاؤنٹیس ونشایر کے ہاں، جو گروسنیر کلے ئر میں رہتی تھیں، مدعو تھیں۔ دوسرے دن صبح کے اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ وہ دعوتی بیگمات میں سب سے زیادہ حسین اور خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ اور مجھے بھی اس رائے سے اتفاق ہے۔ اُس وقت وہ کلغی، جھمکے، اور مالا پہنے ہوئے تھیں اور کئی نازک چوڑیاں ہاتھوں میں تھیں۔ ان کے خاوند بھی ان کے ہمراہ تھے۔ چونکہ انھیں دوسرے دن صبح کو پیرس ایک ضروری کام کے لیے جانا تھا اس لیے وہ جلد ہی دعوت سے واپس آ کر مصروف خواب ہوگئے کاؤنٹس ونشائر کے مکان سے مسز ڈین لین (یہ بیگم کا نام ہے)، بڑکلی سکائر ناچ دیکھنے گئیں اور وہاں سے دو تین بجے رات کو اپنے مکان واپس آئیں۔ گھر پر انکی ماما نے کپڑے اور زیورات اُتارے اور علٰحدہ علٰحدہ قرینے سے بکسوں میں رکھ کر آہنی محفوظ صندوقچہ میں اپنی ماما کے روبرو مقفل کر دیئے۔ مسٹر ڈین لین اس عرصہ میں برابر والے کمرہ میں میٹھی نیند سوتے رہے دوسرے دن صبح کو وہ سوار ہوگئے اور مسز لین دوپہر کے قریب بیدار ہوئیں۔ کھانے سے فراغت پاکر گاڑی منگائی اور خرید و فروخت کے لیے بازار چلی گئیں اور دو ایک جگہ ملنے ملانے کے بعد ساڑھے پانچ بجے واپس مکان پر آئیں۔ اسی رات کو انہیں اپنے چند نیویارک کے دوستوں کے ساتھ کھانا کھانا تھا جو گرام ول روڈ پر مقیم تھے تیاری کی غرض سے وہ کپڑے بدلنے کے کمرہ میں گئیں۔ ماما کو کنجی دیکر بیگم بولیں "میں آج زمردی زیور پہنونگی"۔

ایک لمحہ بعد ماما کے مُنہ سے خوف کے مارے چیخ نکل گئی کیونکہ سوائے چند کاغذات کے صندوقچہ بالکل خالی تھا۔

مالکہ :۔ "کیوں کیا ہوا؟" اور فوراً کرسی سے اُچھل کر ماما کے برابر آکر کھڑی ہوئیں معاملہ بالکل دگرگوں تھا وہاں جواہرات کا نام و نشان بھی نہ تھا بیگم نے مجھ سے بعد میں کہا کہ "مجھے جواہرات کے جانیکا بہت رنج ہوا تھا۔ پھر یہ سوچ کر کہ کچھ تدبیر کرنی چاہیے

فوراً ماما سے خانساماں کو بلوایا اور اس کے آتے ہی حکم دیا کہ سکوٹ لینڈ یارڈ کو ٹیلیفون کے ذریعہ اطلاع کر دے کہ ایک ہوشیار سُراغ رساں کو جلد پارک لین بھیجا جائے کیونکہ وہاں بڑی بھاری چوری وقوع میں آئی ہے۔

مسز وین کیس نے اس رات کو دعوت میں شرکت سے انکار کر دیا اور مجھے اپنے کمرہ میں لے گئیں اور اپنے مالی نقصان کا ذکر کیا۔ انہیں یقین کامل تھا کہ دوپہر تک کمرہ میں کوئی نہیں گیا تھا، اور نہ کوئی ایسے نشانات تھے جن سے صندوقچہ کھولے جانے کا شبہ ہو سکے کوئی اور چیز بھی غائب نہ ہوئی تھی ایک کنجی ان کے پاس تھی اور دوسری بنک گھر میں محفوظ تھی۔ میں نے خود بکس کا معائنہ کیا کھڑکی کھول کر جھانکا اور ایک ہی نظر میں معلوم کر لیا کہ اس راستہ سے کوئی نہیں گھسا ہوگا میں نے باورچی وشاگرد پیشہ لوگوں وغیرہ کے بیانات لیے تو ان سب نے یک زبان ہو کر یہی کہا کہ اُس دن کوئی اجنبی مکان پر نہیں آیا باقی ماندہ نوکر بھی اسی رائے سے اتفاق کرتے تھے۔ جب ملازمین کمرہ سے باہر چلے گئے تو میں نے بیگم سے اُن کے چال چلن کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ماما ان کے پاس آٹھ برس سے ہے اور بہت ایماندار ہے باورچی اور خدمتگاروں کا چال چلن بھی اچھا ہے۔ مسٹر وین کیس کا خدمتگار ان کے ہمراہ پیرس گیا ہوا ہے اس لیے وہ اِس واردات سے قطعاً ناآشنا ہے۔ میں بیگم صاحبہ سے اجازت حاصل کر کے روانہ ہوا تاکہ اس پیچیدہ معاملہ کے سُلجھانے کی کوشش کروں۔

حقیقت حال کی اطلاع پولیس میں دیکر میں اس معاملہ پر غور کرنے اپنے گھر واپس آیا۔ اس میں شک نہیں کہ مسز وین کیس جو کنجی اپنے گلے میں ریشمی تاگہ سے باندھکر لٹکائے رہتی تھیں اُس کی جعلی نقل کے ذریعہ سے یہ چوری عمل میں آئی تھی۔ اب دریافت طلب یہ امر باقی تھا کہ کسی نے بنک گھر سے تو کنجی حاصل نہیں کر لی۔ یا روزانہ استعمال میں دیکھتے دیکھتے کوئی کنجی نئی تو تیار نہیں کرائی۔ میری نگاہ میں ماما ملزم تھی کیونکہ وہ ہی ایک ایسی ہستی ہو سکتی تھی

جسے ہر وقت چوری کا موقعہ مل سکتا تھا۔ لیکن میری عادت ہے کہ اپنے پہلے خیالات پر اعتبار نہیں کرتا۔ دوسرے دن جونہی بنک گھر کھلا میں نے اندر داخل ہو کر ملنے کی درخواست کی۔ مالکِ بنک نے مجھے کامل یقین دلایا کہ جب سے مسٹر کین نے کنجی اس کے قبضہ میں دی ہے اُس وقت سے کوئی لینے نہیں آیا ہے اور وہ احتیاط سے محفوظ ہے۔ پھر میں پارک لین پہنچا اور بیگم کو نہایت رنجیدہ پایا۔ اُنہوں نے پیرس سے اپنے خاوند کو تار بھجوا دیا تھا اور اُنہوں نے دوسرے دن صبح واپسی کا وعدہ فرمایا تھا۔

میں نے دریافت کیا: "آپ کو اس عرصہ میں کوئی بات معلوم یا دریافت ہوئی؟"

بیگم نے رنجیدہ ہو کر کہا: "بالکل نہیں۔ مجھے یقین ہے میں زیورات کو پھر نہ دیکھ سکوں گی۔"

میں نے انہیں یقین دلایا کہ ہم جان توڑ کوشش کریں گے اور بیگم کی رائے سے دوبارہ ملازمین کی تلاشی لی۔ حالانکہ میں نے پھر گواہی لی لیکن اطمینان نہ ہوا۔ اس کے بعد میں جوہریوں میں گیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ چور (خواہ مرد ہو یا عورت) فروخت سے پہلے زیورات کے نگ نکال لے گا یہاں بھی مجھے ناکامیابی ہوئی۔ ہم نے پیرس، امسٹرڈم، اور تمام بڑے بڑے مقامات پر پولیس کو واقعہ سے آگاہ کیا اور استدعا کی کہ چوروں کا خیال رکھیں عرصہ تک میں بھی اس مقدمہ کی تفتیش میں دن رات لگا رہا لیکن جتنی میں جستجو کرتا تھا اُسی قدر کام بننا مشکل نظر آتا تھا۔

مسٹر وین کین رات کی گاڑی سے آ گئے تھے اور ابھی بستر استراحت ہی پر تھے کہ میں پہنچ گیا۔ بیگم صاحبہ نے میرا ان سے تعارف کرایا کہ یہ خفیہ پولس کے افسر ہیں اور یہ کہ معاملہ ان کے ہی ہاتھ میں ہے۔ میں نے مسٹر موصوف کو نہایت خاموش طبیعت اور صاف باطن شخص پایا۔ اُنہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ میرا اس مقدمہ کے متعلق کیا خیال تھا اور جواہرات ملنے کی مجھے کیا امید تھی؟ اُنہوں نے زیورات کی قیمت پانچ لاکھ سے زائد بتائی اور یقیناً وہ زیورات دنیا کے بہترین جواہرات میں سے تھے۔

اُنھوں نے جہاز پر کسی شخص کو اس معاملہ پر گفتگو کرتے نہیں سُنا تھا۔ اور نہ کسی کو پارک لین میں ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مسٹر وین لین کی نیند ہوشیار تھی اور اُنہوں نے قسم کھائی کہ اُس رات کو کوئی اجنبی مکان میں نہیں گھسا ان کا اپنا لباس بدلنے کا کمرہ جس کا دروازہ دوسری جانب استراحت کے کمرہ میں نکلتا تھا۔ سب بند تھے میں نے ان سب باتوں سے یہ اخذ کیا کہ چوری یقیناً ۱۲ بجے سے شام کے ساڑھے پانچ کے درمیان واقع ہوئی۔ اس سے مجھے بہت کچھ مدد ملی لیکن کچھ مادّی فائدہ حاصل ہوا۔ ایک دفعہ اور میں نے سفر کی تیاری کی ایک دو ہفتہ یونہی گزر گئے اور اس عرصہ میں مجھے کامل یقین ہو چلا تھا کہ نگ لندن میں نہیں ہیں۔ پس میں امسٹرڈم گیا اور وہاں پولس کی مدد سے تلاش جاری رکھی۔ پھر میں نے برلن اور برو سلز میں تلاشی لی مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا آخر کار پھر پیرس گیا کہ وہاں اپنے ایک نوجی دوست کی مدد سے جو اس کام میں خاص مہارت رکھتے تھے مدد لوں۔

میں نے ان سے کل ماجرا کہ سُنایا۔ جب میں نے قصہ ختم کیا تو اُنھوں نے دریافت کیا۔ ”اُس شخص کا نام کیا ہے؟“ میں نے جواب دیا ”مسٹر وین لین“۔ لیکن یہ بات کہ وہ کڑوریتی ہیں میرے دوست کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ فوراً کرسی سے اُٹھ کر برابر والے کمرہ میں گئے اور ایک کاغذ کا پلندہ لے آئے، اُنھوں نے ورق گردانی کرتے کرتے یکایک کتاب بند کر دی اور یوں گویا ہوئے، ”یہ بتاؤ جو اصرات واپس ملجانے پر وہ کیا انعام دینگے؟ یقیناً وہ رقم جو اُجرت میں ملے گی بہت بڑی ہوگی کیونکہ زیورات بھی قیمتی تھے“۔ میں، ”اُجرت پانچ ہزار پونڈ ہے۔ لیکن ابھی تک کسی نے اس رقم کو وصول کرنے میں پیش قدمی نہیں کی ہے۔ مجھے امید ہے کوئی طلب نہ کرسکے گا۔ اور یہ راز بھی نہ کھلے گا“۔

افسر۔ ”تم اِس بات پر مت اڑو۔ اب ہم پھر تفتیش کے لیے چلیں گے“۔
ہم نے تفتیش کی اور میں اسی شب کو لندن واپس آگیا۔

دوسرے دن صبح کے ساڑھے دس بجے میں مسٹر وین لیین کے مکان پر گیا اور انہیں کتب خانہ میں پایا۔

مسٹر وین:۔ "تشریف رکھیے۔ میں نے سُنا ہے آپ پیرس گئے ہوئے تھے"۔
مجھے تعجب ہوا کہ انہیں میرے پیرس جانے کا احوال کیونکر معلوم ہوا۔ حالانکہ مناسب جان کر میں نے خود ہی اس خبر کو اب تک پوشیدہ رکھا تھا۔

"آپ موزیولیون ڈی ریواز کو جانتے ہیں؟"

"جی ہاں"۔

"پھر تو آپ کو سارا حال معلوم ہو گیا ہوگا۔ آپ کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ وہ میں ہی تھا جو بیگم کے سوتے وقت زیور نکال کر اپنے ہمراہ لے گیا تھا اور موزیو ریواز کے پاس بعوض دو لاکھ پونڈ گرو رکھا ہے۔ والی اسٹریٹ کی فرم میں نقصان کے باعث مجھے روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ اب میرا مطلب حل ہو گیا ہے اور میں معہ بیگم کے آج شب کو پیرس جا کر زیورات چھڑا لاؤں گا"۔

یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے مجھے پریشان کر دیا تھا اور اگر میرا فرانسیسی دوست سرا غرساں میری مدد نہ کرتے تو میں مسٹر وین لیین پر کبھی شبہ نہ کرتا۔

فقط
محمد صمصام الحق دہلوی۔ متعلم انٹرمیڈیٹ
کالج علیگڑھ

نظر ثانی

حضرت وحید الدین سلیم صاحب کی یہ غزل تعطیلات نمبر میں شائع ہو چکی ہے لیکن نظر ثانی کے بعد اس غزل کے اکثر اشعار ایک نیا کیف پیدا کرتے ہیں اور اسی لیے ہم اسے دوبارہ شائع کرنے پر مجبور ہیں۔

(اڈیٹر)

پھر نظر آنے لگی جلووں کی طغیانی مجھے
خاک میں لے جائیگا یہ موجزن پانی مجھے

وجد کرتے ہیں مرے نغموں کو سنکر اہل خلد
کیا لبھائے گی پرندوں کی خوش الحانی مجھے

شہپر اور اک رہ جائیں جہاں پرواز سے
اس فضا میں آج دکھلانی ہے جولانی مجھے

نردباں سعی سے تا عرش برپایا خرام
پر زمیں میں لے گیا ذوقِ تن آسانی مجھے

کرکے دانائی کا دعویٰ ایسا میں کھو گیا
ڈھونڈتی پھرتی ہے ہر سو میری نادانی مجھے

حسن ہو جس جا بھی ہو ہو منتظم یا منتشر
کیا بھلی لگتی ہے تاروں کی یہ پاشانی مجھے

بوئے گل بنکر نکل جاؤں لگا قیدِ رنگ سے
تو نے عاجز کر دیا اے دردِ عریانی مجھے

بزمِ چشمِ رنگ کی وسعت میں جو آتا تھو
اس بتِ بیرنگ کی کرنی ہے مہمانی مجھے

چین سے تو بھی نہ بیٹھے گا زمانہ میں کبھی
خاک کر ڈالا اسے او سوزِ پنہانی مجھے

لامکاں میں شوقِ عریانی کی تھی دلچسپ سیر
یوں مکاں سے لے اڑا ہے ذوقِ عریانی مجھے

بزمِ لاہوتی شناساؤں کی تھی اک انجمن
سب نظر آئیں نگاہیں جانی پہچانی مجھے

نقشِ حیرت بن گیا نقشِ کفِ پا دیکھ کر
آگے بڑھکر کیا دکھاتی ہے یہ حیرانی مجھے

معرفت کا درس لینا ہے انھیں سے قلب زار
ہستیاں جن کی نظر آتی ہیں نورانی مجھے

جبہہ سائی غیر کے در پر نہ زیبا تھی سلیم
آستانِ دل پہ رکھنی تھی یہ پیشانی مجھے

خاکسار

ابو الدلکا محمد مظہر اللہ سرشار پانی پتی - امید منزل - حیدرآباد دکن

سخنہائے گفتنی

گشتیم تا کہ خدا آسماں نگہ دارد

اس ساری داستان کے لکھنے کے لیے جس وقت میں آمادہ ہوا ہوں تو سب سے پہلے مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اس کا عنوان کیا رکھا جائے۔ایک اپیل۔عرض حال انجمن القرض ڈیوٹی سوسائٹی۔غرض کہ کیا کیا دل میں نہ آیا۔لیکن محض اس خیال سے کہ ہمارے ناظرین جن کی شان استغنا یا جذبہ شعری ان میں سے کسی ایک کا متحمل نہیں ہو سکتا۔مضمون کی نوعیت کا اندازہ کر کے بیک وقت چار یا پانچ ورق اُلٹ دیں گے میں نے ایک ایسا عنوان پسند کیا جو ممکن ہے کہ نفس مضمون کی نسبت سے بالکل بے معنی ہو۔کیا تعجب وہ دھوکے میں آکر وہ اِس داستانِ غم پر ایک نظر ڈال لیں۔اب رہا یہ کہ اس کا انجام کیا ہوگا اُس کے متعلق میں تو یہی کہونگا کہ جہاں تک اس مسئلہ خاص کا تعلق ہے ممکن ہے خدا کی شان علیمی وہی ہو جو میرا دیرینہ تجربہ ہے۔یعنی کچھ نہ ہوگا۔!

انجمن کی جیسی کچھ حالت ہے اُس کا تذکرہ میرے نزدیک فضول ہے۔اگر کسی صاحب کو اس سے دلچسپی ہے تو اُن کو چاہیے کہ بجائے اُس شمار و اعداد کے جو میں پیش کرونگا یا جو دفتر کے ضخیم رجسٹروں میں محفوظ ہیں اُن کو خود اپنی حالتوں یا اپنے دوسرے بھائیوں کی حالتوں سے اندازہ کریں —— کم و بیش ۱۹ ہزار روپیہ اِس سال کی آمدنی کی توقعات پر نادار طلبا کے لیے منظور کیے گئے تھے۔توقعات بر نہ آئیں اور ہم نے مجبور ہو کر ۱۲ ہزار روپیہ حذف کر دیئے اور صرف سات ہزار تقسیم کیے —— میں اُن لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں جن کو خدا نے انجمن کی حمایت سے بے نیاز کر رکھا ہے وہ نہیں اندازہ کر سکتے کہ احتیاج کیسی سنگین

محرومی ہے ــــ طالبعلمانہ زندگی کی وہ ولولہ انگیزیاں جن کے سہارے دنیا میں رہنا اچھا معلوم ہوتا ہے اور کوئی کامیابی یا کامرانی ناممکن الحصول نہیں معلوم ہوتی اُن لوگوں کو نصیب نہیں ہیں جن کے والدین دوسرے خوش قسمت والدین کی طرح اپنے بچوں کو بھی کامیاب اور کامراں دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اُن کی آرزوئیں اُن کی قسمتوں کو نہیں بدل سکتی ہیں۔ اُس مالی امداد کے کم ہو جانے کی وجہ سے جن کا تذکرہ میں ابھی کر چکا ہوں مجھے جن بدقسمت نونہالوں سے ملنے اور اُن کی دردناک حالتوں کے سُننے کا اتفاق ہوا ہے کاش اُس کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے اور خدا اُن کے قلوب کو گداز بھی کر دیتا جو اپنے اقتدار۔ اعتبار یا آمدنی کا کچھ حصہ اُن لوگوں کے لیے بھی وقف کر سکتے ہیں۔ ان بیچاروں کے جو خطوط اپنے والدین کے پاس گئے ہوں گے اور اُنھوں نے ان کو پاکر جس طرح اپنے اوپر مزید سختیوں کے جھیلنے کا فیصلہ کیا ہوگا اس کا کون اندازہ نہیں کر سکتا۔ والدین کی محبت جیسی کچھ ہوتی ہے اُس کا اندازہ کچھ اولاد ہی کر سکتی ہے۔ اس سے قطع نظر میں سوچتا ہوں کہ ان غریب طلبار کے چھوٹے بھائی بہنوں پر سہولتوں اور کشادگیوں کے کتنے دروازے تنگ یا بالکل بند کر دیے گئے ہونگے۔ جو اپنے معزز و خوشحال ہمسائیوں یا شناساؤں کو جب کبھی دیکھتے ہونگے تو ان کو اس خیال سے تسکین ہو جاتی ہو گی کہ انکا غریب الدیار بھائی عنقریب اُنکا ہم پلہ ہو جائے گا۔

لیکن اب جبکہ انجمن کی یہ حالت ہے کہ اس سال اس قدر تخفیف کر دینے کے باوجود آئندہ کے لیے قطعی مایوسی ہی میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا کہ میں اپنے اُن احباب۔ معاونین۔ و بزرگوں کو ایک بار پھر تکلیف دوں جن کی بیش بہا اور بر وقت پذیرائیوں نے میری ہمیشہ دستگیری فرمائی ہے ــــ جو حضرات انجمن الغرض کی تاریخ اور اُس کے کارناموں سے واقف ہیں اُن سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ انجمن کو کوئی معتدبہ یا مستقل آمدنی نہیں ہے درآنحالیکہ اس سے امداد لینے والوں کی تعداد روزافزوں

ہے۔ اس پرستم یہ ہے کہ جو لوگ اس کی امداد سے بہرہ مند ہو کر ایک کامیاب و با فراغت زندگی بسر کر رہے ہیں اپنے مصائب سنگین اخلاقی پابندیوں اور ذمہ داریوں کو کلیتاً فراموش کر چکے ہیں اب ہم کو سوائے اس کے کوئی اور صورت نظر نہیں آتی کہ یا تو انجمن کا دروازہ ایک نامعلوم مدت تک بند کر کے نادار اور ہونہار طلبا کو اس طرف سے ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیا جائے یا میں اُس گراں مایہ حقیقت کا واسطہ دلا کر اپنے کرمفرماؤں کی عملی توجہ انجمن کی طرف مائل و تل کراؤں جن سے اسلام اور انسانیت کی تار و پود وابستہ ہیں — میں اپنے ان بزرگوں سے التجا کرتا ہوں جن کو خدا نے اپنی فراغت دی ہو کہ وہ ایک حقیقت کی سنگینی اس میں برداشت کر کے دوسرے کو انتہائی مصیبتوں سے نجات دلا سکتے ہیں کہ یہ وقت ہم پر انتہائی ضیق و کرب کا ہے اور ہماری نگاہیں بے اختیار اُن کی طرف اُٹھتی ہیں — مجھے امید ہے اور میں اس خدا سے دُعا کرتا ہوں جو ہر نیکی کا بیش بہاترین معاوضہ دینے پر قادر ہے۔ کہ اُن کے مشورہ سے بھی امداد ہمارے لیے نعمت غیر مترقبہ ہوگی اور بے شمار غریب و نادار خاندان اس کے اس احسان و کرم کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ میں اُن لوگوں سے بھی درخواست کر رہا ہوں جن کے ساتھ انجمن الفرض نے وہی کیا ہے جو کسی دوسری تعلیم گاہ کے کسی طالب علم کے غریب والدین یا بھائی بہنوں نے کیا ہوگا یا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن نہ کر سکے میں جانتا ہوں جن لوگوں کی انجمن نے ایک بار دستگیری کی ہے اُن کو منزلِ مقصود تک پہنچایا ہے اور آج جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے وہ اپنے خوشحال دوستوں سے کسی طور پر پیچھے نہیں ہیں اور جہاں تک خدا کی مرضی تھی وہ زندگی میں کامیاب بھی ہیں۔ لیکن کیا میں آج اُن کو آپ کا وہ دن بھی یاد دلا سکتا ہوں کہ جب وہ انجمن کے انکار اعانت کے امکان سے لرز جاتے تھے اور خدا کے مسبب الاسباب ہونے کے بھی اتنے قائل نہ تھے جتنے اب ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ وہ اپنا دن نہ بھولیں اور جس طور پر ان کی مدد کی گئی آج ان کو اپنے

دوسرے نادار بھائیوں کی مدد کرنی چاہیے ـــــ دن تو بھلا دینے کے لیے بنایا ہی گیا ہے اور دوسروں کی مدد کرنا شاید اتنا ضروری نہیں ہے لیکن خود اپنے وجود کو جس طور پر معرض خطر میں ڈال کر کسی وقت انجمن نے ان لوگوں کو خطرے سے بچا لیا تھا اسی طرح آج ضرورت اس امر کی ہے کہ انجمن کو اس بلا کی سے بچا لیا جاوے جواب قریب قریب متیقن ہوتی جاتی ہے۔ یہاں میں اِن لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کرنا چاہتا ہوں کہ احسان کا بدلہ احسان سے نہیں بلکہ ادائگی فرض سے ہوتا ہے ـــــ جن لوگوں کو انجمن سے فائدہ پہنچا ہے اگر وہ اس وقت انجمن کی طرف متوجہ ہوں تو دنیا کے سامنے ممکن ہے اُن کا یہ فعل انجمن کے ساتھ احسان کا مرادف ہو لیکن میں خود اُن لوگوں سے دریافت کرونگا کہ کیا وہ بھی ایسا ہی خیال کرتے ہیں اگر قرضخواہ کے مطالبات ادا کر دیئے جاویں تو یہ مقروض کا احسان نہیں کیونکہ ایسا کرنے پر اُس سے اخلاقی ہی نہیں بلکہ قانونی مواخذہ بھی ہوگا۔ افسوس ہے کہ مجھے اس طور پر اظہار خیال کرنا پڑا لیکن کیا کیا جائے انجمن الفرض کو بہر حال قائم رکھنا ہے ممکن ہو اب تک اُس کی ساری اعانت و امداد صرف انسانوں کی ناشکر گذاری و سہل نگاری کی محرک رہی ہوں لیکن جب تک علیگڑھ ہماری قوم کا ملجا و ماوی ہے اور جب تک ہمارے ہونہار اور نادار طلبا ر اپنے مخلصانہ مساعی کے خلاف تقدیر کو برسر پیکار پائینگے ـ انجمن اپنی بساعت کے مطابق اُن کی دستگیری سے باز نہیں رہ سکتی۔ انشاءاللہ العزیز۔

پہلا انجمن ۱۸۹۰ء میں قایم ہوئی۔ اب تک اس انجمن نے ۵-۱۴-۲۲۱۱۰۴ جمع کیا ہے اور کم و بیش پانچ ہزار طلبار کی امداد کی۔ اُس نے محض طلبار ہی کی مد نہیں کی بلکہ وقتاً فوقتاً کارکنان کالج و یونیورسٹی کی اعانت سے بھی دریغ نہ کیا اور متعدد عمارتیں اور کمرے یونیورسٹی میں ایسے ہیں جو اس انجمن کی امداد سے تعمیر ہوئے ـ

اب تک انجمن نے جن طلبار کی امداد کی وہ قرض حسنہ کی صورت میں تھی ـ اگر یہ ساری رقم انجمن کو واپس کر دی گئی ہوتی اور جس کے لیے عدالتی کارروائی کے

علاوہ ہر امکانی کوشش کی جا رہی ہے تو آج اُس کی حالت قابل رشک طور پر اُمید افزا ہوتی اور ہم میں سے کسی کے اوقات یوں تلف نہ ہوتے۔ لیکن میرے ان دوستوں کو خلق و خدا کسی کے بتائے ہوئے اصولوں کی پروا نہیں ہے۔ اور ہم کو رہ رہ کر ایسے خیالات کا اظہار کرنا پڑتا ہے جو ہمارے نزدیک بھی کچھ زیادہ دلچسپ نہیں ہیں۔ اور محفلِ تعلیم کے سکون و راحت میں بھی بے سود طور پر خلل انداز ہوتے ہیں۔

اس عرض حال کو پیش کرتے ہوئے میں اُن حضرات سے بھی درخواست کرتا ہوں جن پر ہماری انجمن کو کامیاب بنانے کا فرض عاید ہوتا ہے کہ ہمارے مقاصد کو کامیاب بنائیں اور مسئلہ حاضرہ میں ہمارے ساتھ خلوص روا رکھیں۔ اس وقت کم و بیش دو ہزار طالب علم علیگڑھ سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں اور اگر پرانے طلبا اور ہمارے سرپرستوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو تعداد کئی ہزار ہو جاتی ہے۔ میری ناچیز التماس یہ ہے کہ ہمارے ویزٹنگ معاونین موجودہ طلبا، اور بالخصوص وہ طلبا جن کو امداد مل رہی ہے اور وہ لوگ جن کو امداد مل چکی ہے کوشش فرما کر فرداً فرداً اس سال کم از کم بیس روپیہ اپنے احباب۔ اور ہمدردان قوم اور بزرگوں سے بطور عطیہ وصول فرما کر انجمن میں داخل کر دیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ بیس روپیہ وصول کر لینا ایسا دشوار کام ہے کہ اُن کے خلوص ہمدردی سرگرمی سے بالاتر ہے۔ اور اُس میں ان کو اتنی جد و جہد کرنی پڑے گی۔ کہ بعض بہت ضروری اور دلچسپ مشاغل سے محروم ہو جانا پڑے گا۔

میں صرف یہ اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آئندہ سال انجمن کی حالت جیسی کچھ ہوگی اُس کا اندازہ صرف اس طور سے ہو سکتا ہے کہ جو لوگ اس کی امداد کی توقع پر علیگڑھ آئیں گے ان کو نہ صرف محروم رہنا پڑیگا بلکہ وہ لوگ جو اس وقت امداد حاصل کر رہے ہیں اُن کو بھی اپنے لیے کوئی دوسرا انتظام کرنا پڑیگا۔ اگر مجوزہ تحریک کامیاب ہو گئی اور کم از کم دو ہزار احباب نے توجہ فرمائی تو ہمارے آیندہ سال کی آمدنی چالیس ہزار سے

ہوجاوے گی اور اس وقت ہونہار نادار طلبا رکو جو سہولتیں ہو جائینگی اس کا اندازہ کرنا نہایت آسان ہے۔

مگر یہ سب تو صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ اس تحریک پر کتنے خدا کے بندے توجہ کریں گے اس کا خیال کرتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ساری داستان سرائی بے کار ہے۔ یہ ضرور یقین ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے لوگ ظاہری یا باطنی طور پر اظہار سرگرمی بھی کریں گے لیکن روزمرہ کے انہماکِ مشاغل میں یہ امروز و فردا کے نذر ہوتا رہے گا۔ یہانتک کہ ایک عرصہ کے بعد وہ کبھی یہ خیال کر لیا کریں گے کہ کسی وقت اس قسم کی تحریک ہوئی تھی جس کے وہ معین بھی ہوئے لیکن دیگر مشاغل نے مہلت ہی نہ دی کہ اس کی طرف کوئی عملی قدم بڑھایا جا سکتا اس لیے اس کا ماتم بھی فضول ہے؟ بایں ہمہ مایوسی مومن کے لیے معصیت ہے۔

۱۱ دسمبر کو یونیورسٹی کے طلبا رکے مخاطب کرنیکے لیے جو جلسہ میں نے کیا تھا اس نے میری ہمتوں کو بہت کچھ پست کر دیا۔ میں ایک حدتک مایوس ہو گیا۔ لیکن جہاں تک مجھی یونیورسٹی کے طلبائسے ابتک یہ شکایت ہو کہ انہوں نے صرف انجمن کے مقاصد ہی کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ میرے دیرینہ تعلقات کو بھی فراموش کر دیا۔ مجھے اس امر کے بیان کرنے میں خاص مسرت ہے کہ انٹرمیڈیٹ کالج کے طلبا رنے میرے اس رنج و ملال کو زائل کرنے کے لیے میری وساطت کے بغیر ایک نہایت کامیاب جلسہ کیا اور انجمن کی امداد کے لیے خاص کوشش کرنے کے لیے خاص عہد و پیماں کیے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ان کو اس کوششوں میں کامیاب۔ اور بڑے دن کی چھٹیوں کے بعد وہ اپنے نادار بھائیوں کو امداد دینے میں کامیاب ہو کر ثواب حاصل کریں۔ آمین

خاکسار

عبدالمجید قریشی۔ امین انجمن الغرض علیگڑھ

کلام ہادی

غیر ممکن تھی یہ حالت پردہ ہائے ساز سے
دل میں اک ہنگامہ برپا ہے تری آواز سے

عشق کی لب بستگی گویا صدائے صور تھی
ساری دنیا گونج اٹھی آہِ بے آواز سے

بڑھ گئیں بیچارگی کی اور بھی دشواریاں
دل ہوا کیوں آشنا اُس کے فریب ناز سے

بے نیازی تیری اے نا آشنائے جذبِ دل
ہو گئے رسوا کیا عجب نکلے حریمِ ناز سے

اے خدا کیوں وجد میں ہیں میرے نالوں سے جہاں
کونسا نغمہ ہے پیدا دُکھ بھری آواز سے

راز کب تک نسبتیں رہتی ہیں دل دیکھیے
آنکھیں کب تک آشنا ہوتی نہیں انداز سے

کاش اُس کو قدر ہو جاتی نیازِ شوق کی
کاش وہ اک دن نکل جاتا فریب ناز سے

آہ سے فرقت میں ہو جاتا ہے غم کا انکشاف
دل کی باتیں پوچھ لیتا ہوں اسی غماز سے

سن ذرا اے بیقرارِ انکشافِ رازِ شوق
دل کی دھڑکن کہہ رہی کچھ دبی آواز سے

کر دیا ہے اس قدر محوِ تصور شوق نے
اپنی ہستی کو میں پاتا ہوں تری آواز سے

ابتو ممکن ہی نہیں رُک جائے سیلاب سرشک
ابتو آنکھیں ہو گئیں آگاہ دل کے راز سے

مانع افشائے غم کیونکر ہو عہدِ خامشی
دل کی حالت چھپ نہیں سکتی کبھی انداز سے

عشق کے ہمراہ ہیں صد ہا نوا ہائے خموش
دل ابھی واقف نہیں اس سازِ بے آواز سے

غیر ممکن ہے چھپانا اب تو ہادی دردِ دل
کام وہ لینے لگے ہیں غمزۂ غماز سے

(ہادی مچھلی شہری)

جلال الدین خوارزم شاہ

ایک ڈراما

پردہ دوازدہم

مجلس سوم

جلال الدین ۔ مہرجہاں

مہرجہاں ۔ (مسرت و اشتیاق کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتی ہے) اے میرے پادشاہ! آپ نے مجھے بلایا؟ ایک مدت سے یہ لطف و عنایت آپ نے میرے حال پر نہیں کی، اس عنایت سے آپ نے مجھے ایک زندگی تازہ بخشی، مجھے کیا حکم ہے میرے جلال؟۔

جلال الدین ۔ میری جان! اس قدر خوش نہ ہو، ذرا ادھر کو آؤ، میں لڑائی پر جا رہا ہوں ایک دور کا رشتہ دار ہے ۔ ۔ ۔ مگر دیکھو، تم بگڑ نا مت ۔ ہاں ۔ تو بات یہ ہے کہ قونیہ کا کیقباد مسلمانوں سے تیغ آزمائی کرنے کے لیے چنگیز کا جانشین ہونا چاہتا ہے ۔ ایوبیہ طائفے کے اشرف نے اس کے ساتھ اتفاق کیا ہے کہ بیت المقدس اہل صلیب کو ہدیتاً پیش کریں گے ۔ دونوں مل کر میرے اوپر چڑھائی کر رہے ہیں اور اس غرض کو حاصل کرنے کے لیے تاتاریوں اور عیسائیوں کے ساتھ متحد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

مہرجہاں - کیقباد جو نہ کرے تھوڑا ہے۔ رہے تو نیہ والے بلوچی وہ ہم میں سے نہیں آپ کو معلوم ہو کہ یہ لوگ ہمارے ہمیشہ مخالف رہے ہیں اور آپ کے لڑائی پر جانے سے میں کیوں بگڑوں۔ آپ کی شان شاہانہ میں یہ فتح وظفر اور شامل ہو جائے گی،

جلال الدین - یہ تو خدا کے سوا اور کون جان سکتا ہے کہ غلبہ کس کے ہاتھ رہے گا لیکن تمہارے کہنے ہی کے مطابق ایک نئی فتح حاصل کرنے کے لیے اگر جاؤں تو چند دنوں تک مجھ سے علحدہ رہنے پر راضی ہو جاؤ گی۔؟

مہرجہاں - اے میرے بادشاہ! میں آپ سے کیوں علحدہ رہوں۔ کیا سفر گرجستان میں میں نے آپ کے ساتھ رہ کر آپ کی خدمت میں کوئی کمی کی۔

جلال الدین نہیں، نہیں، بات یہ ہے کہ سفر میں میرے آرام کے لیے اس قدر مشقت و تکلیف اٹھاتی ہو کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتا۔

مہرجہاں - اے میرے بادشاہ! میں جنت میں رہوں اور وہاں کے عیش و آرام حاصل ہوں لیکن اگر آپ سے علحدہ رہوں تو وہ دنیا کی ہر قسم کی مشقت کے مقابلہ میں جو آپ کے ساتھ رہ کر ملے زیادہ تکلیف دہ ہے۔

جلال الدین - اسے میں جانتا ہوں۔ مگر تمہیں تکلیف میں دیکھ کر مجھے اضطراب ہوتا ہے۔

مہرجہاں - اے میرے جلال - آپ کے دل سے جو بات نہیں نکلتی اُسے زبان پر لانا آپ کے لیے مناسب نہیں آپ کی باتوں کو مجبوراً میں دوسرے معنی پہناؤنگی۔

جلال الدین - آؤ - میرے پاس آؤ - - - (مہرجہاں کے سر کو اپنے کندھے پر رکھتا ہے۔ دو ایک منٹ حیران حیران - آنکھوں سے اُس کے چہرہ پر نظر ڈالتا ہے اس کے بعد کمال شفقت سے کہتا ہے) مجھ پر رحم کھاؤ اور اس مرتبہ میرے ساتھ مت چلو۔ میرے حال کو نہیں دیکھتیں اور تمہیں نہیں معلوم کہ میرا یہ حال تمہاری ہی وجہ سے ہے۔

مہرجہاں - میرے جلال - میں نے آپ کے ساتھ کیا کیا - آپ کی کون سی حالت میری وجہ سے ہوئی!

جلال الدین - (چند منٹ اُس کے چہرہ پر پھر اُسی طرح نظر ڈال کر) نہیں، ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ اور اگر ساتھ لے بھی گیا تو اپنے تئیں سنبھال نہ سکونگا - مجھ پر رحم کرو۔

مہرجہاں - اے میرے بادشاہ! خدا کے لیے دیکھیے تو آپ کو کیا ہو رہا ہے۔ مجھے مار ڈالیے۔

مگر مجھے حزیں نگاہوں سے تو نہ دیکھیے۔
جلال الدین۔ مہرجہاں۔ اگر تم میرے دل کو چیر کر دیکھو تو اُس کے اندر تم کو ایک عجیب راز ملے گا۔ تم اُس کی دہشت کا مقابلہ نہ کر سکو گی۔
مہرجہاں۔ مجھے متعلق آپ کے دل میں کیوں کوئی راز چھپا بیٹھا رہے۔ میں ہر بلا۔ ہر مصیبت کے مقابلہ کی طاقت رکھتی ہوں۔ اگر کسی مصیبت کی طاقت نہیں رکھتی تو یہ کہ آپ کے دل سے بیگانہ رہوں۔
جلال الدین۔ میں سوتے میں جو باتیں کہتا ہوں اُس سے کوئی راز نہیں رہتا مگر مجھے نیند ہی کب آتی ہے کہ نیند میں باتیں کروں مگر جب میں بیہوش ہو جاتا ہوں اور اس وقت باتیں کرتا ہوں کیا اُن سے بھی تم کچھ نہیں سمجھیں۔
مہرجہاں۔ اے میرے بادشاہ! میں تو کچھ نہیں سمجھی۔ خدا کے لیے اپنے دردِ دل کو مجھ سے کہیے اندیشہ و فکر سے میرا دل دھڑک دھڑک کے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔
جلال الدین۔ آہ ... کس قدر مشابہ ہو!
مہرجہاں۔ کس سے مشابہ ہوں؟
جلال الدین۔ اس قدر مشابہ ہو کہ کسی چیز میں تو ذرّہ برابر فرق نہیں۔ سوائے اس کے کہ تمہارے بالوں میں زردی ذرا زیادہ ہے اور کسی بات میں کسی حال میں بھی تو سرِ مو فرق نہیں، تمہارے چہرہ کو جب دیکھتا ہوں تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ خدا نے جب تم میں سے ایک کو پیدا کیا تو خود اُس نے اس قدر پسند کیا کہ ایک تمثال ثانی بھی بنائی۔
مہرجہاں۔ (خوف زدہ لہجہ میں) اے میرے بادشاہ! میں کس سے مشابہ ہوں۔ میرے اور کس کے درمیان ذرہ برابر فرق نہیں۔
جلال الدین۔ اور کس سے مشابہ ہوگی؟ میرے دل میں سے باہر آؤ۔ مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں دریائے سنت میں ہوں۔ اور کس سے مشابہ ہوگی؟ اس ملکہ سے مشابہ ہو جسے میں نے اپنے ہاتھوں قربان کیا۔
مہرجہاں۔ (ڈر کر جلال کے پاس سے ہٹ کر) میرے بادشاہ!
جلال الدین۔ بالکل اُس سے مشابہ ہو۔ میرا ذہن پریشان ہے۔ میرا قلب مضطرب، میں تمہارے چہرہ پر نظر ڈالنے کا متحمل نہیں کر سکتا۔ جلال پر رحم کھاؤ اور اس سفر میں ساتھ مت چلو.... (جلال تیزی سے باہر جاتا ہے۔ مہرجہاں روتی ہوئی ایک طرف کو گر پڑتی ہے)
(پردہ گرتا ہے)

پردہ سیزدہم

مجلس اوّل

مہرجہاں۔ اس کے بعد ایک کنیز

مہرجہاں۔ (صوفے میں آہستہ آہستہ بیٹھکر) آہ! چند برس کے لطفِ زندگی کا یوں ایک دم محو ہو جانا بھی کیسی سخت مصیبت ہے۔ روح ہر وقت پرلذت تاثرات سے لطف اندوز تھی۔ ہر وقت ایسے جان پرور منظر پیش نظر تھے کہ یکایک اب جدھر نظر ڈالتی ہوں تاریکیٔ عدم کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ عیشِ زندگی کے کس قدر مخالف ہے، روح بیزار ہے۔ دنیا میرے لیے مزار ہو گئی دنیا کس قدر بڑا مزار ہے، انسان اُسے کس قدر دہشت ناک پاتا ہے (ایک لونڈی کمرہ میں داخل ہوتی ہے) لڑکی! باہر گڑبڑ کیا ہے۔ (لونڈی باہر جاتی ہے مہرجہاں اپنے دل سے باتیں کرتی ہے) ظالم تونے مجھے کیسی غفلت میں ڈال رکھا تھا، اس پردۂ غفلت کے پیچھے جو شکلیں مجھے نظر آتی تھیں میں انہیں عینِ حقیقت تصور کرتی تھی اور اُن کے زیرسایہ زندگی بسر کر رہی تھی اس زندگی کے ہر لمحہ کو فردوسی اور ابدی لمحہ سمجھتی تھی جو کبھی متغیر نہ ہوگا۔ یوں لذت کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی۔ کیا یہ انصاف ہے کہ ایک غافل بچہ کو۔ ایک عاجز دوانے کو جب بے ضرر کھیلوں میں مصروف ہو آسے اُن سے محروم کر کے اُس کی ساری عمر وقفِ گریہ و الم کر دی جائے! اُف … یہ جو کبھی کبھی التفات کی چھوٹی چھوٹی نشانیاں مجھے نظر آتی تھیں جنھیں میں ہزار جان سے عزیز رکھتی تھی، یہ التفات یہ عنایات، میرے لیے نہ تھے۔ میں تو اُس کی نظر میں انسان بھی نہیں۔ میں تو ایک مردہ کی تصویر تھی۔ یہ جو کبھی کبھی عجیب ناقابلِ فہم حزن و ملال یہ جو کبھی کبھی جگردوز برودت نظر آتی تھی یہ سب اُسی کی وجہ سے تھی۔ آہ … میرے دل کے حسیات، میرے دل کے خوف سب صحیح نکلے۔ میں اصل سبب نہیں سمجھتی تھی … بھلا کون اس

بات کا خیال کر سکتا ہے کہ دو جدا سلطنتوں کے خاندانوں میں دو عورتیں ایسی پیدا ہوں جو ایک دوسرے سے بالکل مشابہ ہوں اور وہ دونوں ایک ہی آدمی پر عاشق ہوں ؟ - دیوانہ ؟....
دیوانہ! کاش کہ تو تصویر میت نہ ہوتی تو مصنع تعظیم - جھوٹا التفات تیرے نصیب میں نہ ہوتا - شاید کبھی ایک نظر محبت - ایک نگاہ کشش تیرے لیے بھی ہوتی - اب محبت اور نظر عاشقانہ کیسی ساختہ حرمت اور تلطیفات کذب کا بھی امکان باقی نہیں وہ اب تجھ سے نفرت کرتا ہے - تجھ سے ڈرتا ہے - تجھے جادو خیال کرتا ہے - - - آہ! یہ جسم - یہ فزار منفور - یہ جسم جو حقیقت میں ایک جنازہ ہے - کیوں بیجان نہیں ہو جاتا - کیوں اپنے قفس میں روح کو لیے ہوئے عذاب جہنم سہہ رہا ہے -
(تھوڑی دیر خاموش رہتی ہے پھر روتی ہوئی ایک طرف کو گر پڑتی ہے) یا ربی الٰہی! اگر تیرا ارادہ یہی تھا کہ میں اور نیرہ ہم شکل پیدا کی جائیں تو چاہیے تھا کہ اس سے اول تو جلال کو مجھے دکھاتا، تیرا کیا بگڑتا جو وہ راحت و آرام جو سنت کی موجوں میں تو نے اُسے احسان و عطا کیا وہ میرے نصیب میں ہوتا - کیا تیری ترتیب خلقت بگڑ جاتی -

کنیز - (داخل ہو کر) حضور تشریف لاتے ہیں -

مہر جہاں - (حیرت سے) کیا بادشاہ ؟

(جلال الدین داخل ہوتا ہے - چہرہ پر انتہا درجہ کا ضعف، حالت پریشان و بگڑی ہوئی ہے)

مجلس دوم

مہر جہاں - جلال الدین

مہر جہاں - (گھبرائی ہوئی جلال کے پاس جا کر) اے میرے بادشاہ - ایسے اچانک کیسے آئے ؟

جلال الدین - ہزیمت خوردہ سپاہی اپنا ہی پیغام بر ہوتا ہے - اُس کی خبر بد خود اُس کے سوا کون لائے گا -

مہر جہاں - کیا شکست خوردہ سپاہی -

جلال الدین ۔ ہاں یہ شکست خوردہ ۔ ایسا شکست خوردہ جیسا جوار غزنہ میں ہم نے تاتاریوں کو تلوار کے بجائے محض چھڑیوں سے بھگا دیا تھا ۔ ذلیل و کمینے سپاہی، لڑائی کے زمانہ میں مجھے کچھ تھکن محسوس ہوئی تو میں محض ٹیکا لگانے کے لئے ایک درخت کے پیچھے ہو گیا، وہ سمجھے کہ میں فرار کر رہا ہوں، میں کہ یا میری فوج ساری کی ساری دشمن کی طرف چلی جائے یا بالکل محو ہو جائے ۔ لڑائی سے منہ پھیرنے والا نہیں ۔ انھوں نے جب یہ خیال کیا کہ میں فرار کر رہا ہوں تو ذرا یہ بھی تو دیکھا ہوتا کہ دشمن کے غلبہ کا کوئی تھوڑا سا نشان بھی ہے یا نہیں ۔ آہ، میں انہیں سکھاؤں گا ۔ انشاء اللہ پھر میدانِ جنگ آراستہ ہوگا اور اگر اس وقت میری تلوار کا خوف دشمن کے ہتھیاروں سے زیادہ نہ ہوا تو وہ بیشک میدانِ جنگ سے اُلٹے پھر آئیں، میں کہتا ہوں کہ ہم پھر میدانِ جنگ میں جائیں گے مگر انشاء اللہ تاتاریوں سے مقابلہ ہوگا ان سے نہیں، ملوک طوائف بھی پدر مرحوم کی طرح معلوم ہوتے ہیں ۔ ہمارے سپاہیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے پھر بھی ہمارے دشمن بھاگ گئے حالانکہ اُن کی قوت ہم سے تگنی تھی ۔ عدل الٰہی بھی کس قدر عظیم الشان ہے، اُس نے میرا جسم میرے طالع کے مناسب بنایا ہے میں نئی مصیبت میں مبتلا ہوا ۔ لیکن اس مصیبت میں پڑتے ہی وہ ناامیدی، وہ خوف آمیز تصورات سب الحمدللہ غائب ہو گئے جو آپکون کے میدان میں مجھے اطمینان حاصل تھا جو امنگیں وہاں تھیں وہ پھر رونما ہو رہی ہیں مگر مجھے خوف ہے کہ اس آفتاب شوق کا طلوع کہیں اُس روشنی کی مانند نہ ہو جو غروب آفتاب کے بعد اُفق میں ہوتی ہے مگر شکر ہے کہ میرے دل میں ایسی کشادگی و انشراح ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ میں از سرِ نو دنیا میں آیا ہوں، مایوسانہ خیالات میں کیوں وقت گذاروں ۔ میں تو صرف تمہیں دیکھنے یہاں آیا تھا، تمھیں دیکھنے کو میرا اتنا دل چاہا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیدائش سے لیکر اس وقت تک میں دیکھنے کی آرزو میں تھا ۔

مہرجہاں ۔ (اپنے دل سے) یہ جانتی ہوں کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں دل سے نہیں کہہ رہے ہیں مگر پھر بھی اُن کی باتوں پر یقین کرنے کو میرا دل چاہتا ہے ۔

جلال الدین ۔ کیوں ایسی کھنچی ہوئی بھی ہوئی بیٹھی ہو ۔ کیا مجھ سے بگڑی ہوئی ہو ۔

مہرجہاں ۔ توبہ، توبہ، میرے بادشاہ ۔ میں تو خیال کرتی ہوں کہ آپ گھبرائیں گے ۔

جلال الدین ۔ خدا کے لیے ۔ ملکہ ۔ اس قدر غمزدہ ہو کر تو نہ بیٹھو اور میرے انبساط دل کو خراب نہ کرو ۔ (کچھ سوچ کر) آہ! تم مجھ سے اس لیے روٹھی ہوئی ہو کہ میں ساتھ نہیں لے گیا ۔ پریشانی اور بیماری کی

حالت میں جو باتیں میرے مُنہ سے نکلیں اُن سے ناراض مت ہو، تمہیں خبر نہیں کہ اس وقت میرا کیا حال تھا، میری جان بخار کے ہذیان میں جو باتیں مُنہ سے نکل جائیں کہیں کوئی اُن کا بھی خیال کیا کرتا ہے۔

مہرجہاں ۔ اے میرے پادشاہ! میں بگڑی نہیں ہوں۔

جلال الدین ۔ جانتا ہوں۔ جانتا ہوں۔ چھپاؤ مت۔ بخار میں بھی انسان جو کچھ کہتا اور سنتا ہے اس کے ذہن میں خواب کی طرح باقی رہتا ہے، میں نے جو کچھ کہا وہ مجھے سب یاد ہے۔ میری جان ملکہ۔ تمہارے چہرہ کی بناوٹی مسرت بھی صبح کاذب کی طرح خوبصورت معلوم ہو رہی ہے۔ مہرجہاں تمہیں مغموم دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ یہ جو دنیا کے آرام و غم میرے دل میں جمع ہو گئے ہیں اُنہیں کون تسلی دیگا۔

مہرجہاں ۔ آہ! آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے اگر ہزار میں سے ایک کو بھی صحیح سمجھوں تو مجھے وہ مسرت نصیب ہو جو جنت میں حوروں کو ازل سے ابد تک بھی نصیب نہ ہوگی،

جلال الدین ۔ اگر میں حقیقت میں محبت نہیں کرتا تو مجھے کون سی ضرورت ہے کہ محبت کا سوانگ بھروں۔ ایک دن میں نے اپنا حال بیچاری زاہدہ سے کہا تھا تو وہ بولی کہ خدا تمہیں اسقدر دوست رکھتا ہے کہ چونکہ تم نے اپنی محبوبہ کو اس کی راہ میں فدا کیا اُس نے تمہارے لیے تمہاری محبوبہ کی ایک ہمشکل بھیجی اور عنایت کی اس عنایت کو وسیلۂ محبت سمجھنا حقیقت میں خدا نے اپنے کسی بندہ پر جو کرم نہیں کیا وہ مجھ پر کیا۔ کیا میں ایسا احمق ہوں کہ اس عنایت کو ایک وسیلۂ الم قرار دوں۔

مہرجہاں ۔ (اپنے دل سے) شاید صحیح کہہ رہے ہیں (جلال سے) آپ اُسے چاہیں یا نہ چاہیں مگر مہرجہاں تو آپ کی اسیر آپ کی فدائی ہے، ہر شخص اپنی جان سے زندہ رہتا ہے میں آپ کے وجود سے زندہ ہوں۔ ہر شخص اپنے محبوب کے وصل کا تصور باندھتا ہے میں آپ کی راہ میں قربان ہونے کے سوا اور کچھ نہیں سوچتی۔ (دروازہ سے ایک کنیز داخل ہوتی ہے اُس سے) کیا ہے!

کنیز ۔ پادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے مجھے یہ دیا گیا ہے اور مجھ سے کہا ہے کہ فوراً پیش کروں۔

جلال الدین ۔ لاؤ، (کنیز جلال کو دو اطلس کے خریطے پیش کرتی ہے۔ جلال اُنھیں کھول کر

پڑھتا ہے کنیز باہر جاتی ہے)
جلال الدین۔ کس قدر فضول الفاظوں کا تار باندھ دیا ہے۔ مقصد کیا ہے۔ صلح چاہتے ہیں،
مخصوص ایلچی بھی بھیجے ہیں؟
مہر جہاں۔ کس نے میرے بادشاہ!
جلال الدین۔ (نظر کاغذ پر) کیقباد اور اشرف (نظر اُٹھا کے) بہت خوب، مسلمانوں میں خونریزی
حرام ہے، مصالحت سید الاحکام ہے، خوب، اسے جانتے تھے تو میرے اوپر چڑھائی کیوں کی۔ کیا
میں نے تمھیں لڑائی کے لیے بلایا، کچھ سوچ کر ان کا اصل مقصد کیا ہے۔ میرے ہراول کے گنتی
سو آدمیوں کے دھاوے کو اُنھوں نے دیکھا اور اپنی ہزیمت کو اٹل قضا سمجھا، اب ڈر کر پھر تنہا اپنے
نصیبے کو آزمانا نہیں چاہتے اپنے دوستان خالص تاتاریوں اور عیسائیوں کا انتظار کرنا چاہتے ہیں۔
بہتر ہے انتظار کریں میرا فرض تو یہی ہے کہ جہاں تک ہوسکے مسلمانوں میں تلوار نہ چلنے دوں۔ صلح چاہتے
ہیں تو صلح کر لوں، نتیجہ کی خرابی کا میں ہی ذمہ دار ہونگا اگر وہ عہد شکنی کریں گے تو عدالت الٰہی میں اسکا
نتیجہ بھگتیں گے (ملکہ سے) آج شام کھانا ہم تم ساتھ کھائیں گے۔
مہر جہاں۔ (نہایت خوش ہو کر) کیسی عنایت، اے میرے بادشاہ!
جلال الدین۔ اب بھی تمھارا روٹھنا نہیں گیا، لو قسم لو، اب جہاں جاؤنگا تمھیں ساتھ لیجاؤنگا۔
میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔
مہر جہاں۔ اے میرے بادشاہ! خدا کی توفیق و عنایت ہر وقت آپ کے ساتھ ہو۔ (جلال الدین
باہر جاتا ہے) یا اللہ کیا جلال کی باتیں صحیح ہیں، کیا میں اُس کی نظر میں نیرہ کا بھوت نہیں۔ بلکہ نیرہ
کی ہمشکل محبوبہ ہوں۔

پردہ چہار دہم

ایک کمرہ جس میں ایک کنیز ہے۔ ایک طرف کو جلال سو رہا ہے۔ دوسری طرف ایک چھوٹی چوکی
پر اک تنہا موم بتی جل رہی ہے۔ نورالدین زمین پر ایک نمدے پر بیٹھا ہے۔ سامنے دوائیوں کی بڑی
بڑی شیشے رکھے انھیں دیکھتا ہے۔ اُس کے پاس نوکروں کا سردار سو رہا ہے کمرے کے بائیں جانب ایک
اور کمرہ ہے جس کے دروازہ پر پردہ پڑا ہے۔ اس کے مقابل میں ایک بند دروازہ نظر آتا ہے)

مجلس اوّل

جلال الدین سوتا ہوا - نوکروں کا سردار سوتا ہوا

نورالدین - اور اُس کے بعد مہرجہاں

نورالدین (دوائیوں کے شیشوں پر نظر ڈال کر، اپنے دل سے) کچھ نہیں، یہ حکیم خاک بھی حکیم نہیں
جو لوگ کہتے ہیں کہ طب و حکمت ایک چیز ہے وہ کس قدر غلط کہتے ہیں۔ دو تین مٹھی معدے میں ایک ایک گھنٹہ
کے اندر، تین چار سیر پانی بھر دینا یہی حکمت ہے؟ شاید ایک زمانہ ایسا آئیگا جب کہ جو فائدہ اس تین چار سیر پانی
سے حاصل ہوتا ہے وہ دو قطروں سے حاصل ہوگا۔ مگر نتیجہ کیا؟ رازی، فارابی، ابن سینا کیا کیا حقائق
کشف کئے، مگر سب اپنے ساتھ مزاروں میں لے گئے۔ ممکن ہے کہ بقراط اپنی حکمت کے زور سے مُردوں کے
بدن میں حرکت لے آئے، مگر یہ اس کے اختیار میں نہ تھا کہ اپنے بیماروں کو جنھیں اجل نے اپنے پنجے میں پکڑ لیا
تھا اس سے روک لے کہ وہ انسان سے مٹی کا ڈھیر بن جائیں۔ اُف! ہر چیز مجہول اور نامعلوم ہے، گذشتہ
اور زمانۂ آئندہ اُس سے زیادہ نامعلوم۔ ازل سے تاریکی میں دنیا میں آئے، کچھ آنکھیں کھلیں، کچھ
روشنی نظر آئی، اور اُس کے بعد سیدھے ابد کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابد کی پہلی منزل موت ہے۔ یہاں کی
آنکھیں پھر بند کر دی جاتی ہیں۔ اک وقت آئیگا کہ پھر کھلیں گی؟ مگر کب کھلیں گی؟ کیا زمانہ مزار بھی اتنا لمبا ہے جتنا اُدھر
سے دُنیا میں آنے کا زمانہ؟ مگر یہ خیالات کے گھوڑے دوڑانے کا زمانہ نہیں۔ بادشاہ بیمار پڑا ہے
اور کیسا بیمار؟ کیسی مصیبت ہے! چہرے کا رنگ ایسا زرد پڑ گیا ہے جیسے آفتاب غروب کے وقت ہوتا ہے
اُس کا جسم ایسا ہو گیا ہے جیسے قبر سے کوئی مردہ اُٹھ کھڑا ہوا ہو۔ جسم میں وہ آگ پھنک رہی گویا اندر ایک
جہنم بند ہے۔ یہ حال دیکھنے سے تو بہتر ہے کہ انسان دنیا ہی میں نہ آئے۔ پیدا ہونے سے پہلے مزار میں چلا جائے۔
مگر ارادہ الٰہی سے لڑائی نہیں لڑی جا سکتی۔ سوائے اس کے چارہ نہیں کہ اپنی بساط بھر کوشش کی جائے
دیا اس کے شیشوں کو اُٹھا کر اس میں سے ایک ایک گھنٹہ بعد اک قدح، اس میں سے دو دو گھنٹے بعد اک
قدح پلانے کی ہدایت ہے۔ بہت اچھا طبیب صاحب! مگر اُسے جگائے کون؟ اس بیمار کو جسے اک دو
گھنٹے کی نیند اب نصیب ہوئی ہے، اس بیمار کو جو حمیت، اسلامیت، انسانیت کا نو طلوع آفتاب ہے، جو ہم سب

کی امید نجات ہے، کس کا ایسا پتھر کا دل ہو کہ اس عزیز بیمار کو اُس کی آرام نیند سے بیدار کرے قسم ہے خدا کی، اگر ہمارے اطبا کا اپنے بیماروں کے ساتھ یہ سلوک ہے تو اُن کے لیے مناسب ہے کہ وہ چنگیز کی فوج میں سپاہی ہو جائیں۔

مہرجہاں:۔ (دروازے میں سے نظر آتی ہے) مبارک: مبارک۔

مبارک:۔ (سوتے سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) حضور۔

نورالدین:۔ (جس دروازے سے مہرجہاں داخل ہورہی ہے، اس کے سامنے جاکر) ملکہ! کچھ حکم ہو!

مہرجہاں:۔ مولانا! کیا آپ بادشاہ کی نگرانی کررہے ہیں۔

نورالدین:۔ میری اور مبارک کی نوبت ساتھ ساتھ تھی۔ اس بیچارے کی آنکھ لگ گئی۔ معاف کیجیے۔

مہرجہاں:۔ میں اس مہینے بھر میں جس قدر سوئی ہوں اُسے جمع کیا جائے تو چار گھنٹے نہ ہوں۔

مبارک:۔ (اٹھکر) حضور کیا حکم ہے۔

مہرجہاں:۔ ٹھیر یہیں ٹھیر، تو غریب تو ڑا ہی ہے۔ (نورالدین سے) مولانا! طبیب بادشاہ کی بیماری کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ کچھ آپ کے بھی سمجھ میں آیا۔

نورالدین:۔ حضور نے بڑا مشکل سوال کیا ہے۔ ہمارے ملک میں طبیب ہے ہی کون؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ بادشاہ کی بیماری تفکرات کی وجہ سے ہے۔ باقی اس مصیبت کی تشخیص میرے بس کی نہیں باقی خدا کی درگاہ سے مجھے یہ امید ہے کہ وہ ملت اسلامیہ پر رحم فرمائیگا، اور میرا خوف از سرتاپا غلط ثابت ہوگا۔

مہرجہاں:۔ سمجھتی ہوں، سمجھتی ہوں۔ آپ کو جس بات کا اندیشہ ہے اُسے میں بھی سمجھتی ہوں، بادشاہ کی تپ، تپ محرقہ سے مشابہت رکھتی ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اس دنیائے دنی سے اپنے تئیں بالاتر پایا اور اسے اپنے رہنے کے قابل نہیں سمجھا۔ دنیا کو دشمن کے پنجے سے چھڑا نہ سکا، خود اپنے تئیں دنیا کے پنجے سے چھڑانا چاہتا ہے۔ اگر خودکشی ممنوع نہ ہوتی، تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ وہ کب کا خودکشی کر چکا ہوتا۔ (اپنے دل سے) آہ! اگر خودکشی کر لیتا، تو مجھے یکیں چھوڑ جاتا اور اپنی چھوٹی بیرہ کے پاس چلا جاتا۔ (یہ آواز) اس کی روح، اجل سے اس عنایت کی خواستگار ہے کہ اُسے علائق دنیا سے آزاد کردے، جس طرح وہ دولت و ملت کی سطوت و شان کو زیادہ کرنے کی کوشش کرتا تھا، اسی طرح اپنی بیماری کو بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی کیا تدبیر کریں۔ اس کے دل کی ناامیدی کو کس طرح رفع کریں۔

مبارک ۔ میں اگرچہ ایک چھوٹا آدمی ہوں مگر میرے دل میں روشنی کی ایک تھوڑی سی جھلک کے مانند ایک خیال ہے اُسے عرض کرتا ہوں، میری ناچیز رائے میں بادشاہ کو اس نا اُمیدی اور اس حالت سے نجات دینے کا ایک ہی چارہ کار ہے اور وہ یہ کہ تاتاریوں کے ساتھ لڑائی کی جائے۔

نورالدین ۔ ہمارے بادشاہ کو جس چیز نے سب سے زیادہ مایوس کیا وہ مسلمان بادشاہوں کا نااتفاق سے اتفاق کرنا تھا۔ اپنے بھائی غیاث الدین کی خیانت نے بھی اس کے دل پر اتنی چوٹ نہ لگائی تھی اُس کی ساری کوشش یہ بھی کہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق ہو اس لیے جو محض نفاق کا وشنوں کی وجہ سے لوگوں نے خیانتیں کیں - بغاوتیں کیں - اس کو اس نے کچھ زیادہ اہمیت نہ دی، اس کا ہرایک کام نجات اسلام کے لیے تھا اور مسلمانوں سے بھی وہ اسی کی توقع کرتا تھا لیکن اُس نے سب سے بڑی خیانت سب سے بڑی بیوفائی مسلمانوں ہی سے دیکھی اس کے بھائی اس کے ہم مسند مسلمان ہی تو تھے، میں خیال کرتا ہوں کہ حضرتِ آدم جنت سے نکلتے وقت جس قدر مایوس ہوئے ہوں گے ہمارا بادشاہ بھی جس فردوسِ دنیا کا تصوّر اپنے ذہن میں کئے ہوئے تھا اُس سے محروم ہو کر اتنا ہی ناامید ہوا ہو گا ۔

مہر جہاں ۔ آہ ۔ بیشک ایسا ہی ہے اور جس طرح حضرتِ آدم دوبارہ جنت کو گئے ۔ یہ بھی جنت کو جانا چاہتا ہے ۔ وہاں اس کے لیے ایک قصر اور اس قصر میں ایک حور اس کی منتظر ہے ۔

جلال الدین (بستر میں کروٹ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے) اپنے بالوں کو مٹی سے صاف کر ۔ کیا تو بھوت بن گئی ہے، کیا قبر سے نکل کر مجھے ستانے کے لیے آئی ہے ۔ میں نے تجھے اللہ کی راہ میں قربان کیا تھا دنیا میں تیرا کیا کام ؟

مہر جہاں ۔ الٰہی ! الٰہی ! میں ہی اُس کے نظروں کے سامنے ہوں، تپ کی حالت میں بھی آنکھیں بند ہیں مگر میں ہی اس کے سامنے پھر رہی ہوں ۔ میں دنیا سے اُٹھ بھی جاؤں تو بھی اُس کے ذہن میں یہی خیالات رہیں گے ۔

جلال الدین ۔ (بستر میں حرکت کرتے ہوئے) بچہ کہاں ہے، قطب الدین کو کیا کیا ۔ اُسے مٹی میں دبا کے یہ زندہ کابوس کیا ہے جو تیرے ساتھ پھر رہا ہے ۔ مبارک مہر جہاں کا ہے ۔ اس کا غلام ہے تیرے پاس کیوں ہے، سنت کی ندی تمہیں نظر نہیں آتی ۔ بالکل خاک مزار کی طرح معلوم ہوتا ہے اس کے اندر مردوں کی ہڈیاں ہیں، ہڈیوں کے ٹکڑے ہیں، غیاث اپنے کیے کی سزا پائی ملعون ۔ دیکھا تو نے ۔ اسلام کی ہزیمت کا باعث ہونا کس عاقبت کو پہونچا

ہی - بیچاری زاہدہ اب بھی بیٹھی اس مجرم کے سرہانے رو رہی ہے جو اللہ کی رحمت سے محروم ہو گیا ہے، مگر کیا کرے بیچاری عورت، یہ ماں کی مامتا ہی، کاش کہ اس خنزیر کو جننے کے بجائے ایک سانپ جنتی تو اس کا ضرر بہت پہونچتا ہے بہت پہونچتا تو چند آدمیوں تک پہونچتا، چنگیز مر گیا مردود چنگیز جس کی خواہشوں کے لیے دنیا تنگ تھی وہ چار گز زمین میں دبا پڑا ہے ملعون تو اس دنیا کو اپنے لیے اور خدا کے لیے ایک جگہ کم سمجھتا تھا - جو لوگ خدا کے بندوں کے لیے زندگی بسر کرتے تھے انھیں کہتا تھا کہ جائیں اور دوسری دنیا تلاش کریں - آج مرا پڑا ہے، قبر میں دھنسا پڑا ہے - دیکھو بلند ہوتا ہے - پھول رہا ہی - پھول پھول کر بغداد پہونچا - عباسیوں کے تخت کو خاک سے ملا دیا - پھر بلند ہوتا ہے - آسمان تک بلند ہوتا ہی - ملعون، دور فلک کو لوٹا کر کیا پھر دنیا میں آئیگا، الٰہی ایسا نہ ہو - اپنے بندوں پر رحم کر - ایک بجلی بھیج جو اس ملعون کے مزار کو اس کی طرح تحت الثرا میں لیجا ئے -

مہر جہاں - بادشاہ کے اس حال کی میں متحمل نہیں ہو سکتی، میں اسے جگاؤں گی - خواب میں اُسے جو تکلیف پہنچ رہی ہی وہ ناقابل برداشت ہے -

نورالدین - آپ کو ترس نہیں آتا، اتنے دن ہوئے بادشاہ دو گھنٹہ کی نیند بھی نہیں سوئے -

جلال الدین - (بڑبڑاتے ہوئے) اے میرے اللہ، اے میرے اللہ، تو نے فرعون جیسے چنگیز جیسے لوگوں کی جو تیری ذات مقدس سے شریک ہونے کا دعویٰ کرتے تھے رسّی دراز کی تیری حکمت انسانی عقل سے بالا ہے، ان کی جزا و سزا بھی . . . مگر یہ ظالم جو تیرے دین تیرے پیغمبر تیری شریعت کے نام کو چنگیز و فرعون سے بھی بڑھکر دنیا سے اٹھانا چاہتے ہیں اور جن پر اتنی لعنتیں ہوں کہ چنگیز و فرعون پر بھی کبھی نہیں ہوئیں تو انہیں کب تک وقت دیا جائے گا -

مہر جہاں - خدا کی قسم میں بادشاہ کو جگاؤں گی - یہ نیند آرام کی نیند ہے؟

جلال الدین - (بستر پر حرکت کرتے ہوئے) اُف، . . . جلا جا رہا ہوں - میرے معدہ میں، میرے دل میں آگ بھڑک رہی ہے - کوئی نہیں جو مجھے تھوڑا سا پانی، تھوڑی سی دوا دے -

مہر جہاں - لائی میرے بادشاہ (نقاب اٹھا کر دوا دیتی ہے)

جلال الدین - یہ تمہارے پاس کون کھڑے ہیں؟

مہر جہاں - نورالدین اور مبارک، اسی وجہ سے نقاب ڈالے ہوئے ہوں - میرے بادشاہ!

جلال الدین - کیا باتیں کر رہے ہو؟

مہر جہاں - آپ کے حال کے سوا اور کیا باتیں کر سکتے ہیں - خواب میں بھی آپ دنیا کو سنوارنے

کی کوشش کر رہے ہیں۔ بڑبڑانے کی حالت میں بھی آپ پُردرد باتیں کرتے ہیں۔

جلال الدین۔ بات کاٹ کر (غفلت کے ساتھ) خدا کا واسطہ۔ حرمت اسلام کا واسطہ مجھے مت چھیڑو، مجھے میرے حال پر رہنے دو، میں نے چند دفعہ شہید ہونے کا ارادہ کیا میرا دامن پکڑ لیا۔ مجھے کہا فرض ہی فرض ہے اور پھر کسی نے بھی اپنا فرض ادا نہ کیا۔ مجھے کہا غیرت لازم ہے اور پھر سب غائب ہو گئے۔ میں ایک خرقہ۔ ایک لقمۂ نان پر قناعت کر سکتا تھا۔ مگر کسی نے دنیا کے بہترین نعمتوں کو لقمہ اور بہترین خلعت کو خرقہ کی نظر سے دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ مجھے یہ نہیں سمجھ سکتے، انہیں میں نہیں سمجھ سکتا خدا انہیں جو شہید ہو گئے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے جو زندہ ہیں وہ سلامت باقی رہیں۔

مہر جہاں۔ اے میرے بادشاہ۔ کیا میں بھی اُس زمرہ میں داخل ہوں جس نے آپ کو نہ سمجھا اور آپ کو سمجھ کر آپ کے مطابق نہ ہوا۔

جلال الدین۔ نہیں تم نہیں ہو۔ نورالدین بھی نہیں۔ مبارک بھی نہیں، اُن کے علاوہ چند اور لوگ ہیں مگر کیا کریں۔ یہ اُمید کب تک رکھیں کہ دس بارہ آدمی دنیا کو پنجۂ فلک سے چھڑا دیں گے۔ آہ والد مرحوم۔ والد مرحوم۔ آپ ہزار درجہ عقل مند تھے۔ بس آپ میں اتنی کمی تھی کہ آپ نے آپ نے ایفائے فرض کی اتنی کوشش نہ کی جتنی میں نے۔

نورالدین۔ اے میرے بادشاہ! کیا اب ہم ترکِ فرض کریں گے۔

جلال الدین۔ دشمن کے مقابلہ میں، دین کی راہ میں آرزو کرنے کے سوا اب ہمارا فرض اور کیا رہ گیا ہے۔ ہم اُسے چھوڑنا بھی چاہیں تو وہ ہمیں نہ چھوڑے گا۔

مہر جہاں۔ میرے جلال۔ میرے بادشاہ! اپنے اوپر رحم کیجیے کہ آپ کا اپنے پر رحم کرنا عین اسلام پر رحم کرنا ہے مجھے حمیت اور غیرت آپ کی محبت نے سکھائی۔ وہ جلال الدین جو معالی میں دنیا کا اُستاد تھا کیا اب ایک عورت سے سبق لینے کا محتاج ہو گیا۔

جلال الدین۔ میرے ساتھ مرنا چاہتی ہو۔

مہر جہاں۔ اے میرے بادشاہ۔ آپ کے دو بازو ہیں، مجھے بھی خدا کی راہ میں فدا کیجیے تاکہ ایک بازو میں نیزہ اور دوسرے بازو میں مہر جہاں سوئے اور اس طرح جو دیوانہ الٰہی میں ہم منظر پیش کریں کیا عجب وہ کیا منظر ہو گا۔

جلال الدین۔ افسوس۔ کہ ایک کے جسم سے پانی کے قطرے گرتے ہوں گے۔

مہر جہاں۔ انشاءاللہ۔ میرے بدن سے خون شہادت بہتا ہو گا۔

مجلس دوم

اشخاص سابق۔ اورخاں

(کمرے کا دروازہ آہستہ آہستہ کھٹکھٹایا جاتا ہے)

نورالدین ۔ کون ہے ؟
اورخاں ۔ (باہر سے) میں ہوں ۔ اورخاں، بادشاہ کو بیدار کیجیے ۔ ایک اہم واقعہ پیش آیا ہے ۔
جلال الدین ۔ میں جاگ رہا ہوں ۔ کیا کہنا چاہتے ہو ؟
اورخاں ۔ (باہر سے) حضور سے تنہائی میں شرف یاب ہونا چاہتا ہوں ۔ جو بات عرض کرنی ہے وہ بہت اہم ہے ۔
جلال الدین ۔ کہو ۔
اورخاں ۔ حضور کے سوا اور کسی سے نہیں کہہ سکتا ۔
جلال الدین ۔ (مبارک سے) دروازہ کھول دے آجائیے ۔
اورخاں ۔ (داخل ہوکر) حضور سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں ۔
جلال الدین ۔ یہ نقاب والی عورت میری حرم ہے ۔ یہ نورالدین ہے ۔ یہ مبارک ہے ۔ تنہائی کی کون سی ضرورت ہے ۔
اورخاں ۔ میں نے دیکھ لیا، میرے بادشاہ، اب آپ لوگ یہاں سے جائیے ۔ میرے ساتھ جو سپاہی یہاں ہیں ان میں سے چند نفر کے ساتھ نورالدین اور ملکہ کو لیکر پہاڑوں میں چلے جائیے باقی فوج میرے ساتھ یہیں رہے گی ۔ مرتے دم تک میں حضور کی حفاظت کی کوشش کرونگا ۔
جلال الدین ۔ کس سے محافظت کی کوشش کروگے ؟
اورخاں ۔ اے میرے بادشاہ، عراق میں ہمارے جتنے آدمی ہیں خدا اُن سب کو برباد کرے اور برباد تو ہو ہی گئے خدا انھیں آخرت میں اُن کی غفلت کی سزا دے ۔ شمالی ایران محو ہوگیا،

ہمارے دشمن کے نیزے ہیں نظر آ رہے ہیں۔ جب تک اُنھیں نیزے نظر نہ آئے اُنھوں نے دشمن کے گھوڑوں کے ہنہناہٹ اور اُن کی ٹاپوں کی آواز سنی۔ ہمارے پاس پانچ ہزار آدمی بھی نہیں۔ تاتاریوں کے پاس ایک لاکھ سے زیادہ فوج ہی، آدھ گھنٹہ نہ گزرنے پائیگا کہ ہم سب اسیر یا ہلاک ہو جائیں گے۔ اگر حضور حکم دیں تو میں دشمن کو تین چار گھنٹے روک سکتا ہوں اس عرصہ میں حضور اپنا کچھ انتظام فرمائیں۔

جلال الدین۔ جاؤ۔ ، مہرجہاں اور مبارک، تم اس کمرہ میں جاؤ (وہ جاتے ہیں، نورالدین سے) مولانا، میں اور خاں کے ساتھ مقابلہ کو نکلونگا۔ ملکہ کو کس کے سپرد کریں۔

نورالدین۔ میرے بادشاہ، مسلمان حکمراں سب کے سب بیوفا۔ بے عزت نکلے۔ کوئی یزید کوئی حاکم بامراللہ کی تقلید کرتا ہی۔ میں نے حضور کو ان کے مقابلہ میں جنگ کرنے کی صلاح دی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور خاں کا ساتھ دینے میں میں اس وقت حضور سے آگے رہونگا۔ حضور اب مجھسے رائے نہ لیں، اس کے بعد میرا مقصد، میری فکر۔ میری رائے یہ ہے کہ جان دیدوں (نورالدین جاتا ہی)

جلال الدین۔ (اپنے دل سے) سبحان اللہ، اس قدر اصحاب ہمت میں سے کسی کو بھی مصائب دنیا کے برداشت کرنے کا اقتدار نہ رہا۔ کریں بھی کیا بیچارے۔ اصحاب تصوف کے تعریف کے مطابق قلب ایک جدا دنیا ہے۔ مگر اس بھاری بوجھ کے نیچے یہ دنیا بھی پاش پاش ہو جائے گی۔ دل باندازۂ حیات مختصر مگر دنیا کے تکالیف دنیا کی طرح بے پایاں۔ اچھا ٹھرو۔ ملکہ۔ مبارک۔ یہاں آؤ (دونوں اندر داخل ہوتے ہیں) مبارک۔ لڑائی نے دوسری شکل پیدا کری ہے۔ ملکہ کو تیرے سپرد کرتا ہوں۔ ان پہاڑوں کے پیچھے اپنے تئیں جا کر چھپا لو اور میرا خیال مت کرو۔ میرے متعلق ایک فرض ہے اُسے پورا کردوں گا۔

مہرجہاں۔ میرے بادشاہ! میرے بادشاہ! میں آپ سے جدا ہو کر کہیں نہ جاؤں گی۔ جس طرح فلک جسم سے سایہ کو جدا نہیں کر سکتا مجھے بھی آپ سے جدا نہ کر سکے گا۔ آپ جہاں جانا چاہتے ہیں جائے۔ جو کرنا چاہتے ہیں کیجیے، میں سایہ کی طرح آپ کے قدموں میں آپ کے ساتھ چلونگی۔ آپ جہاں رہیں وہاں تھوڑی سی جگہ مجھے بھی دیں، جنت ہو تو وہاں، زمین ہو تو وہاں۔ آپ کے بستر میں میرے لیے تھوڑی سی جگہ تھی تو کیا آپ مزار میں اُس تھوڑی سی جگہ کو مجھے نہ دین گے۔

مبارک ۔ اے میرے بادشاہ! میں ملکہ کا سایہ ہوں میں اسکی ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں مگر اُس کے تابوت کا اُٹھانا میرے ہاتھوں سے نہ ہو سکے گا۔ میرے حال کو دیکھئے مصیبتیں اُٹھا اٹھا کر جہنم کے خدام کا ہمشکل ہو گیا ہوں، جہنم کے خدام کے ہمشکل آدمی کا ایک شہید کے مزار میں کیا کام، مجھ پر تو رحم ہی کیجئے۔

جلال الدین۔ نکل یہاں سے او نامبارک، (مبارک باہر جاتا ہے۔ جلال مہر جہاں سے کہتا ہے) اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، میں تم سے جُدا ہو کر جاؤنگا۔ میری بات تو سنو، نیرہ کے واقعہ کو جانتی ہو نیرہ بالکل تمہاری طرح تھی۔ ہمارے سامنے دریا آیا میں نے اُسے دریا میں ڈبو دیا۔ تم نے ابھی کہا تھا کہ میں خون کے دریا میں ڈوبوں گی۔ میں خون کا دریا کہاں سے لاؤں کہ اُس میں تمہیں ڈبو دوں اگر کہیں تم تاتاریوں کے ہاتھ پڑ گئیں تو تمہارا جو حال ہوگا اس کا خیال مجھے مزار میں وہ تکلیف دیگا جس کی نہ خدام جہنم نہ ملائکہ سوال سے مجھے اُمید ہے۔ کیا تم اصرار کر کے میرے ساتھ جانا چاہتی ہو اور پھر کسی مشرک تاتاری کی ہم بستر لونڈی بننا چاہتی ہو؟

مہر جہاں ۔ آہ، جلال! جلال! آپ جہاں جائیں گے میں وہاں جاؤں گی۔ آپ جو حکم دینگے وہ کرونگی۔ آپ کے کسی حکم کی مخالفت نہ کرونگی۔ کسی مشرک کی ہم بستری؟ یا ربی! یا ربی! ایسے وقت انسان کیا کرے۔ کیا موت اس کے حال پر رحم نہ کرے گی؟ میرے بادشاہ مجھے حکم دیجیے کہ میں کیا کروں۔ آہ۔ دیکھو، تمہاری آنکھیں آفتاب کی طرح چمک رہی ہیں۔ میرا جانا ہوا میلہ تبریز میں دیکھا ہوا جلال یہ تھا۔ اُس وقت اس چہرہ کے ایک طرف آتش فروزاں کی روشنی اور دوسری طرف دُھوئیں کا عکس تھا۔ اس وقت اس مبارک چہرہ کے ایک طرف آتش غیرت اور دوسری طرف درد مایوسیت ہے مگر اس وقت کے چہرہ سے یہ چہرہ زیادہ روشن ہے۔ آہ، جلال، بیہوش ہو جاؤنگی . . . نہیں بیہوش نہیں ہونگی . . . مشرکوں کی ہم بستر لونڈی نہیں بنوں گی . . . میں آپ سے جدا نہ ہونگی، جدا ہوں گی بھی تو دنیا میں موت کے ذریعہ جدا ہونگی، اور آخرت میں انشاءاللہ پھر ہم ایک جگہ ہونگے۔ اللہ منصف ہے، فرمائیے؟ میں کیا کروں۔ حکم دیجیے کہاں جاؤں؟

جلال الدین ۔ (کمال جدو متانت سے مہر جہاں کے ہاتھ چومتا ہے) میری طرح طبیعت پر قابو رکھو مبارک کو بلاؤ اس سے کہو کہ اول تمہیں سامنے پہاڑوں کے پیچھے لیجاوے۔ میں دوسری جگہ جاؤنگا۔ اگر فلک نے رخصت دی تو انشاءاللہ پھر ملیں گے۔ مبارک کے پاس کچھ سپاہی بھی ہیں،

مبارک لڑائی بھی لڑ سکتا ہے۔
مہر جہاں۔ (بیہوشی کے عالم میں جلال، جلال، آپ کی کمر میں جو خنجر ہے وہ مجھے دیجئے کہ اگر کوئی تاتاری مجھے پکڑنے آئے اور آپ میرے پاس نہ ہوں اور لڑائی بھی ایسی بے رحم نکلے کہ میں زندہ رہوں (زور سے جلال کے کمر سے خنجر نکال لیتی ہے) اب مہر جہاں پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں۔ مجھے ڈبونے کے لیے اگر خون کا دریا آپ کو نہ ملے گا تو میں خود پیدا کر لونگی۔ جائیے اے میرے بادشاہ راہ مولا آپ کے لیے کشادہ ہو۔ (جلال جاتا ہے) مبارک! مبارک! (مبارک داخل ہوتا ہے) ہمارے آقا گئے، کیا تم نے دیکھا؟
مبارک۔ ہاں میں نے جاتے دیکھا،
مہر جہاں۔ تمہیں کہاں جانے کے لیے حکم دیا؟
مبارک۔ پہاڑوں کے پیچھے جانے کے لیے، لیکن . . .
مہر جہاں۔ لیکن ویکن کچھ نہیں، سپاہیوں کو حاضر کرو، میں ابھی جاتی ہوں تمہارے پاس کوئی مردانہ لباس ہے۔
مبارک۔ ہے مگر . . .
مہر جہاں۔ (بات کاٹ کر) اگر مگر کچھ نہیں، کہاں ہے لباس؟
مبارک۔ اندر کے کمرے میں۔
مہر جہاں میں جا کر لاتی ہوں، تم دو منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ (جاتی ہے)
مبارک (اپنے دل سے) ملکہ۔ ملکہ، جس قدر بادشاہ سے تمہیں محبت ہے اگر اللہ اور دین سے بھی اتنی ہی محبت ہے تو یقیناً تم مقام ولایت میں ہو، بادشاہ کہاں گئے، وہ بھی تلاش موت میں گئے ہیں۔ عجیب بات ہے ملکہ بھی موت کی عاشق ہو گئی ہے۔ موت میں اُن میں اور ہم میں فاصلہ رہے گا یا مزار میں یہ کسے معلوم! (مبارک جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)
(باقی آیندہ)

علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر ایٹ لا
کے
اردو کلام کا مجموعہ
"بانگ درا"
چھپ کر تیار ہو گیا ہے جلد منگوائیے ورنہ دوسرے
ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔
قیمت چار روپیہ علاوہ محصولڈاک بذمہ خریدار
المشتہر
شیخ طاہرالدین بازار انارکلی لاہور
ایک متبرک اور نادر تحفہ
ملنے کا پتہ
منیجر صاحب انسٹی ٹیوٹ پریس علیگڑھ
سیر المصنفین
از
مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے (علیگ)
ملنے کا پتہ منیجر دارالاشاعت غازی آباد

"شذرات"

سالِ نو کی آمد سال گزشتہ کا اختتام اور سال نو کا افتتاح "خیر باد" اور "خیر مقدم" کی کشمکش میں مبتلا کرنے کے لئے عجیب وغریب سامان رکھتے ہیں ہم حیران ہیں کیا کریں کیا نہ کریں مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ مستقبل کی دل فریبیاں، ماضی کی واقعات نگاری سے کہیں زیادہ دل کش ہیں آئندہ نامہ وپیام کے وعدے گزشتہ تساہل کی معذرت سے بدرجہا خوش گوار ہیں۔ لہذا اس اقتضائے قلبی سے متاثر ہو کر ہم اپنے مخلص ناظرین میگزین اور احباب کی خدمت میں بہ کمال صدق واخلاص ہدیۂ مبارک باد پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ "گر قبول افتد زہے عز وشرف"۔

ایک مبارک مراجعت ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کی ذات کسی تعریف وتوصیف سے بے نیاز ہے سال گزشتہ آپ بہ غرض سیاحت انگلستان چھ ماہ کے لئے تشریف لے گئے تھے صاحب موصوف کی ہر دل عزیزی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ بظاہر اس مختصر سی غیبت میں ہر شخص چشم براہ اور سراپا انتظار بنا ہوا تھا چنانچہ دو روز پیشتر واپسی کا مژدہ سن کر ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ۵ر جنوری سنہ ۳۵ء کی صبح چہل پہل اور لطف وفرحت کا جو نظارہ پیش کیا شاید سالہا سال تک قلوب سے فراموش نہ ہوگا۔ جملہ ممبران اسٹاف اور طلباء یونیورسٹی ریلوے اسٹیشن پر ہاتھوں میں گلہائے رنگا رنگ اور دلوں میں شوق ملاقات لے کر ٹرین کے انتظار میں جمع ہو گئے ایک ایک لمحہ ایک ایک دن سے کم نہ تھا۔ آخر کار وہ ساعت منتظر آئی۔ نعرہ ہائے مسرت اور پھولوں کی بارش اس خیر مقدم کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ہر ایک سے نہایت گرمجوشی سے معانقہ اور مصافحہ کیا اور دیر تک اس سے مہلت نہ ملی احباب کے اصرار کے خلاف آپ پاپیادہ طلباء اور اسٹاف کے ہمراہ یونیورسٹی میں تشریف فرما ہوئے

ہز ایکسیلینسی وائسرائے کا ورود مسلم یونیورسٹی کی تاریخ شاہد ہے کہ اس علمی درس گاہ کو اس سے پیشتر بھی مقتدر حکام والیان ریاست، امیر افغانستان اور حتی کہ ہز مجسٹی کنگ امپر

کے قدوم میمنت لزوم کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ مگر ہز ایکسیلنسی لارڈ ریڈنگ کا ورود مختلف خصوصیات کی بنا پر خاص طور پر قابل یادگار رہے۔ یونیورسٹی چارٹر ملنے کے بعد اب تک ایسا عظیم الشان دور اور انوکھا منظر مدرسۃ و یونیورسٹی میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ یونیورسٹی کا نوکیشن نے جو بجائے خود مسلمانان ہند کی دیرینہ خواب آرزو کی تعبیر ہے اس نادر موقع کی رونق میں چار چاند لگا دئے ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال اور لارڈ ریڈنگ کا جمع ہونا ہمارے مدرسۃ العلوم کی تاریخ میں ایک ایسے باب کا افتتاح کرتا ہے جو اپنی نظیر آپ ہی کہا جا سکتا ہے اور جس کو آیندہ مورخین "قران السعدین" کا لقب دینے میں شاید پس و پیش نہ کریں مدتوں پیشتر سے انتظامات میں جس سرگرمی کا اظہار کیا گیا اُس سے اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ بخوبی ہو سکے گا۔ اس ورود مسعود سے متاثر جو انقلابات ہوئے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ مگر ظاہری زیب و زینت چمن یونیورسٹی کی بہار اور اسٹریچی ہال کی آرائش صحیح معنوں میں ارکین اور منتظمین کے جذبات مسرت آگین کی ترجمانی کر رہے تھے۔ قاضی جلال الدین صاحب جلال کو جو شغف اور ید طولیٰ حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ کئی روز قبل اکابر ملک و ملت کی آمد نے جس میں سر محمد شفیع و مولوی غلام حسین صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور بھی دوبالا کر دیا۔

اگرچہ مدت قیام بہت مختصر تھی مگر کیا بلحاظ معنوی فوائد اور کیا بہ لحاظ مادی منافع نہایت ہی کامیاب کہی جا سکتی ہے ہز ایکسیلنسی کا پر مغز ایڈریس ایسے مفید و کار آمد نصائح پر مشتمل تھا کہ بذات خود ایک درس یا سبق کی حیثیت رکھتا ہے لارڈ ریڈنگ کا یونیورسٹی کے معاملات میں ہمدردی کا اظہار اور آیندہ ہر قسم کی معاونت کے مستحکم وعدے صدر جہ امید افزا ہیں جن کا ایفا مستقبل قریب میں انشاءاللہ ہوگا۔

حضور عالیہ بیگم صاحبہ بھوپال کی قدیم فیاضی ضرب المثل ہے کانوکیشن کا موقع اس کلیہ سے کیوں کر مستثنیٰ ہو سکتا تھا ایک لاکھ کی گراں بہا رقم ایک ایسے مالی مشکلات کے زمانہ میں جس قدر قابل قدر اور ہمت افزا ہے ظاہر ہے ایسی شاہانہ فیاضیوں کا نتیجہ ہے کہ یہ غریب مسلمانوں کی درس گاہ کو جو مرتبہ اور عروج حاصل ہے دنیا پر مخفی نہیں کاش کہ دیگر والیان ملک بھی اپنی جاہ و منصب کے مطابق دست کرم بڑھائیں۔

اس تاریخی واقعہ کے اس خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہونے میں یوں تو جملہ ممبران اسٹاف اور طلبا یکساں قابل مبارک باد ہیں مگر (جی۔سی۔سی) یو۔ ٹی۔ سی اور جنڈار می نے خاص طور پر انتظام میں مدد دی اور حسب سابق بیرونی مداخلت ومعاونت سے بے نیاز کر دیا۔ جزاہم اللہ۔

آخر میں شام کے "ایٹ ہوم" کا تذکرہ بھی لطف سے خالی نہ ہوگا جس کام میں تشریف صاحب، قریشی صاحب، پیرزادہ عبدالرشید صاحب اور جلیل صاحب جیسے اعلیٰ انتظامی قابلیت رکھنے والوں کا ہاتھ ہو اس کی خوش اسلوبی اور نظم ونسق کا پوچھنا ہی کیا۔

ہمارا خیال ہے کہ اس ضمن میں علی گڑھ میگزین کا ذکر نہ کرنا ایک بڑی فروگذاشت ہوگی کانوکیشن نمبر ایسی آب وتاب اور شان کے ساتھ نکلا کہ ہر جانب سے خراج تحسین وآفرین وصول ہوا یقیناً ہمارے دوست اسحاق صاحب مستحق مبارک باد ہیں۔

قند مکرر سرولیم میرس کو جو انتہائی شغف اور تعلق مسلم یونیورسٹی سے ہے اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے اراکین یونیورسٹی کی استدعا پر تشریف آوری کا شرف بخشا۔ نمایاں خصوصیت اس ورود مسعود کی یہ ہے کہ "معزز مہمان نے اپنے آپ کو مہمان نہ سمجھا" اس طرف میزبان بھی اس جذبہ خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ ہز اکسیلینسی نے مسلمانوں کے تاریخی کارنامے اور ان کی علمی ترقیاں اس فصاحت اور فراخ حوصلگی سے بیان کئے کہ حال وماضی کا مقابلہ کرنے اور مستقبل کو منوانے میں مشعل ہدایت کا کام دیں گے۔

وائس چانسلر صاحب نے یونیورسٹی کی ضروریات کا ذکر کرکے حسن طلب کا ثبوت دیا تھا جس کے جواب میں علاوہ وعدہ ہائے معاونت ہز اکسیلینسی نے اپنی جیب خاص سے ۵۰۰ روپیہ کی رقم مرحمت فرمائی۔

رؤسا کی دریادلی اور اخلاص کا تقاضا "میرس ہوسٹل" کی صورت میں پورا ہوا جو اس موقعہ کو ناقابل فراموش بنا دیگا۔

"یونین" جو اس درس گاہ کی روح رواں ہے وہ کیوں محروم رہتا۔ ہز اکسیلینسی کے لائف آنریری ممبر بننے کے وقت جس مسرت اور جوش کا اظہار کیا وہ اس کلب کی قدیم روایات کے عین مطابق تھا جن حضرات نے بچشم خود معائنہ کیا ان کے واسطے اعادہ بے سود اور جو حضرات موجود نہ تھے ان کے لئے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔ ہز اکسیلینسی نے ہر شعبہ کا نہایت اطمینان اور شوق کے ساتھ معائنہ کیا۔

اولڈبوائے یہ رسالہ ہمارے قدیم ایم۔اے او کالج کے ممتاز گریجویٹ سید محمود خاں صاحب کی ادارت میں ماہ بماہ شائع ہوتا ہے۔ اس کے مقاصد نام ہی سے ظاہر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ چند سال سے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی سرگرمیاں چند در چند وجوہ کی بنا پر سست رہیں۔ ایسوسی ایشن مذکور کے مقاصد اور کارناموں میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ جدید اور قدیم طلبا کا رشتہ محبت جن سلک کا اس کا مقصد ہے لیکن ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ رسالہ ان سرگرمیوں کو از سر نو تازہ کرنے میں کامیاب ہو اور ہمیں امید واثق ہے کہ ہمارے رفیق قدیم سید محمود خاں صاحب اپنی انتہائی جد و جہد سے کام لے کر اس رسالہ کو کامیاب بنائیں گے۔ طلبا قدیم سے درخواست ہے کہ وہ صاحب موصوف کا ہاتھ بٹائیں۔

نقش ثانی و نظر ثانی کی حقیقت میگزین کے تعطیلات نمبر میں مولانا وحید الدین سلیم کی ایک غزل شائع ہوئی۔ اس کے بعد وہی غزل کچھ تغیر و تبدل کے ساتھ دسمبر نمبر میں شائع ہوئی۔ موخر الذکر غزل کے مرسل ابو الذکا محمد مظہر اللہ سرشار پانی پتی ہیں۔ مولانا سلیم کے خط سے معلوم ہوا کہ یہ کارروائی کسی بزرگ نے از راہ عناد کی تھی۔ ہم مولانا کا خط بجنسہ ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ دنیائے ادب میں اور ایسی بے ادبی۔

مجی و مکرمی۔ دسمبر ۱۹۲۲ء کا علی گڑھ میگزین پہنچا۔ شکریہ قبول کیجیے۔ صفحہ (۰۷) پر میری ایک غزل ترمیم شدہ نظر ثانی کے عنوان سے چھاپی گئی ہے۔ یہ غزل پہلے تعطیلات نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔ پہلی شکل میں یہ میری غزل تھی دوسری شکل میں ان صاحب کی ہے جنھوں نے ترمیم کی ہے۔ ترمیم شدہ غزل کے بھیجنے والے کوئی صاحب ابو الذکا محمد مظہر اللہ سرشار پانی پتی ہیں۔ پہلی صورت اور دوسری صورت میں اگر غزل کو بالمقابل رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ صاحب ممدوح نے اصلاح دیکر میری غزل کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ دیگر ناظرین بھی اگر مقابلہ کی تکلیف گوارا کریں گے تو یقیناً صاحب ممدوح کی طباعی اور معنی آفرینی کی داد دینگے۔ میں ان کی اس عنایت کا بہت ممنون ہوں مگر انصاف یہ ہے کہ یہ غزل پوری کی پوری انھیں کے نام نامی سے منسوب کی جائے۔ صاحب ممدوح نے اپنی جودت طبع دکھا کر غزل مجھ سے چھین لی ہے اور اس لئے بہتر ہے کہ یہ انھیں کے نامۂ اعمال میں درج کی جائے اور ناظرین بھی اس کو میرے ناچیز کلام میں شامل نہ سمجھیں۔ آپ میری طرف سے صاحب ممدوح کی اس تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کر دیں۔ پانی پت کے باشندوں میں سے کوئی صاحب اس نام اور تخلص کے میرے علم میں نہیں ہیں۔ اگر یہ واقعی کوئی اہل ہستی پانی پت میں رکھتے ہیں تو ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ میرے وطن کے آسمان پر ایک نیا ستارہ چمکا ہے اور اس کی تابانی اور ضیا فشانی پر اہل وطن جس قدر فخر کریں بجا ہے۔ چونکہ یہ ترمیم حیدرآباد سے بھیجی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب یہیں ہیں مگر تعجب ہے کہ انھوں نے اب تک اپنے دیدار سے مجھ کو مشرف نہیں فرمایا۔ اگر خوش نصیبی سے یہ موقع مجھے ملا تو میں ادب کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرونگا۔ وحید الدین سلیم از حیدرآباد دکن ۲۰ فروری ۱۹۲۳ء

اصلاح ماہ اکتوبر و نومبر کے میگزین صفحہ او پر تلی کے حسب ذیل مصرعے یوں درست فرمالیجیے۔

(۱) میں خوش رو مطرب جھونکوں میں ... ... (۲) وہ اوس کے موتی کی مالا ....

(اڈیٹر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علی گڑھ میگزین

جلد (۳) نمبر (۸) | بابت ماہ جنوری و فروری ۱۹۲۵ء | قیمت سالانہ مع محصول ڈاک للعہ، قیمت فی رسالہ مرادی ۸؍

شیخ علی حزیں

فارسی لٹریچر کے بلحاظ سادگی و رنگینی بیان مختلف دور ہیں۔ اور ہر دور ایک ممتازانہ حیثیت کے ساتھ ممتاز ہے۔ ملک کے تمدن اور معاشرت کو علم ادب کے ساتھ جو رابطہ اور تعلق ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ بمصداق "دُرْ مَعَ الدَّهْرِ كَيْفَ دَارَ" زمانہ کے ساتھ ساتھ زبان کا ادب بھی رنگ بدلتا رہتا ہے۔ ہر عہد کی خصوصیات اور ہر زمانہ کے تازہ انقلابات زبان کی نظم و نثر پر بغیر اپنا رنگ جمائے نہیں رہتے۔ زبان فارسی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظم فارسی کی دنیا میں ہر عہد کا ایک نیا رنگ اور ہر زمانہ کا ایک نیا ڈھنگ بین طور سے نمایاں تھے۔ کہیں تو رودکی اور فردوسی کی سی وہ سادگی کہ ہزار سادگیاں اُس پر قربان۔ جو چیز نظر سے گذری دل میں اُتر گئی۔ نہ پیچیدہ بندش۔ نہ مشکل ترکیب۔ نہ استعارات کا طومار، نہ تشبیہات کی بھرمار۔ ہر مضمون سادہ اور نیچرل پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور کہیں خاقانی، انوری کی سی وہ پیچیدگی کہ ہر شعر بجائے خود معما ہے جس کے حل کرنے کے لئے خاص توجہ اور خاصہ وقت درکار ہے

قاعدہ ہے کہ ہر چیز گو وہ کیسی ہی بذات خود دلکش ۔ دلکشا کیوں نہ ہو۔ بار بار دیکھنے یا زیادہ استعمال کرنے سے نگاہوں میں اجیرن ہو جاتی ہے۔ اور سابق کی طرح وہ نظر فروز۔ دلکش نہیں رہتی۔ اسی قاعدہ کے تحت میں ادب فارسی کی تاریخ بھی خیال کرنا چاہیئے۔ ایک خاص طرز پر ایک معتد بہ زمانہ کی مشق نے نکتہ سنجان فارس کے دل اکتا دیئے اور جدت پسند طبیعتیں ایجادات و ترقی کے راستہ ڈھونڈنے لگیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے سادگی اور واقعہ نگاری ۔ رنگینی اور مبالغہ آمیزی زیب و زینت حسن ادب ہو گئی ۔ خیالات آسمان تک اڑنے لگے ۔ بمضمون مقولہ مشہور "اَوْہَامُہٗ خَلَّاقٌ" قوت واہمہ نے وہ اختراع کئے کہ فرشتوں کے ہاتھ میں بھی تسبیح دیئے بغیر نہ چھوڑا ۔

بروئے گل نہ شبنم ساختہ جا
گسستہ چرخ تسبیح ملک را

تازہ اور گرم مضامین طبیعتوں کو گرمانے لگے ۔ نرم اور شیریں الفاظ مذاق کو لذت بخشنے لگے ۔ نئی نئی تشبیہات اور نئے نئے استعارات ۔ بندش استوار، ترکیبیں دشوار۔ غرض کہ اقسام نظم و نثر سے کوئی چیز نہ رہی جس نے رنگ نہ بدلا ۔

زبان کے اسی اتار چڑھاؤ کے لحاظ سے شعرائے فارس چار طبقوں میں منقسم ہیں اور ہر طبقہ کی خصوصیات اسی کے ساتھ مخصوص ہیں ۔ طبقہ اوّل جہاں فردوسی ۔ اسدی ایسے شہسوار سرگرم رفتار ہیں ۔ سادگی اور واقعہ نگاری کے لئے مشہور رہی ۔ مگر افسوس طبقہ ثانی اور ثالث نے جہاں خاقانی، انوری ایسے خوشخرام سرگرم خرام ہیں ۔ سابق شاعری کی دنیا بدل دی اور اپنے کلام کی بنیاد محض تکلفات ۔ مبالغہ اور رعایت لفظی پر رکھی جس کا اثر ملک اور خود زبان پر جیسا پڑا ظاہر ہے ۔ مگر چندے بعد یہ حالت بھی نہ رہی ۔ اور مطابق ضرب المثل History repeats itself دور اوّل کی کہنہ اور فرسودہ یادگاریں تازہ ہوئیں ۔ چوتھے دور کے شعرا خواب غفلت سے کچھ بیدار ہوئے اور اپنے شکستہ حال ادب کو سنبھالا ۔ اس دور کی یادگار اسیر ۔ جلال ایسی ہستیاں ہیں

جن میں شیخ علی حزیں سرآمدخیل ہیں۔

شیخ صاحب بارھویں صدی کی نامور اور مستند شعرا کی یادگار ہیں ان کی شاعری کا آوازہ خود ان کے زمانۂ حیات میں چہار دانگ عالم میں پھیل گیا تھا۔ اصل نام محمدؐ اور علی لقب تھا۔ مگر نام نے لقب کے سامنے کچھ فروغ نہ پایا۔ اور صرف علی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ۲۷ ربیع الاوّل اور بقول صاحب خزانۂ عامرہ ربیع الثانی ۱۱۰۳ھ مطابق ۱۶۹۲ء بروز دوشنبہ بمقام اصفہان پیدا ہوئے۔ شیخ صاحب کے آبا و اجداد ایک قصبہ نامی "استا" کے رہنے والے تھے۔ مگر شیخ شہاب الدین (جو شیخ صاحب کے سلسلۂ نسب میں نویں پشت کے دادا تھے) اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر لاہجان میں جو اُس زمانہ میں سلطنت گیلان کا دارالسلطنت تھا سکونت پذیر ہوئے۔ اور یہی شہر آیندہ نسل کے لئے مستقل وطن قرار پایا۔ شیخ علی حزیں کے والد ابوطالب یہیں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وطن میں پائی۔ اصفہان اُس زمانہ میں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ ہر قسم کے ماہران فن وہاں موجود تھے۔ جن کے چشمۂ فیض سے تشنہ لبان علوم عقلی و نقلی اطراف و اکناف عالم سے آ آ کر سیراب ہوتے تھے۔ اِسی بنا پر شیخ ابوطالب بھی اپنے والد کی ایما سے بغرض تحصیل علم وہاں تشریف لے گئے اور اُستادالعلما آقا حسین خوانساری و مولانا محمدؐ رفیع لیسے قابل اور مستند علما کی خدمت سے مستفید ہونے لگے۔ ہنوز فارغ التحصیل نہ ہوئے تھے کہ ان کے والد رہگزرائے عالم بقا ہوئے۔ اب لاہجان لوٹنے کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔ خاک اصفہان نے ایسا دامن پکڑا کہ پھر نہ چھوڑا۔ اور ایک مکان خرید کر وہیں فروکش ہو گئے۔ رفتہ رفتہ حاجی عنایت اللہ اصفہانی سے جو وہاں کے معزز اور سربرآوردہ عمائد سے تھے تعارف پیدا ہو گیا اور یہاں تک رابطہ اتحاد و وداد مربوط ہوا کہ حاجی موصوف نے اپنی لڑکی کا عقد شیخ صاحب (ابوطالب) سے کر دیا۔ اِس سے چار لڑکے پیدا ہوئے۔ سب سے بڑے شیخ علی حزیں تھے۔

شیخ کی تعلیم و تربیت | شیخ کی عمر جب چار سال کی ہوئی تو اُن کے والد نے مولانائے اعظم ملّا شاہ محمدؐ شیرازی کے سپرد کیا۔ چوں کہ وہ قدرتاً ذہین و شوقین واقع ہوئے تھے دو سال کے اندر

بہت سی فارسی نظم و نثر کی کتابیں پڑھ لیں اور عربی صرف و نحو و رسائل منطق پڑھنا شروع کیا۔ ابھی آٹھ سال کی عمر کو بھی نہ پہونچے تھے کہ علوم متداولہ میں معتد بہ دسترس حاصل کر لی اور طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوئی۔ چپکے چپکے شعر کہنے لگے جب اُن کے والد ابو طالب اور استاد محمد رفیع کو معلوم ہوا کہ لڑکے کی طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل ہے اُنھوں نے اس سے منع کیا مگر کچھ فائدہ مترتب نہ ہوا۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ''مرا حرف طبیعت یکبارہ ازاں ممکن نہ بود، چیز یکہ وارد خاطر میشد، می نوشتم۔ و پنہاں میداشتم'' چند تکمیل و تحصیل علوم ضرور یہ تزکیہ و تصفیہ نفس کے لئے عارف حقایق و معارف قدوۂ کرام شیخ ''خلیل اللہ'' طا تعالیٰ قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے انفاس متبرکہ سے مستفید ہونے لگے۔ چونکہ یہ بزرگ خود موزوں طبیعت رکھتے تھے اور احیاناً شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ اُنھوں نے سابق استاد (محمد رفیع) کی طرح شعر کہنے سے نہ روکا بلکہ اس فن شریف کی تکمیل کی طرف ہمت دلائی۔ وقتاً فوقتاً شعر بھی سُنا کرتے تھے ''حزیں'' تخلص اُن کا ہی رکھا ہوا ہے۔

جب تک شیخ کے والد زندہ رہے تو غم دنیا سے آزاد اور فکر معاش سے بےفکر رہے مگر مرنے کے بعد (جب کہ ۱۱۲۷ھ تھا) وہ دلجمعی نہ رہی۔ دو بھائی ایک ماں اور ایک ضعیفہ دادی کی پرورش کا بوجھ گردن پر آپڑا۔ ذریعہ معاش زیادہ فراخ نہ تھا۔ مزید براں یہ کہ اسی اثنا میں چچا بھی قضا کر گئے، جو کچھ اُنھوں نے ترکہ چھوڑا وہ سب برباد ہو گیا۔ بدیں وجوہات اصفہان میں رہنا از بس دشوار ہوا۔ وہاں سے شیراز کا رخ کیا۔ یہاں بھی دلچسپی کے سامان پیدا نہ ہوئے اور چار و ناچار پھر اصفہان لوٹ آئے۔

ابھی والد اور چچا کا حادثہ جانکاہ دل سے فراموش نہ ہوا تھا کہ دونوں بھائی یکے بعد دیگرے مر گئے۔ رہے سہے ہوش و حواس جلتے رہے۔ دنیا تنگ۔ جہان تاریک نظر آتا تھا۔ بقول متنبی ؎

فَصِرْتُ اِذَا اَصَابَتْنِیْ سِهَامٌ تَکَسَّرَتِ النِّصَالُ عَلَی النِّصَالِ

(میرے اوپر مصائب کے اتنے تیر برسے کہ اُن کی نوکیں آپس میں ٹکرا کر ٹوٹتی تھیں)

اس پرطرّہ یہ کہ خود اصفہان دارالامن نہ رہا۔ ۱۱۳۴ھ میں افاغنہ کے گروہ نے محمود نام ایک شخص کی سرپرستی میں اصفہان پر حملہ کیا اور خفیف لڑائی کے بعد اس کو فتح کر لیا۔ لوگ بے سروسامانی کی حالت میں اپنے مکانات چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ شیخ علی حزیں سے بھی نہ رہا گیا اور موقع پاکر بحالت بیکسی مجبے بسی رات کو نکل کھڑے ہوئے اور منازل خطرناک طے کرکے خونسا اور خوانسار سے خرم آباد کہ جو والی لرستان فیلی کا دارالحکومت تھا پہونچے۔ وہاں مستند علما صلحا سے صحبت رکھنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد مختلف امصار و دیار میں سفر کیا۔ ہمدان۔ زنول۔ شوشتر۔ جوبزہ۔ بصرہ وغیرہ میں سیاحت کا اتفاق ہوا۔ ۱۱۵۳ھ زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئے۔

اشتیاق علم | غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ علوم متداولہ اور مروّجہ میں سے کوئی علم نہ ہوگا جو شیخ صاحب سے بچا ہو۔ وہ علوم اسلامیہ سے ہی واقف نہ تھے۔ بلکہ یہودی۔ عیسائی عالموں سے توریت۔ انجیل بھی پڑھی تھی، اُن کے لئے اکتساب علم کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا تھا۔ کسی فرقہ کا کوئی عالم ملتا ہو اُس سے استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں۔

"واز ہر فرقہ ہر جا کسے یافتم کہ بمذہب خود ربطے داشت۔ با وصحبت میداشتم۔ واستعلام مقاصد وسخنان او مینمودم۔ دریں وادی مرا با ارباب آرائے مختلف المقدار گفتگوئے روئے دادہ کہ خدا داند۔" اُنھوں نے دیگر مذاہب کی صرف کتابیں ہی نہ پڑھی تھیں۔ کچھ نہ کچھ اُن کے متعلق تصانیف بھی فرمائی تھی۔ جیسا کہ اس کے آگے لکھتے ہیں۔

"درضمن این مشاغل کتب متداولہ را درس میگرفتم۔ وحواشی وتعلیقات سامی نوشتم۔ وبہ تقریبات رسائل منفردہ در تحقیقات مختلفہ تحریر مینمودم۔ واکثر را اوّل بنظر فضلائے آں فن رسانیدہ اطمینان حاصل میکردم۔ وہمہ مورد تحسین ایشاں میشد۔"

شیخ کی شعر و شاعری | شیخ کی طبیعت جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف میلان رکھتی تھی۔ چھ سات سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ شعر کہنے لگے تھے۔ باوجود کثرت مشاغل و ہجوم وظایف تحصیل شعرا اور موزوں طبع لوگوں کی صحبتوں میں شریک ہوتے اور اُن سے اختلاط

رکھتے تھے۔ اس قدر ذہین اور تیز طبع واقع ہوئے تھے کہ فی البداہتہ شعر کہہ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ طالب علمی کے زمانہ میں مکان پر ان کے والد کے پاس کچھ لوگ جمع تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے "ملا محتشم کاشی" کا یہ شعر پڑھا ؎

اے قامتِ بلند قداں در کمند تو
رعنائے آفریدۂ قدِ بلند تو

بعض لوگوں نے اس شعر کی حد سے زیادہ تعریف کی۔ شیخ ابوطالب (شیخ علی حزیں کے والد) سے نہ رہا گیا اور کہنے لگے۔ ملا محتشم شاعر تو اچھا ہے مگر کلام تمکین نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسی شعر میں دیکھ لو۔ مصرعہ اول مانوسِ طبع نہیں۔ قامت کو کمند اُفتادہ کہنا درست نہیں۔ اگر لفظ "قامت" نہ ہوتا اور ترتیب شعر اس طرح نہ ہوتی "اے آنکہ بلند قداں در کمند تو" تو کلام زیادہ مطبوع اور پسندیدہ ہوتا۔ اس کے بعد شیخ ابوطالب علی حزیں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور کہا میں جانتا ہوں کہ تم شاعری سے باز نہیں آئے۔ اگر اس شعر پر کچھ کہہ سکتے ہو تو کہو۔ اُسی وقت شیخ نے یہ مطلع فی البداہتہ پڑھا ؎

صید از حرم کشد خمِ جعد بلند تو
فریاد از تطاولِ مشکیں کمند تو

یہ شعر سن کر تمام حاضرین جلسہ پھڑک اُٹھے اور تحسین و آفریں کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں ابھی داد ختم نہ ہوئی تھی کہ شیخ نے اس اثنا میں دوسرا شعر موزوں کر لیا ؎

شد رشک طور از آمدنت کوئے عاشقاں
بنشیں کہ باد خندہ رو جا بہا سپند تو

اس شعر کو سن کر خود اُن کے والد علامہ سے بھی نہ رہا گیا۔ اور کہنے لگے کہ ملا محتشم کاشی کے شعر میں وہ بات نہیں جو اس میں ہے۔ شیخ نے پھر یہ تیسرا شعر پڑھا ؎

مشکل شدہ ہست کار دل از عشق و خوشدلم　　　شاید رسد بخاطرِ مشکل پسند تو

غرض کہ اسی طرح اثنائے درد میں ایک ایک شعر موزوں کرکے تمام غزل پوری کردی۔ ایک دوسرے موقع کا ذکر ہے کہ شیخ وجع المفاصل میں مبتلا ہوئے اور مرض لاحقہ نے اس قدر زور پکڑا کہ صاحب فراش ہوگئے۔ معالجہ جاری تھا۔ طبیب برابر آتے تھے اور علاج کرتے تھے مگر بیماری میں کوئی تخفیف نہ تھی۔ آخرالامر مرزا شریف خلف حکیم جلال الدین جو اُس زمانہ کے حاذق اور تجربہ کار طبیبوں میں سے تھے علاج کے لئے مامور ہوئے۔ ابھی علاج کو تین دن بھی نہ گذرے تھے کہ خود حکیم موصوف اسی درد میں مبتلا ہوگئے۔ جب شیخ صاحب کو اس بات کی خبر ہوئی تو اُسی درد و کرب کی حالت میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع یہ تھا ؎

بجرم عشق اگر کشتی مرا۔ ممنون احسانم
گناہ زاہد بے درد یارب چیست۔ حیرانم

اس شعر میں حکیم مذکور کی بیماری کی طرف اشارہ ہے۔

تصنیف کا حال | شیخ صاحب نے اپنی مدۃ العمر میں بہت سی مثنویاں۔ ساقی نامہ اور مختلف رسائل مختلف مضامین پر لکھے ہیں۔ چار دیوان خود ان کے ہاتھ کے جمع کردہ ہیں۔ پہلا دیوان تمام اقسام سخن کو حاوی ہے۔ اور تقریباً سات آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ باقی تین دیوان بھی اسی قدر ضخامت کے ہیں۔

مشہد مقدس کے زمانہ قیام میں ایک مثنوی مسمٰی بہ "خرابات" لکھی تھی۔ یہ مثنوی بوستان سعدی کے طرز پر تھی۔ ایک ہزار دو سو بیت تک جمع ہونے پائے تھے کہ چند وجوہ سے تکمیل کو نہ پہونچی۔ اس جگہ نمونۃً چند اشعار مثنوی کے درج کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ افتتاح اس طور سے کی ہے ؎

ثنا ہاست پیر خرابات را — کہ شست از دلم لوث طامات را
عطا کرد ز اندیشہ فارغ دلے — چو میخانہ بخشید سر منزلے

تحمید و تصلیہ کے بعد مقاصد کو اس طرح شروع کیا ہے ؎

الا اے جہاندار فرخندہ خوے | دمے گوش بکشا بفرخندہ گوے
نخستیں نکو گیر راہ سلوک | کہ خلقے گراید بدین ملوک
جہاندیدہ باید پسندیدہ کیش | غم پیرواں خور بہ نبسال خویش
وگر خود ندانی ز دانندہ پرس | ز روشندلان شناسندہ پرس
خرد پروراں را خریدار باش | تن تیرۂ سفلہ گو خار باش
بہ تدبیر سنجیدگاں کار کن | ز مغز خبر دسر گرانبار کن
ترش روز پند سخن گو مکن | نکو خواہ را تلخ باشد سخن
مکن پرورش سفلہ را زینہار | درختے کہ خار است بارش مکار

تصنیف مدۃ العمر | جب کہ شیخ صاحب بلاد مختلفہ میں سیر کرتے پھرتے تھے۔کبھی شیراز میں گذر ہوتا تھا اور کبھی اردگان شیراز میں۔اس مدت میں مختلف کتب کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔عجائب تحقیقات و حکایات نادرہ کا خزانہ ہاتھ آیا۔ارادہ کیا کہ ان سب کو ایک علیحدہ کتاب میں ترتیب دیا جائے۔چنانچہ شیراز کے قیام میں ایک منظوم کتاب کی بنیاد ڈالی اور "مدۃ العمر" کے نام سے موسوم کیا۔سفر فارس موقع پر جب کہ ۱۱۳۳ھ تھا۔تخمیناً سات ہزار اشعار موزوں ہوگئے تھے مگر افسوس اسی سال اصفہان کے انقلاب عظیم نے شیخ کا تمام کتب خانہ برباد کر دیا۔جس کے ساتھ یہ مثنوی بھی تلف ہوگئی۔شیخ صاحب کو اس مثنوی کے ضائع ہونے کا سخت افسوس تھا۔

طبیعت کی رسائی | شیخ صاحب کی طبیعت ایسی رسا واقع ہوئی تھی۔ہر چیز کو خواہ اسی کی طرف میلان ہو یا نہ ہو۔بشوق حاصل کر لیتے تھے۔فن معما کی طرف قدرتاً لگاؤ نہ تھا مگر جب مرزا ہادی خلف شاہ محمد شیرازی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔چوں کہ یہ صاحب خود فن معما کے شایق تھے۔ان کو بھی شوق پیدا ہوا اور چند روز میں اچھی خاصی مہارت بہم پہونچائی اور فی البداہتہ معما کہنے لگے۔یہ مشہور شعر ہے

ز یعقوب گر بشکنی باشنہ | بہی را بجائش بنہ پاشنہ

انھیں کا معمائے شعر ہی۔ ذیل کے شعر میں "نصیر" کے نام کو کس خوبی سے استخراج کیا ہی۔

باسم نصیر

از بسکہ بجاں از غم رنگھیر تو آمد　　　پیکان تو بیخود نسرِ تیر تو آمد

اس قسم کے بہت سے معمّے سوانح عمری میں درج ہیں۔

آخر عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور آٹھ نو سال رہکر مختلف امصار و دیار کی سیر کی مگر ہندوستان کی آب و ہوا اور طرز معاشرت پسند نہ آیا۔ یہاں کے باشندوں سے ہمیشہ نالاں رہے۔ بارہا عزم کیا کہ جلد از جلد ہندوستان چھوڑ کر وطن کو لوٹ جائیں مگر یہ عزم پورا نہ ہوا۔ ۱۱ جمادی الاوّل ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۹ء بمقام بنارس انتقال کیا۔

عبدالحمید (منشی فاضل) اعربک ٹیچر
مسلم یونیورسٹی سٹی اسکول علی گڑھ

غزل

تھی اپنی جگہ ایک جو صورت نظر آئی　　　بتخانہ میں اللہ کی قدرت نظر آئی

دیکھا جسے وہ دل میں لئے لیتا ہی تجھکو　　　ہر آئینہ میں اپنی طبیعت نظر آئی

جب دیدۂ خونبار سے دامن پہ نظر کی　　　لکھی ہوئی اک غم کی حکایت نظر آئی

غم قلزم موّاج تھا دل چھوٹا سا ساغر　　　اے پیر مغاں تیری کرامت نظر آئی

اُٹھی وہ گھٹا وقت گیا خوفِ گنہ کا　　　ہاں جام کہ اللہ کی رحمت نظر آئی

شاید یونہیں ہوجائے جگہ دل میں بھی اک دن　　　آنکھوں میں تمہاری مری صورت نظر آئی

اے آرزو اُبھرے ہوئے اک نقش قدم میں
اپنے دلِ سرگشتہ کی تربت نظر آئی

آرزو لکھنوی

کلامِ یاس

دل عجب جلوۂ موہوم دکھاتا ہے مجھے
شام سے یاس سویرا نظر آتا ہے مجھے

جلوۂ دار و رسن کوئی دکھاتا ہے مجھے
کس دنا کس کی نگاہوں سے چڑھاتا ہے مجھے

دل کو لہراتا ہے ہنگامۂ زندانِ بلا
شورِ ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے

پائے آزاد ہے زنداں کے چمن سے باہر
بیڑیاں کیوں کوئی دیوانہ پنہاتا ہے مجھے

جنس کے کہتے ہیں کہ گھر اپنا قفس کو سمجھو
سبق الٹا مرا صیاد پڑھاتا ہے مجھے

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
کس قدر واعظِ مکار ڈراتا ہے مجھے

پست ہیں اب بھی در و بام تو پردہ رہ جائے
فلکِ خانہ خراب آنکھ دکھاتا ہے مجھے

پاؤں سوئے ہیں مگر جاگتے ہیں اپنے نصیب
کیا سمجھ کر جرسِ لنگ جگاتا ہے مجھے

دیدنی ہے چمن آرائیِ چشمِ عبرت
سیرِ تازہ گلِ پژمردہ دکھاتا ہے مجھے

ترکِ مطلب سے ہے مطلب تو دعائیں کیسی
صبح تک کیوں دلِ بیمار جگاتا ہے مجھے

ننگِ محفل مرا زندہ مرا مردہ بھاری
کون اٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

لبِ دریا کا ہوا ہیں نہ تہِ دریا کا
ناخدا کون سے گھاٹ اب لیے جاتا ہے مجھے

یاس منزل ہے مری منزلِ عنقا سے محال
لکھنؤ میں کوئی کیوں ڈھونڈھتے آتا ہے مجھے

مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہزاروں درود بر رسولِ کریم

مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال دکنی زبان میں ہی۔ قطب شاہیوں کے عہد میں اور ان کے بعد تک یہ دکنیوں میں بہت مقبول رہی۔ سیف الملوک و بدیع الجمال کا دکنی فسانوں میں اس طرح مذکور ہوتا رہا۔ جیسے ہیر رانجھا کا پنجاب میں اور نل دمن کا مالوے میں۔ اکثر قدیم دکنی شعراء نے بھی اس کو سراہا ہی۔ یہ عبداللہ قلی قطب شاہ والیِ گولکنڈہ کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ عبداللہ قلی قطب شاہ کا مشہور درباری شاعر غواصی اس کا مصنف ہی سنہ ۱۰۳۵ھ سن تصنیف ہی جو اس شعر سے ظاہر ہی ؎

برس یک ہزار ہور پنج تیس میں — کیا ختم یو نظم دن تیس میں

غواصی کا ایک شعر نکات الشعراء تصنیف اللہ بخشے میر تقی میر نے لکھا ہی۔ لیکن تخلص بجائے غواصی کے غواص ہی ؎

جو کوئی اس مزرعِ دل پر بردہ کا بیج بوتا ہے
تو ہرگز اس کے بتاں میں گلِ امید ہوتا ہے

لیکن میر صاحب نے ایک حرف اس کے حال میں نہ لکھا البتہ میر حسن نے اللہ مغفرت فرمائے تذکرۂ شعرائے اردو میں دو سطریں غواصی کے لئے وقف کی ہیں۔ فرماتے ہیں "غواصی تخلص در وقت جہانگیر بادشاہ بود۔ طوطی نامہ نخشبی را نظم نمودہ است۔ بزبان قدیم نصفے فارسی و نصفے ہندی بطور ریکٹ کہانی سرسری دیدہ بودم شعر آں نظم بیاد نیست" ترجمہ "غواصی تخلص جہانگیر بادشاہ کے زمانے میں تھا نخشبی کے توتی نامے کو قدیم زمانہ میں منظوم کیا ہی جو ریکٹ کہانی کی سی ہے کہ آدھی فارسی آدھی ہندی۔ سرسری طور پہ دیکھا تھا اس نظم کا کوئی شعر یاد نہیں" لیکن توتی نامے کی تصنیف کا سہرا

مرزا حیرت نے چراغ دہلی میں ابن نشاطی مصنف "پھول بن" کے سر باندھا ہی۔ گارسین دی تاسی
اپنی تاریخ ہندستانی ادب میں لکھتا ہی جس کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے۔ "غواص یا غواصی۔ مولانا
غواصی ہندوستانی شاعر ہی۔ اس کا بیر صرف ایک شعر دیتا ہی جس کا ترجمہ یہ رہا۔ "وہ جواپنے
مزرعہ دل میں اپنے محبوب مقصود کا بیج بوتا ہی۔ وہاں کبھی وہ گل امید کو پھولتے نہ دیکھے گا۔"
مطلب یہ ہی کہ کسی پیاری چیز کی جدائی میں کسی کو یہ امید نہیں ہوتی کہ کسی طرح کا چین آرام میسر
ہوگا۔ اس شاعر سے ایک توتی نامہ منسوب ہی جو دکنی نظم میں مثنوی کے طرز پر ہی جس کا ایک
نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کا مقبوضہ ہی۔ اسی کا ایک قدیم نسخہ میرے خانگی ذخیرے میں ہی
یہ عمدہ نستعلیق خط میں تحریر ہی اور بڑی تقطیع کے چار سو صفحوں پر ہے۔ عام قاعدے کے مطابق
حمد خدا و نعت رسول کے بعد چار صفحے سے زیادہ کے حصے میں عبد اللہ قطب شاہ سلطان
گولکنڈہ کی مدح ہی جس کے زمانہ حکومت میں یہ مثنوی لکھی گئی تھی۔ پھر حسب معمول سبب تالیف
کتاب کا باب شروع ہوتا ہی۔ اس کے بعد آغاز قصہ ہی۔ پھر کہانیاں شروع ہوتی ہیں جن میں
بہت سی کہانیاں دوسرے نسخوں سے مختلف ہیں۔ یہ مثنوی ایک واسوخت پر ختم ہوتی ہی
جو پنڈاری اوڈکی ایک قسم ہی۔" (ترجمہ از گارسین دی تاسی جلد اوّل صفحہ ۴۹۴)

میری نظر سے کوئی تذکرہ ایسا نہیں گذرا جس میں کچھ مفصل حال مولانا غواصی کا ملتا ہو اور
کسی نے مولانا موصوف کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا بھی ذکر نہیں کیا۔ حالاں کہ اکثر
دکنی مثنوی گو شعرا نے اس مثنوی کو سراہا ہی۔ اس کے پڑھنے سے یہ پتہ چلتا ہی کہ مولانا غواصی
سلطان عبد اللہ قلی قطب شاہ کے درباری ہیں۔ اور پایہ کے شاعر شمار ہوتے ہیں۔ اور یہ مثنوی
ان کی پہلی تصنیف ہی۔ مولانا ظاہر کرتے ہیں کہ اگر سلطان نے اس کی قدر کی تو پھر دوسری کوئی
اور مثنوی لکھیں گے۔ چنانچہ وہی روایتی ناداری کا رونا جو تمام شاعر روتے آئے ہیں روتے
ہوئے خاتمے پر فرماتے ہیں ؎

جو سلطان عبد اللہ انصاف کر — میرے جوہران پو تھیں دل صاف کر
پرے

دیوے داد میرا بہوت مان پانوں
(بہت پاؤں)
کہ یوشاہ میرا خریدار ہوئے

امس دور تھیں تاگریباں پانوں
(خوشی سے پاؤں)
تو تازہ میرا طبع گلزار ہوئے

کہ غم تیں ہوں میں سخت بے تھیں
(سے)
پریشانگی میں جما خیال میں

دھروں دوغدغے لاکھ اس ازار تھیں
(تفکرات سے)
لے آیا ہوں ایسے رتن ڈھال میں

جو بھوگی نول شہ تیں کچھ فرح پانوں
(شکی حسن عیش الزکہا۔ دلربے)
اگرچہ ہوں شہ کے بندیاں میں حقیر

(جواہر)
تو اس تھیں رتن خاص ڈھنڈ ڈھنڈ لانو
(ڈھونڈ تلاش کر)
ولے شعر کے فن میں ہوں بے نظیر

(جمع بندی کی)
کہ مونہ کھول یوں میں کہوں کیا اپیں
(منہ۔ دہن آپ ہی)
بہر حال یو نظم الہام سوں
(یہ سے)

گواہی دیوے شعرا ہیں نا چھپیں
(آپ ہی چھپے)
کیا میں نول شاہ کے نام سوں
(سے)

تھوڑی سی تعلّی ملاحظہ ہو۔

میرا گیان عجب شکرستان ہے
(تخیل۔ ذکاوت۔ علم۔ عرفاں)
جتنے ہیں جو طوطو ہندوستان کے

جو اس تے میٹھا سب ہندستان ہے
(سے ہندوستان)
بھکاری ہیں مجھ ہی شکرستان کے

(جتنے طوطی)
شکر کھا میرے اس شکرستان تے
(سے)
کیا میں جو کچھ آئی سو فام میں

وہ کھاتے ہیں مٹھ بول گن گیان تے
(شیریں سخن سے)
کیا ناؤں یک روم ہور شام میں
(نام اور)

(وہی فہم عقل ذہن)
اچایا طرز ایک نیک تازہ مٹھا
(اونچا کیا۔ بلند کیا)
دکھایا ہنسر مو شگافی کیا

جگت بیچ بازیا آوازہ مٹھا
(جہان میں اٹھایا)
سلاست کیتیں ہنر تے صفائی دیا
(کیے تیں کر ہنر سے صفائی۔ جلا)

نزاکت کوں میں آپنے خیال تے دکھایا ہوں باریک کر بال تے
کو اپنے سے میں نے دکھایا ہے سے
لطافت سوں تیا ہوں سخن سنج تیں دھروں آج لگ غیب کے گنج میں
سے تک
دیا تازگی شعر کی دھات کوں سحر کر دکھایا ہر یک بات کوں
قسم، طرز، طرح کو ہر ایک کو
جو میں ہم سوں طبع آزمائی کروں تو سارہاں اوپر پیشوائی کروں
خود ہی سے جمع سارے کی بمعنی حکومت۔ تفوق
کہوں تازے مضمون یک تال منے کہ تیخی آسمتے ہیں مجھ دل منے
میں میرے میں
ہنر کی گوی کا سو میں بالک ہوں بچن گنج اوپر کا اُتم ناگ ہوں
تھا۔ بحث بالک۔ شیر سخن اوپر بزرگ۔ بہترین
سکے کون سنے میرے جو میں کہ رستم ہوں میں آج کے دور میں
کون مقابل ہوسکے
نیمان تیب عجب کھڑگ تو آبدار سدا تیز پانی دھرے بے شمار
تلوار پانی تیلا۔ دھاری۔ جوہر
ہیں آب تیب کی نوک تا تیر تے بچن کی نیا کاٹ یک دھیر تے
تیں زبان تلوار ست سخن ایک سمت سے

غرض ایک مسند ہے جو جوش میں پڑا اُبلتا چلا آتا ہے۔ سبب تالیف میں لکھتے ہیں کہ ایک دن صبح کو باغ کی سیر کو نکلا۔ پھولوں کی رعنائی اور سبزے کی دلربائی دیکھ کے جی لوٹ پوٹ ہوگیا۔ نئے نئے خیال آنے لگے۔ دل نے کہا کہ دنیا میں کوئی یادگار چھوڑنی چاہیے۔ سیف الملوک اور بدیع الجمال کی طرف دھیان گیا۔ اس قصے کے تتمے کو منظوم کیا۔ صنائع بدائع لفظی و معنوی مضمون آفرینی اور جدت طرازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ خود شاعر ہے اور شاعر بادشاہ۔ صاحب دیوان کا بیٹا اور شاعر سلطان صاحب کلیات کا نواسہ ہے۔ آپ بھی صاحب دیوان ہے۔ اس کا ایک دیوان میرے ذخیرے میں بھی ہے۔ ایسے سخن سنج اور سخن رس سخن فہم صاحب کلام کے سامنے زبان ہلانی کوئی ہنسی کھیل نہ تھا۔

لیکن مولانا غواصی کی قادر الکلامی نے ایک مہینہ کی محنت میں اس پائے کی مثنوی لکھ بادشاہ کی خدمت میں پیش کی، مقبول ہی ہوئی ہو گی جو توتی نامہ میں چھپی ہی۔ اسی بادشاہ کی سیف الملوک و بدیع الجمال میں پینتیس چھتیس اشعار میں تعریف کی ہی۔ فرماتے ہیں ؎

چند اچودواں خسروی برج کا — امولک رتن حسن کے درج کا
(چاند چودھواں — انمول۔ نادر بے بہا جواہر)

سو سلطان عبداللہ آفاق گیر — سو لکھن شہنشاہ گردوں سریر
(وہ — خوش سیرت)

سکل بادشاہاں میں اس کا ہی ناؤں — اسی قطب کا قطب تارہ ہی چھاؤں
(تمام جمع بادشاہ کی نام — سایہ)

سلیماں کے جو تخت کا ناؤں ہے — سو وہ تخت شہ تخت کا چھاؤں ہی
(نام — تو تخت شاہی سایہ)

پریاں دیو آویں وطن چھوڑ کسب — کھڑے ہو رہیں ڈرتے ہت جوڑ سب
(سے ہاتھ)

اکثر جگہ مولانا اپنا تخلص لائے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہی کہ غواص اور غواصی دونوں تخلص فرماتے ہیں پر نام کا پتہ کبھی نہ چل سکا اور نہ کہیں سے سن وفات یا پیدایش معلوم ہو سکا۔ تخلص ملاحظہ ہو۔ حمد میں کہتے ہیں ؎

جو غواص ہو تجھ سراتا اچھوں — نوے مضموناں دھنڈ لیاتا اچھوں
(سراہتا ہوں — نئے جمع مضمون کی دھونڈ لاتا ہوں)

نعت میں کہتے ہیں ؎

غواصی جو صدقہ ہی تجھ ناؤں پر — فدا جیو اس کا تیرے پاؤں پر
(تیرے نام — جی۔جان پاؤں)

سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کی تعریف میں جو اپنا تخلص لائے ہیں۔ اس سے ان کے درباری شاعر ہونے پر بھی روشنی پڑتی ہی اور ان کی بادشاہ سے خصوصیت معلوم ہوتی ہی ؎

غواصی جو شاعر ہے شہ کا مدام — کرے یوں دعا شاہ کوں صبح و شام

مولانا غواصی سنی عقیدے کے مسلمان ہیں۔ کیوں کہ مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال میں چہار صحابہ

کی اور حضرت پیران پیر دستگیر کی منقبت ہے۔ اور حضرت پیران پیر کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ حالاں کہ شیعہ دربار ہے لیکن ایسے دھڑلے سے مخالفین حضرت غوث الاعظم کو سنا گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اس سے ان کی صاف گوئی اور صداقت پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

(محی دین)
جکوئی جو محی الدین سوں پھر پڑے — ٹوٹے گردن اس کی تلیں سر پڑے
جو کوئی — سے — پھر جائے / مخالف ہو جائے — تلے۔ نیچے

اسے چھوڑ جو کوئی منگے دین کوں — نہیں دین ایمان اس ہین کوں
مانگے — کو — کمینے بدبخت — کو

نہ اس کوں خدا۔ نا محمد۔ علی — دیوانا کُتا ہو پھرے ہر گلی
کتا

اس کو — (محی دین)
جو کوئی ایک دل ہو محی الدین سوں — سرافراز ہے او دنیا دین سوں
سے — سے۔ ہیں

اچھے جس تیں خوش یو ولیاں کا ولی — خوش اس تھیں خدا ہور محمد علی
ہے — سے — یہ — جس ولی کی — سے — اور

سلطان عبداللہ پکا شیعہ تھا۔ لیکن صوفیائے کرام کا دلدادہ و معتقد تھا اس سے مولانا کو اتنی جرأت ہوئی۔

اس مثنوی میں پہلے حمد ہے پھر نعت۔ پھر چہار صحابہ و حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہم (اجمعین) کی منقبت ہے۔ بعد ازاں سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کی تعریف ہے اس کے بعد تعریف سخن ہے پھر وجہ تصنیف ہے جس میں بہت تعلی کی گئی ہے۔ اور آغاز داستان ہے۔ میرے مملوکہ نسخے میں تیرہ سطری ایک سو اکیاون صفحے ہیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد دو ہزار تیس ہے۔ قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عنوانات منظوم ہوں گے۔ کیوں کہ قدما عام طور پر عنوانات منظوم رکھتے تھے جن کی بحر مثنوی کی بحر سے اکثر جدا ہوتی تھی۔ لیکن ایک دوسرا خوش خط نستعلیق مذہب و مجدول نسخہ جو میرے زیر مطالعہ تھا۔ اس میں عنوانات فارسی منثور تھے۔ میں نے اپنے نسخے کا اس سے مقابلہ کیا اور اختلافات کو تحریر کر لیا۔ ان دونوں نسخوں پر سن کتابت تحریر ہیں۔ میرا مملوکہ نسخہ آسمانی رنگ کے قدیم کدیشی کاغذ پر خط نسخ میں ہے اور بہت صحیح ہے۔ کتابت اور کاغذ سے یہ تیرھویں

صدی کے اول ادھے کی تحریر معلوم ہوتا ہی اور کسی دکنی ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور
کسی زمانے میں میمن حاجی سُلیمان بن حاجی احمدؒ مقام مبنی (بمبئی) کی ملکیت تھا۔ دوسرا استعاً
نسخہ جو کاغذ و اہتمام سے تو غالباً بارھویں صدی کا معلوم ہوتا ہی۔ لیکن طرز تحریر و املا سے
تیرھویں صدی کا جچتا ہے اور غالباً کسی غیر دکنی کے ہاتھ کا ہی یہ نسخہ ناقص ہے۔ نیا صفحہ
چڑھا یا گیا ہی۔ خط اس کا اچّھا پاکیزہ ہی۔ حرف آنکھوں سے باتیں کرتے ہیں سیف الملوک
و بدیع الجمال عشقیہ مثنوی ہی۔ قصّہ کا موضوع ملاحظہ ہو۔ مصر کے بادشاہ عاصم کے ہاں
اولاد نہیں ہوتی۔ بہت پریشان رہتا ہی۔ نجومیوں سے اپنا ستارہ دکھواتا ہی۔ نجومی خوشخبری
سُناتے ہیں کہ اگر بادشاہ یمن کی لڑکی سے شادی ہو تو دل کی مُراد بر آئے۔ عاصم ملک یمن کے
بادشاہ کی لڑکی سے شادی کرتا ہی۔ لڑکا ہوتا ہے۔ اس کا نام سیف الملوک رکھتا ہی انھیں
ایّام میں وزیر کے ہاں بھی لڑکا ہوتا ہے۔ اس کا نام ساعد رکھا جاتا ہی۔ ستارے شناس شہزادہ
کی مصیبتوں کی پیشینگوئی کرتے ہیں۔ بادشاہ ملول ہوتا ہی اور ان دونوں لڑکوں کی ساتھ
پرورش کرتا ہی۔ جب سیف الملوک جوان ہوتا ہی تو بادشاہ اس کو ایک تحفہ دیتا ہی۔ جو حضرت
سُلیمان نے اسے بھیجا تھا۔ اس تحفے میں ایک تصویر زربفت میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے اسے
دیکھکر شہزادہ عاشق ہو جاتا ہی اور اس کی تلاش میں نکلتا ہے۔ بحری سفر اختیار کیا جاتا ہے اور
شہزادہ چین کے ملک میں جا نکلتا ہی۔ یہاں سے پتہ ملتا ہی کہ شاید قسطنطنیہ میں جہاں ملک ملک کا
مسافر آتا ہی۔ اس تصویر والی کا پتہ ملے۔ غرض یہ پھر روانہ ہوتے ہیں۔ آخر جہاز تباہی میں آتا ہی
اور سب یار و دوست تتّر بتّر ہو جاتے ہیں۔ شہزادہ حبشی آدم خوروں کی قید میں آتا ہی۔ زنگی سردار
اس کو اپنی بیٹی کے کھانے کے لئے بھیجتا ہی۔ وہ اس پر عاشق ہو جاتی ہی۔ مولانا نے اس زنگن
کے سراپے میں وہ الفاظ استعمال کئے ہیں کہ چیل کوّے کُھن کھائیں۔ ایسا کھلا کھلا اور ننگا ننگا
ہی۔ کوئی اُنیس بیس شعر اس کے لئے وقف کر دیئے ہیں۔ بمشکل تمام شہزادہ اس سے نجات پا کر
راستے کی مُصیبتیں جھیلتا ایک اور جزیرے میں جا نکلتا ہی۔ وہاں سراندیپ کے راجہ کی لڑکی ایک

جن کی قید میں ہے اسے مار کر راجکماری کو قید سے چھڑاتا ہے۔ یہی راجکماری جب تصویر دیکھتی ہے تو پتہ بتاتی ہے کہ یہ تصویر گلستان ارم کے بادشاہ شہپال کی لڑکی بدیع الجمال پری کی ہے اور سیف الملوک سے وعدہ کرتی ہے کہ بدیع الجمال سے ملوا دیگی۔ آخر شہزادے کی ملاقات بدیع الجمال سے ہوتی ہے۔ وہ جب اس کو اپنے عشق میں سچا پاتی ہے۔ تو ایک خط اپنی دادی شہربانو کے نام لکھ کر دیتی ہے اور ایک دیو کے ساتھ سیف الملوک کو سیمن ٹین اپنی دادی کے پاس روانہ کرتی ہے۔ شہربانو شہزادے سے مل کر خوش ہوتی ہے اور اس کو اپنے ساتھ لے کر اپنے بیٹے کے پاس جاتی ہے۔ جب گلستان ارم میں پہونچتی ہے تو سیف الملوک کو ایک باغ میں چھوڑ جاتی ہے۔ شاہ قلزم جس کے بھائی کو سیف الملوک نے مار کر شہزادی سراندیپ کو چھڑایا تھا اس کے جاسوس ادھر آ نکلتے ہیں اور سیف الملوک ان کو اپنا سمجھکر ساری اپنی بیتی سناتا ہے۔ وہ اس کو پکڑ کر لیجاتے ہیں شاہ قلزم اس کو قید کر دیتا ہے۔ آخر شہپال فوج لے کر جاتا ہے جوب گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ شہپال کی فتح ہوتی ہے۔ وہ سیف الملوک کو چھڑالاتا ہے اور اپنی لڑکی سے شادی کر دیتا ہے۔ ساعد کی شادی راجہ سراندیپ کی لڑکی سے ہوجاتی ہے۔ اور یہ سب خوش و خرّم اپنے ملک کو روانہ ہوتے ہیں اور اپنے اپنے والدین سے جا کر ملتے ہیں۔ اس مثنوی کی زبان صاف ہے اور تعقید بہت کم ہے۔ کتب خانہ میں ایک اور مثنوی تھی جو جس میں کوئی پانچ ہزار اشعار تھے۔ یہ مثنوی شاہ عالم ثانی کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ آصف تخلّص تھا۔ لیکن زبان خراب تھی اور اکثر جگہ وزن سے بھی اشعار گر گئے تھے۔ اس مثنوی کا موضوع سیف الملوک و بدیع الجمال کے بہت مماثل تھا۔ لیکن یہ مثنوی حضرت امیر خسرو کے تغلق نامے و دیگر نادر کتب کے ساتھ دیمک کی نظر ہوئی۔ ایک صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ سیف الملوک و بدیع الجمال بمبئی میں چھپ چکی ہے اور ان کے پاس اس کا مطبوعہ نسخہ ہے۔ لیکن میری نظر سے اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ نہیں گذرا۔ اس مثنوی کا شمار ان نادر مثنویوں میں ہے جو بہت کم ملتی ہیں۔ میں نے اِس کے تمام مشکل الفاظ کے معنی لکھ دیئے ہیں۔

اور دکنی نعت کی تالیف میں مجھے اس سے بہت مدد ملی ہی وجدی کی "تحفۂ عاشقاں" جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ ان دونوں مثنویوں کی زبان نسبتاً بہت صاف و سلیس ہی سیف الملوک و بدیع الجمال کا آغاز اس طرح ہوتا ہی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٰہی جگت کا الٰہی سو توں　　　کرنہار جم بادشاہی سو توں
اے اللہ جہاں اللہ، مالک جو ہے وہ تو　　　کرنے والا ہمیشہ جو ہے وہ تو

تیرے حکم تل نوکر آسمان کے　　　رعیت ملک تیرے فرمان کے
نیچے آسمان

بھریا[1] تس گھراں بیچ تاری حشم　　　کریں نوبتاں سوں النگ دم بدم
بھرا جس جمع گھر کی، محل میں　　　جمع نوبت کی سے بدل

فرنگاں سوں بجلیاں کے رچنا زتوں　　　زحل کوں رکھیا کر فرح باز توں
جمع فرنگی کی بمعنی سے جمع بجلی کی　　　کو رکھا فرحباز
کرچ۔ سیدھی تلوار

جہاں لگ جو بادل کے ہیں کڑکڑاٹ　　　تیری حشم کے ہیں دمامیاں کے ٹھاٹ
تک گرج گڑگڑاہٹ　　　جمع دمامہ کی شان شکوہ

ہنر تیرے دربار کے پار سب　　　چھڑی دار تجھ دار کے جھاڑ سب
خاصہ بردار تیری دروازہ درخت

جو بارا اماماں ہیں ان پر سلام　　　جو راسلج دار تیرے مدام؟
دوازدہ جمع امام کی

نبیاں ہور بعضے ولیاں ہیں جتے　　　تیرے دار کے سر کردہیں وتے
جمع نبی کی اور جمع ولی کی جتنے　　　دربار خادم۔ حاجب اتنے
عرض بیگی

---

[1] بھریا و رکھیا۔ بمعنی بھرا۔ رکھا۔ علی الترتیب۔ یہ قدیم ماضی مطلق کی صورت ہی۔ اور دکن میں اب تک مروج ہی۔ اس میں "ی" جو بادی النظر میں زائد معلوم ہوتی ہے۔ اس کا تلفظ اہلِ دکن اسی قدر تخفیف کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ جو معلوم بھی نہیں ہوتا اور ایک عجیب قسم کی نرمی ان کی گفتار میں پیدا کر دیتا ہی۔ اس تلفظ کا شمالی ہند کے باشندگان سے ادا ہونا ایک امر محال ہی۔ اس کی مثال حضرت کبیر داس جیؒ کے ہاں ملاحظہ ہو ؎

ہیرت ہیرت ہیریا رہا کبیر ہرائے　　　بند سما نا سمر میں سوکت ہیرا جائے
گگن منڈل کے بیچ میں تودی تتو یک گاؤں　　　لکش نشانا روپ کا پرکھ دیکھیا ٹھانوں

تیری بادشاہی کوں کچھ انت نیں
رکوں کی حد نہیں
تیری ملک میں غیر کوں پنت نیں
رکوں کا رستہ۔ رسائی نہیں گذر

خزینے بھریا غیب کے غیب تھیں
خزانے بھرا تو ہی
ہوا توں اپیں پاک بے عیب تھیں
تو آپ ہی تو ہی

بسایا تیرے جگ کوں کر ہات توں
اپنے دنیا۔ جہان کو ہاتھ تو
دکھاتا تماشے ہریک دھات سوں
دکھاتا ہر ایک طرح سے

کھولا یا جنت کے کیواڑاں تھیں
کھولے جمع کیواڑ کی تو ہی
بندایا شفق کے پہاڑاں تھیں
باندھے جمع پہاڑ کی تو ہی

چنداں میں تے توں چندنا کاڑتا
چاند میں سے تو چاندنی نکالتا
سورج تے گرم دھوپ توں پاڑتا
سے تو اٹھاتا۔ نکالتا

دیکھاتا تماشے عجب دو جے تے
سے دکھاتا
دیاتا ہے لک نور یک تور تے
دکھاتا۔ ظاہر کرتا لاکھ ایک سے

ہریا کر دیکھا توں زمیں سات کوں
سبز ہرا دکھائے تو کو
دیا رنگ پھل پھول ہریک پات کوں
ہر ایک پتا کو

نوی پھول ڈالیاں پو بار آئے سو
نئے پہ۔ پر جو
او تشریف ہی تجھ کنے پائے سو
وہ خلعت تیرے پاس سے جو ملا

جو کچھ تو کرے سو سرے جم تجھے
وہ زیب دے بنتا تجھے
سدا سیوے مل سات عالم تجھے
تجھے عبادت کرے خدمت کرے

غواصی جو تجھ دار کا خاک ہے
تیرے دروازے کی
تیرے پانوں کا محض خاشاک ہے

دکھا کیمیا کر توں منج خاک کوں
تو مجھ کو
کھلا پھول کر منج خاشاک کوں
شگفتہ کر گل بنا مجھ کو

رجیا سچا توں غنی ہو رہے
سچا تو اور
غنی تجھ بغیر بھی نیں کوئی رہے
تیرے سوا نہیں

توں مقبول اپنے مقبلاں کا صحی
تو جمع مقبل کی درحقیقت
توں ہی نور روشن دلاں کا صحی
تو جمع دل کی حقیقتاً

جو کوئی زندہ دل ہے توں انکا حیات
تو
جو کوئی تج سنگاتی توں اسکے سنگات
تیرے رفیق۔ ساتھی ساتھ۔ ہمراہ

جو ہوں یا الٰہی تیرا داس میں
غلام
کیا ہوں بہوت یک لج تیرا آس میں
میں نے کی ہے بہت ہی اُمید

توں منج داس پر کھول در فیض کا
تو مجھ غلام
میرے من میں بھر توں اثر فیض کا
دل تو

طراوت توں دے منج اس باغ کوں — دو بخش منج درد کے داغ کوں
تو میرے کو — پھرے کو

عطا کر منجے کچھ تیرے ناؤں سوں — دے پرواز منجکوں بلند دھاؤں سوں
مجھے کچھ اپنے نام سے — مجھکو مقام سے (زنگ)

تیرے نور کا رہ دیکھایا منجے — دلا عاقبت کا پچھانا منجے
اپنے رستہ دکھانا مجھے — عطا کر پہچان عرفان مجھے

رجلا دے میرے جیو کی آنکھ کوں — دی ٹک باس مجہ دل کے پھول بھاگ کوں
دل کو — ذرا بو میری بوستان باغ کو

سدا کسب میرا سو اخلاص کر — تیرے خاص بندیاں میں منج خاص کر
اپنے بندوں مجھے

جگاجوت تجہ دھیان کیرے[1] ارتن — میرے من کے صندوق میں رکھ جتن
منور تیرے خیال تو کا جواہر — قلب امانت

ہماں کر منجے بات کے اوج کا — شہنشاہ کر گیان کی فوج کا
ہما مجھے سخن — حقیقت عرفان

میسحا کا دے منجکوں آثار جم — میرے جیب کوں کر شکربار جم
اثر سدا — میری زبان کو ہمیشہ

بھر امرت کے چشمے میری کلک میں — رتن غیب کے لیا میری ہلک میں
آب حیات — جواہر لا

جو غواص ہو تجہ سراتا اچھوں — نوے مضموناں دھنڈ لیاتا اچھوں
مدح کرتا ہوں — نئے مضمون ڈھونڈ لاتا ہوں

بحق نبی ہور تیرا رسول — مناجات کر منجہ بندے کا قبول
اور اپنے — مجھ بندے کی

مثنوی کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے

بہر حال یو نظم الہام سوں — کیا میں نول شاہ کے نام سوں
یہ سے — کہا سے

---

[1] یہ صرف اضافت کی قدیم صورت ہے چنانچہ حضرت کبیر داس جیؒ اپنے ہاں استعمال کر گئے ہیں:

پریم بنج نکو لکے چرٹھے نہ نام کی گیل — مانس کیری کھالڑی اوڑھ چلے جیوں بیل

برہن دیئے سند میرا سو ہمارے پیو — جل بن مچھلی کیوں سجئے پانی کیرا جیو

یہ لفظ اب بھی گیتوں میں آجاتا ہے جیسے "راج گاری ددنگی موری نندیا نہ جگاؤ۔ ایسو چھل بل ترنسے کرت سوتن سنگ پیت کیری ات جان جانت ناکا ہوسے۔ عمر یا سے کر جو ہاری موری نندیا نہ جگاؤ راج گاری ددنگی" (کھماج)

لکہ اس دعات سوں داستاں بے نظیر
رسالہ لطافت بھریا دل پذیر

جو توفیق پاکر جو بولیا تمام
مبارک گھڑی میں کیا میں تمام

برس یک ہزار ہور پنج تیس میں
کیا ختم یو نظم دن تیس میں

جو عارف وجوداں نزاکت شناس
صفا اس تھیں حاصل کریں بے قیاس

پڑیاں کوں تو سب آدی یو کام کوں
دیوے ذوق اوک خاص ہور عام کوں

لکھنارا یو لاب پرلاب پائے
سدا سرخ روئی کیرا آب پائے

مبارک اچھو ہر کتاں کوں یو مدام
بحق محمد علیہ السلام

مبارک گھڑی میں کیا میں تمام
محمد نبی پر ہزاراں سلام

حید حسن (دہلوی) آشیانہ۔ باغ ظفر جنگ
سیف آباد۔ حیدرآباد (دکن)

غزل

تاب غم خار کیا۔ بادۂ خوشگوار دے
ساقی غمگسار اب ساغر غم فشار دے

نخل امید بے ثمر۔ گریہ و زاری بے اثر
روز سیاہ ختم کر۔ مہر رخ نگار دے

رنج و عتاب ہو چکا۔ سینہ کباب ہو چکا
خوب خراب ہو چکا۔ دل کو مرے قرار دے

صدمۂ ہجر دردزا۔ درد فراق جانگزا
شوق وصال غم فزا۔ مژدۂ وصل یار دے

زندگی اک حباب ہے۔ پیش نظر سراب ہے
یعنی کہ سب یہ خواب ہے۔ خواب کو انتشار دے

ساتھ کے چل دیئے سبھی۔ ہاشمی زندہ ہے ابھی
کاش وہ آئے دن کبھی۔ جان یہ جاں نثار دے

جذبات صدق

اُس دفعہ جناب صدق کی ایک مکمل غزل مرسل ہی جو آپ نے فارسی کی طرز پر موزوں فرمائی ہے، اور جس کی عظمت کے متعلق اس قدر کہدینا کافی ہی کہ آج تک کسی مشہور شاعر نے اس ترکیب کی غزل نہیں لکھی۔ آپ جس صفائی بندش کے ساتھ تخیل کی انتہائی رنگینی سے سادہ الفاظ کو لبریز کر دیتے ہیں وہ آپ اپنی مثال ہی۔ علاوہ ازیں الفاظ کا ترنم، خیالات کی ندرت اور جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی، یہ محاسن جن کی تابناکیوں سے آپ کا ہر شعر زرنگار ہے ارباب ذوق کے لئے ایک وجد آور اور پر کیف سامان نشاط پیش کرتے ہیں۔ ہر شعر میں الفاظ نگینہ کی طرح جڑے ہوئے ہیں گویا ڈھلے ہوئے موتی ہیں کہ سلک شعر میں پرو کر عقد گوہر بیں تیار کر دیا گیا ہی۔ جو تغزل کی دیوی کے لئے بہترین تحفہ قرار دیا جا سکتا ہی۔ (عزیز)

غزل

کہا میں نے یہ پردہ فتنۂ اہلِ نظر ہوکر
کہا پھر کیا بپا کر دوں قیامت جلوہ گر ہوکر

کہا میں نے ستم کا داغ ہی اے ماہ دامن پر
کہا ممکن ہی کیوں کر داغ سے بچنا قمر ہوکر

کہا میں نے بڑی شہرت ہی خورشید قیامت کی
کہا تجھکو تماشا ہم دکھا دیں جلوہ گر ہوکر

کہا میں نے کہ دل پتھر ہی شاید ان حسینوں کا
کہا پھر دل میں گھر پتھر کے پیدا کر شرر ہوکر

کہا میں نے وہ اپنے قول تم نے سب بھلا ڈالے
کہا سہو و خطا سے کون خالی ہے بشر ہوکر

کہا میں نے دلِ زاہد پہ بتخانہ میں کیا گذری
کہا اب تک تپاں ہی بسملِ تیرِ نظر ہوکر

کہا میں نے ہوا انجام کیا شمعِ شبستاں کا
کہا دم بھر میں وہ بھی بجھ گئی شمعِ سحر ہوکر

کہا میں نے کہاں حسنِ خمِ ابرو کہاں خنجر
کہا یہ بھی پری بنجائے گا زیبِ کمر ہوکر

کہا میں نے رہے صدق و صفا سے ربط اچھا ہی
کہا پچھتائے ہم تو صدق سے شیر و شکر ہوکر

تزک جہانگیری اور مجدد الف ثانی

شہزادہ سلیم پسر جلال الدین اکبر شہنشاہ ہند نے باپ کے مرنے پر تخت سلطنت پر بیٹھکر
جہانگیر لقب اختیار کیا تو امور سلطنت کے متعلق روزنامچہ یا یادداشت لکھنا شروع کیا۔ اسی روزنامچہ
کا نام تزک جہانگیری ہے۔

تزک جہانگیری کی ابتدا اس عبارت سے ہے :-

"حمد و ثنا بے مرو حد و سپاس و ستایش لاتحصیٰ و تعد مر یگانہ پادشاہی راسزاست کہ
ذات لازم البرکات پادشاہان جہانگیر باعث اطمینان خلق و عالم و سبب دوام سلسلۂ بنی آدم
گردانید"

لیکن یہ عبارت مرزا محمد ہادی ایک ملازم دربار جہانگیری کی ہے جس نے تزک جہانگیری کے
قبل اپنی طرف سے ایک دیباچہ قایم کیا ہے جس میں بادشاہ کے خاندانی حالات درج ہیں اور دیگر
معززین و اراکین سلطنت کے تذکرے ہیں مندرجہ بالا عبارت سے اس دیباچہ کی ابتدا ہوئی ہے
روزنامچہ جہانگیر کی ابتدا جہانگیر کے قلم سے اس دیباچہ کے بعد یوں ہوئی ہے :-

"از عنایات بے غایات الٰہی یک ساعت نجومی روز پنجشنبہ ہشتم جمادی الثانی ہزار دہ
و چہار ہجری گزشتہ در دارالخلافت آگرہ در سن سی و ہشت سالگی بر تخت سلطنت جلوس نمودم"

جہانگیر اس روزنامچہ کو صرف انیسویں سال جلوس تک اپنے قلم سے لکھتا رہا یا اپنی نگرانی
خاص میں لکھواتا رہا۔ کوئی باب یا فصل اس کتاب میں نہیں ہے البتہ ہر جشن کے ذکر کے لئے جداجدا
سرخیاں قایم ہیں۔ مثلاً "جشن اولین نوروز"

"جشن نوروز میں نوروز از جلوس ہمایوں" کی سرخی سے جو عبارت شروع ہوئی ہے وہ
بہت عرصے کے بعد "بفراغ خاطر رو رانہ درگاہ گردد و اگر توقف را مصلحت خود می داند ہر گوشہ کہ
ازیں ملک التماس نماید عطا فرمائیم" پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد جہانگیر نے روزنامچہ لکھنا یا لکھوانا

کمزوری، عدیم الفرصتی یا تبدیل خیال کی وجہ سے بند کر دیا اور مرزا ہادی نے از خود حالات مابعد لکھکر جہانگیر کے حالات اخیر تک اس میں لکھدیئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہی:-

بائیسویں سال جلوس میں کشمیر کی سیر کو بادشاہ گیا۔ ایک ہرن کو شکار گاہ میں ایک پیادہ ہانک رہا تھا کہ اُس کا پاؤں پھسلا اور وہ پہاڑ سے لڑکتا ہوا خندق (کھڈ) میں گرا۔ بادشاہ پر اس نظارہ کا ایسا بُرا اثر پڑا کہ بادشاہ کی حالت خراب ہونے لگی اور پھر اس کا انتقال ہوگیا۔ مرزا ہادی نے جہانگیر کے حالات کے بعد شاہجہاں کی تخت نشینی اور دیگر متعلقات لکھکر کتاب (تزک جہانگیری) ختم کی۔ اخیر فقرات اس کے یہ ہیں۔

"طغرائے غرائے ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی بر مناشیر دولت ثبت شد، وجہاں پیر از سر نوجواں گردید، وجہانیاں راسرمایۂ امن و اماں بدست آمد"

تزک جہانگیری کی ماہیت بیان کرکے اب میں دکھاتا ہوں کہ شیخ احمد سرہندی (مجدّد الف ثانی) کے حالات اس میں کس طرح درج ہیں۔

۲۳ ربیع الاوّل ۱۰۲۷ھ کو سولھواں جشن بادشاہ کا ہوا چنانچہ "جشن سیزدہمیں نوروز از جلوس ہمایوں" کے ذیل میں پہلے طاعون پھیلنے کا ذکر ہی۔ اس کے بعد حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے قید کرنے کا حال یوں لکھا ہوا ہی۔

"دریں ایام بعرض رسید کہ شیخ احمد نام شیادے در سہرند دام زرق وسالوس فرو چیدہ بسیارے از ظاہر پرستان بے معنی را صید خود کردہ، وبہر شہرے و دیارے یکے از مریدانِ خود را، کہ آئین دکان آرائی ومعرفت فروشی ومردم فریبی را از دیگران پختہ تر داند خلیفہ نام نہادہ فرستادہ ومزخرفاتے کہ بمریدان ومعتقدانِ خود نوشتہ کتابے فراہم آوردہ مکتوباتے نام کردہ ودراں مہملات بسیار مقدمات لاطائل مرقوم گشتہ کہ بکفر وزندقہ منجر می شود۔ ازاں جملہ در مکتوب نوشتہ کردہ کہ در اثنائے سلوک گزارم بمقام ذی النورین افتاد۔ مقامے دیدم بغایت عالی وخوش بصفا۔ ازانجا در گزشتم بمقام فاروق پیوستم واز مقام فاروق بمقام صدیق عبور کردم وہر کدام را تعریفے درخور آں نوشتہ۔

وازانجا بمقام محبوبیت واصل شدہ مقامے مشاہدہ اُفتاد بغایت منور وملون۔ خود را بانواع انوار وانوان منعکس یافتم یعنی استغفراللہ ازمقام خلفا درگزشتہ بعالی مرتبت رجوع نمودم و دیگر گستاخیہا کردہ کہ نوشتن آں طولے دارد وازادب دور است۔ بنا برایں حکم فرمودم کہ بدرگاہِ عدالت آئین حاضر سازند حسب الحکم بملازمت پیوست۔ وازہرچہ پرسیدم جواب معقول نتوانست سامان نمود۔ وباعدم خرد ودانش بغایۃ مغرور وخود پسند ظاہر شد۔ صلاح حال او منحصر دریں دیدم کہ روزے چند در زندانِ ادب محبوس باشد تاشوریدگی مزاج وآشفتگی دماغش قدرے تسکین پزیرد وشورش عوام نیز فرونشیند لاجرم بال رابسکدلن حوالہ شد کہ درقلعہ گوالیار مقید دارد۔"

مفصلۂ بالا عبارت جہانگیری لکھی ہوئی یا لکھوائی ہوئی ہی اس کے بعد کچھ عرصہ تک جہانگیر توزک جہانگیری کو لکھتا رہا یا لکھواتا رہا۔ آخر میں یہ کام معتمد خاں کے سپرد ہو گیا تھا کہ وہ جہانگیر کے منشا کے موافق مسودہ لکھکر اور بادشاہ کو دکھا کر بیاض سلطانی میں اُسے نقل کر دیا کرے۔

"تزک جہانگیری میں مہابت خاں کی لڑائی اور مجدد صاحب کا قید سے چھوٹنا اس طرح مذکور نہیں ہو جس طرح معتقدین حضرت مجددؒ نے تحریر کئے ہیں لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں ہو کہ مجدد صاحب کو قید سے جہانگیر نے چھوڑا اور اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ مجددؒ صاحب کی برگزیدگی کا جہانگیر قائل ہو گیا تھا یا محض مصالح ملکی پر نظر کرکے آپ کو وہ مشیر اپنا ظاہر کرتا تھا اس کے متعلق کوئی تذکرہ تزک جہانگیری میں نہیں ہو۔ ملکی معاملات کے ساتھ ان باتوں کا ذکر نا مناسب بھی نہیں تھا۔ جہانگیر کیسا ہی سیدھا سادہ مزاج رکھتا تھا لیکن عقل جہانداری رکھتا تھا۔ اعتقادات مذہبی دل میں رکھنے کے تھے۔ تزک جہانگیری میں درج کئے جانے کے لایق وہ نہ تھے یہ بھی ایک قابلِ غور بات ہو کہ مجدد صاحب کے قید ہونے کے تھوڑے ہی زمانہ بعد جہانگیر نے تزک جہانگیری کا معتمد خاں سے لکھوانا بند کر دیا تھا اور مرزا ہادی نے از خود لکھنا شروع کیا تھا۔ مرزا ہادی کے لئے معتقدات بادشاہ کا ذکر حالات سلطنت کے ضمن میں مناسب نہ تھا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ مرزا ہادی کے خیالات حضرت مجدد کے متعلق کیسے تھے پھر بھی حضرت مجددؒ کی طرف سے جو بدگمانی بادشاہ کے دل میں تھی اُس کا

عرصہ تک قایم رہنا تزک جہانگیری سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ برعکس اس کے بادشاہ کی طرف سے حضرت مجدد کی خدمت میں زرِ نقد پیش کش ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ قید کے سال دو سال بعد تزک جہانگیری کی یہ عبارت ہے:-

"بست و دویم ماہ مذکور (شہر ذی قعدہ) جشن وزن شمسی آراستگی یافت۔ سال پنجاہ و پنجم از عمر ایں نیازمند بمبارکی و فرخندگی آغاز شد۔ بدستور ہر سال خود را بہ طلا و اجناس وزن فرمودہ در وجہ مستحقان مقرر فرمودم از انجملہ شیخ احمد سرہندی را دو ہزار روپیہ عنایت شد۔"

دو سال کے پہلے حضرت مجدد بجرم ریاکاری مستوجب عتاب شاہی تھے اور اب ایسے بے خطا ٹھیرے کہ مراحم خسروانہ کے سزاوار ٹھیرے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مجدد صاحب کے معتقدوں نے جو تاریخی حالات ان کے لکھے ہیں ان کا تزک جہانگیری میں مذکور نہ ہونا ان کے صحت میں شبہ کرنے کی وجہ نہیں ہو سکتا۔

بہرحال مجدد صاحب ایک خانقاہ کے درویش تھے ارا کین دولت ان کے مرید ہوئے تو بذریعہ مریدوں کے مجدد صاحب نے بادشاہ کے خیالات کی اصلاح کرنا چاہا۔ مکتوبات حضرت مجدد میں بہت سے مکتوب ایسے ہیں جو ظاہرا ارا کین دولت کے نام ہیں لیکن در پردہ جہانگیر کے نام ہیں۔ اس کے بعد بادشاہ کو مجدد صاحب کی طرف سے اندیشہ ہوا اور انہیں اُسی طرح گوالیار میں اُس نے قید کیا جس طرح شاہ قاسم سُلیمانی کو چنار میں قید کیا تھا۔ شاہ قاسم سُلیمانی مرتے دم تک قید میں رہے لیکن مجدد صاحب اس لئے لشکر شاہی پر اُن کا اثر تھا بہت جلد قید سے چھوٹے۔ مجدد صاحب بڑے پایہ کے درویش تھے قید میں وہ بہت خوش تھے حالت قید میں جو خطوط انھوں نے اپنے مریدین کے نام لکھے ہیں ان میں لذاتِ قید کا ذکر کیا ہے اور لطف قید کی کیفیت قید سے چھوٹنے کے بعد بھی آپ نے لکھی ہے۔ بادشاہ نے مجدد صاحب کو قید سے چھوڑ کر اپنا پیر بنایا یا نظر بندی کا ایک نیا راستہ کھولا بہرحال یہ مسلم ہے کہ برابر سفر اور حضر میں وہ مجدد صاحب کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس معیت کا ذکر بھی کئی مکتوبوں میں مجدد صاحب نے کیا ہے اخیر اخیر مجدد صاحب کا رسوخ

جہانگیر کے دربار میں اُس سے کہیں زیادہ تھا جو ابوالفضل اور فیضی کو دربار اکبری میں حاصل تھا معتمد خاں اور مرزا ہادی کی کوتاہ قلمی نے تزک جہانگیری میں مجدّد صاحب کو نظر انداز کیا اس لئے ملکی تاریخوں میں مجدّد صاحب کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن مجدّد صاحب کے خلفا اور مُریدین کی کتابوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہابت خاں کے نظر بندی سے رہائی پانے کے بعد نور جہاں سے زائد مجدّد صاحب کی رائے کو امور سلطنت میں دخل تھا۔ مجدّد صاحب سے ہر معاملات میں جہانگیر گو بظاہر استصواب نہیں کرتا تھا لیکن درپردہ یہ ضرور خیال رکھتا تھا کہ کوئی امر خلاف مزاج مجدّد صاحب کے سرزد نہ ہو۔

ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی

خیالاتِ عزیز

کیا ربط فرشتوں کو محبت کے اثر سے
اس درد کو پوچھے کوئی عاشق کے جگر سے

سُورج جو مقابل ہو مرے رشک قمر سے
تا صبح قیامت وہ پڑا نور کو ترسے

کس غیرتِ خورشید کی آمد ہے کہ یارب
کلیاں سی کھلی جاتی ہیں کچھ بادِ سحر سے

ایماں کے ہیں جذبات میری دل میں فراہم
خرمن یہ مرا پھونک دے۔ تو برق نظر سے

بیتی نہیں رات اور یہ مجھ کو ہے غم سے
لیجائیگا بازی مرا دل شمع سحر سے

مظلومیاں جھیلیں گے مسلماں مگر اے جوش!
تلوار کہاں کھول کے رکھدیں وہ کمر سے

اللہ شبِ غم کی بھی کیا صبح ہے غمناک
اِک گرد سی جھڑتی ہے پڑی نورِ سحر سے

پھر کوچۂ قاتل کو عزیز آج چلا ہے
نکلے ہیں جنازے کئی اس رہگذر سے

عزیز احمد خاں عزیز (علیگ)

افکارِ عالیہ

(نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی مدظلہ)

فضائے دہر میں ہم مثل برق آکے چلے — تڑپ کے کاٹ دیا وقت مُسکرا کے چلے

بسانِ نکہتِ گُل ساتھ ہم صبا کے چلے — وہ آشنا ہی جو کہنے پہ آشنا کے چلے

رواروی میں ہیں ہم سن لو قافلے والو! — جسے کہ ساتھ ہو دُنیا قدم اُٹھا کے چلے

یہ دیکھتا ہوں کہ ہے دل کی لاش اور میں ہوں — خبر نہیں ہے مجھے وار کب ادا کے چلے

نمود عشرتِ پیری ہُوا اجل آئی — چراغِ صبح تھے گویا کہ جھلملا کے چلے

نثار ہو جیے اس دل پہ جو ہو صاحبِ درد — وہ پاؤں چومئے جادہ پہ جو وفا کے چلے

ہندوستان کے سلاطین مغلیہ

باب اوّل

تیمور اعظم

پیدائش ۱۳۳۶ء وفات ۱۴۰۵ء

ملک اطالیہ[1] کے ایک چھوٹے سے شہر کے باشندے دریائے فرات[الف] سے لیکر کوہ البین[2] تک حصہ دنیا کے حکمراں ہوگئے۔ تہذیب ہم کو اُن سے وراثتہً پہونچی ہے اُن کی تاریخ ہمارے چھوٹے بچوں کو پڑھائی جاتی ہے۔ اُن کی زبان اور اُن کے علم ادب سے ہم ویسا ہی مانوس ہیں جیسا اپنے ملک کے علم ادب سے۔ اُن کے حکمرانوں اور ممتاز آدمیوں کے حالات زندگی مشترکہ علم کا جزو ہیں۔ ہم اُن کے عادات اور اُن کی بلند خیالیوں اور مخفی تحریکوں کو سمجھتے ہیں۔

رومتہ الکبریٰ[3] کے زمانہ عروج سے صدیوں مابعد مشرق کے انتہائی حصہ میں تاتاریوں اور منگولیوں کے فرقوں نے جانباز سپہ سالاروں کی ماتحتی میں بڑی قوت جمع کی اور قابل آبادی ایک حصہ دنیا کو پولینڈ[5] سے لیکر خلیج فارس اور ہندوستان تک۔ قسطنطنیہ سے بحر چین تک۔ کوریا سے

---

[1] اٹلی جنوبی یورپ کا ملک ہے اس کا دارالسلطنت روم ہے رقبہ ۱۱۰۰۶۳۲ مربع میل اور آبادی تین کروڑ سے زیادہ ہے
[2] البین یا جزیرہ سفید۔ برطانیہ کا قدیم نام۔ جنوبی و مشرقی ساحل پر سفید کیا ڑیوں کی وجہ سے گال قوم نے یہ نام تجویز کیا تھا [3] اٹلی کا دارالسلطنت۔ دریائے رین اور ڈینوب کے جنوب اور دریائے فرات کے مغرب میں رومیوں کی سلطنت ہر مقام پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس تمام خطہ میں دنیا نے اپنے قوانین اور خیالات روم ہی سے حاصل کئے [4] ملک روس کا ایک صوبہ ازمنہ متوسطہ میں وسطی یورپ کی ایک طاقتور سلطنت تھی۔ وارسا صدر مقام ہے۔ رقبہ ۹ ہزار مربع میل آبادی ۹ ملین ہے۔

الف۔ [illegible]

دریائے گنگ تک تسخیر کر لیا۔ اُن کی اولاد نے ہندوستان میں ایک مستحکم سلطنت کی بنا ڈالی جس کا اختتام ہمارے زمانہ میں ہوا۔ ایسے اجنبی اشخاص مثل چنگیز خاں یا تیمور یا اُن کے جلیل القدر جانشین بابر اور اکبر کی نسبت ہم موجودہ زمانہ کے متعلق کیا ہیں اور زندہ خیال قایم کر سکتے ہیں؟ شیکسپیئر[1] کا ڈراما جولیس سیزر ہمارے اسکولوں کے طلبہ کے لئے روم کی تاریخ کے نصاب میں ابتدائی کتاب کا کام شاید دے سکے لیکن مارلو[2] کی تصنیف "تیمور" جو اُس سے کسی طرح کم مشہور نہیں ہے تاتاری خان اعظم کا محض ناکافی اور ناکمل مرقع ہے۔

ان لوگوں کو ہماری قومی زندگی سے کبھی مس ہی نہیں رہا۔ وہ بالکل اجنبی ہیں۔ ہم اسپین کے موروں[3] کے حالات جان سکتے ہیں۔ شجاع صلاح الدین سے بھی ہم بہ نسبت شیر دل رچرڈ بادشاہ انگلستان یا سینٹ لوی والی فرانس کم واقف نہیں مگر منگولوں کے ساتھ ہم کو جو دلچسپی اور تعلق ہے وہ محض ایک علمی تحسین کی غرض سے ہے۔ اِس مُعمّہ کے حل کرنے میں عجیب مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس قوم کے کسی خاص شخص کے عادات اور اطوار بھی ہمارے عادات اور اطوار سے بیگانہ نہیں ہیں بلکہ اُن کی تاریخیں بھی اجنبی شکل میں پیش کی گئی ہیں جو بجائے مطمئن کر دینے کے اُلجھن اور پریشانی میں ڈال دیتی ہیں۔ یہ خیال کر لینا بہت آسان ہے کہ الغ بیگ[4] تیمور کے پوتے نے ۱۴۲۰ء میں بمقام سمرقند علم ہیئت کے

---

[1] انگریزی زبان کا مسلم الثبوت شاعر و ڈراما نویس [2] مشہور ڈراما نویس۔ انگریزی زبان میں غیر مقفیٰ شاعری کا موجد سمجھا جاتا ہے [3] شمالی افریقہ میں طرابلس الغرب کے باشندے مور کہلائے جاتے تھے۔ مور کا اطلاق اُن عربوں پر کیا جاتا ہے جنھوں نے اندلس فتح کر کے اوریل آٹھویں صدی عیسوی سے آخر پندرھویں صدی عیسوی تک اسپین میں حکومت کی ہے اور جن کے علم و تہذیب کا سلسلہ یورپ کے دل پر بیٹھا ہوا ہے اُن کے آثار قدیمہ اب بھی وہاں نظر آتے ہیں۔ علم ہندسہ اور الجبرا میں کامل دستگاہ حاصل کر کے قریب قریب موجد ہونے کا لقب حاصل کیا [4] الغ بیگ نے اپنی سلطنت کے جملہ منجمین کو جمع کیا اور اُنھوں نے اپنی کوشش سے وہ نقشہ بنایا ہے جو الغ بیگ کے نام سے مشہور ہیں۔ اِس بادشاہ نے صلح آشتی اور رعایا کی امن و امان کو اپنا مقصد اولین قرار دیا۔ جھگڑے و فساد کی طرف اُس کی طبیعت مائل نہ تھی۔ الغ بیگ نے ایک تاریخ الوس اربع میں ہے اس میں زیادہ تر انھیں چار حصہ جات سلطنت کے حالات درج ہیں جن کو چنگیز خاں نے اپنے چار بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ عبداللطیف خاں اُن کے بیٹے نے اُن کو شکست دے کر قید کر لیا اور قتل کر ڈالا مگر خود بھی چند روز بعد اپنے بھائیوں کے ہاتھ مارا گیا۔

متعلق ایک بے نظیر عظیم الشان رصدگاہ ٹیکو براہی کے رصدگاہ یورانیبرگ واقع ڈنمارک سے بھی
ایک سو چالیس برس قبل تعمیر کرائی تھی لیکن اُن سازشوں اور ظالمانہ کارروائیوں کا سمجھنا قریب
قریب ناممکن ہے جن کی وجہ سے یہ نیک نہاد شاہزادہ تخت سے اُتارا اور آخر کار اپنے ہی بیٹے کے
ہاتھوں قتل کیا گیا وقس علیٰ ہذا۔ اس لیے چنگیز خاں یا تیمور (تمرلنگ) کے عہد کی مسلسل تاریخ جسے
کسی ایشیائی مورخ نے ترتیب دیا ہو ہمارے خیال میں بالکل غیر متعلق اور خلاف عقل ہوگی اس کے
صفحات جس میں تمام تر خونریزی کے حالات درج ہیں۔ دوزخ کے مانند ہیں۔ جو بالکل فضول اور
بے مطلب باتیں ہیں جن کا کچھ حاصل نہیں۔

اگر ہم اس شوق کو پورا کرنا اور تیمور لیسے حکمراں کے حالات، عادات، اور اطوار کا کم سے کم
کچھ حصہ جاننا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنے ہی ملک کے اُن لوگوں کی تحریرات
اور بیانات جمع کریں جنھوں نے اُس کے حرکات و سکنات کو بچشم خود دیکھا ہو۔ یہ مجموعہ ہماری
نظروں کے سامنے ایک نمایاں خاکہ کھینچ دیتا ہے جس کے واقعات اگرچہ مکمل نہیں ہیں تاہم فہم میں
آسکتے ہیں۔ لیکن اُس کے متعلق مزید مشرح حالات کے لیے ہمیں اُسی ملک کے باشندوں کی تصنیفات
کا اقتباس کرنا چاہیے تاہم انتخاب کرتے وقت یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ مصنف ہمارے نزدیک
مشہور ہے اور اُس کا بیان مدلل ہے؟ بالآخر اگرچہ یہ امر دقت طلب ہے تاہم حد امکان میں ہے کہ
ہم اس تصویر کو دُنیا کی نظر میں اُس کے مناسب موقع پر چسپاں کریں جو ہم کو اپنے رومن بزرگوں
سے میراث میں ملی ہے اور جسے ہم نے اپنے لیے اختیار کر لیا ہے مگر یہ امر ملحوظ خاطر رکھنا نہایت ضروری
ہے کہ منگولوں کی تاریخ روم کے زمانہ سے قریب قریب دو ہزار سال کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔

تاتاری[2] خان اعظم کے دربار میں ایک سفارت

سینٹ لوئی فرانس کا بادشاہ ۱۲۴۸ء [۱۲۵۴ء] میں بیت المقدس کی زیارت کے لیے جہاز پر سوار ہو کر

---

[1] سلی ایشیا کا ایک شہر

[2] اب ملک تاتاری کا اطلاق سلطنت چین کے بعض حصوں، ترکستان اور جنوبی روس پر ہوتا ہے

روانہ ہوا۔ وہ ابھی قبرص ہی تک پہونچا تھا کہ اُس کے حضور میں تاتاری خانِ اعظم کے سفیر بار یاب ہوئے، وہ غلطی سے یہ سمجھا کہ خان نے عیسائی مذہب قبول کر لیا ہے۔ یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سارا سین (مسلمانوں) پر ایک طرف سے حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ دوسری طرف سے صلیبی جنگ کرنے والوں نے قدم بڑھایا۔ بادشاہ نے شام سے ولیم ڈی روبروقس ایک عیسائی درویش (پادری)، کو جو فرائر مانیرس کے سلسلہ کا ایک راہب تھا بطور ایلچی کے تاتار روانہ کیا۔ اس سفر کی علت غائی یہ تھی کہ وہاں کے خفیہ حالات دریافت کیے جائیں اور جہاں تک امکان میں ہو لوگوں کو عیسائی بنایا جائے۔ ڈی روبروقس عجیب خوبیوں کا آدمی تھا۔ وہ جفاکشی، پیری یا زہد اور ایمانداری کا سچا نمونہ تھا۔ اُس کا خط جس میں اُس نے اپنے غیر معمولی سفر کے حالات قلمبند کر کے شاہ فرانس کے حضور میں ارسال کیا تھا اس قابل ہے کہ توجہ کے ساتھ تمام و کمال پڑھا جائے جس کے دیکھنے سے وہ متذکرۂ بالا تعریف کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ ڈی روبروقس مئی ۱۲۵۳ء میں قسطنطنیہ سے تاتار کو روانہ ہوا اور مہینوں کے خطرناک سفر

بقیہ صفحہ ۴۳۔ تاتاری قوم منگولین نسل کی ایک شاخ تھی جس نے غالباً قریب دسویں صدی عیسوی کے ایک حصہ یورپ پر قبضہ کر لیا تھا۔ یورپین چنگیز خاں کی نسل کے اُن لوگوں کو تاتاری کہتے ہیں جنھوں نے چین پر اپنا قبضہ اور تیرھویں صدی عیسوی میں وسط ایشیا کو چھایا تھا۔ بعد اس کا اطلاق منگولوں کے کل گروہوں پر جو مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ میں ظاہر ہوئے ہوتا رہا۔

سلہ اُن عربوں سے مراد ہے جنھوں نے سلطنت رومۃ الکبریٰ کے سرحد کو متزلزل کر دیا تھا اور بعد میں اُن تمام عربوں کے لیے مستعمل ہونے لگا جنھوں نے اسلام اختیار کر لیا اور اپنی فتوحات کو شام۔ فارس۔ مصر اور شمالی افریقہ تک وسعت دی۔

سلہ ترکوں کے ہاتھ سے بیت المقدس کے لینے کے لیے یورپ کے عیسائی قوموں کو بار ہا جنگ کی شکل میں جان و مال کی قربانیاں کرنی پڑی ہیں۔ ان محاربوں کو صلیبی جنگ اور ان میں حصہ لینے والے عیسائیوں کو کروسیڈر کہتے ہیں لوئی نہم (سینٹ لوی) نے اپنی زندگی میں دوبار ایک ۱۲۴۹ء اور دوسرے ۱۲۷۰ء میں جس میں انگلستان کا بادشاہ ایڈورڈ اول بھی شریک تھا۔ صلیبی جنگ کی اور اگرچہ بیت المقدس اب تک ترکوں کے ہاتھ میں ہے تاہم ان لڑائیوں سے مغرب نے بہت فائدہ اُٹھایا۔ انگلستان میں عامۃ الناس کی آواز زوردار سمجھی جانے لگی۔ دول کے تعلقات دوستانہ ہو گئے۔ ایشیا میں یورپین تجارت کو فروغ ہوا اور سب سے زیادہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ رُک گیا۔

کے بعد چنگیز خاں کے پوتے باتو (پیدائش سنہ ۱۱۶۲ء وفات سنہ ۱۲۵۵ء) کے دربار میں پہنچا۔

تیمور کی رعایا قریب قریب چنگیز خاں کی رعایا جیسی تھی۔ صرف خاص فرق یہ تھا کہ یہ لوگ اسلام قبول کر چکے تھے مگر جدید مذہب کی پوری پابندی نہ تھی اُن کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے اس سے اچھا اور کوئی طریقہ ہوگا کہ اس نیک پادری کے روزنامچہ سے چند فقرے اس موقع پر نقل کر دیے جائیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"اُن حدود سے گزرنے کے بعد ہم تاتار پہنچے وہاں پہنچکر ایسا معلوم ہوا کہ میں ایک نئی دنیا میں داخل ہوا ہوں۔ وہاں کے باشندوں کے طریقۂ زندگی اور طرز معاشرت کو حتی الامکان میں بندگانِ عالی کے حضور میں بیان کرونگا۔ اُن کا کوئی مستقل مسکن نہیں ہے نہ وہ آج یہ جانتے ہیں کہ کل کہاں قیام کریں گے۔ تمامی سیتھیا جس کی وسعت دریائی ڈینوب سے مشرق کے انتہائی حد تک ہے اُن کے قبضہ میں ہے۔ اُن کا ہر ایک سردار اپنے ساتھیوں کی تعداد کے لحاظ سے اپنے چراگاہ کے حدود جانتا اور اُن مقامات سے واقف ہے۔ جہاں جاڑہ، گرمی، بہار اور خزاں میں مویشی چرانا چاہیے۔ اُن کے مکانات مدور کھچوں کی بنیاد پر بنائے جاتے ہیں جن میں وہ نہایت کاریگری سے اوپر لیجا کر ایک دوسرے سے ملا دیتے ہیں۔ چھت بھی کھپانچ کی ہوتی ہے جو اوپر جاکر گولائی میں ملجاتی ہے اُس کے اوپر وہ سفید یا سیاہ نمدہ ڈھانک دیتے ہیں۔ اس گنبد کو وہ مختلف قسم کی تصویروں سے آراستہ کرتے ہیں"۔

"ان مکانات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑے بڑے بیس بیس فیٹ چوڑے چھکڑوں پر لیجاتے ہیں۔ جن میں بائیس بیل جوتے جاتے ہیں اور ہر قطار میں گیارہ گیارہ بیل ہوتے ہیں گاڑی کے دُھرے کی جسامت جہاز کے مستول کی سی ہوتی ہے۔ باتو نبیرۂ چنگیز خاں کی سولہ بیگمات ہیں ان میں ہر ایک عالی شان محلات میں رہتی ہیں۔ اسی لیے تاتاری امیر کا دربار ایک بڑے موضع کے مانند معلوم ہوتا ہے"۔

پڑاؤ پر مکانات گاڑیوں سے اوتار کر ترتیب دیئے جاتے تھے۔ ان مکانات میں بستر اور

اسباب کے لیے مخصوص جگہ ہوتی تھی۔" ایک چھوٹا پتلا سا بت بھی ہوتا ہے وہ گویا کل مکان کا محافظ خیال کیا جاتا ہے"۔ ہر مکان میں علی العموم ایک رسم رائج ہے یعنی ایک تپائی ضرور ہوگی جس پر دودہ پینے کے لیے برتن اور پیالے رکھے جاتے ہیں۔ گرمی کے دنوں میں گھوڑی* کے دودہ سے زیادہ وہ اور کسی شے کی پروا نہیں کرتے۔

"حضور والا۔ اُن کے غذا کے متعلق میری یہ التماس ہے کہ یہ لوگ بلا تفریق و امتیاز کے اپنے کل جانوروں کا گوشت جو ضعیفی یا بیماری کی وجہ سے مرجاتے ہیں کھایا کرتے ہیں"۔

تاتاریوں کے رسم و رواج اور قوانین بہت طوالت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ سزائی تازیانہ اور موت خاص سزائیں ہیں۔

"ان وحشی آدمیوں میں پہونچکر میں نے خیال کیا کہ جیسا میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ میں بالکل ایک نئی دنیا میں آگیا ہوں۔ پہلا سوال جو اُن لوگوں نے مجھ سے کیا یہ تھا کہ اس سے قبل ہم اُن لوگوں کے ساتھ رہے ہیں یا نہیں۔ پھر عرصہ تک ہمیں انتظار میں رکھا۔ ہم سے ہماری روٹی طلب کرتے تھے اور ہر شے کو دیکھ کر تعجب اور اُس کے لینے کی خواہش کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اُنھوں نے کوئی چیز مجھسے بہ جبر نہیں لی لیکن جو کچھ بھی وہ دیکھ پاتے بہت ضد کے ساتھ مانگتے۔ اگر کوئی شخص اُنھیں کوئی چیز دے بھی تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ضائع ہوگئی کیونکہ وہ کمبخت بڑے ناشکر گذار ہیں۔ جب ہم اُن سے علٰحدہ ہوئے تو میں نے فی الحقیقت یہ خیال کیا کہ ہم نے شیطانوں کے ہاتھ سے رہائی پائی"۔

اس سفر میں ایلچی چنگیز خاں کے دوسرے پوتے زغتائی کے روبرو پیش کیا گیا جس کے سامنے وہ خوف اور شرم کے ساتھ حاضر ہوا۔ اور اگرچہ راہب ایلچی کے تحائف بہت تھوڑے تھے

---

*کا سماس یا کومیس گھوڑی کا دودہ منعقد۔ گائے کے دودہ کو جوش دیکر جس طرح اب ڈبوں میں بند کرکے یورپ والے فروخت کرتے ہیں بعینہ اسی طرح گھوڑی کے دودہ کو اُبال کر تاتاری استعمال کرتے اور دوسرے جانوروں کے دودہ سے ہاضمہ کے حق میں بالخصوص جبکہ لگاتار سفر آتی ہو مفید جانتے تھے۔

تاہم اُس کی خاطر و مدارات میں کمی نہیں کی گئی۔

"میں نے اُس کے سامنے حواریوں کے عقائد کی تشریح کی جس کے سننے کے بعد اُس نے صرف سر ہلا دیا۔ مگر ترجمان "ناقابل تھا"

"راستہ میں اُنھوں نے بجز زمین اور آسمان کے کچھ نہیں دیکھا بلکہ وہ برابر مشرق کی جانب چلے گئے"، یہانتک کہ اپنے منزلِ مقصود کو پہونچ گئے۔ خان کے دربار میں پہنچکر ایک گونہ اونھیں راحت و آسائش نصیب ہوئی۔ یہ دیکھ کر کہ وہاں متعدد نسطورین[1] اور جیکوبیٹ کاہن اور بہت سے پناہ گزیں روسی۔ یونانی۔ اہل ہنگری۔ مسلمان۔ اور نیز نائٹ ٹیمپلر[2] فرانسیسی سنار پیرس کا ولیم بوکیر اور اُس کی زوجہ "میٹز[3] واقع لارین کی ایک عورت" اور ایک آوارہ گرد انگریز موجود تھے جن سے وہ ملے سخت تعجب معلوم ہوا۔ یہ عہد تیمور سے سو برس پیشتر کا ذکر ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کے عہد میں سمرقند میں انواع واقسام کے فنون پائے جاتے تھے۔ تاتاریوں اور منگولیون کے فرقوں کی حالت اُس کے عہد میں بھی سوا اس کے کہ بدلے نام انھوں نے

---

[1] نسطورین پانچویں صدی عیسوی میں بمقام قسطنطنیہ مذہب عیسوی کا ایک زبردست امام گذرا ہے اُس کے پیرو نسطورین کہلاتے ہیں اُس کا اعتقاد یہ تھا کہ الوہیت اور بشریت دونوں وجود ایک ہی وجود (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا بشکل انسان) میں سرایت نہیں کر سکتے اور اس لیے حضرت مریم کو خدا کی ماں کہنا مناسب نہیں ہے اگرچہ اُنکو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں کہہ سکتے ہیں۔ اس اعتقاد کیوجہ سے اُس پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ یہ فرقہ فارس ہندوستان اور ایشیا کے دیگر ممالک میں بھی قایم کیا گیا تھا اور اب بھی اس کا وجود کہیں نہ کہیں ہے۔

[2] جیمس ثانی شاہ انگلستان کے معزولی کے بعد جو لوگ اُن کے یا اُس کے ورثا کے ہوا خواہ تھے یا ولیم اور میری کے حق میں جو انقلاب ۱۶۸۸ء میں ہوا تھا اُس کے مخالف جس کو بائٹ کہلاتے تھے۔

[3] نائٹ کا ایک مذہبی مرتبہ یا درجہ ۱۱۱۸ء میں قائم کیا گیا۔ اس کے ممبروں کا فرض یہ تھا کہ زیرین یروشلم کی حفاظت کریں۔ ۱۲۹۱ء یہ شہر سار اسین کے قبضہ میں آگیا اور یہ سوسائٹی وہاں سے قبرس کو منتقل ہو گئی۔

[4] جرمنی کا شہر ۱۸۷۱ء یہ فرانس کا شہر تھا۔

اسلام قبول کر لیا تھا۔ بدستور قائم تھی۔ چوتھی صدی میں نسطورین نے خراسان میں دین عیسوی کی اشاعت کی۔ مروین ۳۳۴ء میں اور سمرقند و ہرات میں ۴۲۰ء میں نسطورین بشپ موجود تھے۔ کیرات کے ترکمانوں نے بحیثیت مجموعی ۱۰۰۷ء میں عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ ماوراءالنہر میں بدھ مذہب چین کی طرف سے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تھوڑے ہی دنوں بعد اسلام حدود فارس سے گذر کر آیا۔ چنگیز خاں ان سب فرقوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرتا تھا۔

مگر چنگیز خاں اور اس کے بیٹوں کے عہد کی یہ مذہبی آزادی تیمور کے زمانہ میں جاتی رہی۔ اور مذہبی معاملات میں مسلمان ملاؤں کا عمل دخل ہوگیا لیکن فنون تعمیر، زرگری، اسلحہ سازی، اور پارچہ بافی کے پودے، یورپ، چین، افریقہ، عرب اور فارس سے منتقل ہو کر ان جنگلوں میں نصب ہو چکے تھے۔ ہیئت، ریاضی، شاعری، اور مختلف قسم کے علوم کا بیج ڈالدیا گیا تھا اور زمین بعض فنون کے اس حیرت انگیز ترقی (بالخصوص فن تعمیر) کے لیے تیار کر دی گئی تھی جس کے لیے تیمور اور اس کے سلسلہ میں اس کے قریب تر جانشینوں کا عہد خاصکر ممتاز خیال کیا جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

غزل

کر نہ اظہار محبت جوش میں ۔۔۔ اے دل دیوانہ قسمت ہوش میں
بیخودی کس کا تصور بندھ گیا ۔۔۔ کون آ بیٹھا مرے آغوش میں
مدعائے دل نہ جیتے جی کھلے ۔۔۔ ظرف اتنا ہو لب خاموش میں

دیکھو یہ دنیا ہے میخانہ نہیں
ہوش میں آجاؤ بیخود ہوش میں

بیخود (علیگ)

فکرِ سلیم

(نتیجۂ فکرِ عالی جناب مولانا وحید الدین صاحب سلیم)

کس قدر تیز ہے جلوہ تری رعنائی کا
چاک ہو جائیگا پردہ مری بینائی کا

میری ہمت کے جو قدرے تھے بکھر کر سمٹے
کیوں نہ ممنون ہوں تری حوصلہ افزائی کا

جو خموشی میں مزا پایا ہے کیونکر ہو بیان
ناطقہ بند ہے گویا مری گویائی کا

وہ مئے شوق سما سکتی ہے کس مینا میں
جس سے لبریز ہے دل تیرے تمنائی کا

مرکزِ حسنِ ازل تک ہو رسائی کیونکر
حوصلہ پست ہے تاروں کی توانائی کا

ساقیِ حسن مئے جلوہ ذرا روک کے دے
کہ چھلکنے کو ہے ساغر مری بینائی کا

کروٹیں زردہ تمنائیں بدلتی ہیں مری
میں ہوں قائل ترے غمزوں کی مسیحائی کا

کان رکھ دل کی طرف غور سے سن اے مظلوم!
کون دیتا ہے یہ پیغام شکیبائی کا

چاندنی رات میں دریا کا وہ لہریں لینا
کھنچ گیا نقشہ تری نازکی انگڑائی کا

نحن اقرب ترا اک عشوہ ہے اے حسنِ ازل
کون ہیں ہم کہ ہوں مانع تری یکتائی کا

گوشِ غافل نہیں سنتا ہے تری حمد مگر
شوق ہر چیز کو ہے زمزمہ پیرائی کا

ہر تصور میں ہے پھولوں کی بھری رنگینی
شوق یہ کس کو ہوا ہے چمن آرائی کا

میری دنیائے تخیل میں اندھیرا ہے اگر
تم نقاب آ کے الٹ دو شبِ تنہائی کا

ہو نہ گر رنگِ مجازی میں حقیقت کی بہار
پھونک دو لیکے چمن قافیہ پیمائی کا

المرسل

حضرت درد بریلوی

رضاب کی سرگذشت

(۱)

زمانۂ قدیم میں ساحلِ یونان پر، بلند و بالا برف آلود پہاڑیوں اور سمندر کے درمیانی خطّے میں ایک سادہ وضع نیک معاش قوم آباد تھی جس کا نام بتانا ضروری نہیں۔ یہ لوگ اگرچہ بالکل سمندر کے کنارے بستے تھے لیکن زراعت انکا آبائی پیشہ تھا اور سال میں ایک یا دو بار ان میں سے کچھ لوگ سمندر سے مچھلیاں بھی پکڑکر لایا کرتے تھے مگر زیادہ تر یہ لوگ کھیتی باڑی کرنے اور انگور کی بیلیں چڑھانے میں اپنا وقت صرف کیا کرتے تھے اور زمین چونکہ بہت زرخیز تھی اس لیے اپنی محنت سے بہت معقول فائدہ اٹھایا کرتے تھے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی قریب کے ساحل سے تجارتی کشتیاں بندرگاہ میں لنگر انداز ہوتیں اور ایسے موقعوں پر، کیا مرد کیا عورت، ہر ایک ہی جہازیوں سے گلخپ کرنے کے شوق میں دوڑا ہوا جاتا اور درآمدہ اشیاء، یعنی رنگین کپڑوں اور زیورات کو بنظرِ استحسان دیکھتا اور اپنے تیل، غلہ جات اور شراب کے بدلہ میں یہ مُطلاّ ذخائر تو واردوں سے خرید کرتا۔ لیکن جونہی کہ جہاز اپنے ملک کو واپس روانہ ہو جاتا سب کے سب بکمال اطمینان و طمانیت اپنے اپنے کام پر واپس آجاتے اور جن جن لوگوں نے زرق برق ملبوسات یا زیورات خریدے ہوتے وہ اگلا تیوہار منانے تک کے لیے ان چیزوں کو صندوقوں میں مقفل کر دیا کرتے۔

اس سرزمین میں غریب و امیر کی کوئی تمیز و تخصیص نہ تھی اور بہت کم اشخاص یہاں ایسے تھے جنھیں درحقیقت غریب و مفلس کہا جا سکتا ہے لیکن صرف ایک ہی شخص وہاں ایسا تھا جو کسی نامعلوم وجہ سے ہمیشہ اپنے ہموطنوں سے زیادہ قلاّش رہا کرتا تھا۔ یہ شخص اپنی عمر کا انتیسواں سال ختم کرنیوالا تھا لیکن اب بھی وہ نہایت سُرخ و سفید اور تن و تندرست اور زراعت کے کام میں بہت ماہر تھا مگر افسوس یہ ہے کہ بدقسمتی و فلاکت نے اُس کا ساتھ کبھی نہ چھوڑا۔ اگر کبھی وہ موسم خوشگوار دیکھ کر گھاس

وغیرہ کاٹنے کا ارادہ کرتا تو کبھی یکایک بارش تمام فصل خراب کر دیتی کبھی اسی قسم کی کوئی اور مصیبت اُس کا پیچھا لیتی، جس سال اُس کے کھیت کی پیداوار کم ہوتی تھی اُسی سال ہر جگہ فصلیں پہلے سے بہت بہتر ہوا کرتیں اور کبھی شراب تیار کرنے کا وقت وہ غلط سوچتا تھا؛ اگر کبھی گاتوں پر بھیڑیے حملہ آور ہو جاتے تو زیادہ تر اُسی کی بھیڑ بکریوں کا قلع قمع کرتے؛ اُس کے گھوڑے بلا وجہ لنگڑے ہو جایا کرتے اور اُس کے گائے بیل بے سبب کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہو جاتے، غرض کہ کسی کام میں بھی اُس کا بھلا نہ ہوتا تھا اور باوجود انتہائی محنت و کفایت شعاری کے وہ روز بروز مفلس ہوتا جاتا تھا۔

ان تمام مصیبتوں کے باوجود یہ شخص اپنا دل قوی رکھتا تھا اور صرف ایک چیز (جس کے سبب اُسے اپنی قسمت سے شکایت رہتی تھی) یہ تھی کہ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی جو اس بڑھاپے میں اُس کو دُعائیں دے سکے یا اُس کے دل کو مسرور کر سکے؛ اس شخص نے متعدد بار دیوتاؤں سے گڑگڑا کر التجا کی تھی کہ وہ اُس کی تنہائی پر رحم کریں اور اُسے خیال تھا کہ اگر اُس کے ہاں ایک بچہ بھی ہو گیا تو بس اُس کی دلی آرزو پوری ہو جائے گی اور اُسے بے حد مسرت حاصل ہو گی۔

ایک دن گرمی شدت کی تھی اور صبح سے کام کرتے کرتے تھک کر قریب سہ پہر یہ شخص سو گیا اور اُسی نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ اپنی بیوہ کا ہاتھ پکڑے کھڑا ہے اور وہ دونوں ایک خوبصورت ننھے سے پودے کو، جو ان کے پاؤں کے پاس اُگ رہا ہے، غور سے دیکھ رہے ہیں؛ دیکھتے ہی دیکھتے یہ پودا بڑھنا شروع ہوا اور بڑھتے بڑھتے اِن کے قد کے برابر آ گیا۔ ایک عجیب قسم کی چمکدار روشنی اِس درخت کو گھیرے ہوئے تھی اور ایسی تیز اور چمکیلی روشنی تھی کہ ان دونوں، میاں بیوی، کی آنکھیں اُس پر نہ ٹھہر سکیں اور یہ دونوں بے ہوش ہو کر گر پڑے؛ تھوڑی دیر یہ دونوں بالکل غافل پڑے رہے اور ایسے کہ گویا مر گئے؛ لیکن بغیر آنکھیں کھولے ہی دونوں کو محسوس ہوا کہ وہ پودا اب ایک خاصا بڑا درخت بن گیا تھا اور اُس کی شاخوں میں سے ایک تاج، ایک تلوار، ایک جھانجھ اور ایک منتر نیچے لٹک رہے تھے؛ وہ دونوں ابھی لیٹے ہوئے ہی تھے کہ ہوا کا جھکڑ چلنا شروع ہوا جس کے سبب اُس درخت کے پتے ہلنے لگے؛ -

تا ضیں ایک دوسرے سے ٹکراتے اور ایسی آوازیں دینے لگیں جیسے جنگی باجے بجتے ہوں یا جیسے ہتیاروں کی جھنکار ہوتی ہے اور اِسی شور وغل کے دوران میں کچھ مردانی آوازیں آئیں جو غیر ملکی وحشیانہ راگ الاپ رہی تھیں ۔

کسان گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور چاروں طرف گھبرا گھبرا کر دیکھنے لگا کہ اس عجیب و غریب خواب کا مطلب کیا تھا؟ آخر کار اُس نے محسوس کیا کہ یہ خواب ایک بشارت تھی جو اُسے دی گئی اور اُسے اس خیال کے سبب جب وہ کھڑا ہو کر اپنے کام کاج میں لگ گیا تو وہ پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش معلوم ہوتا تھا، رات کو جب وہ اپنے گھر واپس پہنچا تو اُسے خبر ملی کہ اُسی دن اُس کے ہاں ایک لڑکی تولد ہوئی ہے ۔

اب اس خوش نصیب بڈھے سے زیادہ مسرور و شاداں کون ہوسکتا تھا؟ اگرچہ وہ غریب تھا لیکن اُس نے اِس ولادتِ مسعود کی خوشی میں اپنے تمام پڑوسیوں کو ایک پُر تکلف دعوت دی اور اکل و شرب کے مہیا کرنے میں اُس نے ہرگز بخیلی نہ کی۔ اُس نے خیال کیا کہ اب تو میری قسمت ہی بدل گئی اب کیا ہے؟ اگلے سال تک غالباً میری تقدیر کا پانسہ ہی پلٹ جائے گا ۔

لیکن اگلا سال بھی پہلے سالوں سے کچھ زیادہ بختاوری کا نہ تھا، وقت گذرتا گیا اور اُس کی لڑکی بچے سے ایک جوان خوبصورت لڑکی ہوتی گئی مگر اب بھی وہ پہلے کی طرح مفلس کنگال رہا اور تقریباً ہر ایک کام میں ہی بدقسمتی کا شکار رہا، القصہ وہ لڑکی، جس کا نام رُضاب تھا۔ اُنیس برس کی ہوگئی اور اب اسقدر حسین و خوبرو ہوگئی تھی کہ سارے ملک میں اُس کا کوئی ہمسر نہ تھا اور بہت سے نوخیز نوجوان اُس پر دل و جان سے فریفتہ تھے۔ لڑکی اپنے ہر والہ و شیدا سے بے رُخی برتتی اور اُس کے فریاد و شیون کا اُس پر بالکل اثر نہ ہوتا، بہت سے نوعمر اُس کے عشق میں اپنے آپ کو دل شکستہ اور مایوس حسرت تصور کرنے لگے تھے، لیکن اس میں اس لڑکی کا کوئی قصور نہ تھا کیونکہ اس نے کسی کی ہمت افزائی تو کی نہ تھی ۔ وہ سب سے

الگ تھلگ رہتی، گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی اور اپنی مفتخرانہ چال ڈھال
کے سبب اپنے گرد و نواح کی چھوٹی سی دنیا میں وہ ایک عجوبہ ہستی معلوم ہوتی تھی۔
گرمیوں کا موسم تھا اور ایک روز رات کو وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے فقیر منش
گھر کے بے تزئین ہال میں بیٹھی ہوئی تھی، جھٹ پٹا ہو چکا تھا اور جگادڑیں کھڑکیوں سے ٹکراتی
پھرتی تھیں: ضعیف کسان نے ابھی شمع بھی روشن نہ کی تھی بلکہ اندھیرے ہی میں بیٹھا ہوا باتیں
کر رہا تھا۔ وہ اپنے پُرجوش زمانۂ شباب کا ایک قصہ بیان کر رہا تھا جبکہ چند بحری قزاقوں نے
اُس کشتی کو جس میں وہ کسان خود سفر کر رہا تھا گھیر لیا اور بہت جدال و قتال واقع ہوا! لیٹروں
کے جہاز کے اگلے حصہ پر ایک اژدھے کی رنگین تصویر منقش تھی اور فولادی ہتیاروں نے بہت
جلد دشمن کو نیچا دکھا کر ارباب قضا و قدر کے حوالے کر دیا مگر آخر کار اُس جہاز پر قبضہ ہو گیا باوجود یکہ
تقریباً تین گھنٹہ تک خوب گھمسان لڑائی رہی اور فریقین کی قسمت "تصفیہ طلب" رہی۔ کسان بولا
ہم نے جہاز کو ایک تنگ رتیلی خلیج میں دھسا دیا اور اُسی روز رات کو اُس کا تمام مال و اسباب
لوٹ لیا۔ جہاز میں بعض چیزیں، مثلاً ذرّہ بکتر، زرّین و منقوش کپڑے اور نقرئی و طلائی زیورات
وغیرہ، بہت قیمتی و نفیس تھیں ہم نے مال تقسیم کرنے کے لیے قرعہ اندازی کی، اُس وقت تک بد قسمتی
نے میرا پیچھا نہ لیا تھا اور اس لیے مجھے بھی کافی حصّہ مل گیا۔ مجھے شراب کے دو پیپے اور اعلیٰ
قسم کے شہد کا ایک مٹکا ملا، اس کے علاوہ مجھے ایک ارغوانی رنگ کا ریشمی لبادہ بھی، جس
پر تمام تر زرّین سوزنکاری ہو رہی تھی، ملا اور (رُضابؔ سے مخاطب ہو کر) مجھے افسوس ہے کہ
میں نے اُس کو فروخت کر دیا! ایک منقوش و زرّین خود بھی، جو شاید کسی شاہزادہ کی ملکیت
ہو گا، اور وہ کمان اور ترکش جو سامنے دیوار پر لٹک رہے ہیں، میرے حصّہ میں آئے، علاوہ
بریں ایک اور چیز بھی تھی جو اس وقت تک میرے پاس موجود ہے، آؤ، موم بتّی جلا کر میں رُضابؔ
کو ایک انوکھی چیز دکھاؤں!"
رُضابؔ کی مشتاق نگاہوں پر زیر لب خنداں کر کے کسان کی بیوی نے شمع روشن کی۔

اور کسان نے ایک نہایت بوجھل صندوق کو، جو کمرے کے ایک کونے میں رکھا تھا، کھول کر کچھ ڈھونڈھنا شروع کیا۔ صندوق پارچہ جات پوشیدنی اور اسی قسم کے کپڑوں سے بھرا ہوا تھا مگر اُس کی تہ میں سے کسان نے ایک پلندہ، جو سُرخ ریشمی کارچوبی کپڑے میں لپٹا ہوا تھا، نکالا اور اُسے بحفاظت میز پر رکھ کر رُضاب کی طاقتِ صبر وضبط کے خلاف اُسے آہستہ آہستہ کھولنے لگا۔

آخر کار وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور میز پر شمع کی روشنی میں چمکتی ہوئی، ایک جفت طلائی پاپوش رکھی ہوئی دکھائی دیں جن میں قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے اور جن میں سے قوس وقزح کی مانند رنگ برنگ کی خیرہ کناں شعاعیں نکل رہی تھیں؛ رُضاب نے ایسی شاندار چیز کبھی نہ دیکھی تھی کیونکہ اُس طرح کی جوتیاں یقیناً کسی ملکہ کی ہونگی، ذرا لجا کر اُس نے اُنہیں چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن یہ محسوس کرکے کہ ایسی خوشنما چیزیں شاید اُس کے مقدر میں نہ تھیں، رُضاب نے ایک آہ سرد بھری اور مُنہ پھیر لیا۔

اُس کے باپ نے حسرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا: "جس وقت مجھے یہ جوڑا ملا تھا اُس وقت میرے پاس کافی روپیہ پیسہ تھا مگر میرے کوئی بیوی بچہ نہ تھا جو میرا شریکِ راحت وعیش ہو سکتا، لیکن اب جبکہ خدا نے مجھے ایک ایسی بیٹی عطا کی ہے جس کی خوبصورتی ایسی ایسی چیزوں کا حسن دوبالا کر دے تو میں بدقسمتی سے ایسا مفلس ہوں کہ ان کا اپنے پاس رکھنا ہی حماقت ہے۔ ان جوتیوں کے علاوہ میری ہر قیمتی چیز میرے پاس سے جا چکی اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان کو صرف اس غرض سے رکھ چھوڑا ہے کہ ملک بھر میں کوئی بھی اس لایق نہ تھا جو ان کی بھرپور قیمت ادا کر سکے، لیکن اب میں آفتوں میں پھنسا ہوا ہوں اور یہ جوتیاں اب میرے پاس نہ رہنی چاہئیں لیکن میں اب بھی انھیں اپنے پاس رکھنے کو آمادہ ہوں کیونکہ انھیں دیکھ کر ایک ذی ہوش شخص نے یہ بتایا تھا کہ مجھے ان کی بہت حفاظت کرنی چاہیے کیونکہ انہی کے سبب میرے بھلے دن آیو آلے

ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو بھلے دنوں کے آنے میں بہت دیر لگی اور ہم کو تو فاقہ کشی کی نوبت آ گئی۔ بڑے پادری نے اکثر مجھ سے کہا ہے کہ میں یہ جوتیاں اُس کے ہاتھ بیچ دوں، شاید وہ انکے بدلے مجھے ایک جوڑی بیلوں کی دیدیگا مگر کچھ کام تو چلے گا، رُضاب! تم کل اُس کے پاس یہ لیکر چلی جانا اور تم جس قدر اچھا سودا اُسکو چکا لانا!"

یہ سُنکر رُضاب کے چہرہ پر خون کی ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی اور اُس کی ماں نے اس سُرخی کو دیکھ کر، اور اس کا مطلب سمجھ کر، کہا: "آہا! ارے لڑکی! تجھے شرم آتی ہے کہ ہم اتنے مفلس کیوں ہو گئے جو اپنی چیزیں بھی بیچنے لگے؟ نامراد! تو ایسی سرپھری نہ ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟ اب تک تو تیری پادری کے لڑکے سے شادی بھی ہو چکی ہوتی!"

رُضاب نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اُس کے چہرہ پر ایک کرختگی سی طاری ہو گئی، اُس کا باپ اُس کی مدد کو پہنچا اور بولا: "نہیں، بیوی! تم لڑکی کو بُرا بھلا نہ کہو! اُس سے ہرگز ایسی جگہ شادی نہیں ہو سکتی۔ جہاں اُس کا دل نہ چاہتا ہو اور ہم بھی تو اس کا بُرا چاہنے والے نہیں جو اس کے خلاف منشا کام کر بیٹھیں۔"

---

(۲)

دوسرے دن علی الصباح رُضاب خواب سے بیدار ہوئی اور اُس نے مندر کا، جہاں بڑا پادری رہتا تھا راستہ لیا، یہ راستہ کچھ دور تک سرسبز چراگاہوں، خوش وضع مکانوں اور انگور کی لدی ہوئی بیلوں کے سایہ میں گذرتا تھا۔ بہت سے گاؤں والے، جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے یا اپنے مکانوں کے دروازوں پر طمانیت کھڑے تھے، رُضاب سے بخوبی واقف تھے اور انھوں نے رُضاب کا بڑے جوش سے خیر مقدم کیا جس کا اُس نے سکوت آمیز سلامت سے، جسے بعض لوگوں نے تکبر سے تعبیر کیا، جواب دیا۔ محنتی اور جفاکش کسان کی جب وہ نہایت طمانیت سے سیٹی بجاتا ہوا سڑک پر چہل قدمی کر رہا تھا، آنکھیں، رُضاب کی بے توجہ اور بے التفات نگاہ

کے سامنے، یہ محسوس کرکے کہ وہ بہت وحشی نما اور اُس حسین خاتون کے مقابلہ میں ایک ذلیل سی ہستی ہے، نیچی کرلیں؛ ایک عورت نے جو اپنی جھونپڑی کے دروازہ پر کھڑی تھی، رضاب کے اس خود دارانہ رویّہ سے برافروختہ ہوکر یہ کہا،- "اوہو، بیگم صاحبہ! اگر کہیں تم سچ مچ ہی اس دنیا میں اتنی ہی ذی وجاہت ہوتیں، جتنی کہ تم آج کم رتبہ اور حقیر ہو، تو تم شاید ہم جیسوں کی گردنوں کے علاوہ کہیں قدم ہی نہ دھرتیں!"

لیکن رضاب نے اِن باتوں کی مطلق پرواہ نہ کی اور اپنی دُھن میں سیدھی چلی گئی؛ تھوڑی ہی دیر میں وہ وادی میں سے گذر کے پہاڑ پر چڑھنے لگی، مندر سے آدھے راستہ پر شاہ بلوط کا ایک جھنڈ تھا اور ہلکی ہلکی ہوا شاخوں کو جھونکے دے رہی تھی اور شاخیں ہل ہل کر ایک ایسا غم انگیز راگ پیدا کر رہی تھیں جو فی الوقت رضاب کے خیالات کی صحیح ترجمانی کر رہا تھا کیونکہ اُسوقت غریب وعاجز رضاب کے خیالات یہ تھے کہ۔ "موجودہ صورت حالات میں زندگی بسر کرنا ایک دشوار اور ناقابل برداشت کام ہے اور مسرّت وشادمانی محض خواب وخیال ہے"۔

راستہ اب اور بھی زیادہ ڈھلواں ہو چلا تھا جس پر پیدل چلنا نہایت دشوار تھا اور رضاب جب پہاڑ کی چوٹی کے قریب میدان میں پہنچی اور مندر کے قریب درختوں کے جھنڈ میں داخل ہونے سے پہلے درّۂ کوہ میں سے ہو کر گذرنے لگی تو اس کا سانس پھول رہا تھا اور وہ ہانپ رہی تھی۔

درّہ کوہ میں وہ تھوڑی ہی دُور گئی ہوگی کہ اُسے پادری کا خوبصورت سیاہ چشم لڑکا ایک شکاری کُتا ساتھ لیے آتا ہوا ملا؛ لڑکا راستہ چلتے چلتے رُک گیا اور اس نے رضاب کو بتایا کہ پادری سمندر کے کنارے مچھلیوں کی اُچھل کود کا تماشا دیکھ رہا ہے اور شاید اسی راستہ سے واپس آتا ہوا ملے،۔ لڑکے نے یہ بھی کہا کہ "بہتر ہے تم گھر میں چل کر والد کا انتظار کرو، بلکہ ٹھیرو میں بھی واپس چلتا ہوں، شکار وکار مجھے ملا نہیں اور بےکار تھکا؛ تم اگر اندھیرے سے ڈرتی ہو تو میں تمھیں گھر بھی پہنچا آؤنگا"۔

لڑکا نہایت شوق سے گفتگو کر رہا تھا اور بہ نگاہ شوق اُس کے مُنہ کو تک رہا تھا کیونکہ

اُسے اس مغرور حسین لڑکی سے بہت محبت تھی اور اب بھی اُسے توقع تھی کہ وہ لڑکی کو رام کر لیگا۔
لیکن رضاب نے نہایت لاپرواہی سے انکارانہ سر ہلا کر اُس کو خدا حافظ کہا اور بغیر پیچھے نظر ڈالے
راستہ چلنا شروع کیا، کچھ دُور بعد وہ درّہ قدرے وسیع ہو جاتا تھا اور پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اُسے
دامنِ کوہ کا تمام منظر نظر آنے لگا؛ تقریباً تین میل اُدھر ایک تنگ مگر گلزار وادی میں مندر واقع
تھا جو سفید خوبصورت عمارت تھی اور چاروں طرف سے پھلواریوں اور مکانات سے احاطہ کی ہوئی
تھی۔ موسمِ گرما کی ہلکی ہلکی صاف ہوائیں ایسی صاف اور لطیف تھیں کہ رضاب کو مکانوں کی چھتوں پر
اُڑتے ہوئے کبوتر بھی دکھائی دے رہے تھے اور جنگلی درختوں کی جو اناج کے کھیتوں کے گرداگرد
قطار در قطار کھڑے تھے، چوٹی پر بیٹھے شور کرنے والے کوّوں کی کائیں کائیں بھی صاف سُنائی دیتی
تھی۔ مندر اور اُس کے قریب کی عمارات سے بھی زیادہ قریب، بلکہ بالکل رضاب کے پاؤں کے پاس،
دامنِ کوہ میں ایک گھنا جنگل تھا اور وہیں ایک چھوٹا سا پہاڑی نالہ ایک جھیل میں جا کر گرتا تھا۔
جس کے صاف و شفاف پانی پر آفتابِ عالمتاب کی درخشاں کرنیں عجب خوشنما عالم پیدا کر رہی تھیں۔
تھوڑی دیر دم لینے اور سستانے کے بعد رضاب نے پھر راستہ طے کرنا شروع کیا؛
ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی تیز پڑ رہی تھی اور جس وقت وہ اُس گھنے جنگل کے پُرلطف
سایہ میں پہنچی وہ بہت تھک گئی تھی اور بڑی مسرت سے سبزی ہری گھاس پر دراز ہو گئی؛
پھر اس نے اپنے چرمی توشہ دان سے کھانا، جو وہ ساتھ باندھ کر لائی تھی، نکالا اور بکمال
فراغت نیت بھر کر کھایا؛ پھر گُل بہار کے تختہ میں سے نکل کر وہ جھیل کی طرف بڑھی اور وہاں
کا صاف و سرد پانی پیا اور اپنی جگہ پلٹ آئی، درختوں کے سائے میں وہ لُطف آ رہا تھا کہ
رضاب کا دل وہاں سے ہٹنے کو نہ چاہتا تھا، وہ بڑی دیر تک گھاس پر لیٹی ہوئی خواب
آلود نگاہوں سے پتوں کی ہریالی اور گنبدِ مینائی کے مختلف قطعات کو، جو پتوں کے جھنڈ
میں سے کہیں کہیں جھلک مار رہے تھے، بحسرت دیکھا کی؛ کچھ دیر بعد اُسے خیال آیا کہ
جھیل میں نہانا بڑا پُرلطف کام ہوگا۔ چنانچہ اس نے چشم زدن میں کپڑے اُتار ڈالے مگر
پہلے اُس نے اُس پلندہ کو کھولا جسے وہ اپنے ساتھ لیجا رہی تھی، اور اُن طلائی جوتیوں کو اپنے گورے

گورے برہنہ پاؤں میں ڈال کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی، جوتے اُس کے پاؤں میں اسقدر ٹھیک تھے کہ گویا اُسی کے لیے بنائے گئے تھے یہ دیکھ کر اُس نے نہایت ٹھنڈا سانس بھرا اور با دلِ ناخواستہ اُن کو گھاس پر رکھ دیا۔

لمحہ بھر کے اندر اندر ہی وہ اس سرد قطعۂ آب میں شپا شپ کرتی نظر آئی، کبھی وہ اِدھر تیر کر جاتی کبھی اُدھر، کبھی وہ چت تیرتی کبھی پیٹ اور کبھی پہلوؤں کے بل، کیونکہ واقعہ یہ تھا کہ اُس مُلک کے تمام تو عمر لڑکے لڑکیوں کی طرح رُضاب بھی پانی کو گویا اپنا گھر سمجھتی تھی، وہ اسی طرح پانی سے کھلاڑ کر رہی تھی کہ یکایک اُس نے ایک عقاب کی تیز و کرخت آواز سُنی اور مُڑ کر دیکھا تو یہ تجیم شہیم پرندہ ایک چٹان پر سے نیچے کی طرف آ رہا تھا، عقاب نیچے اُترتا چلا آیا یہاں تک کہ اُس کے بازوؤں کی پھڑ پھڑاہٹ صاف سنائی دینے لگی اور رُضاب نے گھبرا کر ایک چیخ ماری، وجہ یہ تھی کہ سورج کے اثر سے طلائی جوتیوں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی اور رُضاب سمجھ گئی کہ یہی چمک اُس پرندہ کو وہاں لائی ہے، ایک ہی منٹ میں عقاب نیچے زمین پر گرا، اُس نے اپنے بازو پھڑ پھڑائے اُوپر اُڑا اور رُضاب نے دیکھا کہ وہ طلائی جوتی اپنے پنجوں میں لیے ہوئے ہے، عقاب نے ایک اور کرخت چیخ ماری اور ہوا میں ایک بڑا سا چکر لگا کر وہ پھر اُونچا اُڑا اور ایک آگے نکلی ہوئی چٹان کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اِس سانحہ پر رُضاب کو بہت دل گرفتہ اور پژمردہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن تعجب یہ ہے کہ اُسے کوئی قلق نہیں ہوا، جو نہی فوری صدمہ اُس کے دل سے دُور ہوا اور لباس پہن کر اُس نے جوتی کو سُرخ ریشمی غلاف میں لپیٹا ہی تھا کہ اُس نے اپنے دل کو تقویت دینے کے ذریعہ سوچنے شروع کر دیے، وہ سوچنے لگی کہ بھلا کسے خبر ہے کہ یہ عجیب و غریب واقعہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کا پیش خیمہ نہ ہوگا؟، اور گھر واپس آتے ہوئے وہ راستہ بھر اسی اُدھیڑ بُن میں لگی رہی اور اپنے خیال میں اپنے ذی رُتبہ ہونے کی بابت، جس طرح کہ اُس نے بہت سی کم رُتبہ لڑکیوں کے شاہزادوں اور رئیسوں کے لڑکوں کو رِجھا کر دولت و مرتبت حاصل کر لینے کے قصے سنے تھے ہوائی قلعہ تعمیر کرتی رہی۔

لیکن گھر پہنچنے پر اُسے اپنی ماں کے غیظ و غضب سے دوچار ہونا پڑا اور اُس کے باپ نے بھی، اگرچہ کبھی پہلے اُسے زجر و توبیخ نہ کی تھی لیکن اس موقع پر اُسے ملامت آمیز نظر سے دیکھا؛ بالآخر جب اُس کی ماں کا غصہ ذرا دھیما ہوا اور اُس کی تلخ و ناگوار ملامت آنسوؤں میں بدل گئی تو ضعیف کسان رُضاب کے پاس آیا اور اُس کو تسلی دلاسا دینے لگا۔ بڈھا بولا، "میری بچی! خوشی اور عیش اب بھی تیری قسمت میں ہے، اور مجھے یقین کامل ہے کہ ایسا ضرور ہوگا؛ اگر مجھ پر سخت سے سخت مصیبتیں بھی نازل ہونیوالی ہیں تو اب مجھے زیادہ عرصہ پریشان نہ کر سکیں گی کیونکہ عالم میں ایک جگہ ایسی بھی ہے جہاں دنیاوی تفکرات انسان کا پیچھا نہیں کر سکتے اور میں اُس جگہ کی طرف نہایت تیزی سے سفر کر رہا ہوں"! - اُس نے اپنے حلقہ زدہ، دھسی ہوئی آنکھوں سے اپنی بیٹی کو بڑے پیار کی نظر سے دیکھا اور اگرچہ اُس کے ہونٹھ متحرک تھے، اُس نے زیرِ لب مسکرانے کی کوشش کی؛ رُضاب نے جب اپنے باپ کی طرف نظر ڈالی تو خود اُس کی آنکھیں بھی نمناک ہونے لگیں اور ایک ہی منٹ میں ضعیف کسان نے رضاب کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنے کام پر چلا گیا -

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد وہ پھر چونچال نظر آنے لگا، وہ اپنے مستقبل اور آیندہ فلاح کے ذرائع پر بحث و تحیص کرتا اور بہت جلد اُس نے اپنی بیوی کے غم زدہ چہرے کو مصنوعی تبسم و شادمانی کا مظہر بنا دیا -

---

(۳)

اگلے چند مہینے بھی رضاب اور اُس کے ماں باپ کے لیے خوشی کے مہینے نہ تھے، اُنکی فلاکت اور عسرت روز بروز بڑھتی گئی اور ہر نئی آفت کے نزول پر رُضاب کی ماں کا مزاج اور بھی چڑچڑا ہوتا گیا؛ صبح سے شام تک وہ کسی وقت بھی اپنے خاوند اور اپنی بیٹی کو تلخ و ترش کہے بغیر نہ رہتی اور ہر وقت اِن دونوں پر ملامت کی بوچھار کرتی رہتی؛ وہ دن رات ٹھنڈے سانس بھرا کرتی اور کہتی :-

"اللہ! میں نے ایسے ناکارہ مرد سے شادی ہی کیوں کی تھی؟ جس نامراد گھڑی سے

چولی دامن کا ساتھ ہوا ہے مردوے نے کوئی گھڑی عیش نہ کرنے دیا اور اس تھکاری رضاب کے بیے ضرورت غرور تکبر نے تو بس ستم ہی کر دیا! کمبخت کی ضد اور ہٹ تو دیکھو کہ جب سے وہ ناشاد جوتیاں نظر آئی ہیں اس مردار کے دماغ ہی کہیں نہیں ملتے!' ان میں اتنی عقل کہاں کہ یہ دخاوند سے مراد ہے)، ایک جوتی جو رکھی ہی' اُسی میں سے جواہرات نکال کر بیچ ڈالیں، اور روٹی کپڑے کا سرانجام کریں، مگر عقل کا بھلا یہاں کیا کام! اللہ میری توبہ ہے! کیسے نامعقولوں سے پالا پڑا ہے!"

اس جوابی زجر و توبیخ کے دوران میں ضعیف کسان نہایت بے چینی سے اپنی بیٹی کا منہ تکا کیا لیکن رضاب بظاہر نہایت بے پرواہی سے، اپنا چہرہ مُہرہ ساکت وصامت بنائے ہوئے چرخہ کاتتی رہی؛ کچھ دیر بعد جب کسان کی بیوی اپنے تیسے میں آکر اندھا دھند کمرہ سے باہر نکل گئی تو کسان اپنی بیٹی سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا، "یہ تمہاری ماں کہتی تو سچ ہیں کیونکہ اب ہماری حالت بہت نازک ہوگئی ہی، اور صرف وہ جواہرات ہی ہماری نجات کا باعث ہو سکتے ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ معلوم کیوں میرا جی ہی نہیں چاہتا کہ ان جواہرات کو اپنے پاس سے علٰحدہ کروں! رُضاب، کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟ 'تمہیں یاد ہوگا کہ تمہاری پیدائش کے دن میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا تھا اور میں یہ خیال کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ جوتیاں کسی نہ کسی طرح تمہاری آیندہ خوشحالی کا سبب ہوں گی!"

رضاب کا چہرہ شہاب ثاقب کی طرح سُرخ ہوگیا مگر وہ اپنے باپ کو دیکھ کر باآہستگی یوں گویا ہوئی۔ "میں نے اُس خواب کی بابت سنا تو ہے، لیکن یہ بات اتنی پرانی ہوگئی ہے کہ اب تو کچھ یونہی سی یاد ہے۔" بڈھا کسان مسکرایا اور کہنے لگا: "خیر! اُس کے دوھرانے کی ضرورت نہیں، تم جوتی اپنے ہی پاس رہنے دو، ممکن ہی اب بھی تمہارے دن پھر جائیں! اچھا ہے، ہمیں اُس وقت تک اپنی آیندہ خوشحالی کے بے ثبات خوابوں میں ہی مست رہنے دو!"

ان واقعات کو ایک سال گزر گیا اور جون کا مہینہ آگیا اور ٹھیک اُسی تاریخ کو، جس دن

وہ پادری کے ہاں جانے کو تیار ہوئی تھی، رضاب شہر جانے کے لیے تیار ہوئی تاکہ گھر داری کی چند ضروری چیزیں خرید کر لائے؛ اس غرض سے وہ گھر کے دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ کسی فوری خیال کے سبب وہ واپس پلٹی اور اپنے خاص کمرے میں پہنچ کر اُس بھاری صندوق کے آگے دوزانوں بیٹھ گئی؛ اُس نے باقی ماندہ جوتی کو جو سال بھر سے اُسی سُرخ ریشمی کپڑے میں لپٹی پڑی تھی، صندوق میں سے نکالا اور عالم خیال میں اُس کی طرف نظر جمائے بیٹھی رہی، پھر اُس نے اپنے گاؤن کی تہ میں جوتی چُھپا کر شہر کا راستہ لیا۔

شاہرہ عام پر لوگوں کا اژدہام تھا جو سب کے سب شہر کی جانب اس طرح رُخ کیے ہوئے تھے گویا کہ وہاں کوئی مشغلہ اُن کی خاص دلچسپی کا باعث ہے۔ ان لوگوں کی باتوں کے کچھ اُکھڑے اُکھڑے فقرے جو رضاب کے کانوں تک پہنچے، اُن کا مطلب یہ تھا کہ ایک تجارتی کشتی میں سے کچھ اجنبی ساحل پر اُترے ہیں، یہ لوگ بڑے امیر کبیر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ عمدہ عمدہ لباس زیب بر کئے ہوئے ہیں، عجیب قسم کی بولی بولتے ہیں اور کچھ عجیب وضع قطع کے لوگ ہیں ان لوگوں کی آمد آمد کی خبر پہلے ہی دُور و نزدیک پھیل چکی تھی اور ہر شخص شہر کی طرف بسرعتِ تمام چلا جا رہا تھا تاکہ ان اجنبی مسافروں کو جا کر دیکھے۔

اسی مجمع کے قدم بقدم رضاب بھی شہر میں داخل ہوئی اور منڈی میں جا پہنچی؛ اُس نے وہاں پہنچکر دیکھا کہ بہت سے آدمی جمع ہیں اور سب قربانگاہ کی طرف، جو چوراہے کے عین وسط میں نصب تھا گامزن ہیں اسی ہجوم میں کسی جگہ دور پر رضاب نے کچھ ہتیاروں کی سی چمک بھی دیکھی، لیکن وہ سب کچھ دیکھتی دکھاتی اپنی خرید و فروخت کی غرض سے آگے بڑھی اور جب وہ تمام سودا خرید چکی تو پھر منڈی کی سمت واپس ہوئی اور متجسسانہ طور پر اس بے ہنگم مجمع کے چوطرف پھرنے لگی۔

یکایک اُس کے دل میں یہ ناقابل ضبط خیال آیا کہ لاؤ دیکھوں تو سہی، قربانگاہ کے قریب ہو کیا رہا ہے؟، چنانچہ مجمع کو ہٹا کر اُس نے اپنے لیے راستہ نکال ہی لیا اور ہجوم عام نے بھی اُس کے

دلربایانہ حسن و انداز کو دیکھ کر اُس کے لیے راستہ بنا دیا۔

قربانگاہ کی سیڑھیوں پر کافی ہجوم تھا اور وہیں وہ لوگ بھی کھڑے تھے جن کی آمد آمد کا شہر میں اسقدر غل شور تھا؛ مسافروں میں سے بعض تو نہایت رنگ برنگ کے عمدہ ریشمی لباس میں ملبوس تھے اور بعض خود سر پر لگائے چار آئینہ سجائے بیٹھے تھے اسی مجمع میں اُس گاؤں کے اکثر سر آوردہ اور ضعیف العمر اشخاص بھی موجود تھے اور بڑا پادری بھی زرق برق لباس پہنے وہاں کھڑا تھا؛ پادری کے ہاتھ میں ایک نہایت تیز چھرا تھا اور ایک خوبصورت بچھیا، جس کے گلے میں پھولوں کے ہار پڑے تھے، قربانی کے لیے لاکر کھڑی کر دی گئی تھی؛ جونہی رضاب کی نظر اس منظر پر پڑی پادری کا ہاتھ بلند ہوا، ایک بجلی سی کوند گئی اور وہ بچھیا تڑپتی ہوئی زمین پر گری۔

لیکن ایک اور چیز نے رضاب کی توجہ سب طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کر لی؛ وہ چیز کیا تھی؟ .... ایک آہنی تپائی قربان گاہ کے قریب بچھی ہوئی تھی اور اُس تپائی پر۔ کیسی حیرت کی بات ہے!! ۔ وہ گمشدہ طلائی جوتی، جو سال بھر پہلے اسقدر عجیب طریقہ سے کھوئی گئی تھی اور جس کا دوسرا پاؤں اسوقت رضاب کے ملبوس میں پوشیدہ تھا، اپنی چمک دمک سے ہجوم کی آنکھیں بند کیے دیتی تھی۔

یہ جوتی دیکھتے ہی رضاب تنکر کھڑی ہو گئی اور بغیر سوچے سمجھے وہ قربانگاہ کی طرف بڑھی؛ سب پر خاموشی طاری تھی اور خوش پوش مسافر جو قربان گاہ کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے اُسے دیکھ کر نہایت متعجب اور مرعوب ہوئے؛ خوبصورت تو وہ تھی ہی لیکن اس وقت خاص طور پر رضاب کا چہرہ اور اُس کا سانچے میں ڈھلا ہوا جسم سادی حسن و نور کا سرچشمہ نظر آتا تھا؛ وہ خاکستری رنگ کا سادہ لبادہ پہنے تھی؛ گھر کا سودا سلف اُس کے کندھے پر پڑا تھا اور وہ ایک ملکہ بنی کھڑی تھی اس طرح کہ اُس کا سر ایک عجیب انداز سے اوپر اُٹھا ہوا تھا اور اُس کی آنکھیں ایک خاص قسم کے نور سے معمور تھیں وہ سیڑھیوں پر چڑھ گئی اور نہایت پُر اطمینان اور صاف آواز میں، جو اس مجمع کے انتہائی کنارے تک ہر طرف یکساں سنی گئی، کہنے لگی:۔

"شاید آپ اِس چیز (جوتی کی طرف اشارہ کرکے) جوڑ کی۔ جسے آپ بہت بیش قیمت سمجھتے ہیں، تلاش میں ہونگے: یہ لیجیے، یہ دوسری (جوتی اپنے لبادہ میں سے نکال کر) جوتی بھی موجود ہے! یہ جوڑا پچھلے سال آج ہی کی تاریخ میں نے پہلی بار پہنا تھا؛ یہ میرے باپ کی ملکیت ہیں بلکہ قیمتی اشیاء میں صرف یہی ایک چیز اُن کے پاس رہ گئی تھی اور اسی لیے وہ اِس کی جان و مال سے بھی زیادہ حفاظت کیا کرتے تھے!"

یہ کہ کر رضاب نے دوسری جوتی نکالی اور تپائی پر رکھدی؛ مجمع میں شور و غل برپا ہوگیا اور عمر میں پہلی بار رضاب کو محسوس ہوا کہ خون اُس کے چہرہ پر نہایت تیزی سے دوڑ رہا ہے اور یہ کہ نسوانی شرم وحیا نے اُس کا دامن پکڑ لیا ہے مگر جب ذرا غل شور کم ہوا اور خاموشی نے دوبارہ اپنا تسلط کیا تو اُس خوش پوشاک نووارد مجمع میں سے ایک ضعیف مسافر آگے بڑھا اور کہنے لگا: "خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے میری اِن ضعیف اور کمزور آنکھوں کو ایسا نظر فریب حُسن دیکھنے کا موقعہ عطا کیا اور اُس کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اُس نے میرے آقائے نامدار بادشاہِ ہفت کشور کو ایسی حسین ملکہ عطا فرمائی!!"

رضاب کے چہرہ کا رنگ فق ہوگیا اور انتہائے تحیّر و استعجاب کے سبب وہ بید کی طرح لرزنے لگی؛ "خداوندا! ان کا مطلب کیا ہوسکتا ہے؟"... لیکن اُس کی حیرانی دیکھ کر ضعیف العمر مسافر کہنے لگا: اے ملکۂ حُسن! تو گھبرا نہیں! جس خدا نے تجھے اسقدر حسین پیدا کیا ہے اُسی نے تجھے ایک شاندار پُرعظمت مستقبل کے لیے بھی مقدر کیا ہے اور اسی لیے تجھکو وقتِ مقرّرہ تک اِس ملک میں تمام دُنیا کی حریص و مشتاق نگاہوں سے محفوظ رکھ چھوڑا ہے؛ آج ہی وہ دن ہے کہ خدا نے ہمیں تیرے وطن تک پہنچایا تاکہ اس طرح وہ اپنی مشیّت کو پورا کرے! پورا ایک سال گذرا کہ ہمارے آقا نے قربانگاہ پر بہت سی قربانیاں پیش کی تھیں، نذریں چڑھائی گئیں، آگ روشن کی گئی اور شعلے، جو سورج کی روشنی کے آگے ماند تھے بلند ہونے لگے مگر جونہی شعلے کی لپک اُٹھی آسمان پر سے ایک تیز آواز کانوں میں آئی اور اوپر سے جگمگ جگمگ کرتی ہوئی کوئی چیز الاؤ میں گری۔ بعض لوگ جو آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے بتاتے ہیں کہ انھوں نے ایک عقاب کو اُڑتے ہوئے دیکھا جو اسقدر اُونچا اُڑ رہا تھا کہ فقط ایک سیاہ نقطہ سا معلوم ہوتا تھا۔

بادشاہ نے ایک لمحہ صبر کے بعد اپنا ہاتھ بڑھایا اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں سے اُنھوں نے یہ جوتی باہر نکالی، بہت دیر تک وہ اُسے بغور دیکھا کیے اور پھر یکایک بغیر کچھ کہے سُنے وہ وہاں سے اُٹھ گئے۔

اُسی دن سے ہمارے بادشاہ روز بروز تنک مزاج اور زرد رُو ہوتے گئے، وہ بہت گفتگو کم کرتے تھے اور وہ بھی کچھ بہکی بہکی اور اُکھڑی اُکھڑی۔ آخر کار ایک دن اُنھوں نے ہمیں یہ جوتی دی اور حکم دیا کہ ہم سارے ملکوں میں گشت لگائیں اور اُس حسینہ کو تلاش کرلائیں جو اس جوتی کی مالک ہو۔ بادشاہ سلامت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "وہ لڑکی کوئی ہو اور اُس کا نام و نشان کچھ بھی ہو، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ لڑکی میری بیوی بننے کے لیے مقدر کی گئی ہے، اور جب تک وہ نہ ملے گی میں ہرگز چین سے نہ بیٹھوں گا۔"

غرض ہم بہت حیران ہوئے کہ الٰہی، کیا کریں! اور سمجھے کہ بادشاہ سلامت پر کسی بھوت پریت کا سایہ ہو گیا ہے مگر ہم روانہ ہوئے اور بہت سے نئے ملکوں کی خاک چھانتے، طوفان خیز سمندروں کو عبور کرتے، دشوار گذار وادیوں اور پہاڑوں میں سے نکلتے، جھوٹ سچ کے قلابے ملاتے اور شادکامی اور ناکامی کا مُنہ دیکھتے ہوئے خدا کا شکر ہے کہ آج یہاں پہنچے اور یہاں ہمارا سفر اب ختم ہوتا ہے؛ اب اس کے سوا کوئی کام باقی نہیں رہا کہ تم ہمارے جہاز میں سوار ہو کر وہاں چلی چلو جہاں ہمارے بادشاہ سلامت تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

یہ کہکر اُس نو وارد نے رضاب کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ہاتھی دانت کی ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ جب وہ بیٹھ گئی تو باقی تمام اجنبی بھی آگے بڑھے اور یکے بعد دیگرے رُضاب کو سلام کرنے اور دو زانو ہو کر اُس کے لبادے کے دامن کو چومنے لگے؛ اِس واقعہ پر مجمع میں دوبارہ شور و غل ہونے لگا۔

ضعیف مسافر پھر رضاب سے مخاطب ہوا اور پوچھنے لگا کہ آیا وہ اُن کے ساتھ جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ اگر چل سکتی ہے تو کب تک؟، رضاب نے نہایت آہستگی سے جواب دیا کہ "بہتر تو یہ ہے کہ آج ہی روانہ ہو جائیں مگر میں پہلے گھر جاکر ذرا اپنے والدین سے مل آؤں اور اُن کو اپنی داستان سُنا آؤں کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ وہ میرے سوا کسی اور کی زبان سے یہ تمام ماجرا سُنیں!"

نوواردین اِس پر رضامند ہو گئے اور اس مرعوب و خاموش مجمع میں سے گذر کر رضاب نے اپنے گھر کا رُخ کیا، وہ اب تک اِس ناگہانی واقعہ کے سبب مبہوت و ششدر تھی لیکن راستہ چلنے سے اُس کا تحیّر قدرے دور ہوا اور وہ اپنی اِس خوش قسمتی پر نہایت شاد و نازاں ہوئی۔

جس وقت اُس نے گھر کے اندر قدم رکھا اُس کا باپ مویشیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا اور چونکہ اب وہ پہلے سے زیادہ نحیف و ضعیف ہو گیا تھا اس لیے رُک رُک کر قدم بڑھاتا تھا، اپنی سرگذشت سُنانے کے شوق میں رضاب نے زور سے چلا کر کہا:- "ابّا، ابّا! دیکھو، ایک ملکہ تمہارے پاس آ رہی ہے! کیا تم اُس کو نہ دیکھو گے؟"

ضعیف کسان مُڑا اور اُس کے قریب آ کر حیرت سے رضاب کا مُنہ تکنے لگا کیونکہ واقعتاً اُس کی آنکھیں ستاروں کی طرح دمک رہی تھیں اور اُس کے چہرہ پر ایک انوکھا اور نرالا حُسن برس رہا تھا۔ رضاب نے اپنا سارا قصّہ کہ سُنایا مگر پہلے پہلے تو دفورِ شوق میں وہ جلد جلد بول رہی تھی لیکن آخر آخر اُس کی آواز ہلکی پڑتی گئی کیونکہ انتہا سے زیادہ مسرور ہونے کی بجائے اُس بڈھے کسان کا چہرہ فرطِ غم والم سے سیاہ پڑتا گیا، جب یہ داستان ختم ہوئی تو وہ کچھ دیر تک تو ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا لیکن جب طاقت گویائی پھر عود کر آئی تو اُس نے آہستہ آہستہ اور رُک رُک کر یہ کہنا شروع کیا۔

"میری بچی! اگر تو خوش ہے، تو بہتر ہے، میں بھی خوش ہوں مگر میں سمجھتا تھا کہ ہمارے بُرے دن اب گئے، پہلے دن آنے والے ہیں۔ میں اپنی عمر کے آخری دن آرام و عیش کے ساتھ بسر کرنا چاہتا تھا، مجھے شرم آتی ہے کہ میں تمہاری ساری خوشی ملیامیٹ کر رہا ہوں لیکن میرا دل تو یہی چاہتا تھا کہ تم میرے بڑھاپے کے عالم میں میرا دل بڑھانے کو میرے پاس رہو، مگر قسمت میں یہ نہ لکھا تھا، خیر! اگر تم چاہو تو میں اس دُور دراز ملک میں بھی تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں اگرچہ بہرحال میں زیادہ عرصہ تمہارے پاس بسر نہ کر سکوں گا، پیاری بچی! کیا تم اپنی نئی زندگی میں یہ یاد رکھ سکو گی کہ ہم نے کس قدر غور و پرداخت اور ناز و نعم سے تم کو پالا پوسا ہے؟ کیا تمہیں میرا

یہ مجھریایا ہوا چہرہ یاد رہے گا، اور کیا تم میرے اس دل کی قدر کرسکو گی جس میں تمہاری محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے ؟" یہ کہہ کر بڈھا لیک لخت ساکت ہو گیا۔

رضاب "پیارے ابا! جو نئی زندگی میں بسر کرنے جا رہی ہوں اُس میں آپ کی محبت و شفقت کی یاد ہمیشہ میری مونس و غمخوار ہوگی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں چاہے اور سب کو بھول جاؤں اس کو کبھی نہیں بھول سکتی، لیکن اب جلدی کیجیے، جہاز والے بندرگاہ میں میرے منتظر ہونگے، بادبان چڑھائے جا چکے ہیں اور ہمیں جلد روانہ ہو جانا چاہیے!"

ایک محبت بھری نظر ڈال کر، دونکی تبسم کے ساتھ کسان کپڑے بدلنے گھر میں گیا، اور رضاب باہر کھڑی ہوئی اپنے تعجب خیز مستقبل کے خوشنما خواب دیکھتی رہی، تھوڑی دیر بعد کسان اپنی بیوی کو ساتھ لیے ہوئے باہر آیا؛ ایسی خوشی کے موقع پر ایک نیکبخت عورت نے اپنے بہترین کپڑے پہن لیے تھے اور اُس کے خاوند نے وہ سرخ جوڑا زیب بدن کیا تھا جو وہ برسوں پہلے، جب وہ مالدار اور باعزت شخص تھا اور رئیسوں بادشاہوں کا ہم نوالہ ہم پیالہ بنا ہوا تھا، پہنا کرتا تھا، اس لباس پر اب بہت سے داغ دھبے پڑ گئے تھے اور کئی جگہ پیوند بھی لگا ہوا تھا؛ رضاب کی ماں بالکل خاموش تھی لیکن کنکھیوں سے اُس نے اپنی پیاری بیٹی کی طرف دیکھا اور اپنا سفید و سیاہ سر گویا تعظیم کے طور پر خم کیا۔

غرض اسی طرح یہ تینوں منڈی میں پہنچے جہاں وہ نو وارد اور عام مجمع، جو اب پہلے سے بھی زیادہ کثیر ہو گیا تھا، رضاب کی آمد آمد کے منتظر تھے؛ جونہی یہ تینوں قریب پہنچے لوگوں نے تالیاں بجانا اور غل مچانا شروع کیا اور رضاب کا باپ اسقدر زرد پڑ گیا اور اس طرح کانپنے لگا کہ آخرکار رضاب نے اُسے سہارا دیا۔ پہلے ہی وہ شاہزادیوں کی طرح شان اور رعب سے چل پھر رہی تھی چنانچہ رضاب نے بادشاہ کے سفیروں سے مخاطب ہو کر شاہانہ انداز سے یہ کہا "میں چاہتی ہوں ہم فوراً روانہ ہو جائیں! چلو، آگے بڑھو!"

وہ شخص جو اِن سب کا افسر معلوم ہوتا تھا آگے بڑھا اور بولا "حضور عالیہ! سب چیزیں

تیار ہیں، جہاز کو موڑ دیا گیا اور رُخ سمندر کی طرف کر دیا گیا ہے لیکن کیا آپ روانگی سے قبل تاج اور کوئی عمدہ لباس، جو آپ کی شان و شوکت کے لائق ہو، نہ پہنیں گی؟"

رضاب: "نہیں! میں چاہتی ہوں کہ میں اسی طرح بادشاہ کے سامنے جاؤں جس طرح کہ تمہارے سامنے آئی تھی، اور وہ مجھے اسی فقیرانہ لباس میں دیکھیں جو میں پہنے ہوئے ہوں، خیر، اب ورنہ گردشام ہوئی جاتی ہے!"

چنانچہ یہ سب جہاز کی سمت روانہ ہوئے مگر رضاب کی آنکھیں ترتھیں، اُس کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے، اور اُس نے اپنے باپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا؛ خود کسان کا یہ عالم تھا کہ وہ تھرتھر کانپ رہا تھا اور اُس کے چہرہ پر مُردنی چھائی ہوئی تھی؛ تھوڑی ہی دیر میں یہ لوگ جہاز کے قریب جا پہنچے۔ اور رُضاب نے سمندر کے کنارے پر لکڑی کا زینہ، جو صحن جہاز سے ملحق تھا، طے کیا؛ اُس نے پیچھے ایک نظر بھی نہ ڈالی اور سیدھی جہاز کے اگلے حصّہ پر پہنچی، وہاں کھڑے ہو کر وہ سمندر کی متلاطم لہروں کا تماشا دیکھنے لگی اور اس عرصہ میں جہازیوں نے زینہ طے کر کے جہاز کا لنگر اُٹھا دیا۔

رفتہ رفتہ بادبانوں میں ہوا بھرنے لگی اور جہاز کو حرکت ہوئی لیکن رُضاب نے اپنی جگہ نہ چھوڑی، اُس کے پیچھے کی جانب ساحل پر سے لوگوں کے شور و غل کی آوازیں بتدریج ہلکی ہوتی گئیں حتی کہ بالکل سنّاٹا چھا گیا اور سوائے موجوں کے تھپیڑوں اور جہاز کے چڑچڑ کرنے کی آوازوں کے کوئی اور آواز نہ سُنائی دی؛ آفتاب اُفق سے نیچے اُتر گیا، جھٹ پٹا بھی ختم ہوا، ستارے صاف طور پر چمکنے لگے مگر رضاب اپنی جگہ پر ایسی جمی رہی گویا کوئی سکتہ میں رہ گیا ہو؛ تازہ اور صاف ہوا اور اُس کے چہرہ اُچٹ اُچٹ کر گرنے والے قطراتِ آب کا بھی اُسے مطلق احساس نہ تھا، نہ وہ کپتان کے حکم نہ آواز کو سُن رہی تھی اور نہ جہازیوں کے مؤدبانہ جوابات کو۔

آخرکار اُس نے اپنا مُنہ پھیر کر پیچھے کی طرف دیکھا؛ زمین ساحل کا پتہ نشان بھی مٹ چکا تھا اور سوائے کالی کالی موجوں اور سمندری جھاگ کے کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔

رُضاب پر فوری خوف طاری ہوا اور وہ صحن کے کنارے کنارے دُور تک دوڑتی چلی گئی درآنحالیکہ اُس کے کالے مگر گھنے بال ہوا کے زور سے کھل کر اُس کے شانوں پر پڑے تھے اور مارِ سیاہ کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے، وہ یکایک رُک گئی اور اپنے تئیں سنبھال کر پھر جہاز کے اگلے حصّہ کی طرف گئی جہاں وہ ضعیف مسافر اپنے چند ساتھیوں کے پاس کھڑا تھا

رُضاب: ۔"کیا تم مہربانی سے مجھے میرے باپ تک پاس لے چلوگے؟"

چاند رضاب کے زرد زرد رخساروں پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور ڈھکی ہوئی لالٹینیں حرکت میں آکر صحن جہاز پر عجب عجب بھیانک تصویریں بنا رہی تھیں، ضعیف مسافر نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ ایک عجیب انداز سے اُس کی طرف دیکھا کیا، اُس کی خاموشی نے رضاب کے دل میں ایک نشتر سا چبھو دیا اور اُس پر موت کا سا عالم طاری ہوگیا۔ بالآخر وہ کہنے لگا "آپ کے والد کنارے سے آگے بڑھے ہی نہیں؛ وہ تو کہتے تھے کہ وہ اپنے ہی لوگوں میں رہنا پسند کریں گے اور یہ کہ وہ ایک اجنبی ملک میں غیروں کا مطمحِ نظر بننا پسند نہیں کر سکتے؛ میرے خیال میں اُن کی یہ رائے نہایت صائب تھی، اور اس لیے میں نے اُنھیں مجبور بھی نہیں کیا؛ میں تو سمجھتا تھا آپ کو یہ تمام باتیں معلوم ہونگی!"

رضاب کچھ نہ کہہ سکی اور اُس نے مُنہ پھیر کر ساحل کی جانب گھورنا شروع کیا۔

"آپ فرمائیں تو" ضعیف مسافر نے کہا۔ "ہم اپنا رُخ پھیر لیں، اگرچہ ہمارا یہ تمام سفر بالکل فضول ثابت ہوگا، کوئی بڑی بات تو نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسی مفیدِ مطلب ہوا سے فائدہ نہ اُٹھانا سراسر ظلم ہوگا!"

رضاب نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی غرض سے اُس نے جہاز کی ایک رسی کو مضبوط پکڑ لیا؛ اُس نے بولنے کی کوشش کی اور واپسی کا حکم دینا چاہا لیکن اُس کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کا باپ صرف اسی لیے اُس کے ساتھ آنا پسند نہ کرتا تھا کہ وہ غیر ملک میں رہنا پسند نہ کرتا تھا بلکہ اس

لیے کہ اُس کو یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں اُن کی بیٹی کو اس نودولتی کے عالم میں اُس کی مفلسی کے سبب شرمندہ نہ ہونا پڑے ۔ رضاب نے اپنے دل کو ٹٹولا تو اُسے کامل یقین ہو گیا کہ اس کے والدین کا خیال ٹھیک تھا اور اُنھیں اپنی لڑکی سے جس قدر محبت تھی وہ اُس سے کہیں زیادہ تھی جو خود رضاب کو اپنے ماں باپ سے تھی یا ہو سکتی تھی ۔

"خدا کی مرضی میں کسی کو کچھ دخل" رضاب نے کہا اور مُنہ پھیر لیا ۔

مواج سمندر کی سطح پر وہ سیاہ جہاز سُرعت تمام سفر کرتا رہا اور رفتہ رفتہ رضاب کی حالت میں سکون پیدا ہو گیا اور اُس کا وہ خوف و ہراس جاتا رہا ۔ فقط

روڈہوپ کی سرگذشت
منظومہ ولیم موریس } ترجمہ محمد سلیم الحق حقی احقر دہلوی علیگ غفرلہ

غزل

سوزِ اُلفت اور سازِ دل کو باہم کیجیے
محفلِ ہستی کسی صورت تو برہم کیجیے

جی میں ہے یوں ہوش و سرمستی کو باہم کیجیے
بند کیجیے آنکھ اور سیرِ دو عالم کیجیے

جو دکھائے اب جنونِ فتنہ ساماں دیکھیے
جو کہے اب آپ سے یہ فتنۂ غم کیجیے

سوزِ غم سے خاک کر دیجیے جہانِ آب و گل
دردسے آپ اپنا پیدا ایک عالم کیجیے

بدگمانی کیجیے پیدا اسی میں لُطف ہے
حُسنِ ظن جتنا مری جانب سے ہو کم کیجیے

چارہ سازِ دہر کی ناعاقبت اندیشیاں!
چار دن کیواسطے فکرِ دو عالم کیجیے

حاصلِ سوزِ محبت جانیے اس کو جلیل
زخمِ دل کیواسطے کیوں فکرِ مرہم کیجیے

جلیل قدوائی

سرِ شام

مصوّرِ جذبات منشی شبیر حسن خاں صاحب جوشؔ ملیح آبادی

جب مہرِ درخشاں مری آنکھوں سے ہو اوجھل — جب چرخ پہ آوارہ نظر آتے ہوں بادل
سینے میں خیالات ہوں جب لامتناہی — جب چھائی ہو ہر چیز پہ ہلکی سی سیاہی
جب خون شفق گرم ہو - خاموش ہو صحرا — جب بہتا ہو تھم تھم کے مچلتا ہوا دریا
جب شوخ ہلال آئے لیے چہرۂ روشن — جیسے کسی نوعمر کا ٹوٹا ہوا کنگن
جب چرخ پہ دھندلے سے ستارے نظر آئیں — جب دشت میں پرتول کے طائر اتر آئیں

ہمراہ مرے جب کوئی ہمدم ہو نہ ہمراز
جب فاصلے سے بانسری کی آتی ہو آواز

کھنچ آئیں جب اس مرکزِ اسرار پہ جذبات — پیدا ہوں حسرت سے، غم انگیز خیالات
جب دردِ جگر اتنی لطافت سے ہو پیدا — دل کو خلشِ غم پہ بشاشت کا ہو دھوکا
کھینچا ہو طبیعت نے جب احساس کا جوہر — جب اشک ہوں آنکھوں میں، تبسم ہو لبوں پر
جب شورشِ ادراک کی خاموش ہوں دل میں — جب شادی و غم دونوں ہم آغوش ہوں دل میں

جب موجِ ہوا میں نفسِ شام کی بو ہو
حسرت ہے کہ اس وقت مرے سامنے تو ہو

چشمِ باطن

اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہیئے — اچھے تو کیا بُروں سے بھی نفرت نہ چاہیئے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیئے — کانٹوں سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیئے

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے یہ بھی نسیمِ بہار کا

جو خشک جھاڑیاں نظر آتی ہیں جابجا — پھولوں کے خاندان سے ہیں دیکھتا ہے کیا
ٹھکرا کے برگِ زرد کو چلنا نہیں سوا — اس انتہا میں دیکھ! جھلکتی ہے ابتدا

کل اس ورق پہ رنگ چھڑک کر شراب کا
خاکِ چمن نے روپ بھرا تھا گلاب کا

سراپا انتظار

ہم اپنے ناظرین کی توجہ کو ایک چھوٹے مگر نہایت دلفریب و خوشنما بنگلہ کی جانب منعطف کراتے ہیں جو نواحات ناٹنگ ہل میں واقع تھا۔ یہ جگہ قریبی عمارت سے الگ تھلگ ایک وسیع باغ کے وسط میں اس طرح بنی ہوئی تھی کہ سڑک کا پہلو چھوڑ کر ہر سہ طرف باغ کی حد پر آہنی باڑ تھی جس پر سدا بہار بیلیں اور سرسبز پودے اس کثرت سے لگے ہوئے تھے کہ کسی کو بھی قریب سے گذرنے والے کو اندر کا حال معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ بنگلہ میں پہونچنے کے لئے ایک حلقہ دار سڑک دو آہنی پھاٹکوں سے گذر کر اندر جاتی تھی۔ کوٹھی کے چاروں طرف باغ۔ میدان اور روشیں نہایت عمدہ معلوم ہوتی تھیں۔ ایک جانب اصطبل اور دوسری طرف نایاب پودوں کی حفاظت کا مکان بنا ہوا تھا۔ کھڑکیوں میں جھلملیاں تھیں یہ جن میں سے وہ جو کمرہ نشست اور کمرہ طعام کی کھڑکیوں میں لگی ہوئی تھیں۔ برابر دن و رات بند رہتی تھیں۔ کوٹھی تک پہونچنے کے لئے ایک پختہ سڑک ناٹنگ ہل کی سڑک سے نکلی تھی۔ اور یہ فاصلہ تقریباً نصف میل تھا۔ عمارت کی پس افتادہ جائے وقوع کی وجہ سے بہت کم لوگ اس طرف سے گذرتے تھے۔ ہاں ان مزدوروں کی آمد و رفت اکثر رہتی جو کسی کام پر جا رہے ہوں۔ یہ کوٹھی شربری والا کے نام سے مشہور تھی۔ اس کی نوعیت آبادی لنڈن کے بحر ذخار کے ساحل پر ایک پرسکون و پرسکوت جھونپڑی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی لئے اس کے مکیں ہر قسم کے لوگوں کی نظر استعجاب یا گفتار بے جا سے مامون و محفوظ تھے۔ مختصر یہ کہ جو شخص لنڈن کی پرآشوب زندگی کے پاس رہکر امن و سکون کا طالب ہو۔ اس کے لئے یہ ایک نہایت اعلیٰ و باموقعہ جگہ تھی۔

یہ کیفیت جو ہم نے اجمالاً بیان کی ہے۔ دن کے وقت ہوتی تھی مگر ہم اپنے ناظرین کو مکان کے اندرونی حصوں کی سیر اس وقت کراتے ہیں جب لیلائے شب کی زلفیں عالم طور کارگاہ آفرینش کی ہر چیز کو اپنے سایہ میں لے چکی تھیں۔

عمارت کی پہلی منزل پر نشست گاہ کے پچھلی طرف ایک کمرہ جس کی کھڑکیاں باغ کی طرف کھلتی تھیں۔ بڑے اہتمام سے آراستہ و پیراستہ کیا ہوا تھا۔ اس کی آرایش بالکل مشرقی طرز کی تھی۔ اور کرسیوں کی بجائے دیواروں کے ساتھ ملے ہوئے دروازہ و کھڑکی کی جگہ چھوڑ کر شہ نشین رکھے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے باہر کی جھلملی بند تھی اور اندر قرمزی زربفت کے پردوں کی وجہ سے باہر کی سرد ہوا رکی ہوئی تھی۔ ایک سقفی لیمپ شیشہ کے سرخ گلوب میں سے ہلکی گلابی روشنی پھیلا رہا تھا۔ کمرہ کی ہوا گرم، معطر، فرحت افزا اور خوشگوار تھی یعنی اتنی گرم جیسی آغاز سرما کی راتوں میں ہونا چاہیئے۔ اور ایسی عنبر بیز کہ خوشبو دماغ کو مغلوب کرنے کے بجائے سرور انگیز انبساط پیدا کرے یہ خوشبو اُن خوشنما پھولوں سے نکل رہی تھی جنھیں نہایت بیش قیمت گلدانوں میں قرینہ سے رکھا گیا تھا اور ان میں سے چند تو ایسے تھے جو بعض امرا کے بند باغیچوں میں بڑی احتیاط کے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔ آتشدان پر مشرقی وضع کے نادرات آراستہ تھے اور وسطی میز بھی بلاد مشرقیہ کے بیش بہا تحائف سے سجی ہوئی تھی۔

مگر اس آراستہ و پیراستہ کمرہ میں اس سامان جلوہ آرائی و عجوبہ نمائی کے درمیان رہتا کون تھا کون اس وقت شہ نشین کے قرمزی گدّوں پر اس شان برنائی سے پیچھے جھک کر بیٹھا تھا؟ ... ۔ ایک مہ لقا نازنین۔ کیوں کہ یہ اہتمام دلکشی کسی خاتون ہی کا حصّہ ہو سکتا ہے۔ اس کی عمر ۳۰ سال کے قریب تھی اور گو اس کا حُسن ملیح مشرقی نژاد ہونے کی خبر دے رہا تھا۔ تاہم اگر سخت سے سخت سنگدل نکتہ چیں بھی اس پیکر آتشیں کی تفصیل حُسن و جمال میں جو آبائی سرزمین کی موسمی حدت یا فطری عیش پسندی کے اثرات کے باوجود ہر لحاظ سے مکمل تھی، عیب جوئی کی جرأت کرتا تو انگشت بدنداں رہجاتا۔ اس کا لباس نہایت قیمتی اور نواحی آرایش کے عین مطابق تھا۔ گو بادی النظر میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ دُنیا کی کس قوم یا کس مُلک سے مخصوص سمجھا جا سکتا تھا۔ اس نازنین نے مختلف مشرقی ممالک کے محاسن لباس کو منتخب کرنے کے بعد نفاست و عمدگی کے سب پہلو مدِ نظر رکھکر اسے تیار کرایا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس غیرتِ حوُر

پری تمثال حسینہ کا جلوہ بے پناہ اس لباس میں انتہائی تابناک نظر آرہا تھا۔
گلے میں اجوائی شب افروز کی مطلاخفتان جس کا تنگ گریباں اُس کے گلوئے سیمین اور
دامن گھٹنوں سے نیچے تک پہونچتا تھا۔ اس پر ایک بیش قیمت کربند جس میں نایاب ہیرے ٹکے
ہوئے تھے اور گریباں میں چھوٹا مگر نہایت قیمتی بروچ تھا۔ نیلی زربفت کا کرتا جو اس کے نیچے تھا
شوخ نظروں کے سیلاب تمنا کو روکنے کا فرض اچھی طرح انجام دے رہا تھا۔ بازو شانوں تک
کھلے ہوئے تھے ممکن ہے مبصران حسن کی نگاہ عیب جو انھیں ضرورت سے زیادہ فربہ قرار دیتی
مگر ان کی بے عیب ساخت ہر قسم کی نکتہ چینی کا موثر جواب تھی۔ ہاتھوں میں جواہرات سے مرصع
عجیب ساخت کے کڑے تھے انگلیاں لمبی و مخروطی۔ ناخن شفاف۔ بادام نما۔ ہلکی گلابی رنگت
رکھتے تھے۔

جوش تفصیل میں اصل بات یعنی اس نازنین کی پوشاک کی کیفیت نامکمل رہ گئی۔ بالائی حصہ
بدن کے لباس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ زیریں حصہ بیش قیمت ساٹن کی شلوار میں ملبوس تھا جس پہ شرق کی
بہترین قیطون لگی ہوئی تھی۔ مزید برآں اس شلوار کو ترکی وضع پر ٹانگ کے وسط میں اس انداز سے
تراشا گیا تھا کہ اس کے چھونے سے اعضا کی فربہی قطعی محسوس نہ ہوتی تھی حسن دلنواز کا اندازہ محض
ٹخنوں اور پاؤں کی نزاکت سے ہو سکتا تھا۔ ننگے خوشنما پاؤں میں کارچوبی کے نرم سرخ مرقش
کے سلیپر جن پر ٹکے ہوئے موتیوں کی قیمت کا اندازہ کوئی پختہ مغز جوہری ہی خوب کر سکتا تھا
اس وقت جب کہ یہ خاتون کرہ مذکور کے شہ نشین پر انداز رعنائی سے نرم و مخملی گدّوں پر پیچھے کو
جھکی بیٹھی تھی۔ کوئی شخص سرسری نظر سے دیکھکر معلوم کر سکتا تھا کہ اس خوشنما بدن کی موزونیت
برقرار رکھنے میں مصنوعات سے امداد نہیں کی گئی ہے۔ مگر اوّل تو کسی خوش نصیب کا اس حسن
روح پرور کی بارگاہ میں باریاب ہونا ہی معلوم اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یقیناً اُس کی نگاہ سرسری
جائزہ ہی پر اکتفا نہ کرتی۔ کیوں کہ فطرتاً وہ اس کی ہر تفصیل دیکھنے پر مجبور ہو جاتا۔ اور ایسی حالت
میں اس کے لئے یہ معلوم کرنا ذرا بھی دشوار نہ ہوتا۔ کہ اس جمال جانستان کی تکمیل میں دست قدرت سے

خود ہی وہ پختگی پیدا کر دی ہے، کہ انسان کی نگاہ عیب جوئی سے قاصر رہ جائے۔ غرض کہ اس کے اظہار میں کسی تصنع کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ اعضاء کی موزونیت خود ہی لباس میں وہ شانِ لفریبی پیدا کر رہی تھی جس کا حصول اس ذریعہ سے منظور ہوتا ہی۔ اس کی قامت متوسط تھی مگر کچھ بدنی ساخت کچھ لباس کی تراش اور کچھ اس شان و وقار کے باعث جس کا اظہار خرام و سکون ہر دو حالات میں ہوتا تھا۔ اُس کا بدن درازی کی طرف مائل نظر آتا تھا۔ —

یہاں تک ہم نے صرف اس ماہوش نازنین کے لباس کی کیفیت بیان کی ہو جو مشرقی آرایش کے اس کمرہ میں شاہانہ انداز سے بیٹھی تھی۔ لیکن اس تفصیل کے تکملہ کے لئے اس کے حسن برق پاش کی نسبت بھی چند کلمات ضروری ہیں۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ وہ حسنِ ملیح کا شاندار نمونہ تھی مگر یہ ملاحت جیسی قوم کی سانولی رنگت سے مختلف ہسپانیہ یا اطالیہ کے باشندوں کی رنگت سے زیادہ مشابہ تھی۔ جلد بدن اس ملاحت میں بھی اتنی صاف کہ گرم مشرقی خون اپنی تیزیِ رفتار سے عارض پر گلگوں پیدا کرتا تھا۔ مگر نہیں۔ ہماری رائے میں چوں کہ اس توضیح کے باوجود ملاحت کے لفظ سے غلط فہمی کا امکان ہو۔ اس لئے ہم اس کے بجائے شفاف گندمی رنگ کا لفظ استعمال کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ اس نازنین کی صورت میں وہ ملاحت جسے زیتونی رنگت کا لازمہ سمجھا جاتا ہی قطعاً موجود نہ تھی اور عہد شباب کی تازگی و تابش بلوغ کی اس بالیدگی میں بھی بدستور قایم تھی شاید ناظرین یہ خیال کریں کہ بعض ایشیائی اقوام کی طرح اس نے بھاری سرپیچ پہن رکھا ہوگا۔ مگر نہیں اس کے سر پر فقط ایک ہلکا بیش قیمت معجر تھا۔ اور یہ الماس و دُرِ شہوار سے مُرصع تھا۔ جن کی مجموعی قیمت کسی چھوٹے والیِ ملک کی دولت سے کم نہ تھا۔ اس کے نیچے اس نازنین کے گیسوئے عنبریں جوڑے کی صورت میں نہ تھیں۔ بلکہ سیدھی اور سپید مانگ نکال کر لہراتے ہوئے سانپوں کی طرح دونوں شانوں اور پشت پر لٹک رہی تھے۔ بالوں کی سیاہی شب اسود کی تاریکی کو شرما رہی تھی گو یہ سیاہی چمک سے خالی تھی۔ تاہم بال موٹے و کھُردرے نہیں۔ بلکہ ریشم کی طرح مُلائم۔ نرم اور سیدھے تھے۔ صرف ان کے سروں پر ایک قدرتی گہرا خم پایا جاتا تھا۔ پیشانی بلند نہ سہی۔ تاہم

اتنی فراخ تھی کہ اُس سے چہرہ پر اثر وقار عیاں ہو رہا تھا۔ ناک سیدھی اور نتھنوں سے گلاب کی
پتیوں کی شباہت ملتی جلتی تھی۔ بالائی ہونٹ نازک۔ مگر دونوں لب تراش کے اعتبار سے اتنے
مکمل تھے کہ ایک ماہر سنگتراش کے ہاتھ بھی نہ بنا سکتے تھے۔ دہانہ اس عالم سکوت و سنجیدگی میں عشق کے
دیوتا کی کمان سے مشابہ تھا۔ ٹھوڑی نازک اور گول۔ چہرہ کی ساخت بیضوی۔ کمان ابرو۔ نگاہ جھکی
اور اس چشم سرگیں کی حفاظت و خوشنمائی کے لئے نہایت موزوں۔ جسے عورت کی رُوح کا آئینہ
اور سب سے تیز حربہ سمجھا گیا ہے پلکیں گھنی اور غیر معمولی لمبی تھیں جس وقت اس کے لب لعلیں کھلتے
تو دُرِ دنداں کی لڑیاں نہایت ہموار مکمل اور دُرِ شہسوار سے مشابہ نظر آتی تھیں۔ اگر اُس کا دست حنائی
کنپٹی کے پاس زلف عنبرین کو چھیڑنے کی جرأت کرتا۔ تو نہایت خوشنما۔ اور چھوٹے نازک کان نمودار
ہو جاتے۔ ان میں سوائے دو بُندوں کے اور کوئی زیور نہ تھا۔ مختصر یہ کہ مشرق کے اس شہرۂ آفاق
حُسن کی جس کا حال اکثر قصّوں کہانیوں میں سُنا کرتے تھے۔ وہ جملہ تفصیلات جو لازمہ تکمیل سمجھی گئی
ہیں۔ اس نازآفریں۔ غیرتِ حور۔ ماہ جبیں نازنیں کی ذات با صفات میں موجود تھیں۔

ناظرین معاف فرمائیں کہ ہم جوش میں آ کر تفصیلات میں پڑ گئے اور اصل مطلب کو نظر انداز
کر دیا۔ رات کے نو و دس بجے کا درمیانی وقت تھا۔ اور شہر بری والا کے اس کمرہ میں جس کا ذکر
ہم شروع میں کر چکے ہیں۔ مشرقی حسینہ عجب مغموم و انداز فکر سے بیٹھی ہوئی تھی۔ کبھی اس کے چہرہ سے
جوش۔ کبھی اضطراب۔ کبھی تشویش کے آثار ظاہر ہوتے۔ وہ گاہے کروٹ لیتی۔ گاہے اُٹھ کر بیٹھ جاتی
اور تھوڑی دیر تک سامنے نظر کیے رہنے کے بعد پھر دراز ہو جاتی۔ پاؤ گھنٹے کے عرصہ میں اس نے
کئی بار ایک خوشنما ہیروں سے مرصع گھڑی کو جو ایک بھاری طلائی زنجیر کی مدد سے اُس کی خفتان
میں لگی ہوئی تھی۔ دیکھا۔ کئی بار اُس کی سحر بار آنکھیں جن میں عموماً انداز کسل غالب رہتا تھا۔ اس جوش
باطن کی وجہ سے جو رُوح کو بے قرار بنائے ہوئے تھا۔ جگمگانے لگیں اور آخر ایک بار پھر گھڑی پر
نظر ڈال کر اُس نے آہستہ سے اپنی مشرقی زبان میں کہا۔ "آہ۔ وقت گذرا جاتا ہے اور وہ ابھی تک
نہیں آئے"

یہ الفاظ گو دبے ہوئے لہجہ میں اس قدر آہستگی سے کہے گئے تھے کہ اُس کے سوا کسی اور کو
نہ سُنائی پڑتے۔ تاہم آواز جس میں وہ ادا ہوئے۔ اتنی باریک۔ ایسی نقرئی۔ اور اتنی دلفریب تھی
کہ نہایت سخت و کرخت زبان بھی اس کی وجہ سے دلکش معلوم ہوتی۔ یہ ایسی آواز تھی جسے انسان
ایک بار سُن کر کبھی نہیں بھولتا۔ جس کی ندائے خوش آیند نغمۂ طرب کی آخری آواز کے مانند رُوح پر
گرفت حاصل کر کے بہت دیر تک راحت و مسرّت کی یاد دل میں چھوڑ جاتی ہے اور قلب انسانی
اُسے پھر ایک بار سننے کو بیتاب ہو جاتا ہے۔

اسی کرب و بیقراری میں اس نازنین نے ایک چھوٹی نقرئی گھنٹی کو جو پاس ہی رکھی ہوئی تھی
حرکت دی اور اس کی آواز سُن کر ایک ہندوستانی عورت جو صورت سے خادمہ نظر آتی تھی۔ کمرہ میں
داخل ہوئی۔ اس کی عمر ۲۰ سال کے قریب تھی۔ دراز قامت۔ چھریرا بدن۔ جسم کی ساخت موزوں
خط و خال دلکش اور چال سے تصویر خراماں معلوم ہوتی تھی۔ چہرہ کی رنگت گو اس نازنیں کے مقابلہ
میں جس کا ذکر پیشتر ہوا ہے۔ بہت سانولی مگر دلکش تھی۔ آنکھیں آتش روح سے اس طرح شعلہ بار تھیں
کہ انھیں دیکھ کر طبیعت میں راحت و خوف کا مشترکہ احساس پیدا ہونا یقینی تھا۔ ہونٹ ارغوانی اور
ان کے اندر اُس کے دانت چوڑے مگر اس خاتون کے دُرِ دنداں کی طرح ہموار سپید و بے عیب تھے۔
خط و خال چھوٹے لیکن متناسب۔ بال نہایت سیاہ۔ ہر قسم کے بل و خم سے عاری۔ لمبے و سیدھے
ہر دو شانوں اور پیٹھ پر سے لٹکے ہوئے تھے مگر ان بالوں کے سیدھا ہونے نے اُس میں کوئی عیب
پیدا نہیں ہونا تھا۔ فی الحقیقت مغربی آب و ہوا میں جمال نسوانی کی یہ ایک بالکل نئی و نادیدہ
مثال تھی۔ لباس سپید اور سُوتی کپڑے کا تھا۔ جسے اُس کی حیثیت اور قومیت کے مطابق سمجھا جا سکتا
ہی مگر سر پر دوپٹہ یا اوڑھنی کے قسم سے کوئی چیز نہ تھی۔ بوقت خرام اس کی جملہ حرکات بید مجنوں
کی لچک اور قابل رشک سُبک رفتاری ظاہر کرتی تھیں۔ ہاتھوں میں طلائی کڑے اور پاؤں میں
سونے کی پازیب تھیں۔ یہ ایک سادہ مشرقی سلیپر پہنے ہوئے تھی مگر جس طرح اوپر بیان کیا گیا ہی
وہ اس سُبک رفتاری سے چلتی تھی کہ دبیز قالین پر پاؤں کی چاپ بالکل نہ سنائی دیتی تھی۔

یچی نگاہوں سے کمرہ میں داخل ہوکر وہ اسی طرح غلامانہ انداز سے مودب فاصلہ پر کھڑی ہوگئی گویا وہ جس کے سامنے حاضر ہوئی۔ ہفت اقلیم کی ملکہ تھی۔ اس نازنین نے اشارہ سے پاس آنے کو کہا تو وہ اپنا ڈھیلا لباس اچھی طرح سمیٹ کر اُس کے قریب پہونچی۔ اوّل الذکر نے چند الفاظ اُس کے کان میں کہے جس کے بعد وہ سر کو ہلکا خم دیکر چلی گئی اور چند منٹ کے عرصہ میں چاندی کا بھاری قاب لیکر واپس ہوئی۔ جس پر کٹ گلاس کے برتن میں آب لیموں یا شربت کے قسم کی کوئی مفرح چیز تھی۔ خاتون موصوف کے سامنے ایک زانوں کے بل جھک کر اُس نے وہ قاب پیش کی۔ نازنین نے انداز رعنائی سے گلاس ہاتھ میں لے کر مُنہ سے لگایا اور جو کچھ اُس میں تھا ایک ہی بار پی گئی۔ معلوم ہوتا تھا ذہنی اذیت واضطراب نے اُس کا گلا خشک کر دیا ہے اور غالباً اسی وجہ سے اُس کو گرمی محسوس ہوتی تھی چنانچہ اشارہ پاتے ہی خادمہ نے مشرقی پرندوں کے خوشنما پروں کا ایک بیش قیمت پنکھا پیش کیا جس کے دستہ عاج میں نادر و نایاب جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔

"سندرا۔ کیا واقعی دس بج گئے۔ یا میری گھڑی کچھ غلط ہے" خاتون نے اُسی مشرقی زبان میں خادمہ سے کہا۔

"راجکماری جی۔ دس کا عمل ہو چکا ہے" خادمہ نے کہنا شروع کیا۔

مگر اس نازنین نے جلدی سے قطع کلام کر کے کہا "سندرا۔ اس جگہ رہتے ہوئے ان تکلفات کی ضرورت نہیں" پھر وہ انداز دلفریبی سے مُسکرا کر کہنے لگی "مگر میں بھول گئی۔ اپنی زبان میں ہمیں ایسے القاب استعمال کرنے ہی پڑتے ہیں۔ خیر۔ سندرا۔ یہ تو بتاؤ یہ عجیب و غریب ملک تمھیں پسند آیا یا نہیں؟"

"سرکار۔ میں نے اسے اب تک اتنا کم دیکھا ہے کہ کوئی رائے قایم نہیں کر سکتی" خادمہ نے اب کی جبراً احکام کے زیر اثر اُس لقب کو حذف کر کے جواب دیا جو اُس کی مالکہ کو جائز طور پر حاصل تھا "لیکن عملی طور پر جہاں آپ ہوں وہاں میں ہر طرح خوش ہوں۔ آپ کے زیر سایہ بسر کرتے ہوئے

مجھے اس کی قطعی پروا نہیں کہ میں کہاں ہوں۔"

"پھر بھی تم نے کچھ نہ کچھ رائے ضرور قایم کی ہوگی"۔ راجکماری نے کہا۔ "بس میرے سوال کا جواب حسن ارادت سے قطع نظر کرکے دو کہ اس ملک کی نسبت جہاں دنیا کی دعویدار مہذب قوم انگریز بستی ہی۔ تمہاری آزادانہ رائے کیا ہی؟"

سندرا تھوڑی دیر تک فکر کی حالت میں چپ رہی۔ آنکھیں فرش زمین کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یکایک اُس نے اپنی مالکہ کے چہرہ کی طرف دیکھکر جواب دیا۔ "جی ہاں مجھے انگلستان پسند ہی۔"

عین اسی وقت صدر دروازہ پر دستک سنائی دی جس سے راجکماری نمایاں طور پر چونکی اس نے جلدی سے سندرا کو اشارہ کیا اور وہ فوراً دبے پاؤں کمرہ سے نکل گئی۔ اس کی رخصت پر دروازہ بند ہوتے ہی راجکماری کا اضطراب پہلے کی نسبت زیادہ بڑھ گیا اور منتظر آنکھیں کسی کو ڈھونڈنے لگیں۔ فکر و تشویش کی لہر بدن کے ہر حصہ میں دوڑ گئی۔ مگر فوراً ہی اُس کا خوشنما چہرہ راحت و اُمید سے چمک گیا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ہمارا نوجوان مہاراجہ اُف ۔۔۔۔ داخل ہوا۔

اسے دیکھکر راجکماری نے کچھ اس طرح کی حرکت کی گویا بے اختیار اپنی جگہ سے اُٹھکر اُس سے لپٹ جانا چاہتی ہی مگر کسی خیال رُک گئی اور اپنی جگہ پر بدستور بیٹھی ہوئی۔ مہاراجہ کو ایسی نظروں سے دیکھتی رہی جن میں جذبہ شوق کے ساتھ اثر ملامت بھی شامل تھا اور ضمناً التجائے رحم و معافی کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ آنے والا لمحہ بھر تک دروازہ کے قریب کھڑا رہا۔ دونوں چپ تھے۔ دونوں پر کوئی نامعلوم اثر سکوت غالب تھا۔ نہ تو مہاراجہ ہی کے سمجھ میں آتا تھا، اور نہ راجکماری ہی کی عقل کام کرتی تھی کہ آغاز گفتگو کس طرح ہو۔

"ہائیں۔ خیریت تو ہی۔ آخر یہ حال کیا ہی؟" نو وارد کے زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"اُف۔ یہ پوچھنا۔ اور وہ بھی کس سے۔ آہٹ پہ کان۔ در پہ نظر۔ دل میں اضطراب۔ پوچھو ستم کشوں سے مزہ انتظار کا۔" راجکماری کے منہ سے ایک عالم بے خودی میں نکلا۔ اور فکر و تردد

سے کے بعد راحت و مسرت کے مراجعانہ اثر نے اُسے اس قدر مغلوب کر دیا کہ وہ اُس شہ نشین پر نیم غشی کی حالت میں گر پڑی۔

(ترجمہ اقتباس انگریزی از فسانہ اسرار انسانی)

شمیم ملہوری

غزل

تعجب کیا کشادہ ہی اگر دامن نیستاں کا　　تحیر ہی کہ ہر ذرہ میں عالم ہی بیاباں کا

نہ استعداد ذاتی ہو تو ہی امداد لا حاصل　　گہر ہوگا وہی قطرہ صدف میں جو ہی نیساں کا

عیاں رہتا ہی دائم کیوں نہ ہو نظروں سی پوشیدہ　　ملی وہ کیا کہ ہو جس کا مکاں ہر ذرہ لامکاں کا

اسیری موجب کلفت نہیں ہاں الفتِ گل ہی　　قفس میں ہوں مگر شکوہ زباں پر ہی گلستاں کا

ضلالت کے اندھیرے سے عیاں نورِ ہدایت ہی　　ہویدا از شبِ تکفیر سے ہی حسن ایماں کا

تفکر پر ہے عالم میں مدارِ ہستی انساں　　فنا ہی ٹوٹ جانا سلسلہ افکارِ پنہاں کا

یہی گمراہیاں ہیں رہنمائے منزلِ مقصد　　خیال آیا ہی کانٹوں میں الجھکر ہی گلستاں کا

بہت کچھ مجھکو کہنا تھا مگر اب کیا کہوں جعفر
کوئی مطلب تو سمجھے اِن خیالاتِ پریشاں کا

افاداتِ ثاقب

کیا تعجب گر کوئی غمخوار دُنیا میں نہ تھا
درد میری دل میں تھا اور میری اعضا میں تھا

غیر کی امداد سے چمکے نہیں اہلِ کمال
نام کو روغن چراغ طورِ سینا میں نہ تھا

اپنی قسمت سے بگڑ جاؤں کہ دَورِ چرخ سے
میں تو وہ ڈھونڈا کیا جو عیبِ دُنیا میں نہ تھا

یوں تو مُشتِ خاک تھا دل خون ہو کر بہ گیا
لیکن اس قطرے میں وہ کچھ تھا جو دریا میں نہ تھا

حُسن ظاہر ہو گیا تھا سدِّ بابِ معرفت
قلبِ یوسف تھا مگر چشمِ زلیخا میں نہ تھا

پرورش کیا چیز ہے جو کچھ ہے استعداد سے
خشک ہے گوہر کہ جیسے قعرِ دریا میں نہ تھا

وہ تو وہ ہیں راہ چلنے میں نظر ڈالی تھی کل
آپ میں ذرّہ کوئی نقشِ کفِ پا میں نہ تھا

دل یہ کہتا ہے کہ نالے بے اثر تھے شامِ غم
میں یہ کہتا ہوں کہ اس شب کوئی دنیا میں نہ تھا

جو اندھیرا دیدۂ ثاقبؔ نے دیکھا شامِ ہجر
بختِ واژوں میں نہ تھا زلفِ چلیپا میں نہ تھا

[signature]

آغاز و انجام

(۱)

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کئے ہوئے
(غالب)

موسمِ سرما کی طویل راتیں بچپن میں قصہ اور کہانی کی اعانت سے کٹیں۔ اسکول اور کالج کی زندگی میں اگر نصف شب احباب کی پُرلطف صحبت کی نذر نہ ہوئی تو کسی دلچسپ کتاب کی مدد سے طے ہوئی۔ جب یہ فصلِ زندگی بھی تمام ہوئی تو دُنیا کی وسیع فضا میں دلِ مضطر نے اپنی دلچسپی کے لئے بہت سی نئی راہیں اختیار کیں۔ فطرتِ انسانی نے بے اختیار بنا کر حضرت کو کسی نہ کسی مقناطیسی مرکز سے چسپاں ہی رکھا۔ دُنیا کی ہر لطیف شے بلکہ ہر درخشاں ذرّہ ان کے لئے قطب بنا اور ان کے جذبات کو اپنی جانب کھینچتا تھا۔ یہ کشمکش لطیف تھی۔ اور ہر شے کی کشش ان کے لئے سرمایۂ زندگی۔ اب کہ یہ طویل راتیں کسی نوع کاٹے نہیں کٹتیں؛ ایک مرتبہ یہ رات کچھ ایسی سمٹی کہ اس کا خمیازہ اب تک مجھے بھگتنا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اُس شب کو اپنے موسمی قانون میں ایک تکلیف دہ ترمیم کی تھی۔ ورنہ وہ شب اور ترنمِ ترشح اس قابل تھا کہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ وہ لطیف صحبت لامتناہی ہوتی تو پُرکیف سازِ زندگی کبھی اس طرح بیراگ نہ ہوتا۔ مگر آہ، یہ سب بے ثبات زندگی کا ایک عارضی لمحہ تھا۔ مُرغِ سحر کی بانگ نے اس کا رخصتی بگل بجایا۔ حضرتِ دل تڑپے، خوب تڑپے اور تڑپ کر رہ گئے۔ یہ جو کچھ گذرا اُن کو اب تک یاد ہے۔ دسمبر کی وہ شب طویل نہیں بلکہ جون کی سب سے زیادہ مختصر رات بن گئی۔ مہاوٹوں کی بارش اُن کا اُس شب مہمان ہونا، ناقابلِ فراموش بلکہ ایک غیر فانی یاد ہے۔ وہ شب مسلسل باتوں میں کٹی۔ وہ گفتگوئے راز و نیاز کبھی ختم نہ ہوتی مگر مُرغِ سحر کی آواز نے سکوتِ شب اور ترنمِ باراں کو توڑا۔ اُس صحبتِ پُرکیف میں رخنہ اندازی کی۔ اس آواز نے پرستارانِ اُلفت کو چونکایا۔ اُن کی حیرت پُرکیف تھی، اُن کی رخصت دل آزار

لیکن تاہم دلفریب۔ وہ اُٹھکر چلے جاتے، مگر اُٹھنا اور جانا ایک سعی دشوار بنا جاتا تھا۔ حضرتِ دل کو ناز تھا کہ میں مفتوح ہی نہیں بلکہ فاتح بھی ہوں۔ مُرغِ سحر نے پھر بلند آہنگی سے یاد دہانی کی۔ وہ شفیق ناصح برابر اپنا فرض انجام دے رہا تھا۔ چلنے اور ٹھہرنے کی کشمکش آخر تمام ہوئی صبح کی روشنی ہر طرف پھیل گئی، گھبرا کر کیسی دلفریب گھبراہٹ کے ساتھ انھوں نے اپنے پازیب اُتارے اور جمال کے تکیوں کو اُن کا محافظ بنا کر وہ جھپ سے کمرہ سے باہر نکلجانا، پازیب چھپانے کی ادا، اخفائے رُسوائی کا وہ پُرکیف اضطراب حضرتِ دل کے لئے ایک دائمی سرور بنا جس نے اُس کو برسوں مخمور اور مدہوش رکھا۔

یہ آغاز تھا محض ایک المناک انجام کا۔

(۲)

انجام

مجھ سے پوچھے کوئی انجامِ محبت کے مزے
جامِ حرماں کے مزے۔ بادۂ حسرت کے مزے (نیرنگ)

سرما کی طویل شب شروع ہو چکی تھی۔ جمیلہ عالمِ سکرات میں حیات بے ثبات کی آخری منزل شدید کرب و اضطراب کے ساتھ طے کر رہی تھی۔ اُس کی مایوس نظریں ہر شے پر ہراس کے ساتھ پڑتیں، وہ متجسس تھیں کہ پھر ایک مرتبہ اُس صورت کو دیکھیں جس کا دیکھنا حشر تک ناممکن ہو جائے گا۔ طبیب جواب دے چکے تھے، نبض کی غیر مسلسل حرکت قلب کی آخری تڑپ پر دال تھی۔ بار بار مریضہ پر عالمِ غشی طاری ہوتا تھا لیکن جب ہوش آتا۔ اُس کی متجسسانہ نگاہیں کسی کی تلاش میں بے چین معلوم ہوتی تھیں۔ جمال عین اُس وقت پہونچا جب کہ اُس کی رفیق زندگی قریب قریب بے جان ہو چکی تھی۔ فکر معاش میں وہ گھر سے دُور تھا، مریضہ یکایک مرض الموت میں مبتلا ہوئی۔ وہ ابھی پہونچا بھی نہ تھا کہ جمیلہ بیجان ہو چکی تھی جب وہ گھر پہونچا تو بد حواس تھا۔ از خود رفتہ تھا۔ شدتِ غم نے اُس کو ششدر بنا دیا۔ وہ جمادات کی طرح بے حس تھا۔ اُس کے قلب محزوں کو اس عجب انجام

نے آغاز دلفریب کی یاد دلاکر پاش پاش کر دیا تھا۔ سرمایہ کی وہ شب جس کے اختصار پر اُسے مدتوں حسرت رہنی یاد تھی۔ مگر اس شب غم کا طول بھی وہ کبھی نہ بھولے گا۔ اُس کا دماغ بے شمار یادوں کا مرکز تھا۔ اب وہ بالکل دیوانہ تھا۔ اُس نے ایک مجنونانہ اور حسرت انگیز انداز کے ساتھ جمیلہ کے سر کو اپنی آغوش میں لیا۔ منہ پر منہ رکھکر آواز دی۔ مریضہ نے حالت نزع میں پہلی ہی آواز پر آنکھیں کھول دیں۔ بس یہی آخری دیدار تھا۔ بجائے مُردنی کے آنکھوں میں اب نور تھا۔ اُس نے بغور دیکھا۔ اس لئے کہ وہ پہچانتی نہ تھی۔ بلکہ اس لئے کہ جب تک آنکھوں میں جان ہے اُس کی نظریں جمال ہی کے چہرہ پر رہیں۔ اُس نے اشارہ سے اپنی خشک زبان جس پر موت کی تشنگی نے کانٹے ڈال دیئے تھے۔ جمال کو دکھلائی جس کو اُس نے اپنے لعابِ دہن سے تر کیا۔ یہی آخری پیار تھا۔ مریضہ کو یکایک ہچکی آئی اور آنکھوں سے روشنی زائل ہو گئی۔ جمیلہ اب ایک میت تھی۔ اُس کی کُھلی ہوئی آنکھیں جمال کے چہرہ کا عکس لے رہی تھیں تاکہ مدفن میں اُس کے چہرہ کا عکسی فلم اُس کے ساتھ رہے۔ اور اسی طرح اُس کا خواب مدام دائمی سُرور سے پُر کیف رہے۔ جمیلہ رخصت ہو چکی تھی، مگر یہ رخصتِ آغاز کی رخصت سے کس درجہ مختلف تھی۔ جمال کے لئے اس شب کا طول قیامت کے طول سے کم نہ تھا۔ اُس کا فاتحانہ سُرور اب مبدل بہ اندوہ تھا۔ آغاز میں وہ فاتح الُفت تھا مگر انجام میں مغلوبِ غم۔

سید شفاعت حسین بی اے (علیگ)

پڑا ہوں صورتِ نقشِ کفِ پا　　　اٹھوں گا بھی تو میں مٹ کر اٹھوں گا
یہی کہتی ہے دل کی بے قراری　　　کوئی دن اور مر مر کر جیوں گا
میں بیخود ہوں زمانہ جانتا ہے
پئے ہوں اور تھوڑی سی پیوں گا

بیخود (علیگ)

افکارِ اصغر

جانِ نشاط، حسن کی دنیا کہیں جسے
جنت ہے ایک، خونِ تمنا کہیں جسے

اُس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرف
ایسا حجاب، چشمِ تماشا کہیں جسے

یہ اصلِ زندگی ہے یہ جانِ حیات ہے
حسنِ مذاق، شورشِ سودا کہیں جسے

میری وداعِ ہوش کو اتنا بھی ہے بہت
یہ آب و رنگ حسن کا پردا کہیں جسے

اکثر رہا ہے حسنِ حقیقت بھی سامنے
اِک مستقل سرابِ تمنا کہیں جسے

نظروں سے سیرگاہِ فنا سب گذر گئی
ایسا کوئی نہیں کہ شناسا کہیں جسے

ہر موج کی وہ شان ہے جامِ شراب میں
برقِ فضائے وادیِ سینا کہیں جسے

زندانیوں کو آکے نہ چھیڑا کرے بہت
جانِ بہار، نکہتِ رسوا کہیں جسے

میں ہوں ازل سے گرمِ رہِ عرصۂ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

سرمستیوں میں شیشۂ مے لے کے ہاتھ میں
اتنا اُچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے

شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے
وہ ربطِ خاص، رنجشِ بیجا کہیں جسے

میری نگاہِ شوق پہ اب تک ہے منعکس
حسنِ خیال، شاہدِ زیبا کہیں جسے

میری فغانِ درد پہ اُس سروِ ناز کو
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

دل جلوہ گاہِ حسن بنا فیضِ عشق سے
وہ داغ ہے کہ شاہدِ رعنا کہیں جسے

ہم بیخودوں نے سکر میں وہ محو کر دیا
ذوقِ علوم، کاوشِ بیجا کہیں جسے

اصغر نہ کھولنا کسی حکمت مآب پر
رازِ حیات، ساغر و مینا کہیں جسے

حضرتِ اصغر

غزل

زصور مژده به مایوس انتظار آمد — ببیں که حُسن گلوسوز آشکار آمد

بجانِ من نه به ناز و ادا نگار آمد — مگر مجسمۂ شان کردگار آمد

ستم ظریفیٔ تقدیر آشکار آمد — مرا جنوں شده در بوستاں بهار آمد

مقام گریہ جہان ست نے سرائے سرور — بخندۂ گلِ تر شبنم اشک بار آمد

بده ز شربت دیدار جرعه زود مرا — بیا بیا به لبِ تشنه جان زار آمد

ہزار کوه معاصی شود ته موجے — اگر بجوش مرا چشم شرمسار آمد

زکوٰة حُسن بده کاسۂ گدائی را — کنوں زمانہ چو با طبع سازگار آمد

بخاک رانده فلک آنچناں که خاک شدم — نه آمده نه بجوش آه شعله بار آمد

مہر گیر در آغوشِ لطف انور را

تباه حال بسویت اُمیدوار آمد

انوار حسین خاں بی اے (علیگ)

پٹواری

مکرمی جناب بیخود صاحب، اڈیٹر "میگزین"

السلام علیکم

میگزین، خوش ادا میگزین، کی ارتقائی تاریخ دیکھیے گا، تو میرا خیال ہے، "رشیدی" دور میں یہ بلحاظ حسنِ صورت و سیرت عالمِ شباب پر تھا، "منظوری" دور میں بھی علمی اٹکھیلیاں کچھ کم منظورِ نظر نہ رہیں، آپ کے زمانہ میں، سنا ہے، اس کی ادبی پھبن بیخودی کا عالم طاری کیے دیتی ہے،

اللھم زد فزد!

قابلِ احترام "کامریڈ" کے صفحۂ "گپ" نہیں! "مطائبات ادب" میں سے مرحوم شیخ ولایت علیؒ صاحب بمبوق بی۔ اے (علیگ) کے "پٹواری" والے مضمون کے اچھوتے اور ظرافت میں ڈوبے ہوئے خیالات، اصل یہ ہے، زندہ دلی کا نچوڑ ہیں، راقم کا ان خیالات سے زیادہ متاثر ہو کر انہیں اُردو کا قالب دینا اس واقعہ پر مبنی ہے کہ خود یہ راقم بھی ہوبہو ایسے ہی عجوبۂ روزگار پٹواری سے دوچار ہونے کا شرف حاصل کر چکا ہے، فرصت کی نامساعدت، افسوس! اس کے گدگدانے والے تصور کی تصویر نہ کھینچ سکی تھی اور یہ دیرینہ عزیز خیالات ماند ہو چلے تھے، کہ محترم "کامریڈ" نے غیر متوقع رفاقت کر کے انہیں پھر چمکا دیا، کرم گردش خدایا زندہ باشد۔ چنانچہ اس مضمون کے نام نہاد ترجمہ سے یہاں صرف اپنے خیالات کی ہی ترجمانی مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے چھیڑ کانے والے خیالات کو اُردو قالب دے کر ایک روشن "علیگ" دماغ کے نتیجۂ فکر کی محسوس یادگار کو بھی ہنس مکھ "میگزین" کی آغوش میں اُجاگر کرنا چاہتا ہوں، جس کے لئے آپ کی عاطفانہ توجہ درکار ہے۔ فقط

خاکسار سید وزیر حسن

"پٹواریت" سے یہاں، عام طور پر سروکار نہیں ہے، کیونکہ اختلافِ طبائع نے پٹواریوں میں بھی تدریجی کیفیت پیدا کر دی ہے، البتہ فرقۂ "پٹواریاں" میں سے چوٹی کے ایک ایسے پٹواری کا ذکرِ خیر مطلوب ہے، جو اسی آفاقی نسلِ انسانی کا گویا ایک "دو پایہ فرزند" تو بیرا ایک انسان ہے، تاہم اس کے اخلاقی خصائص اور جسمانی ساخت سے یکقلم منہ موڑ لینا اقتصادیات ہی نہیں "اطرافیات" کے طالبِ علم کے لیے بھی صریح ٹوٹے کا موجب ہے۔ یہ نادر الوجود ہستی بقول ڈارون مسئلہ ارتقا ر (Evolution Theory) کا گویا عملی نتیجہ ہے جس کی چند در چند جبلی عادات و صفات سے بیس بسوے پتہ بھی یہی چلتا ہے کہ یہ ساری کی ساری اس کے "جدِ امجد" (بن مانس!) کی ہی غیر محسوس ترقی یافتہ عادات و خصائل ہیں۔ اس خوش صفات کی اخلاقی اور دماغی قابلیت، زود فہمی، ذرا سے خطرہ سے بچک جانا، موقع پا کر پھکی سے کام لینا، نیز اس کی قابلِ دید بھاگ دوڑ، دراصل اس کے بوزنیوی جدکی ہی میراث سمجھئے، ایسے جدِ اعلیٰ کی حیرت انگیز ورثہ کا بار اٹھانا، اگر انصاف کوئی شے ہے، تو خاموشی سے مان لینا پڑتا ہے کہ اس سعادتمند کے ہی متحمل ظرف کا کام تھا۔ جہاں اس نے صرف یہ بوجھ ہی نہیں اٹھایا، بلکہ "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کے شگفتہ مقولہ کی صداقت کو بھی پوری طرح جانچا ہے، میں نہیں سمجھتا، اس کے بوزنیوی جد سے جتنی توقعات ہو سکتی تھیں "اس " سہ کا بیہ" یعنی کم یاب پٹواری کی ذات نادر صفات سے بہ تمام و کمال پوری نہ ہو سکیں!

ایک گانوں اس کے زیرِ نگیں ہے۔ جس میں اسے حق و ذمہ داری کی متحرک گھڑی کہا جا سکتا ہے؛ جہاں سے بلا لحاظِ ضرورت "حکم نادری" نفاذ پاتے رہتے ہیں، ان احکام میں کرختگی آواز کو بھی مصلحتاً بڑا دخل حاصل ہے جس سے "بشیر" بانگ حماری!" کی خوش الحانی کا ثبوت ملتا ہے۔ زمینداروں کی چکنی چپڑی باتیں اسے جس طرح چربایا تی رہتی ہیں۔ عام پٹیدار و ں کی لٹھ مار گفتگو کی سینک اس چربی کو پگلا دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ گلگلا دائرۂ انسانیت میں بھی دکھائی دیتا ہے، ورنہ عقلاً اُسے اب تک کبھی کا مسخ ہو جانا چاہیے تھا، چنانچہ زمیندار ہی اس کے زمرۂ احباب میں شامل ہیں، جو فصلی رقومات کے حسابات کی کہانی کہانیاں سنا سنا کر اس کے

دل پرشوق کی بے چینی اور اضطراب کم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اس کے صلہ میں وہ
ان سادہ لوحوں کا سچا ہی خواہ اور امانت شعار منعم بن گیا ہے، جہاں ایسے صرف اتنا ساحق حاصل
ہے کہ گو "بلا جبر و اکراہ" تاہم "بلا رضامندی" مالکِ اصلی اگر رقمی نہیں تو کبھی کبھی اراضی غبن کر لیا
کرے، اگرچہ حساب "جو جو" درست ہوتا ہے لیکن بیچارہ مالک اراضی بدقسمتی سے سال دو سال
میں کچھ نہ کچھ زمین کھو بھی ضرور دیتا ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کے تقدیری معاملات میں یہ خیرخواہی
کیا، ہر شخص معذور ہے، اس کی علمی تحقیقات میں یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ پانی کی
طرح زمین بھی بخارات میں منتقل ہو سکتی ہے لہذا آفتاب کی شدت تمازت سے دس بیگھے اراضی
میں سے بیگھے یا نصف بیگھے زمین کا بخارات ارضی بن کر اڑ جانا اور اس لیے اراضی کا گھٹنا
امر محال نہیں ار ہا حساب بتو یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے چنانچہ اس کی واقعیت وہ
ہر ایک آسامی پر "سلیٹ" "پنسل" اور "ڈھوتے" "پونے" پہاڑوں کے ناگزیر "حربہ" سے
منوا تا رہتا ہے، یعنی جہاں کسی نے حسابی چوں چرا کی اور اس نے سلیٹ اٹھائی! حسابی
مگر جیب گرم کرنے والے، معاملات میں اس کا "انجان" (Subconscious)
ایسے ایسے کرتب پیش کراتا ہے، کہ بایدوشاید ہی کسی انسان محض سے ظہور میں آ سکتے ہیں
حالات کے لحاظ سے شبہ قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے، آیا سارے کے سارے بن مانس
کہیں حساب داں (حامد صاحب معاف فرمادیں!) تو نہیں ہوتے؟! مختصر یہ کہ اس کی حسابی
لرنت سننے سے زیادہ دیکھنے سے علاقہ رکھتے ہیں، الفاظ کتنے ہی موثر کیوں نہ جمع کر لیے
جائیں، میں مایوس ہوں کہ اس کے محیر العقل کرتبوں کا خاکہ نہیں کھینچ سکتا!

گاؤں یا اپنی سلطنت کی موجودہ پریشان فضا کے لحاظ سے یہ دائی موضع یا بہر وپیہ
مشیر قانونی (Legal Adviser) بھی بے گناہ ہے، ذرا کسی کو مالی، جانی،
ارضی، سماوی، رنج یا نقصان پہنچا، اور یہ اپنی "تربوزی" (Plus) جھکاؤ دار تو ندیہ کا تا
ہوا، ثالث بالغیر کی حیثیت سے وارد! عام اس سے کہ قانونی چارہ کار کی ضرورت ہو یا

ہو۔ اس نے تعزیری دفعات کی بے ہنگام تسبیح شروع کی، پھر وہ وہ خود ساختہ منطقی شوشگافیاں
کیجیے کہ ارسطو اور مل بھی کان پکڑیں، بریں ہمہ آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا، اس تمام جدوجہد اور بال
کی کھال کھینچنے سے اس خاکسار کے ذاتی مفاد نہیں، مفاد مالگذاری ہی پیش نظر رہتا ہے۔
جس کی آڑ میں اگر تھوڑا بہت کچھ اس کے حق میں چھڑ گیا، تو ظاہر ہے، اتنی عرق ریز کوشش کے
بعد سستا نہیں ہو سکتا۔ اصل بات یہ ہے یہ سب "جی حضوریت" کے ٹھاٹھ ہیں، حکام بالا دست کی
کی جوتیاں سیدھی کرنا آخر بے معنی تو نہیں! "جی حضور" بلکہ اس سے صرف یہی فائدہ حاصل نہیں ہوا،
بلکہ ایک حد تک یہ نذر بھی ہو گیا ہے، بلا لحاظ تلقین والقائے حکامی اب یہ آنکھ بند کرکے "پھوٹ
ڈال کر حکمرانی" (Divide et Impera) کے اصول پر بھی کاربند ہو گیا
ہے، چنانچہ گاؤں کی حالیہ ناچاقی اسی افسوں کا تباہ کن نتیجہ ہے، بنا بریں جس قدر مالی، دیوانی
فوجداری مقدمات درپیش ہو جاتے ہیں، اُن میں یہ بحیثیت جج خانگی سمجھوتہ کا بہانہ کرکے خوب
ہاتھ رنگتا ہے۔ بفرض محال ہی مقدمات اگر آگے بھی بڑھ گئے تو پھر صلاح و مشورہ دہی کہیں نہیں
گئی۔ قطع نظر اس کے یہ کسی نہ کسی فریق کی طرف سے گواہ بھی ضرور بن جاتا ہے، گو اس کی مشورہ
دہی، گواہی، نیز اس کا وجود میمون بیشتر اپنے ہی فریق کی مایوسی کا باعث ہوتا ہے تاہم اس کی
رائے صائب میں مقدمہ کی ناکامی جج صاحب کی لاعلمی، غیر قانون دانی اور کج فہمی پر مبنی
ہوتی ہے، یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے، کہ سماعت مقدمہ شروع ہونے سے پہلے یہ اپنے فریق کی
کامیابی کی دھن میں ہمہ تن فکر ہو جاتا ہے، جس سے یاں تن و توش غریب کی ہوائیاں اُڑنے
لگتی ہیں، تاڑنے والے اس حالت کو بجائے فکرمندی کے رعب عدالت کے ضیق النفس سے
تعبیر کرتے ہیں، غرض افکار کا یہ دورہ بھی اسے خالی از مطلب نہیں پڑتا، بلکہ ایک دم سے تیز جوع
شروع ہو جاتی ہے، پھر معدے کی صفائی، ہاضمیت، اُس کا غیر معمولی لوچ پن عدالتی کمپاؤنڈ
کے اندر کی کسی چیز کے چھوڑنے کا روادار نہیں ہوتا، جو چیز ہے، بلا درنگ اُتری چلی جائے
ممکن ہے بعض حضرات کا ذہن فی الوقت کمپاؤنڈ والی گھاس ہی کی جانب مائل ہو، لہذا

یہ صاف کر دینا مناسب ہے کہ شو مئی قسمت سے راقم اس قسم کے مشاہدہ سے اب تک محروم ہے۔ حاصل یہ کہ اس عجیب آدمی کی یہ سنر مانہ "جوع البقر" جب اس کے معدے کی تھیلی بھرنے پر تل جاتی ہے، تو بدبخت دہقانی رعایا رکی رپوں کی نہیں، پیسوں کی تھیلی خالی کر کے ہی مطمئن ہوتی ہے، ! اجلاس کے کمرہ میں بیٹھ کر اس کی غیر جانب داری و بیگانہ وشی ہائی کورٹ کے جج کے لیے بھی لائق رشک ہو جاتی ہے، بعض اوقات تو یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ بیچارہ اپنا آپا تک بھول گیا! رجسٹرات کا، جو بیشتر اعزازی اور دکھاوے کے ہوتے ہیں، ایک گٹھڑ ہمیشہ اس کے پیٹھ سے لگا رہتا ہے جسے بالفاظ مناسب یوں تصور کیجیے کہ بے گنتی رجسٹر کا تو دہ، لایعنی ایک طرف، توند کا "تربوزی" ابھار دوسری طرف، اچھے خاصے دو تو نیے نظر آتے ہیں! ان رجسٹرات کا پشتارہ بے تمیزی سے اگرچہ صرف اظہار کارگذاری مقصود ہوتا ہے، لیکن افسوس! حرجی سوالات کی لے دے کی گھیری میں یہی رجسٹرات اکثر اس کے حق میں موجب ننگ و تضحیک ہو جاتے ہیں، تاوقتیکہ مجبور نہ کیا جائے، یہ صرف اپنی یادہی پر کام چلاتا رہتا ہے نیز باور کرنے کی کوشش ہوئی ہے، کہ سارے اندراجات رجسٹر اس کی نوک زبان ہیں، تاکہ تغیر حالات اور تقاضائے وقت کے لحاظ سے یہ اپنے ارشادات کو مطلب کے سانچے میں ڈھالتا رہے، مگر افسوس ہے، وکلا کی بے پناہ نکتہ چینی بالآخر اس کا گلہ دبوچتی رہتی ہے، حتیٰ کہ یہی اندراجات اس کے حق میں "گنوار کا لٹھ" بن جاتے ہیں!

اس "پٹواری" کو کرامت میں بھی خاصہ دخل ہے، کیونکہ اس کا "نرکول" کا بیلا قلم جو صبح سے شام تک گھسیارے کی کھرپے کی طرح مصروف کار رہتا ہے، ایسی ایسی عجوبہ کاریاں دکھاتا ہے کہ اوسط درجہ کے "پہنچے ہوئے" شخص پر بھی مقام حسرت طاری ہو جائے یوں تو اور بہت سے امور کی داستان نویسی کی نسبت بھی یہ اس پٹواری کے دل کی سیاہی بیسوں صفحوں پر پھیلاتا رہتا یا کان کے پیچھے والی کمین گاہ میں تاک لگائے بیٹھا رہتا ہے، لیکن موقع ملا اور اس نے سالہا سال کی پٹہ داری کو اپنے محرک و مالک کی خباثت نفس کے سایہ سایہ ذرا سی جنبش سے شکلی

پٹہ داری میں منتقل کیا۔ جسے سنی اور معصوم شکل بنا کر مفید مطلب ثابت کر دینا اس کے محرک و مالک کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ نیز اسی "صاحب قلم" کی فریب کاری ایک حق دار قابض اراضی کو بآسانی بے دخل کر سکتی ہے اور یہ کسی ایسے شخص غیر کو قابض بلکہ مالک بھی بنا سکتی ہے، جس نے پٹواری ایسے امین محض کو، دیہی "گونذرا" دے دیا ہے، عدالت میں حق و ایمان کا خون کر کے اس اصول پر زور دیا کہ "قبضہ ملکیت کی تفاوت ہے" نیز اسی قبیل کی دوسری خوفناک شہادتیں مہیا کر دینے میں اسے ید طولیٰ حاصل ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ موثر اور کامیاب وہ اعجاز ہے، جس سے یہ پٹہ کی نوعیت تک بدل دیتا ہے، اور جس کی افراط تفریط، اس کی ادنیٰ گردش قلم پر موقوف ہے۔ اس قسم کی جعل سازی کا بدنصیب شکار مدتوں لاعلم رکھا جاتا ہے، بلکہ ساری رعایا، موضع میں سے یہی منتقل ہوتا ہے جس پر اس "حاکم موضع" کی شفقت آمیز توجہ (یہ میں نہیں بتا سکتا حقیقی یا مجازی؟) مبذول رہتی ہے، شاید اس لیے کہ روغن قاز پوری طرح کام کر رہا ہے۔ اور بعض اوقات تو یہاں تک ہوا کہ عدالت میں پہنچ کر بھی اس محسن، خیر خواہی کے عیارانہ ہونے کا پتہ چل سکا، جہاں اس کی "مرمت" بھی کی گئی، لیکن اس پر بھی اس بہی خواہ "خاکسار" کی سفاکی کے آگے یہ ساری باتیں حرف غلط سے زیادہ نہیں، بلا لحاظ اس کے کہ کوئی ناحق و ناروا ذبح ہوتا ہے، یہ اپنی مہلک قلم کے جابر و ظالم افعال کی اتنی تیز چھری پھیری دیتا ہے جو بدبخت شکاروں کا رشتہ حیات تو قطع نہیں کر سکتی، لیکن ایسی بے بسی کی حالت میں تڑپتا ہوا ضرور چھوڑ دیتی ہے، جس سے وہ اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے بھیک کے گوں رہ جاتے ہیں۔ اس کی اس ٹھنڈی مار اور خاموش سفاکی کے آگے تو یقیناً جرمنی کی سی تباہ کن توپیں بھی سرد ہیں۔

اس مجوبہ دہر کی فیلسوفانہ حیثیت بھی فراموش نہیں ہو سکتی، فلاسفی گو اس کی گھر کی گھڑی ہوئی چیز ہے تاہم اس میں کچھ کچھ اصول مذہب زینونیہ (Stoicism) کھلے ملے ہیں۔ چنانچہ یہ ہمیشہ مستقل مزاج، عامل اور اس حد تک پٹہ مار رہتا ہے، کہ بلا مزاحمت آپ اسے

چھٹا دیں! با ایں ہمہ اس کے بیشتر اصول کی نوعیت اس کی مجہول شخصیت کی طرح جہالت کے لفافہ "زار محض" میں سربمہر رہتی ہے، جس کا سمجھ لینا کم از کم ایک چھوٹے موٹے پٹواری بننے کے برابر ہے، عدالت میں بحیثیت گواہ اسے اکثر جانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، جیسے یہ سُولی چڑھنے سے بھی گیا گزرا خیال کرتا ہے، چنانچہ جرّحی سوالوں کے کرب کا خیال ہی نہیں! جمعدار عدالت کا نہایت مدمغانہ لاپروائی سے "بخشش" کے لیے سلام کرنا بھی اسے کھکیا دیتا ہے، تاہم اس کا استقلال، استقامت اور فلسفیانہ خاموشی ایسے نازک موقع پر بھی دُم (!) کے مانند اس کے دم کے ساتھ ساتھ رہتی ہے، بلکہ اصول کفایت شعاری بن جاتی ہے، جج کے ہول اور اس کی "بتانیوالی" لے دے سے یہ جتا کتا بچا چھڑا کر اپنی منفرد رنگوکاری اور مضروب خودشناسی کے بہانہ سے جس وقت "بخشش" کے شکنجے سے خود دارانہ رسیاں توڑا کر مشک نما توند کے ہچکولے سے پہلو بچا کر نکلتا ہے، تو اصل یہ ہے، وہ سین بھی لائق دید ہوتا ہے، اس میں جمع کیجیے عدالتی چپراسیوں کی بے پناہ "تبرا" تو بیچارہ یہ درجۂ "اسفل" کا عہدہ دار ہانپ ہانپ کر زندگی سے بھی مایوس ہو ہو جاتا ہے!

خرگوش کے کان، گدھے کی بیوقوفی، لنگور کی دُم جس طرح آفاقی طور سے ممتاز چیزیں ہیں، اس پٹواری کے مکمل تصور کے لیے "ناریل" بھی ایک ناقابل فراموش شے ہے، نفسیات کا یہ اصول بھی فی الواقع، کتنا سچّا اور مناسب ہے کہ اولاد اپنے آبا و اجداد سے بیشتر افعالِ بطور عمل متوارث ورثہ میں پاتی ہے، بندر اور ناریل کا معاملہ اگر ضرب المثل ہے، تو بہ تقاضائے پوزیشن اس پٹواری نے بھی حقّہ بنا کر ناریل کے نچانے کی بالآخر سبیل نکال ہی لی، یعنی "نرکول" کے قلم سے اُتر کر دوسری چیز "ناریل" ہے، جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز و قریب ہے، اُٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے، سوتے، جاگتے، اگر شغل میں بھی نہ ہو، تو اس کے گلے سے لگا رہنا ایک ناگزیر امر ہے، میرا خیال ہے، اس پٹواری کے تصور سے اگر آپ "قلم" اور "ناریل" منہا کر دیں، تو یہ ایک بلا راج ڈنڈا

(Sentence) کا والی موضع اور بلا بیتار کا سپاہی ہی رہ جائے گا! "ناریل" سے
اسے محبت ضرور ہے، لیکن "ہوم ڈیپارٹمنٹ" کے دوسرے اخراجات کی طرح، اس کا
ضروری خرچ بھی "پٹواری" کی تھیلی کا منہ نہیں کھول سکتا بلکہ گاؤں کی وفادار رعایا ہی
کے لیے یہ بھی وبالِ جان ہے۔ گاؤں کے کسی درخت کے نیچے ٹوٹی ہوئی چارپائی پر فٹ
بھر کا نرکولی قلم کان میں لگا ہوا، ٹاٹ شریف گھٹی ہوئی، رجسٹرات کا پشتارہ بے معنی
پیش نظر۔ مداکا نہ کسمساہٹ سے اس کا دم بدم "ناریل" پر ملنا، نیز اس کے دل کی سیاہی
کو کاغذ پر پھیلانے والے قلم کا اپنے "منشیٔ بے بدل" کے ایما سے "اعمال نامہ کا سیاہ کرنا"
دراصل ایسے دلکش امور ہیں، جس سے غریب کاشتکار متاثر ہو کر "ناریل" کے اخراجات
کی بابجائی کیا معنی، اس ہی خواہ "خاکسار" کی گردن مارنے کی حد تک فرمانبردار رہتے ہیں!
یہ کالا بھی ہے، اور اس حد تک کہ اس کا "سیاہ تاب" لاعلاج ہو جانے کی وجہ سے
قطعی ناامیدی پیدا کرتا ہے، ممکن ہے اس جگہ یہ خیال پیدا ہو کہ فطرت کی ناقابلِ انکار صنعتی
خوبی جس شد و مد سے لائقِ ادب ہے، اس لحاظ سے تو اس کا وجود باوجود چلتی گاڑی میں
روڑے سے بھی گیا گزرا ہے، لیکن صناعِ ازل کی یہاں کمالِ حکمت دیکھیے کوئی کل سیدھی
نہ تھی بازہم بندر سے آدمی تک کے بے گنتی مدارج اسے طے کرا ہی دیے! انسان کے اس
موئی اضافہ کو جسے اخلاقاً "ڈاڑھی" کے نامِ گرامی سے نامزد کیا جاتا ہے، یہ کوئی ترجیح نہیں
دیتا، بجائے اس کے یہ خالی مونچھوں پر ہے، اسے بیشتر سوءِ ہضم کی شکایت بھی رہتی ہے۔
جس کی وجہ سے صرف چار پانچ مرتبہ وہ بھی برائے نام "پٹوارن" کے مجبور اور خوشامد کرنے
سے سیر سوا سیر کا نقل کر لیا کرتا ہے، بشرطیکہ اپنی تھیلی کا منہ سکڑا رہے،
یہ دم اپنی توند کے ! چل بھی خاصا لیتا ہے، لیکن دو چار قدم چل کر توند کو سمیٹ لینا بھی
لابدی فعل ہے، مبادا جھٹکے کھا کھا کر نیچے آ رہے، وہ ایک شہ سوار "اُڑ قدم" کا موجد بھی ہے،
جسے عرفاً "شہ گام" مگر مجازاً "پٹواری چال" کہنا نہایت موزوں ہے، لباس سے اس

بالطبع کراہیت آتی ہے، چنانچہ یہ صرف دھوتی ہی میں رہتا ہے، تاہم از قسم پارچہ صرف ایک
دھوتی ہی اس کی ساری پوشش کی کائنات نہیں! ایک آدھ اچکن بھی ہے، جسے کورٹ
سدھارتے وقت یا کسی حاکم بالادست کی جناب میں "جی حضوریت" کی داد لینے جاتے ہوئے
مجبوراً تن زیب کرلیتا ہے، جس کی بچکانہ بھڑک پر یا تو یہ واقعتہً یا مصلحتاً، صرف غیر ثقہ ظاہر کر کے
سلامت مذاق کی داد کی خاطر، ناک بھوں چڑھاتا رہتا ہے، میرے پٹواری احباب میں سے
ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ اس کا پیجامہ سو ایک خاص اصول صحت پر مبنی ہے!
نیز موجودہ زمانہ کی ہنرمندی اور نفاست پسندی کی مشیخت پر اسے ہمیشہ ہنسی آتی ہے کہ ایک
بکار سی دقیانوسی چیز یعنی دھوتی کا تصور آخر کیا معنی رکھتا ہے، حالانکہ بندر مارکہ Monkey
Brand کی سی پوشاک کے موجود ہوتے، دھوبی یا دھولائی کی ضرورت کا احساس
ہے، در حقیقت عین بدسلیقگی اور بدتہذیبی کی دلیل ہے!

قدرت نے گو ہنسی کے سکون و تفریح سے بھی اس مرد آدمی کو حرمان نصیب نہیں
رکھا ہے، لیکن اس کی عقلمندی ہنسی سے زیادہ بسورنے کو فرحت آور جانتی ہے، بعض نفیسین
کا خیال ہے "انسان اس لیے ہنستا ہے کہ غصہ آتا ہے" گویا غصہ کے تاؤ پیچ کے ازالہ کی ظاہری
صورت ہنسی ہے، اس فیلسوف کا یہ دعویٰ ہے کہ غصہ کا تاؤ پیچ بجائے ہنسی کے بسورنے کی
صورت میں نسبتاً زیادہ ممکن طریقہ سے زائل کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے اس کی ہنسی بھی
مثل دوسری خصوصیات کے بسورتی ہوئی ہوتی ہے، یہ بجائے دائمی بسورنے کے
برائے نام ہنس بھی لیتا ہے، جسے عام فہم الفاظ میں زہر خند یا مداری کی ڈفلی کی "بھڑک دھن" کا
کے سے تشبیہی الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے، جس سے خواہ مخواہ ذہن اس طرف مائل ہوتا
ہے کہ سچ مچ "پٹواری" نے کوئی بڑا بھاری "کرتب" دکھایا ہے کہ گنتی کے لوگ بھی اسے ہنستا
ہوا دیکھ سکے۔ لیکن جو دیکھنے کے گنہگار ہیں، اپنا سارا دھن دولت لٹا کر دوبارہ اس کا
"تبسم زیر لبی" دیکھنے کی تمنا میں مٹے ہوئے ہیں، میرا خیال ہے، یہ ہرگز اتنی بے توقیری

روا نہیں رکھ سکتا کہ ہنس کر اپنی تفریح نفسانی (Mentel hilarity) دکھائیگا! ہنسنا اگر کام کی چیز ہے تو اس کمی کو یہ اپنی گڑگڑی (Gurgling pipe) کے ایک اضافی "کشش" یا بطور خاص مونچھوں پہ تاؤ دیکر دوسروں کے ہنسا دینے سے پورا کر دیتا ہے، برخلاف اس کے رونے کے ناگزیر اور دلچسپ آرٹ میں اسے کامل دسترس حاصل ہے، اپنے بزرگوار کی وفات حسرت آیات پر جس فن دانہ حیثیت سے یہ رویا ہے، میں اسے "بے آنسو کی آہ و بکا" کہونگا! ایک دوسرے موقع پر بھی اس کے کامل ہونے کا ثبوت ملا، جو خانگی ہونے کی وجہ سے ظاہر نہ کیا جاتا، لیکن چونکہ اس کے کمالِ فن پر روشنی پڑتی ہے لہذا مجبوراً بیان کیے دیتا ہوں "پٹوارن" کی دست درازی نے ایک مرتبہ اس کی ہنرمندی کی پوتی کھولی تھی، جس کی وجہ سے اس نے "ہچکی" اور "دشنام آمیز" طرز میں رو کر دکھایا تھا، سنا ہے بعد میں اس نے یہ بھی سمجھایا کہ یہ رونے کی وہ قسم ہے جو صرف حنیف نازک کی جوتیوں کی بدولت میسر آسکتی ہے! کورٹ یا کسی افسر بالا دست کے روبرو اثنائے تنقیح میں جب اس کی غلطی یا فریب کی گرفت ہو جاتی ہے، تو یہ نرالے انداز سے روتا ہے، جیسے آنسو اور سسکیوں کا "گریڈ خوشانہ" کیئے جس سے سنگدل سے سنگدل انسان بھی "رشتہ خلقی" ہو جاے۔ مختلف امور کی رشتہ دوانیوں کی وجہ سے بقول ہزلٹ یہ ہمیشہ "جامہ سے باہر" ملے گا، تاہم اسے اتنا ہوش ضرور رہتا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے سربازار آپ اسے "عریاں" نہ پائیں گے!

القصہ یہ کہ یہ "پٹواری" نیچر کا صلبی فرزند ہے، جس میں خود حفاظتی کی اصلی جبلت کو اس نزاکت اور اجاگر طور پر ترقی ہوئی ہے کہ اس کی دوسری عادات بھی یک لخت اس کے اعراب میں دب گئیں، اس کا سب سے مقدم اور مرغوب فکر یہ ہے کہ تھوڑے سے تھوڑا دیکر زیادہ سے زیادہ کہاں سے ہتھے چڑھ سکتا ہے، اس مقصد کا حصول ہی گویا اس کی ساری دین و دنیا ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ خیال جو اس کے دماغ میں جگہ پا سکتا ہے یہ ہے کہ کہیں سے اور کسی طرح مبلغ ہاتھ لگتے رہیں، جنہیں جوڑتا جوڑتا یہ جان بحق تسلیم ہو جائے، اس کی حیات مستعار کا مطالعہ کئے گزر گی

چال" کا انتہائی تخیل ہی، چنانچہ وہ اپنے "تنا تنی" کے چشم بد دور ابڑھتی پود والے سارے کنبہ کو مبلغ آٹھ روپیہ میں ٹرخا دیتا ہے، اس معقول رقم میں صاحبزادگان بلند اقبال ہائی اسکولز میں تحصیلداری کے سانچہ میں ڈھلتے جاتے ہیں، اور دختران نیک فال کے خاکسارانہ جہیز بھی تیار ہوتے ہیں، تعجب نہیں کہ ان سب باتوں کے ہوجانے پر بھی یہ بابرکت مبلغ آٹھ روپیہ اس کی جیب میں ہی رہجاتے ہوں کیونکہ رشوت سے تو اسے قانوناً نفرت ہی ہے، مگر اسے چھوٹے موٹے کام بھی کیا رشوت کی تعریف میں داخل ہوجائیں گے؟!

عہدہ داران سرکاری کے آگے تو یہ بیچارہ بالکل موم کی ناک، جی حضوریہ، مسکین کم سخن، کاٹ کا اُلّو، تو یہ اجنبی بلکہ سنیاسی اور خدا جانے کیا کیا بن جاتا ہے، جہاں اس کی غیر معمولی فصاحت و بلاغت پر ہی پالا نہیں پڑجاتا بلکہ وہ ساری زبان آوری بھی خاک میں مل جاتی ہی، جو اوروں کے گلا دبوچنے کے لیے ایک درجۂ امتیاز ہے عین تنقیح تو یہ ابھرا ہوا امرود اپنے "بے مثل" نیک کرداروں اور صحت حساب کی خیر مناتا ہوا، صرف لمبے لمبے سانسوں کے ذریعہ ہوا خارج کرنے کے کام کا رہجاتا ہی!

اس عجیب الخلقت کی "بھاکھا" بھی اُردو فارسی کی معجون مرکب ہے، نام خدا، "عمر عزیز" کے چیل سال ہی گذرے ہیں، مگر حیرت ہے، اُردو فارسی کے محاورات اور منقولات کا ایک دفتر بے پایاں یہ کیسے نگل گیا، گلستاں تو اس کے نوک زبان ہے، ذرا تحریک ہوئی ۔ اور اس نے اشعار کا طوفان بے تمیزی اُگلنا شروع کیا، اُردو کی تیسری جماعت تک کی پڑھائی دیکھیے اور ذہن کی اس غیر معمولی چالاکی پر غور کیجیے، عقل کام نہیں کرتی! اسے ادق امتحان کی کامیابی کی مہم سر کرنے پر اسے جس قدر ناز ہو، کم ہے، اس کا "سر اقدس" گو چھوٹا سا ہے، مگر اوندھے، سیدھے روکھے پھیکے، بے معنی و مطلب اشعار کا مخزن ہے جہاں سے یہ ستعداد آ قیمتی قیمتی مگر مفلوج اشعار کے ذریعہ سے اپنے ایک وسواسی عہدہ دار کی دلجبی کرتا یا ایک نگرے اور ضدی کاشتکار کو تھکا لیتا ہے۔

زبانی اہانت تو کیا۔ اسے جُتیا بھی دیا جائے تو بجائے اس کے کہ اس کی عیارانہ طینت کسی ظاہری قوت کو کام میں لائے، بمصلحتِ "مقاومت مجہول" (Passive resistance) اختیار کرتی ہے، صرف اس لیے کہ باوصفِ عام اور جاذب مستثنیات کے بھی یہ "تغیرات" کی ساری دفعات میں اپنی ہی گرفتاری اور گردن زدنی کے اسباب پاتا ہے۔ اس کو "حملہ" تو درکنار کسی "ضرر خفیف" کا مرتکب دیکھ کر ہی مجھے اس سے کہیں زیادہ تعجب ہوگا۔ جتنا کسی ریشٹ مل پادری کی علانیہ خطاکاری، یا ایک مقطع مگر چوندھی بصیرت والے مولوی صاحب کے ایسا فتوے صادر نہ کرنے پر ہوتا کہ "سارے گڈ بڈ کرنے والے "کوٹ پتلون"، مسلمان خارج الجنت ہیں! انہیں حوریں مل چکیں"!! بہرکیف یہ، اتنی ساری خوبیوں کے بعد پٹواری کا ہے کو؟ ایوانِ ریاست کی اڑواڑ، سلطنت کی کنجی، حکومت کی پشت وپناہ۔ اور قصرِ شہنشاہیت کا سنگِ بنیاد ہوا! عمرش دراز باد!!

سید وزیر حسن

غزل

حُسن در جنگ زرگری است بعشق — عشق را گو کہ واکند آغوش

گفتہ بودم فسانہ از مستی — تو شنیدی چرا ز عالم ہوش

بادہ پیش آر تا کنم آغاز — داستان ہائے عشق آفت کوش

بے خبر رو کہ ہوش در مستی است — ہوشیار آنکہ بیخودی است بہوش

اصغرا یک نظر بسوئے جگر
آنکہ یک خادم است و حلقہ بگوش

حضرت علی سکندر جگر مرادآبادی

تو کہاں ہے

(از نتیجہ فکر شہزادہ احمد سعید حیرت لدھیانوی)

نور پاشی کر رہی ہے چاندنی مہتاب کی — اور سکوتِ شب سے سارا آسماں معمور ہے
ہو گیا فرشِ زمیں گویا سمندر نور کا — جس کی ہر اک موج مضطر غیرتِ صد طور ہے

شیوۂ صبر و سکون سے پھر بھی میں بیگانہ ہوں
تو کہاں ہے جلد آ تیرے لیے دیوانہ ہوں

کرتی ہے باد سحر پھولوں سے جب اٹکھیلیاں — بام گردوں سے جھلک اٹھتے ہیں جب آثارِ صبح
ننھے ننھے طائروں کی پیاری پیاری بولیاں — ہوتی ہیں سرمایہ دار گرمیٔ بازارِ صبح

ڈھونڈتی ہیں میری آنکھیں تجھ کو اے زہرہ جبیں
میرے دل کو کر رہی ہے تیری یاد اندوہگیں

جب سکوتِ شام میں ملتی ہیں باہم پیار سے — سطحِ دریا پہ وہ اُس کی موجہائے نازنیں
صاف اور شفاف پانی پر مقدس آفتاب — ڈالتا ہے بامِ گردوں سے شعاعِ واپسیں

تجھ کو چھونے کے لیے ہاتھوں کو ہے اک جستجو
تیرے دامن تک پہونچنے کی انہیں ہے آرزو

وہ چٹکنا باغ میں غنچوں کا ہنگامِ سحر — شاخِ گل پہ وہ عنادل کی ترنم ریزیاں
حیرت افزا سبزۂ نوخیز کا نظارہ جب — فرشِ بستاں پہ کرے پیدا تحیر ریزیاں

تو کہاں ہے راحتِ دل مایۂ صبر و سکون
آ دکھاؤں تجھ کو اپنے داغہائے لالہ گوں

اے میرے مہرِ درخشاں اے ضیا پاشِ حیات — تجھ سے ہی روشن ہے میرا خاکدانِ زندگی
اے میرے درمانِ دردِ دل سکونِ اضطراب — اے میرے عیسیٰ نفس روح و روانِ زندگی

دے تسلی کچھ تو عاشق کے دلِ بیمار کو
شوق کی آنکھیں ترستی ہیں تیرے دیدار کو

مرسلہ
ایم یعقوب علیگ

طاعت اور خودرائی

ایک قصّہ

(ا)

ممیز اور احسن جس وقت کہ عالم معنی کے روحانی کالج میں قدرتی تعلیم کے زیر اثر تھے۔ ہوا و ہوس سے دور تھے۔ ریاکاری و مکاری پاس نہ تھی ظلم و تعدی کے نام سے ننگ تھا۔ نام و نمود کی پرواہ نہ تھی۔ علائق سے پاک۔ تعلقات سے سبک دوش۔ فکر سے بری۔ اوہام پرستی سے کنارے رہکر عیش و راحت سے بسر کرتے تھے۔ رات کی خبر نہ تھی۔ دن کا خیال نہ تھا۔ یہ جانتے ہی نہ تھے کہ آفتاب اب کب نکلتا ہے اور کب غروب ہوتا ہے۔ دنیا کس کا نام ہے۔ وہاں کیا ہوتا ہے۔ نفس پرستی کیا شے ہے۔ بدعت کسے کہتے ہیں۔ محسن کشی کے نتائج کیا ہیں۔ طامع کی سزا ہوتی ہے یا نہیں۔ حریص پکڑے جاتے ہیں یا نہیں۔ یہ کیوں صرف اس وجہ سے۔ اس نہج سے کہ اُن کو عالم معنی میں عالم آب و گل کی خبر کہاں۔ مگر جب ایزدی کو ان کے زہد و اتقا۔ طاعت و اباکا امتحان منظور ہوا۔ رُخ پلٹا۔ ہوا بدلی صلب پدر در رحم مادر کی طرف منتقل ہوئے۔ عالم معنی کو الفراق کہا۔ شکم مادر کی نو ماہ کی سختیوں کو جھیل کر عالم آب و گل میں تشریف لائے۔

باپ کا دل ماں کا کلیجہ قوی ہوا ارمان نے لہریں لیں۔ گاؤں اور قصبہ میں دھوم ہو گئی جوق جوق لوگ مبارک باد کو آتے اور خاطر و مدارات سے سیر ہو کر چلے جاتے۔ راہ میں اکثر باتیں ہوتیں اور اس قسم کے تذکرات آتے کہ ذاکر حسین کی قسمت تو دیکھو کیا طرحدار لڑکا پایا ہے خدا پرواں چڑھائے۔ بعد مدت کے گل امید کھلا ہے اس کو تیر پر دوب کا جمنا کہتے ہیں۔ سچ ہے خدا کسی کو ناامید نہیں کرتا اسی لیے تو اُس نے لا تقنطوا من رحمۃ اللہ

فرمایا ہے مگر اتفاق تو دیکھو رشید خاں کے گھر بھی آج ہی سعادت ہونے والی تھی۔ قصبہ پُرفضا میں آج کیسی فضا ہی کہ ہمارے دونوں دوستوں کے گھر دولتِ خدا کی جلوہ گاہ ہیں۔

ناظرین! اس قصبہ کا پُرفضا نام کسی اہل علم کا دیا ہوا ہے اور واقعات ماضیہ اس بات کے شاہد بھی ہیں کہ جس وقت کا یہ نام ہے۔ یہ اہل علم کا مسکن تھا۔ صوفیہ کرام کی آبادی تھی یہاں علم کے چرچے۔ مکاشفات کی بہار تھی۔ دل سکے غنی۔ دولت کے دھنی آباد تھے۔ چوری چوری سے ساہو ہیرا پھیری سے ڈرتے تھے۔ زبان ایک تھی بات کا لحاظ تھا۔ دُروغ گوئی کی خو نہ تھی۔ وعدہ دوعیدکی پابندیاں تعزیرات ہند کی دفعاوں سے بھی زیادہ سخت تھیں لوگ خوفِ الٰہی سے ڈرتے تھے کسی کا آزار کسی کو پسند نہ آتا تھا مگر ادھر کچھ عرصہ سے ہوائے متلاطم کے جھونکوں نے عدم تعاون کی سی کیفیت پیدا کردی تھی جس سے نہ وہ رنگ تھا نہ وہ بات مگر پھر بھی ہمدردی دیرینہ کے اثرات موجود تھے جو شادی وغم کے موقعوں پر اپنے پرانے رسم و رواج کی جھلک پیدا کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اب رفتار زمانہ کے موافق یہاں بھی انگریزی تعلیم کا چرچا تھا آنے والی نسلیں کالجوں میں بھیجی جاتی تھیں جن کی وجہ سے وہ پرانی درسگاہیں جو علم الٰہی اور مکاشفات کا سرچشمہ تھیں۔ علم منطق و فلسفہ کے شوق اور ان کی موشگافیوں کی وجہ سے ویران و سنسان پڑی تھیں اب ناموں کے سامنے۔ بی۔ اے و ایم۔ اے کے حروف کی چاٹ تھی چنانچہ اس بنا پر یہاں بھی چند اصحاب تعلیم حال کے مایۂ ناز تھے اور مغربی تعلیم و تہذیب کے والا و شیدا ہوکر دن دونی ترقی کے مصداق بن رہے تھے۔

(۲)

رشید و ذاکر کے خیالات بھی بچوں کی تعلیم کے متعلق اسی طرف گئے اور دونوں انگریزی تعلیم کے راستہ پر آ گئے فرق صرف اس قدر ہوا کہ رشید نے ضمیر کا داخلہ براہِ راست ضلع ہائے اسکول کی انگریزی کلاس میں کرایا اور ذاکر نے احسن کو کسی قدر مذہبی اور دیسی تعلیم کے بعد داخل کیا۔ جس سے اس کے خیال میں اقوال نادرہ کی عظمت۔ احکام مذہبی کی وقعت اور

آزادانہ زندگی بسر کرنے کی معذت ہی داخل ہوگئی تھی۔
یہ اتفاق کی بات تھی کہ ضمیر اور احسن دونوں مختلف مقامات سے اپنی ہائی اسکولوں کی تعلیم کو درجہ اختتام تک پہنچا کر دیر یا جلد میں پہنچے مگر ایک ہی ڈکالج کی الیف۔ اے کلاس میں پہنچے اس سے پہلے کسی بڑی تعطیل میں اکثر قصبہ کے اندر دونوں کی چلتی ملاقاتیں ہو جاتیں اور سلام و علیک السلام ہو کر رہ جاتا۔ موانست خاص نہ ہوتی اور نہ تعلیم و تدریس کے چرچے ہوتے جس کا سبب بجز اس کے شاید کوئی اور نہ تھا کہ احسن انگریزی تعلیم کی طرف بمقابلہ ضمیر کے دیر میں گیا تھا۔ مگر اپنی رسائی ذہن کی وجہ سے ضمیر کا ہم سبق بن گیا تھا اور ہمیشہ امتیازی امتحانات کے موقع پر مثل اسکالرشپ وغیرہ کے اس کا نمبر صوبہ میں اگر پہلا نہیں تو دوسرا ضرور رہوتا تھا۔ بدیں وجہ ضمیر کو اس سے آزادانہ ملنے اور گفتگو کرنے میں ندامت ہوتی تھی۔ اور یہ خلش رہا کرتی تھی کہ کہیں اور ہم جنس اسے علمی مذاق کا ذریعہ نہ بنالیں۔
کبھی کبھی باپ تعطیلوں میں اکثر ضمیر سے اس بات کا تذکرہ عالم تنہائی میں اس وقت کیا کرتا جبکہ تمام دنیا سوتی اور ضمیر اپنی کتابوں کو لیکر اُن سے ہم خیال ہوتا اور باپ کی شفقت پدری اس کی نگہبان بنتی۔

باپ ۔ضمیر سے، کیوں بیٹا؟ کیا بات ہے کہ تم احسن سے بہت پہلے پڑھنے گئے مگر اب تک کا تمہارا اور اُن کا نتیجہ ایک ہی رہا؟

بیٹا ۔ ہمارا دو سال کا وقت فیل ہونے کی وجہ سے ضائع ہو گیا۔

باپ ۔ تو اب وہ اور تم تو برابر ہو گئے نہ؟

بیٹا ۔ جی ہاں

باپ ۔ اب اُن کی کلاس میں کیا حالت ہے؟

بیٹا ۔ وہ اچھے ہیں۔ مجھ سے کیا بلکہ تمام کلاس سے اُن کا ذہن اچھا ہے۔

باپ ۔ تم سے اور احسن سے تو خوب بنتی ہوگی؟

بیٹا - ابتک تو میرا اُن سے خاص طریقہ سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا -
باپ - کیوں ؟ کیا ہمسائیگی کے یہی معنی ہیں ؟
بیٹا - نہیں - اب تک طبیعت اس طرف نہیں آئی -
باپ - افسوس ! تم کو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے - میں اُن کے بزرگوں کا احسان مند ہوں - ہمیشہ تمہارے اور ان کے خاندان سے دوستانہ مراسم رہے ہیں - اگر ایک ہی کالج اور ایک ہی کلاس میں ہوتے پر تمہاری یہ کیفیت ہوگی تو لوگ انگشت نمائی کریں گے اور یہ تو بتاؤ کہ میرے لیے یہ کیسی دل شکن بات ہوگی - تم کو ان سے دوستانہ مراسم رکھ کر خاندانی اخلاق کا ثبوت دینا چاہیے - ضمیر عرصہ تک تو ان باتوں کو غور سے سنا کیا مگر تھوڑی دیر کے بعد نہ معلوم کیا سمجھ کر بولا -
ضمیر - بہت اچھا - اب میں آپ کے حکم کی تعمیل آیندہ سے کرونگا پہلے مجھے کچھ ندامت سی معلوم ہوتی تھی -
باپ - بیٹا ! ندامت کی کونسی بات ہے - علم کے گاہک سبھی ہوتے ہیں مگر ذہن سب کا برابر نہیں ہوتا - یہ قدرتی دین ہے ایسی صورت میں ہمارا فرض صرف اسی قدر ہے کہ ان سے سبق لیں سیکھیں - دیانتداری اور مروت کو اپنا دستور العمل بنا کر - اجر نیک حاصل کریں - اس کا اجر ہر زمانہ میں ملا کرتا ہے - میں تم سے اس وقت بہت خوش ہونگا جب تم صبر و قناعت کے ساتھ اپنے اس خیال سے باز آؤ گے اور ندامت کا پہلو چھوڑ دو گے -
بیٹا - بہت خوب -

(۳)

باپ کی نصیحت بیٹے کی سمجھ پر غالب آئی - کالج کے تین سال نہایت محبت و ارتباط کے ساتھ دونوں میں گذر گئے - عام ہم مکتبوں نے جان لیا کہ واقعی جیسا یہ دونوں ایک ہی قصبہ کے رہنے والے ہیں ویسی ہی ان کا پُر بہار ارتباط ہے - اب تو دونوں میں کبھی کبھی ایسی

گاڑھی چھنتی کہ ایک جان دو قالب معلوم ہوتے۔ بغیر دیکھے کسی کو ایک منٹ بھی چین نہ آتا۔ گو ضمیر کی طبیعت آزاد و رفتار متضاد احسن کے لیے کبھی کبھی باعث تکلیف ہوتی مگر اس کی علمی قابلیت ذاتی لیاقت۔ خاندانی وجاہت اس کی پرواہ نہ کرتی اور اس عادت کو ضمیر کے پوج دل سے اس طرح مٹا دینے کی کوشش کرتی کہ کبھی ضمیر اس طرف نہ جائے۔ مگر پھر بھی بعض وقت اس کا وہ خیالی طرز۔ کلام سے ضرور جھلک جاتا۔ احسن کبھی کبھی جب عالم تنہائی میں ہوتا تو سوچتا کہ ضمیر کی یہ ضد و آزادی اچھی نہیں ہے ایک نہ ایک دن یہ اسے ضرور نیچا دکھائے گی ابھی میں نے اس روز کلاس میں سبق ہونے کے بعد طمع راست۔ حرف است ہر سہ تہی کے مسئلہ کو نئی و پرانی روش کے بموجب بخوبی سمجھا کر یہ بتلا دیا کہ یہ عقلاؤں کا قانون ہے۔ اس کی تہ تجربات ہیں۔ یہ صرف دقیانوسی خیالات نہیں ہیں۔ نئی روشنی کے لوگ بھی اس کے قائل اور مفتون ہیں مگر اس کے نزدیک مرغ کی ایک ہی ٹانگ ہے نہ معلوم اس نے تعلیم کا مطلب کیا سوچ رکھا ہے۔

اس کی شادی کے ایام قریب ہوتے جاتے ہیں اور یہ جانے کے لیے رضامند نہیں ہوتا۔ میں نہیں سمجھا کہ اس سفید رو لیڈی نے اسے کونسا سبق پڑھا رکھا ہے جو یہ اس کی گندم نما جو فروشی کی طمع میں گرفتار ہے اور بار بار مجھ سے بھی کہتا ہے کہ اس کا ہم معنی لفظ لالچ تو دیکھو تین نقطے رکھتا ہے۔ کہ اسی اثنا میں ڈاک آئی۔ احسن نے ڈاک دیکھی تو اپنے والد بزرگوار کا ایک خط اس مضمون کا پایا۔

"بیٹا ضمیر احمد خاں کی شادی کا نوید تقسیم ہو گیا صرف آٹھ روز باقی ہیں باپ انکا سخت پریشان ہے تم خود انہیں لیکر جلد چلے آؤ۔ ان کے پاس بھی خط گیا ہے۔

ذاکر حسین از قصبہ پر قضا

دیکھتے ہی گھبرا گیا۔ اور میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی

"حضور! کیا حکم ہے

"مسٹر ضمیر احمد خاں کو نمبر ۔ کے کمرہ میں ہمارا اسلام کہو اور جلد بلا لاؤ؟

"بہت اچھا"

آدمی فوراً گیا اور ضمیر کو ساتھ لیکر واپس آیا

ضمیر۔ السلام علیکم

احسن۔ علیکم السلام، "کہو مکان سے کوئی خط تو نہیں آیا"

ضمیر۔ (مسکرا کر) نہیں۔

احسن۔ جھوٹ اور بالکل جھوٹ" یہ دیکھو۔

ضمیر۔ خط دیکھ کر (اپنا خط نکال کر میز پر رکھدیتا ہے)

احسن۔ تمہارے والد صاحب کا خط ہے۔

ضمیر۔ جی ہاں۔

احسن۔ کیا لکھا ہے؟

ضمیر۔ دیکھ لیجیے۔

احسن۔ پڑھتا ہے "بیٹا ضمیر احمد یہ ضد تمہاری اچھی نہیں ہے۔ مجھے برادری میں رسوا کرنا تمہارا فرض نہیں۔ میرا کہنا ماننا چاہیے۔ دولت اور حسن کی طمع اچھی نہیں ہوتی۔ آنا در آئے رکھنا بہتر نہیں .... رشید احمد خاں از قصبہ پرفضا

احسن۔ کیوں یار یہ کیا معمّا ہے؟

ضمیر۔ دوستِ من نہ کوئی معمّا ہے نہ پہیلیاں خاندان کی ایک غریب لڑکی کے ساتھ میں "مارتھی" ایسی حسین و دولتمند کے ہوتے ہوتے کیسے شادی کر سکتا ہوں جب کہ اس کے نام امریکہ بنک میں ساڑھے تین لاکھ نقد جمع ہیں، اور سیکڑوں روپیہ روزانہ کی مستقل آمدنی ہے۔

احسن۔ "مارتھی" کون کیپٹن ڈی کی بیوہ؟

ضمیر۔ جی ہاں۔ بیوہ ہے کیا ہوتا ہے حسین اور دولتمند تو ہے؟
احسن۔ تو آپ کو دولت حسن کی طمع اُدھر لے جاتی ہے؟
ضمیر۔ بیشک۔ دولت ہی سے تو دنیا کا تمام کارخانہ قائم ہے۔ مفلس کو کون پوچھتا ہے۔
وہ تو ماہی بے آب۔ درخت بے برگ۔ ابر بے باراں ہے۔
احسن۔ اچھا تو اس خط کا جواب کیا ہے۔
ضمیر۔ صغرا در بالکل صفر ہے۔ میں ہرگز نہیں کرنے کا۔
احسن۔ تو میں بھی صاف صاف لکھ دوں؟
ضمیر۔ ضرور۔
احسن۔ دیکھو سنبھل کر جواب دینا۔ دوست! طمع اچھی چیز نہیں ہے اس نے بہتوں کو
کوئیں جھکائے ہیں۔ اس کے تینوں حرف خالی ہیں۔
ضمیر۔ (مسکراکر) لالچ کا پیٹ بھرا ہے۔
غرض احسن نے دونوں خطوں کے جواب میں مفصل واقعات لکھ کر ڈاک میں ڈالدیے
ضمیر نے مارتھی کے ساتھ شادی کرلی۔
رشید خاں نے برادری کی منت وسماجت کر کے اپنے چھوٹے لڑکے نصیر خاں کی شادی
جس نے کہ ابھی ایس۔ ایل۔ سی۔ پاس کیا تھا وہاں کردی۔

(۴)

دونوں شادیوں کو ۹ ماہ کا عرصہ گذر گیا۔ "مارتھی" اس درمیان میں کسی ضرورت خاص
سے منصوری پہاڑ پر چلی گئی ضمیر اور احسن دونوں امتحان ہال میں امتحانی پرچوں کے جواب
دینے میں مصروف ہیں۔ ریاضی کا دوسرا پرچہ ہے۔ سوالات بھی حسب اتفاق کسی قدر مشکل ہیں
ذہین اور اچھے لڑکے اس کا اندازہ کرتے ہیں۔ ٹوپیاں میز پر رکھی ہیں۔ ضمیر بھی جو قدرتاً ریاضی
کی طرف سے کزور تھا بحر تفکر میں غوطہ زن ہے کہ یکایک تار کا چپڑاسی آیا اور اس نے پوچھا

ضمیر احمد خاں کون ہے۔ یہ ان کے نام کا تار ہے محافظ امتحان نے تار کا لفافہ لیا اور ضمیر احمد خاں کو دیکر بولے لو یہ تمہارا تار ہے۔ ضمیر نے تار کھولا دیکھا تو لکھا تھا۔ امریکہ بنک کا دیوالہ ہوگیا۔ ایک پائی بھی وصول ہونے کی امید نہیں ہے۔ میں جاتی ہوں۔ وہاں سے مفصل حالت تمہارے مکان پر لکھوں گی۔ ” مارتھی منصوری “

تار کے پڑھتے ہی ضمیر احمد کا بھی دیوالہ ہوگیا۔ حساب کا مضمون سمجھنا اور صحیح حل کرنا دماغ کا کام تھا۔ ضمیر کے دماغ میں اب کہاں اس قسم کی صلاحیت تھی کہ وہ صحیح رہتا اور اس کا قلب اس حادثہ کے برداشت کی قوت پیدا کرتا۔ سکتے کا سا عالم طاری ہوگیا ” مارتھی “ چلی گئی وقت ختم ہوگیا۔ پرچہ لے لیا گیا۔

جب اس کے دوست احسن کو ان واقعات کی خبر ہوئی فوراً پہونچا اسے اپنے کمرہ میں لایا پند و نصائح سے کام لیا نشیب و فراز سمجھائے دوسرے روز امتحان ہال میں لیگیا۔ مگر اب نتیجہ کے اچھے ہونے کی امید نہ رہی لیکن ضمیر بھی کرتا کیا قہر درویش بر جان درویش کسی نہ کسی طرح امتحان ختم کرکے باپ کے تقاضے۔ احسن کے اصرار اور ماں کی محبت سے گھبرایا اور بی اے کے نتیجہ کا منتظر ہوا مگر ” مارتھی “ کا خیال ہے کہ دل سے کسی وقت نہیں جاتا۔

جب کبھی احسن کے مکان پر طبیعت کے بہلانے اور ملاقات کے خیال سے چلا آتا ہے۔ چائے بسکٹ کے انگریزی و ہندوستانی سامان معہ تکلفات کے اکجا جمع ہوجاتے ہیں۔ مگر ضمیر کا دل ہے کہ ہر وقت دھڑکتا ہی رہتا ہے کسی عنوان نہیں بہلتا۔ احسن بھی بمقابلہ پہلے کے اب زیادہ پند و نصائح کا عادی نہیں ہے۔ تالیف قلوب کرتا ہے۔ رائفل اور بندوق لیکر شکار کے حیلہ سے نکل جاتا ہے۔ مگر وہ نہ تو ساڑھے تین لاکھ روپیہ امریکہ بنک سے دلا سکتا ہے نہ مارتھی کو لاکر اس کے سامنے کھڑا کر سکتا ہے۔ اس لیے بیچارہ ضمیر کے خوش کرنے سے مجبور ہے۔ معذور ہے۔ بے بس ہے لاچار ہے۔ لاکھ عنوانوں سے اس کی کج رائے طبیعت کو راہِ راست پر لانے کی ترکیبیں کرتا ہے مگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔

(۵)

بی۔ اے کے امتحان کو ڈھائی مہینہ ہو گئے۔ نتیجہ چھپ گیا۔ قصبہ پر فضا میں احسن کی ممتاز کامیابی کے ڈنکے بج رہے ہیں لوگ ذاکر حسین صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں اور لڑکے کی شادی کرنے کی صلاح کرتے ہیں۔ باپ ہے کہ پھولا نہیں سماتا۔ غریبوں کو خیرات دیتا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ شکر ہے معبود اللہ کا کہ جس کو یہ دن دیکھنے قسمت میں لکھے تھے۔

مگر ضمیر احمد خاں کا کمرہ بند ہے۔ محلہ کے لوگ دروازہ پر جمع ہیں۔ بات کیا ہے۔ یہی ہے اور کیا ہے کہ فیل ہونے کی خبر اور" مارتھی کی یہ چٹھی" پیارے ضمیر احمد خاں بنک کے دیوالے کی خبر پاکر لاہور گئی اور وہاں کا جمع شدہ روپیہ جو جہاز پر چوری ہو گیا لیکر امریکہ آئی یہاں سے ایک پیسہ کے ملنے کی امید نہیں اور دنیا میں بغیر پیسہ کے زندہ رہنا بے کار ہے۔ اس لیے آج امریکہ ہوٹل میں صبح دم میں پہنچ جاؤں گی جہاں سے لوگ دنیا میں آتے ہیں۔ میری موت کی خبر پاکر تم صبر کرنا۔ میں نے اپنی موت کا انتظام کر کے یہ چٹھی تمہارے نام اخبار میں چھپنے کے لیے دیدی ایک ساتھ شائع ہوئی تھی جسے دیکھکر ضمیر کا جذب مضطر جدائی" مارتھی کا متحمل نہ ہو سکا۔ فوراً ایک چٹھی احسن کے نام لکھ کر میز پر رکھدی اور کیواڑ بند کر لیے۔

مسٹر احسن! میں نے تمہارا کہنا نہ مانا دھوکا کھایا۔ مجھے آج سے معلوم ہو کہ واقعی "مطمع را سہ حرف است ہر سہ تہی" میں اپنی اور تمہاری دونوں کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اب تم سے وہاں ملوں گا جہاں نہ ہوا ہے نہ ہوس صبر کرنا اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھنا۔

تمہارا خود رائے دوست

ضمیر احمد مسافر عالم ارواح از عالم تنہائی

راقم میر حیدر قریشی ماہلی

کلامِ ہادی

عشق میں کیا یہ خموشی مری اک راز نہیں　　درد کا نالۂ محزوں بھی تو دمساز نہیں

ہائے وہ دردِ نہاں جس میں نہیں کچھ بھی اثر　　آہ وہ سوزِ جگر جس میں ذرا ساز نہیں

کس قدر ہے ہمہ گیر اُس کے ترنم کی کشش　　کون دنیا میں ہے جو گوش بر آواز نہیں

ہو گئی آنکھ مگر خوگرِ اندازِ ستم　　رنگِ رخسار مرا مائلِ پرواز نہیں

ایک دل اُس میں نہاں غم کے ہزاروں نشتر　　پوچھو پھر کیا ہے جو جینا مرا اعجاز نہیں

کیا تعجب ہے جو پہلو میں لئے بیٹھا ہوں　　دل سے سرمایۂ ہستی پہ کسے ناز نہیں

کیا کروں کس سے کروں بیکسیِ غم کا گلہ　　ہیں تو آہوں کے سوا کوئی بھی دمساز نہیں

جب یہ حالت ہے تو کیوں توڑ نہ دوں تارِ نفس　　سازِ ہستی سے وفا میری ہم آواز نہیں

رونقِ بزم ہے اربابِ وفا پر موقوف　　میں نہ ہوں جس میں تری انجمن ناز نہیں

اُن کے اندازِ تبسم سے ہوا یہ ثابت　　میرے نالوں سے اثر آج ہم آواز نہیں

تیرے جلووں کی جھلک دل میں لیے بیٹھا ہوں　　کوئی اس خلوتِ خاص میں در انداز نہیں

میرے نالے وہ نہیں جن میں نہ ہو غم تیرا　　تیرے نغمے نہ ہوں جنمیں وہ مرا ساز نہیں

ہے فقط پاسِ وفا ورنہ یہ زندانِ قفس　　اہلِ ہمت کے لیے مانعِ پرواز نہیں

منزلیں سیکڑوں ہیں بعد فنا بھی ہادی
تیرے انجامِ وفا کا ابھی آغاز نہیں

ہادی مچھلی شہری

ہر فرعونے راموسیٰ

الترورارف (سوئٹزر لینڈ) کا چوک بازار بھر رہا ہے۔ مطلع صاف ہے۔ دھوپ کھل رہی ہے۔ یکایک ایک خوش رو رعنا جوان داخل ہوتا ہے۔ اہل بازار کی نظریں بے اختیار اس کے چہرہ پر جم جاتی ہیں۔ دراز کشیدہ، فراخ، سڈول، سرخ، سپید، بانکا ترچھا — وہ بے دھڑک ہنستا جھامتا بازار میں سے گزر رہا ہے۔ آنکھوں سے بشاشت کی شعاعیں چھوٹ رہی ہیں۔ کسی جان پہچان پر نظر پڑتی ہے تو اس کا سر نہایت خندہ پیشانی سے سلام کے لیے جھک جاتا ہے۔ "برگ لین کا تیر انداز ولیم ٹیل یہی ہے"۔ یہ الفاظ بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بجلی کی طرح دوڑ جاتے ہیں۔

ولیم ٹیل سوئٹزر لینڈ کا نامی تیر انداز تھا جس جھیل اُوری میں جو بارہ مہینے طوفان کی جولانگاہ بنی رہتی ہے۔ کوئی شخص اس سے بہتر کشتی کھیلنے والا نہ تھا۔ وہ ایک کوہستانی جھونپڑے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا سہتا تھا۔ ان کی خاطر رنج و تعب میں پڑنے کو وہ زندگی کا مآل سمجھتا تھا۔ اس لیے بچے عمدہ خوراک اور نفیس پوشاک کے لیے کبھی نہیں ترسے۔ اور کچھ نہیں تو پہاڑوں میں جا کر ہرن مار لایا کبھی جھیل پر جا کر مچھلیاں پکڑ لیں۔ غرض جو آسائش اور خوشحالی ان کو حاصل تھی اس نواح میں دور دور تک کسی کو نصیب نہ ہوئی۔

ٹیل الترورارف کے بازار میں ہرن کی جس قدر کھالیں لیکر آیا تھا، وہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔ اب وہ بچوں کی جڑاول کے لیے اونی کپڑا خریدنے کو بزازہ کی طرف چلا۔ روپیہ اس کے پاس کافی ملکہ وافی تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ گھڑی بھر میں خرید و فروخت سے فارغ ہو کر وہ باطمینانِ تمام گاتا اور سیٹیاں بجاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چلا۔

دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھا۔ مڑا تو کیا دیکھا کہ ایک آسٹروی سپاہی اسے گرفتار کر رہا ہے۔ آن کی آن وہ چاروں طرف سے گھر گیا۔ جس سپاہی نے اس کا بازو تھام رکھا تھا، ایک ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے جو ایک جھنڈے پر آویزاں تھی کہا، "اور اس ٹوپی کو سلام نہ کرنے کی سزا موت ہے۔ کیا تم آگاہ نہ تھے؟" سارے چوک پر سناٹا چھا گیا۔ دوکانیں بڑھ گئیں سارا بازار دیکھتے دیکھتے اس نقطہ پر سمٹ آیا۔ ایک ایسی شے کے خسارہ میں پڑنے کا وقت آ گیا تھا جو خرید و فروخت ہونیوالی تمام اجناس سے زیادہ گراں تھی۔ ایک انسان کی حریت، ایک قوم کی آزادی۔ ولیم ٹیل کا چہرہ لال ہو گیا اس نے ایک نظر ٹوپی پر ڈال کر سپاہی کی صورت دیکھی اور نرمی سے کہا "مجھ سے کوئی امر خلاف قانون سرزد نہیں ہوا" سپاہی نے کہا، "تم نے ڈیوک کی توہین کی ہے" اس نے جواب دیا "ہوچہ جوش! کیا یہ ضرور ہے کہ آدمی ایک خالی ٹوپی کی ایک خالی پاجامے یا ایک خالی جوتے سے زیادہ وقعت کرے؟"

یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ سپاہیوں کے پیچھے سے ضلع کے جابر و ظالم گورنر جیسلر کی صورت نمودار ہوئی۔ یہ وہی جیسلر تھا جسے مفتوح اور مظلوم اہل سوئٹزرلینڈ پر ڈیوک آف آسٹریا نے مسلط کیا تھا۔ اس نے ان کو پیٹ بھر کے پامال کیا۔ جو کوئی اس کے خلاف سر اٹھاتا، بے دریغ قتل ہوتا یا قید میں سسکتا۔ بربریت کی انتہا ہو گئی: حکم عام دیا گیا کہ جو کوئی آسٹروی نشان حکومت کی تعظیم نہ کریگا قتل کا سزاوار ہوگا۔ ولیم ٹیل گورنر سے مقابلہ ہوا اسے اپنے کسی ہم جنس کا خوف نہ تھا اس کی ہمت کسی انسان کے دبدبہ سے مرعوب ہونیوالی نہ تھی۔ اس نے گھنٹوں اپنے پہاڑی جھونپڑے میں بیٹھکر اس رسوائی پر غور کیا تھا جس میں اس کا پیارا ملک مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے چند رازدار دوستوں پر خروج کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا۔ ایک جابر حکومت کا نشان! میں اور اس کے آگے سر جھکاؤں! ناممکن! ناممکن! گورنر قریب آیا۔ سپاہیوں نے سلامی اتاری۔ اس نے چھوٹتے ہی ولیم ٹیل سے مخاطب ہو کر پوچھا، "کیوں جی! تم حکومت کے

نشان کی ہنسی اُڑاتے ہو۔؟"

اس وقت مجمع کے عقب سے ایک لڑکے کی آواز بلند ہوئی۔ ابا! ابا!۔ لوگ مڑ کر دیکھنے لگے۔ مجمع پھٹ گیا۔ بھیڑ کے اندر سے ولیم ٹیل کا بارہ سالہ بھولا بھالا لڑکا تیر کی طرح باپ کی طرف جھپٹا۔ گورنر نے بڑھکر لڑکے کو روک لیا اور پوچھا "کیا یہ اس باغی کا لڑکا ہے؟ یہ لڑکا شاید ماں کی اجازت کے بغیر بازار دیکھنے کو آگیا تھا۔ ٹیل نے کڑک کر کہا، خبردار جو اس کا بال بیکا ہوا یہ میرا بڑا لڑکا ہے۔ سفاک جیسلر بولا۔ "میں اسے ایذا نہ دونگا۔ البتہ اگر اسے کوئی ضرر پہنچا تو میرے ہاتھ سے نہیں پہنچے گا بلکہ خود تمہارے ہاتھوں سے۔"

اس آنکھوں میں ایک بھیانک روشنی تڑپنے لگی۔ پھر اس نے سپاہی کو حکم دیا، "یہ لو اس لڑکے کو اس درخت میں خوب کس کے باندھو اور اس کے سر پر ایک سیب رکھدو۔" ٹیل نے پوچھا۔ "اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" گورنر نے جواب دیا۔ "ہم نے سنا ہے کہ تم برگ لین کے مشہور قدر انداز ہو، میں چاہتا ہوں کہ آج تمہاری عشاقی کا امتحان لوں۔ تم قتل کے مستوجب ہو۔ لیکن میں رحم دلی سے کام لیکر تم کو معافی حاصل کرنے کا موقع دیتا ہوں دیکھو، غور سے سنو اگر اتنے فاصلے سے تم نے اپنے پیارے بیٹے کی چندیا پر دھرے ہوئے سیب کو تیر مار کر دو ٹکڑے کر ڈالا تو میں ابھی کھڑے کھڑے تم کو رہا کر دونگا۔ ورنہ۔ اگر نشانہ خطا کرے یا اگر بچہ ہلاک ہو جائے۔ فوراً تمہاری گردن اُڑا دونگا۔ یہیں اور اسی وقت۔" ٹیل کا بدن غصہ سے تھرتھرانے لگا اور بولا۔ "آپ کو رحم نہیں آتا آپ سمجھتے نہیں کہ میں اپنی جان بچانے کی خاطر اپنے فرزند کی جان کو ہلاکت میں ڈالدونگا۔"

"میں تم پر احسان کرتا ہوں غور کرو۔ کیا عجب ہے جو نشانہ ٹھیک بیٹھے۔ تمہاری جان بچ جائے۔ اور تم زندہ سلامت اپنے گھر واپس جا سکو۔" ٹیل نے اپنا ایک ہاتھ سامنے پھیلایا جو کانپ رہا تھا۔ "بتائیے! جو آدمی اپنے لڑکے کو چاہتا ہو، وہ کس طرح ہاتھ کو قابو میں رکھ کر اس کی کنپٹی سے ایک انگل اوپر نشانہ باندھ سکتا ہے۔ آہ! ذرا اس بچے پر ایک نظر ڈال لیجیے! حضور،

اس کی صورت دیکھیے۔ اس کے جسم میں آپ کا خون شامل نہیں ہے۔ آپ کیا جانیں کہ اس نے اپنی کیسی دل آویز حرکتوں سے باپ کے دل میں گھر کر رکھا ہے۔ یہ شوخ آنکھیں، یہ بھولی صورت! کیا میں ایسی پیاری اولاد کو اپنے ہاتھ سے خاک خون میں تڑپاؤں! جیسلر نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا۔ "خیر، یا تو نشانہ پر تیر سر کرو یا جان سے ہاتھ دھوؤ۔"

"تو مجھے مرنا قبول ہے۔"

"مگر پہلے لڑکے کی گردن تمہاری آنکھوں کے سامنے جدا کی جائے گی۔" بہادر کی شریف رگوں میں خون کھولنے لگا۔ آنکھوں میں اندھیرا آ گیا۔ بولا "لاؤ کمان! مگر میری ایک التجا ہے۔ لڑکے کا منہ دوسری طرف پھیر دو۔ مجھے اتنی تاب نہیں ہے کہ میں اس کی آنکھوں کو اپنی طرف تکتے ہوئے دیکھ سکوں۔"

باپ اور بیٹے کے درمیان راستہ صاف کر دیا گیا۔ لوگ دو رویہ پرا باندھ کر ڈٹ گئے لڑکا درخت کی طرف رُخ کیے رسیوں سے جکڑا ہوا بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ سیب سیسے کی گولے کی طرح اس کے تالو کو دبا رہا تھا۔ سارے بازار پر قیامت کا سکوت طاری تھا۔

ولیم ٹیل نے دو تیر چھانٹ لیے۔ ایک تیر کو کمر میں رکھا دوسرے کو کمان کے چلّہ میں باندھا پھر لحظہ بھر تامل کیا۔ آنکھیں نیچی کر کے گردن کو ذرا جھکایا۔ دُعا مانگی۔ خاموشی کا یہ عالم تھا کہ پتا بھی نیچے گرتا تو اس کی صدا تمہارے کانوں کو ناگوار گذرتی۔ وہ پھر سر اُٹھاتا ہے۔ اب اس کی آنکھیں مضطرب نہیں ہیں۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ نہیں ہے۔ اس کا چہرہ فولاد گوں ہو گیا ہے۔ وہ چلّہ کھینچا۔ وہ شست بندھی۔ بس!!!!!!! تیر اُڑا اور طرفۃ العین میں درخت کے اندر پیوست ہو گیا۔ سیب دو ٹکڑے ہو کر لڑکے کے قدموں میں گر پڑا۔ آفریں، مرحبا! کے غلغلہ سے فضا گونج اٹھی۔ جیسلر ٹیل کی طرف مڑ کر بولا "کیا نشانہ ہے! مگر یہ تو بتاؤ کہ تم نے دو تیر کیوں چنے تھے؟" ٹیل نے کمر میں لگے ہوئے تیر پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا" اس واسطے کہ اگر پہلے تیر سے میرے جگر بند کو ضرر پہنچے تو دوسرے سے اس کے دشمن کا دل

چھید ڈالوں۔"

"تو میری جان خطرہ میں ہے۔ میں قول ہار چکا ہوں۔ میں تم کو قتل نہیں کرتا۔ میں تمہاری جان بخشی کرتا ہوں مگر تمہاری زندگی کے بقیہ ایام میرے قلعہ کے زندان میں بسر ہونگے۔ پھر مجھے تمہاری تیر وکمان سے کوئی خوف نہیں رہے گا۔"

اس پر ٹیل کو پھر گرفتار کرلیا اور سپاہی اسے بھیڑ میں سے کھینچتے ہوئے بندرگاہ پر لے گئے جہاں گورنر کا جہاز لنگر انداز تھا۔

مگر اتفاق ایسا ہوا کہ جس وقت جہاز جھیل اوری میں پہنچا تو نہایت تیز و تند خوفناک طوفان برپا ہوگیا۔ تختۂ آب پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک تیرگی پھیل گئی۔ جہاز آسٹروی ملاحوں کے قابو سے نکل کر موجوں کی بھول بھلیاں میں جا پھنسا۔ سب کو جان کے لالے پڑ گئے لتنے میں کسی کو خیال آیا کہ جیسا ٹیل بے مثل تیرانداز ہے ایسا ہی لاثانی ملاح بھی ہے۔ جھٹ گورنر سے عرض کیا گیا۔ حکم ملا "ٹھیک ہے اسے رہا کردو شاید وہ ہماری جان بچا سکے۔"

ٹیل نے جہاز کی عناں ہاتھ میں لی تھوڑی سی کوشش میں اس نے جہاز کو راستہ پر ڈال دیا۔ لیکن ساحل کی طرف سے لیجاتے وقت اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا جیسلر اور آسٹروی سپاہیوں کا خیال نہیں بلکہ آزادی کا خیال، اپنی آزادی کا اور سوئزر لینڈ کی آزادی کا۔ اسے لازم ہے کہ اپنی ذات کو بھی دشمنوں سے چھڑالے اور اپنے ملک کو بھی وہ جہاز کو ایک چٹان کے قریب لیگیا جو جھیل کے پہلو میں درآئی تھی۔ جونہی وہ ایک موقع پر پہنچا ٹیل نے جسم کو تول کر ایک جست بھری اور چٹان پر جا کھڑا ہوا۔ جلد جلد چٹان کو طے کرکے چوٹی پر آیا۔ چاروں طرف ایک نظر دوڑائی اسے ان پہاڑیوں کی پست و بلند سے پوری آگاہی تھی آخر گھاٹیوں اور تنگ ڈنڈیوں پر ہوتا ہوا ایسی جگہ نکل آیا جو سرِ راہ تھی۔ اور اسے معلوم تھا کہ اگر جیسلر اور اس کے ہمراہی بچ رہے تو اسی طرف واپس جائیں گے۔

یہاں وہ ایک گنجان جھاڑی میں بیٹھ رہا۔ تیر کو کمان میں جوڑ لیا۔ اس کا دل سوئٹزرلینڈ کے آزاد کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ چشم براہ بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ پہاڑیوں پر اندھیرا چھا گیا۔ دفعتہً اس کے کانوں میں پاؤں کی چاپ آئی۔

"اگر میں صحیح سالم التوداروف پہنچ جاؤں تو مجھے قسم ہے جب تک اس دغاباز ٹیل کے ٹکے نہ اڑا دونگا کمر نہ کھولوں گا۔ اُف رے اچالاکی! تو سہی کہ پاجی کا گھر کھود کر ہل نہ پھروا دوں نہ بیوی کو چھوڑوں گا اور نہ بچوں سے درگزر ونگا، سب کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرونگا"

ٹیل نے اپنے دل میں کہا "تجھے التوداروف کا سواد دیکھنا کبھی نصیب نہوگا" اتنے میں سپاہی مارچ کرتے ہوئے اس کے سامنے سے گزر گئے۔ اور ادھر جیلر اس کی زد میں آیا۔ اُدھر چنگی سے تیر رہا ہوا۔ جیلر دھڑام سے پتھروں میں گر پڑا اور زخمی ہرن کی طرح پھڑکنے لگا۔

ولیم ٹیل نے اہلِ ملک کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ انجام کار آسٹریوں کو نیچا دیکھنا پڑا اور سوئٹزرلینڈ ان کے پنجہ سے آزاد ہو گیا۔

لوگوں نے ٹیل کو بادشاہ بنانا چاہا مگر اس نے قبول نہ کیا۔ حکومت کا انتظام قابل ہاتھوں میں دیکر پھر اپنے اسی جھونپڑے میں واپس چلا گیا جو اسے شاہی محلوں سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ فقط۔

مترجمہ

سید تفضل حسین ناظر مدارس رکن انجمن ادب
حیدرآباد دکن

(بک آف نالج)

قطعات و رباعیات

(۱)

پیش جب آئیں مقدر سے تکالیفِ شدید — ہو مقفل بابِ مقصد اور ناپیدا کلید
مضطرب ہرگز نہ ہو دانا کا پھر یہ کام ہے — دست زیرِ سنگ آہستہ می باید کشید

(۲)

قرآن و خبر جب ہوں دعوے کی دلیل — آیات و احادیث میں کر دیں تاویل
ہر شخص سمجھتا ہے کہ ہم ہیں حق پر — ہر عالمِ دین ہے اپنے فرقہ کا وکیل

(۳)

قرآن پڑھنے والوں میں کچھ زمزمہ کے ساتھ — گندھار پہ آتے ہیں پنچم پہ چڑھتے ہیں
اور سامعین میں ہے یہ خوبی کہ لے کے ساتھ — جب خوب گائیں تو کہیں خوب پڑھتے ہیں

(۴)

جو پیتے رہے شراب یہاں شام و پگاہ — نہرے سے بھی موقعہ پہ تھا استکراہ
کوثر سے انھیں کو رکھے خالق محروم — لاحول ولا قوت الا باللہ

(۵)

کل بحث میں دو شخص تھے بےفائدہ غرق — یہ کہتا اگر غرب تو وہ کہتا شرق
عالم نے کہا صوفی سے آخر کیا ہے — انکارِ خدا اور ہمہ اوست میں فرق

(۶)

کسی کے ملک حقیقی نہیں ہے نعمت و ناز — طریقِ عمرِ رواں میں بھی ہیں نشیب و فراز
بنا ہوا ہے اگر وقت شکر کر ورنہ — زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

(۷)

جب منبروں پہ ہوتی ہے تفسیر اس طرح — مفہوم ہی نہ ہو جو خدا کے کلام سے
معلوم صاف ہوتا ہے قرآن اک نیا — تصنیف کرتے ہیں یہ بزرگوں کے نام سے

(۸)

زہراب پیا شربتِ نوشین کھویا — مذہب نہیں سرمایۂ تسکین کھویا
سائنس کی پائی جو ادھوری تعلیم — دنیا تو نہ ہاتھ آئی مگر دین کھویا

(۹)

تعلیم سے کل میں نے کہا یا ہادی! — گستاخیوں کے ہو گئے لڑکے عادی
اس نے کہا کیا میں نے سکھایا تھا انھیں — ہم معنی ہیں بیہودگی و آزادی

جناب سجاد دہلوی
حیدر آباد دکن

جلال الدین خوارزم شاہ

ایک ڈراما

پردہ پانزدہم

(پہاڑ کی چوٹی پر، برف کے درمیان، درختوں کی شاخوں اور سرکنڈوں سے
بنایا ہوا اک جھونپڑا نظر آتا ہے)

مجلس اوّل

جابر

جابر (گاتا ہی)

کوہ وصحرا برفانی
جنگل وحشت ویرانی

سردی سنڈی موت کی سردی
عریانی کی بیدردی

کیسے جائے گی! ہ پیسے سے

(جیب سے اشرفیوں کی ایک تھیلی نکال کر ہاتھ میں اچھالتا ہے) ہمارا حاجب بھی کیا خوب آدمی ہی
چنگیز کے بیٹے میں اُس نے حلول کیا، یہاں تک کہ مجھے بھی برانگیختہ کر دیا - یہ دیکھو اشرفیوں کی تھیلی
اور اگر اس کا کھا کر ڈالوں تو دس تھیلیاں اور میں (تھیلی کھول کر) استغفراللہ اس کا رنگ ایک
بڑی چیز سے کس قدر مشابہ ہی - نہ معلوم آدمیوں کو اس کی کونسی بات پسند ہے کہ جسے دیکھو اس کی پرستش
کرتا ہی - ہاں ناراض نہ ہو پیارے سونے! تو نہایت حسین ہی - تیرا رنگ آفتاب سے ملتا ہی - دیکھ مجھے

پیدا نہ ہوا۔ تو اس وقت بھی اُس کے مانند ہے، اور ہمیشہ اُس کے مانند رہے گا۔ با عظمت وحیرت
چنگیز خاں! آج اُس کی مسند پر اوکتائی بیٹھا ہے۔ کل نہ معلوم کون بیٹھے گا (تھیلی کو پھر کھول کر) لیکن تو ہر
وقت اور ہمیشہ کے لیے بادشاہ ہے۔ اگر حضرت آدم کے زمانے میں تیری قدر و قیمت معلوم ہوتی تو ہابیل
و قابیل کی لڑائی، مطلقاً تیری ہی وجہ سے ہوتی۔ آج کل تو جتنی جنگ وجدل ہے سب کا باعث تو ہی ہے
خنزیر سونے! زرد چوزے۔ بیلے گھتے! خیر خیر ناراض نہ ہو میرے پیارے زرد پھول جیسے سونے
خدا کسی کو تیرا محتاج نہ کرے۔ کم سے کم میرے پاس تیری کمی نہ ہو (تھیلی کو ہوا میں اُچھال کر) دیکھ تجھے
تھیلی میں رکھتے ہیں تھیلی کو تجھے کس لیے بھرتے ہیں؟ اس لیے کہ میرا دین و ایمان خرید لیں۔ تجھے اس تھیلی میں کس نے
بھرا۔ ایک شخص جو ایک دوسرے شخص کے قدم بہ قدم چل رہا ہے۔ سونا! سونا! وہ شخص کون ہے؟ تجھے
خبر ہے۔ وہ میرے ہی طائفہ کا، میرا ہی عزیز چنگیز خاں کا بیٹا، اوکتائی ہے جس نے اسی آدمیوں
کو ایک ساتھ آگ میں جلایا سونا! سونا! اور اُس کے قدم بہ قدم کون چل رہا ہے؟ اُسے بھی کیا
تو نہیں جانتا؟ سُن۔ وہ براق حاجب ہے جس نے میری تین برس کی ایک بہن کو جنگلی بالی، جس
کے ابرو، جس کا جسم تجھ ہی جیسا سنہرا تھا، پاؤں تلے روند ڈالا مگر اس مبارک آدمی کی حیثیت سے
کچھ لین دین نہیں۔

سونا! سونا! براق حاجب قرہ خطا کا رہنے والا ہے۔ اس کا چہرہ بھی قرہ خطا کی طرح
قرہ، سیاہ ہے۔ میں گو جلاد ہوں، مگر بات کو سمجھتا ہوں۔ سُن تیرا نور بھی اُس کی سیاہی کو دور نہیں
کر سکتا۔ سونا! سونا! اگر تو کہے کہ کیا تیرے چہرے کی سیاہی بھی دور نہیں ہو سکتی تو میں کیا جواب دونگا
(تھیلی کو ہاتھ سے چھوڑ کر)، مجھے چھوڑ دے، لیکن تو مجھے چھوڑ بھی دے تو میں تجھے کب چھوڑونگا۔ ابھی
تو مجھے بھری بھری تھیلیاں مجھے ملنے والی ہیں۔ مگر کس کے خون کے عوض میں؟ اگر جلال
کو قتل کر سکوں تو جلال کا خون کرنے کے انعام میں۔ یہ جلال کون ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ اگر جلال مر جائے، زمین میں دفن ہو جائے تو زمین کے اوپر ایک نئی دنیا آباد ہو جائے حالانکہ وہ
میری طرح اک ذرا سا آدمی ہے۔ تاتاریوں کے پاس، قدیں اس سے فی گنتی ایک لاکھ آدمی
ہیں لیکن اُسے نابود نہیں کر سکتے۔ اکیلا جلال، دنیا سے اُلجھ رہا ہے۔ ہا ہا! اکیلا جلال! ایک ڈیڑھ
گز کا جلال، کیسی عجیب بات ہے۔ جابر کے برابر جلال! دُنیا سے جنگ کر رہا ہے، مگر اس
چھوٹی سی تھیلی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ بھی عجیب بات ہے۔ دنیا میں جس قدر مخلوق ہے اس پر
سب سے زیادہ حکومت سونے ہی کی ہے۔ سونا! سونا! شاید تجھے آفتاب سے نکال کے دنیا میں

لاتے ہیں۔ سونا! سونا! آ! آ اور آ۔ میرے دل میں تو تو ہے ہی، میری بغل میں بھی آ۔ سونا! سونا! تجھے لوگوں نے اس تھیلی میں بھرا اور مجھے دیا۔ تیری قوت سے میں یہاں تک آیا۔ اب اگر میں جلال کو مار ڈالوں، تو تجھے بھری ہوئی چند اور تھیلیاں مجھے ملیں، بلکہ تیری قوت سے میں کعبہ تک جاکر وہاں بھی سونا چوری کر سکتا ہوں مگر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ فی الحال تو اتنا ہی سونا کافی ہے۔ اگر میں نے جلال کو قتل کر لیا تو میرا سونا اور بڑھ جائے گا..... قتل کر دونگا۔ والسلام۔ میرے باپ نے مجھے جلّاد بنا کے پالا۔ ابتک جتنے آدمی میرے ہاتھ سے قتل ہوئے ان کی تعداد سوؤ سے اوپر ہے ان میں کون ایسا تھا جس کی جان لی جانی چاہیے تھی کسی کی نہ لی جانی چاہیئے تھی، اسے میں نے کبھی نہ سوچا۔ اگر سارے کے سارے انسان ایک جگہ جمع کیے جائیں اور سب کو ملاکر ایک انسان بنا یا جائے اور مجھ سے کہا جائے اسے قتل کر ڈال، تو مجھے کچھ تردد ہوگا؟ کہتے ہیں کہ جلال دنیا میں سب سے بڑا انسان ہے۔ دنیا کے انسانوں کے مجموعہ سے بڑا ہی۔ اگر اُسے مار ڈالوں تو کیا ہوگا۔ کیا جو سونا مجھے ملنے والا ہے اُس میں کمی آجائیگی۔ کہتے ہیں ممکن ہی جلال مجھے مار ڈالے۔ مگر یہ ممکن نہیں۔ ان پہاڑوں کے ہر پتھر کے پیچھے ایک آدمی چھپا ہوا ہے۔ اور ہر آدمی کے بغل میں، میری طرح اشرفیوں کی ایک تھیلی ہے (جس پتھر پر خود بیٹھا ہے، اُس سے نیچے کی طرف دیکھتا) دیکھو، ایک آدمی آرہا ہے۔ فقیروں کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ یہاں اس وقت اس کا کیا کام ہے۔ ذرا میں یہاں سے ہٹ جاؤں۔

مجلس دوم

(جلال درویشوں کے لباس میں آتا ہی جلّاد پتھر کے پیچھے ہو بیٹھتا ہی)

جلال الدین: ۔ کہتے ہیں موت ہر وقت انسان کے پیچھے لگی رہتی ہے، مگر آہ! ایسے بھی انسان ہیں کہ مہینوں برسوں موت کے پیچھے دوڑتے ہیں، اور وہ اُن سے بھاگتی ہے اور اُن کی آرزو پوری نہیں ہوتی۔ اور خاں، نورالدین ضرور شہید ہو چکے ہونگے۔ مجھے یہاں تک کون لایا۔ تاتاریوں نے تعاقب کیوں چھوڑ دیا۔ میں نے یہ درویشی لباس اس لیے اختیار نہیں کیا کہ مجھے

کوئی بادشاہ یا بڑا آدمی نہ سمجھے۔ میں نے یہ لباس اس غرض سے پہنا ہے کہ جس وقت میں شہید ہوں تو میرا لباس، میری شباہت ویسی ہو جیسی کہ قرونِ اولیٰ کے مجاہدین کی ہوتی تھی میرے ساتھ جتنے سپاہی تھے اُنھوں نے کفن پہن رکھے تھے وہ کیا ہوئے؟ کہاں گئے؟ آہ! ہوئے کیا، سب شہید ہو گئے۔ ان کے جسم خون آلود خاک میں پڑے ہونگے، مگر ان کی روحیں عرشِ اعلیٰ کی سیر کر رہی ہونگی۔

جابر:۔ (پتھر کے پیچھے اپنے دل میں) یہ ضرور جلال الدین کے آدمیوں میں سے ہے۔

جلال الدین:۔ نہیں یہ نہیں ہوا، بلکہ سب بھاگ گئے۔ دس میں سے ایک بھی نہیں مرا۔ ذلیل، رذیل۔ الٰہی! میں جب ان کی نظروں کے سامنے تھا، اس وقت اُنھوں نے مجھسے وفا نہ کی، ساتھ نہ دیا، تو میں جب اُن کی آنکھوں سے چھپ جاؤنگا تو بھلا خدمتِ دین میں وہ کیا ثابت قدم رہیں گے۔

جابر:۔ (پتھر کے پیچھے سے سر اُٹھا کر، اپنے دل میں) یہ جلال کا سپاہی نہیں، بلکہ غالباً خود جلال ہے (تھیلی کو ہاتھ میں لیکر) سونا! سونا! بتا کیا کروں۔

جلال الدین:۔ سب سے یہی امید رکھتا تھا کہ بھاگ جائیں گے۔ مگر اورخاں سے، نورالدین سے مبارک سے، اور کیا نام لوں، وہ نیزہ کی تمثال ثانی، ہرجہاں سے یہ امید نہ رکھتا تھا کہ میری تلاش بھی نہ کریں گے۔ شاید مر گئے، اگر مر گئے تو انھیں مجھسے پہلے نہ مرنا چاہیے تھا۔ آج کے دن، دین محو ہو رہا ہے، وطن محو ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کا خون ایک سیلاب بن کر حجاز کی طرف جا رہا ہے۔ بیت اللہ رخنہ دار ہوگا۔ پیغمبر کو مزارِ اقدس میں آرام سے نہ چھوڑا جائے گا۔ کیا میں اپنے تمام ساتھی، مجاہدین کو ختم کر کے ختم ہوں گا بے شک ادائے فرض ضروری ہے مگر وہ مبارک فرض ضرورت سے زیادہ ظالم نکلا (جس پتھر پر بیٹھا ہے اسی پر گر پڑتا ہے)

جابر:۔ (اپنے پتھر کے پیچھے سے ایک دفعہ پھر سر نکالتا ہے) ضرور یہ جلال ہے۔ (اس کے پاس جاکر) تم یہاں کیا کر رہے ہو۔

جلال الدین:۔ تو کون ہے، تیرا کیا کام ہے۔

جابر:۔ میرا کچھ کام نہیں۔ مگر چونکہ میں آپ سے واقف ہوں اس لیے عرض کرتا ہوں، کیا آپ ہمارے بادشاہ نہیں ہیں۔

جلال الدین:- ہاں میں تمہارا بادشاہ ہوں، تمہارا نہیں ساری دنیا کا بادشاہ ہو سکتا ہوں، اس لیے کہ سچائی کا بادشاہ ہوں، میں نے چونکہ سچائی کی خدمت کی لازم تھا کہ دنیا مجھے بادشاہ بھی۔

جابر۔ اگر آپ سچائی کے بادشاہ تھے تو دشمن کے سامنے سے کیوں بھاگے۔ یہ درویشوں کا لباس کیوں پہن رکھا ہے۔ کیا آپ موت سے چھپتے پھرتے ہیں۔ اہل وعیال کو تاتاریوں کے پنجے میں چھوڑ کر تمہاری مدد کو آنے والے تمہیں کہاں پائیں گے۔ فقیروں کے لباس میں۔ سنسان جگہوں میں ....

جلال الدین:- (بات کاٹ کر جھپٹ کر باادب سے بات کر۔ میں وہ ہوں کہ میں نے دنیا کی تین سمتوں میں ہر جگہ علیحدہ علیحدہ ایک سلطنت قایم کی، عراقِ عرب میں زمانۂ بنی امیہ میں جو نفاق مشہور تھا وہ آلِ عباس کے عہد میں عراقِ عجم میں منتقل ہو گیا۔ عراق کے میرے تمام افسروں اور عمالوں نے مجھسے بیوفائی کی۔ وہ سلطنت جسے میں نے تیسری دفعہ قائم کیا تھا وہ بھی میرے ہاتھ سے گئی مگر اب میں ایک چوتھی سلطنت قائم کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں، تجھ جیسے کتے کیا سمجھ سکتے ہیں کہ میں نے درویشی لباس کیوں پہنا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے میں ایک اور سلطنت قایم کردوں گا اور تم جیسے مسلمان مرتدوں سے جنہوں نے اپنی عورتیں، اپنے بچے تاتاری مشرکوں کے سپرد کر دئے اُن سے جنگ کرونگا اور شہید ہوں گا۔

جابر۔ (جلال جس وقت عالمِ غضب میں کہہ رہا تھا جابر آہستہ آہستہ اُس کے پاس آتا ہے، جلدی سے اپنی کمر سے ایک خنجر نکال کر جلال کے سینہ میں بھونک دیتا ہے) جنگ کرا کر موت کے پنجہ سے اپنے تئیں چھوڑا سکتا ہے تو جتنی چاہے جنگ کر۔

جلال الدین:- (باوجود زخمی ہونے کے جابر کا ہاتھ پکڑ کر غور سے اُس کے چہرے کو دیکھتا ہے) - ضرور میں نے اس چہرہ کو کہیں دیکھا ہے۔

جابر:- (تھوڑی دیر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر کے) پہچانا !

جلال الدین:- ہاں پہچانا، صاحب کا جلاد خنزیر، تو صاحب کا جلاد نہیں ہے ؟

جابر۔ ہاں۔

جلال الدین۔ میری جان لینے کا کیوں قصد کیا۔

جابر۔ اس لیے کہ مجھے سونا دیا گیا، میرے ہاتھ کو اس قدر دباؤ .... جو سوال کروگے میں بتاؤں گا۔ براق حاجب کے آدمیوں نے مجھے اشرفیاں دیں، اصل میں تاتاریوں نے انھیں

دیں تھیں، مجھے چھوڑ دیں بھی نہیں چھوڑ دونگا ورنہ اس وقت اگر آواز دوں تو ان پتھروں
کے پیچھے سے چالیس آدمی نکل آئیں گے۔

جلال الدین - الٰہی تو انصاف کر۔ ایک قاتل کے چالیس مددگار ریا ایک میں مظلوم ہوں کہ
اگر میں کہوں میری مدد کو آؤ تو کون آئے گا۔

مہرجہاں ۔-(ہاتھ میں دو خنجر لیے ہوئے جو اُس نے جلال کی کمر سے لیا تھا) میں آؤں گی آپ
میرے بادشاہ اللہ کے مومن بندے آئیں گے۔ یہاں سے نیچے نظر ڈالیے دیکھیے کتنی تلواریں
آپکے حکم کی منتظر ہیں۔ (جابر کے ساتھ آہستہ آہستہ چلے جاتے ہیں)۔

جلال الدین:- میری نیرہ تو فرشتہ ہونے کی قابل تھی۔

مہرجہاں :- اب بھی نیرہ! (جلال سے) نیرہ نہیں ہے میرے بادشاہ' مہرجہاں (اپنے دل میں)
میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ (جلال سے) وہ جو دوسری نیرہ ہے' وہ مہرجہاں جو دوسری
نیرہ بننا چاہتی ہے! آپ نے جو وعدہ کیا تھا کہ میں خون کے دریا میں ڈبو دی جاؤں گی وہ
وقت آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔

جلال الدین:- باری۔ باری (جابر کے ہاتھ کو پکڑے رکھ کر) میں تیرے احسان کا کس طرح
شکریہ ادا کروں۔ مجھے قتل ہو کر ہی مرنا تھا۔ میں ایک ملعون جلاد کے ہاتھ سے شہید ہو رہا ہوں
جس نے طمع زر سے مجھے مارا ہے۔ جو یہ کہہ کے مجھے زخمی نہیں کرتا کہ میں نے اسلام پر ظلم کیا
یا میں نے اپنے ادائے فرض میں کمی کی۔

جابر :- (اپنے دل سے) یہ دیوانہ ہے کیا۔ مر تو رہا ہے اور مرنے کے لیے خدا کا شکر ادا
کرتا ہے۔

جلال الدین -(جابر کو زور سے جھٹکا دیکر گراتا ہے) ہٹ یہاں سے او قاتل۔ دفع ہو' اگر
میرے سپاہی تجھے اس وقت دیکھیں تو تیرے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جانوروں کا لقمہ بنا دینگے
جا جہنم میں یہاں سے ملعون' مگر میں نے تجھے معاف کیا' اگر میرے نصیبے میں شہادت ہے تو میں نے
حضور باری میں بھی تجھے معاف کیا۔

مہرجہاں :-(پاس آکر) آپ کا چہرہ خاکستری ہو گیا' کیا ہو گیا' (جلال گر پڑتا ہے اور اس کے
سینے سے خون اُبل اُبل کر باہر نکلتا ہے) یہ خون کیسا' خون کے دریا میں تو میں ڈوبنے والی تھی

آپ ڈوب رہی ہیں اے میرے بادشاہ۔ میرا نام آپ کی صفات کا مظہر تھا۔ کیا وہ آفتاب خون میں غروب ہو رہا ہے۔ (ٹیلے پر چڑھ کر سپاہیوں کو آواز دیکے) اس قاتل کو پکڑو اس نے بادشاہ کو ہلاک کر دیا۔
جلال الدین:- چپ رہو میں نے اسے معاف کیا، اس کی ہزار جان بھی ہو تو وہ خون کا عوض تو نہیں ہو سکتی
مہرجہاں:- اے میرے جلال۔ آپ ملک نصر سے کچھ کم رہنے والے نہیں آپ قاتل کو معاف کر سکتے ہیں مگر ہم معاف نہیں کرینگے۔ میں آپ ہی کے انصاف پر چھوڑتی ہوں۔ خون مقتول کا نہیں ہوتا اس کے وارثوں کا ہوتا ہے اے میرے بادشاہ، آپ اپنی رعایا، اپنی فوج کے باپ تھے، ملعون نے لاکھوں مسلمانوں کو یتیم کر دیا۔ خنجر برامت محمد کی تاتاریوں کے اسیر ہونے کا باعث ہوا۔
جلال الدین:- میرے پاس آؤ۔ میری زندگی چند منٹ کی اور ہے۔ میں اللہ کے حضور میں جا رہا ہوں۔ دنیا میں تیرے سوا میرا کوئی رفیق نہیں۔ اگر تمہیں جلال سے محبت ہے۔ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو کہو، نور الدین۔ اُور خاں۔ مبارک کہاں ہیں۔
مہرجہاں:- اور خاں، نور الدین شہید ہو گئے، مبارک میرے ساتھ آیا ہے اور آپ کے حکم کا منتظر ہے۔
جلال الدین:- میرے پاس آؤ۔ میرا زخم کاری ہے۔ تمہارے چہرہ کو دیکھوں شاید زخم کی تکلیف میں کچھ کمی آئے۔
مہرجہاں:- آئی میرے بادشاہ! انشاء اللہ کوئی بات نہیں،
جلال الدین:- میرے بائیں طرف تو دیکھو،
مہرجہاں:- آہ، خون! خون! الٰہی! الٰہی، تو نے ہر شخص کی جان اس کے جسم سے کیوں وابستہ کر دی ہے۔ تو نے کیوں یہ اختیار نہیں دیا کہ ایک شخص اپنی جان دوسرے کو بخش دے۔
جلال الدین:- چپ رہو، موت کا وقت ہے، آخرت کی سب سے قریبی منزل میں خدائے تعالیٰ کی حکمتوں کے متعلق نعوذ باللہ جرح و قدح نہیں کی جا سکتی۔ آہ، مر رہا ہوں، دنیا میں کون باقی رہا ہے۔ تمہارے پاس قلم کاغذ نہیں کہ ایک تھوڑی سی وصیت لکھواؤں۔
مہرجہاں:- میری چھوٹی اُنگلی قلم کا کام دے سکتی ہے اور میرے پیراہن کا کپڑا کاغذ بن سکتا ہے اے میرے بادشاہ۔
جلال الدین:- سچ کہتی ہو، اپنے پیرہن سے ایک ٹکڑا پھاڑو۔
مہرجہاں:- لیجئے۔
جلال الدین:- اپنی چھوٹی اُنگلی اِدھر لاؤ۔
مہرجہاں:- (نہایت درجہ رنج اور گھبراہٹ کے ساتھ پیچھے ہٹ کر) آپ کے خون میں میرے جلال!
جلال الدین:- ہاں۔ میرے خون میں جو وصیت میں کروں گا وہ اسی قابل ہے کہ جلال کے خون سے

لکھی جائے۔ کیوں بجی ہو، چالیس سال سے اپنے خون کو میں نے خدمتِ دین کے لیے وقف کیا تھا۔ کیا وہ اب قابل بھی نہیں ہے کہ میرے آخری وقت میں امتِ مرحومہ کے لیے روشنائی کا کام دے۔ اپنی چھوٹی انگلی کو ڈبو۔ اور آخرت میں جو حکم ہے اسے لکھوں گی۔

مہرجہاں:۔ لیجئے ڈبولی، میرے بادشاہ کا دنیا میں

جلال الدین:۔ لکھو،

مہرجہاں:۔ فرمائیے میرے بادشاہ۔

جلال الدین:۔ تاتاریوں سے جس قدر جنگ کرنا ممکن تھا میں نے جنگ کی مگر مظفر توفیق نہ ہوا۔ چونکہ ہم توفیقِ الٰہی کے لائق نہ تھے۔

مہرجہاں:۔ میں نے لکھا لے میرے بادشاہ

جلال الدین:۔ تمہاری انگلی میں خون نہیں رہا۔

مہرجہاں:۔ ایسی باتیں نہ کیجئے۔ میں دیوانی ہوجاؤں گی۔

جلال الدین:۔ خدا کے لیے ضبط سے کام لو، میرا خون شدت سے بہہ رہا ہے، موت میرے گرد منڈلا رہی ہے۔ لاؤ اپنی انگلی بڑھاؤ۔

مہرجہاں:۔ بہت اچھا، میرے بادشاہ

جلال الدین:۔ "ہم میں سے پانچ اگر خدا کی راہ میں جنگ کرتے تھے تو پانچ ہزار اپنے نفع کا خیال کرتے تھے اس بے تمیزی کی وجہ سے تاتاریوں کا مقابلہ کرنا ناممکن ہوگیا تھا، دولتِ عباسیہ جس نے اسلام کے اوپر اس بلا کو بلایا میرا یقین ہے کہ خود اسے دشمن بہت جلد محو کردے گا"

مہرجہاں:۔ لکھ لیا میرے بادشاہ۔

جلال الدین:۔ لو اور خون لو۔

مہرجہاں:۔ اُف، یا ربّی، یا ربّی۔

جلال الدین:۔ بے فائدہ افسوس سے وقت مت گنواؤ اگر مجھ سے محبت کرتی ہو تو لکھو،

مہرجہاں:۔ فرمائیے، میرے بادشاہ

جلال الدین:۔ "تاتاری بھی انسان ہیں، جب ہم سے اُن کا خلا ملا ہوگا تو یقیناً اسلام کے فیض شرف کو دیکھیں گے۔ اُم کا دل اسکی حقانیت کی طرف مائل ہوگا۔ اس لیے جو مسلمان قوم اُن کی مفتوح نہیں ہوئی ہے اُس کا فرض یہ ہے کہ اپنے وطن کی محافظت میں اُن سے آخر دم تک جنگ کرے جنھیں تاتاریوں نے فتح کرلیا ہے اُن کے لیے لازم ہے کہ وہ انہیں مسلمان کرنے کی کوشش کریں" لکھ لیا؟

مہرجہاں:۔ لکھ لیا، اے میرے بادشاہ

جلال الدین:۔ اب جاؤ۔ وصیت نامہ مبارک کے حوالہ کرو پھر میرے پاس آؤ۔
(مہرجہاں مبارک کے پاس جاتی ہے) مرنے کے بعد بھی اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ تاتاریوں نے اسلام قبول کر لیا تو محشر تک میں اپنی قبر میں آرام سے سوؤں گا۔
غیب سے ایک آواز۔ اطمینان رکھ، ایسا ہی ہوگا۔
جلال الدین ۔ (چاروں طرف نظر ڈال کر مگر کسی کو نہ دیکھ کر) الٰہی۔ کیا میں اس قدر تیرے مقبول بندوں میں سے ہوں کہ ہاتفِ غیب مجھے اطمینان دلا رہا ہے، میں مطمئن ہوا اور تیری حضور غربت میں خوش خوش آرہا ہوں اس کے بعد اگر حیاتِ جاودانی بھی میرے قدموں پر پڑی ہو تو اُس پر نگاہ نہ ڈالوں (بیہوش ہو جاتا ہے)
مہرجہاں ۔ مبارک!
مبارک ۔ حضور۔
مہرجہاں ۔ بادشاہ کا یہ وصیت نامہ ہے اور تم اس پر معمور ہو کے اس کی تبلیغ کرو، لو
مبارک ۔ فوج کے لیے کیا حکم ہے۔
مہرجہاں ۔ پڑھو تو۔ مرتے دم تک جنگ کرنے کا حکم ہے۔
مبارک ۔ بادشاہ کا کیا حال ہے۔
مہرجہاں ۔ بادشاہ کو حلال کر دیا۔ میں چیختے چیختے تھک گئی کسی نے میری آواز بھی نہ سُنی، جاؤ میرا وقت مت لو، ہم دونوں آخرت کے مسافر ہیں، اس دنیائے دنی سے چھٹکارا پائیں گے۔
مبارک ۔ میں بھی بادشاہ کے حکم کی تعمیل کے لیے جا رہا ہوں۔ حقِ خدمت بخش دیجیے۔
مہرجہاں ۔ بخشا۔ انشاءاللہ اب لوائے حمد کے نیچے ملیں گے۔
مبارک ۔ (مہرجہاں کے قدم چومتا ہے تلوار نکال کر) دنیا اور آخرت کے درمیان کی گہرائیوں پر سب سے زیادہ بے خوف گذرنے کے لیے پل یہی ہے، شہادت۔ شہادت، الٰہی، میرے دل میں شہادت کے سوا اب اور کوئی آرزو باقی نہیں رہی۔
مہرجہاں ۔ (جلال کے پاس جا کر) میرے جلال، میرے بادشاہ۔
جلال الدین ۔ آہ، نیرہ، نیرہ۔
مہرجہاں ۔ پھر وہی نیرہ، میں نیرہ نہیں ہوں، لے میرے بادشاہ، مہرجہاں پر بھی تو ایک نگاہ ڈالو
جلال الدین ۔ تم ہو مہرجہاں؟ ۔۔۔ میں موت کے عالم میں ہوں، جو شخص پنجہ اجل میں گرفتار ہو اُس سے جو کچھ دیکھا جائے کم ہے۔ میری باتوں سے ناراض مت ہو، الٰہی، الٰہی، آگئے اب سعادت ہی سعادت ہے اپنے حبیب اکرم کی حرمت کا واسطہ، اپنے قہر و غضب کو ضعیفوں پر مت بھیج ۔۔۔۔ دیکھو، میں تمہیں ایک مژدہ سُناتا ہوں، دین دنیا کی اگر تمہیں محبت ہے تو میں جانتا ہوں ۔۔۔۔۔ بھول گیا۔ میں گیا

چاہتا تھا۔
مہرجہاں۔ میں نے دنیا میں ہر قسم کی محبت آپ سے سیکھی، اے میرے پادشاہ، میں دین وملت کو چاہتی ہوں
اس کے پیورے سے چھوٹے مقصد کے لیے میرے ہزار جان ہوں تو اس پر فدا کروں، فرمائیے آپ کیا فردہ سے
رہتے تھے۔
جلال الدین۔ آک زمانہ آئے گا کہ تاتاری عموماً دینِ حق کو قبول کریں گے۔
مہرجہاں۔ آہ۔
جلال الدین۔ (رک رک کر، آہستہ آہستہ) ۔۔۔۔ اس بات پر ایسا یقین کرو جیسا یقین اللہ کی ۔۔۔۔ وحدانیت
کا ۔۔۔۔ یقین ہے ۔۔۔۔ جیسا میرے ۔۔۔۔ موجود ہونے کا ۔۔۔۔ یقین ہے ۔۔۔۔ یقین کرو ۔۔۔۔
جس وقت تم وصیت نامہ مبارک کو دینے کے لیے گئیں ۔۔۔ میں نے حضور الٰہی میں دعا کی کہ تاتاریوں
کے قبولِ اسلام ۔۔۔۔ کی خبر ۔۔۔۔ کو آخرت میں ہی سہی مجھے سنائی جائے ۔۔۔ میری دعا ۔۔۔۔ قبول
ہوئی ۔۔۔۔ ہاتفِ غیب سے ۔۔۔۔ اطمینان رکھ " کی آواز آئی ۔۔۔۔ میری روح مسرت سے بھری عالم بالا ۔۔۔۔
کو جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔۔۔ ہاتف ۔۔۔۔ جھوٹ نہیں کہہ سکتا ۔۔۔۔ اسقدر خواب ۔۔۔ اس قدر تپ کے
بحرانوں ۔۔۔۔ کے بعد سکرات موت میں گزر کر ۔۔۔ خیال اور حقیقت میں ۔۔۔۔ فرق کر سکتا ہوں
یقین کرو (بیہوشانہ حالت میں) میں خوش نصیب ہوں، مہرجہاں ۔۔۔ میں شہید ہوں ۔۔۔۔ الحمد للہ
۔۔۔۔ الٰہی ۔ الٰہی ۔۔۔۔ مجھے تو نے ۔۔ وہ سعادت ۔۔۔۔ بخشی ۔۔۔ جس پر دنیا کی ۔۔۔۔ کل موجودات
۔۔ رشک کرے ۔۔۔ تیری شانِ عظمت کو ۔۔۔۔ تیری مخلوقات تیری بڑائی کو کیا سمجھ سکتی ہے ۔۔۔۔ آہ روح
۔۔۔۔ ایک جہانِ معنوی ۔۔۔۔ ایک عالم علوی ۔۔۔۔ سے نیچے گر کر ۔۔۔۔ اس زمین پر ۔۔۔۔ سیکڑوں
بلاؤں ہزاروں افرتوں میں مبتلا ہوئی مگر ۔۔۔۔ اس چرکین جسم ۔۔۔ کے کون سی بات سے محبت کرتی ہے
۔۔۔ کہ اس سے جدا ہوتے وقت ۔۔۔۔ اسقدر مضطرب ہوتی ہے ۔۔۔۔ دنیا بھی ۔۔ میری زندگی کی طرح نظر کو
۔۔۔۔ غائب ہو گئی ۔۔۔۔ مہرجہاں تم ۔۔۔۔ بھی نظر نہیں آتیں ۔۔۔۔ نہیں نظر آ رہی ہو ۔۔۔ ہر قسم کے نورِ
عظمت میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی ہو (بیہوش ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تسلیم روح کر دی)
مہرجہاں۔ استغراق کے عالم میں، تھوڑا سا سوچنے کے بعد) گیا! اسلام کا سب سے پہلا سپاہی
اسلام کا سب سے آخری ملجا گیا، جلال الدین جو دنیا میں سب سے بڑا، دنیا پر جس کا اقتدار حاوی
جو کل انسانوں پر غالب تھا، وہ ان پتھروں سے "اس زمین سے جس پر وہ پڑا ہے زیادہ عاجز
ہے، ۔۔۔۔ کریں اُمید ۔۔۔۔ دیوانے لوگ، اس دنیا سے وفا کی، اور اقبال سے بقا کی، کریں اُمید
۔۔۔۔ آہ، وہ پادشاہ کہ جس زمین پر اس کے قدم پڑتے تھے اور آفتاب کی طرح جہاں اُس کا سایہ
پڑتا تھا وہ نور اور زندگی میں غرق ہو جاتی تھی۔ اُس نے ایک عظیم الشان سلطنت، ایک جہان حمیت پیدا

گیا۔ اُن کے بُڈّی دل قوجوں کو محو کیا، آج، ایک کتے کی طرح ذلیل قاتل کے خنجر کا کشتہ پڑا ہے اس کی
قوت بازو سے بے بس لوگ اجل سے محفوظ رہتے تھے بدنصیب لوگ اُس کی درایت سے فائدہ اُٹھاتے تھے
کہاں ہے وہ استناد گاہ، (نہایت زور سے) آہ، میرے بادشاہ، اس کے بعد کون بال بکھرے ہوئے
بیواؤں کے خون رونیوالے یتیموں کے، پابجولاں قیدیوں کے، تلواروں کے نیچے تڑپنے والے بیکسوں
کی امداد کو پہونچے گا؟ زمین پر آپ ملک العباس تھے، آہ ہم کیسے گنہگار بندے ہیں کہ قہار منتقم نے تم کو بھی
ہم سے چھین لیا، آپ شہید ہو گئے، اب تاتاریوں کی تلواروں اور نیزوں سے ایک موحد بھی زندہ نہ رہیگا
آہ قبر میں، وہ صاحب حمیت اس غم سے آرام سے نہ سو سکے گا۔ صد حیف، گیا، جلال گیا، اللہ کو بھی
منظور ہے کہ نور دنیا سے غائب ہو جائے اور تاریکی اُسے گھیر لے، یا ربی، یا ربی، کیا قیامت پورے
ہول و وحشت کے ساتھ دنیا میں آگئی۔ تجھے یہ مصیبت کے دن بھی ہمیں دکھانے تھے، میرے سینہ
پر ایک شہید کا زخم بھی تو نہیں، ایک جنت کی کھڑکی بھی تو نہیں کہ اُس سے اُس عالم کو دیکھوں اور یہ جا نگداز
سماں بھول جاؤں۔ (حواس باختہ عالم میں اپنی انگلی پر نظر ڈال کر) آہ، اس کا خون میری انگلی میں لگا ہوا
ہے، اور میں اس طرح بھر رہی ہوں گویا اپنے ہاتھوں میں حنا لگائی ہے۔ یہ خنجر کیا میرے جلال سے اس لیے
لیا تھا کہ میں مزار میں عذاب کے فرشتوں سے لڑونگی؟ الہی، اگر یہ فعل گناہ ہے تو اس کی سزا تو دیگا، انسان
تو نہ دینگے، (خنجر اپنے مار لیتی ہے) آہ، اس کے بستر پر جو میری جگہ تھی کیا اس کے مزار میں خالی رہے گی،
(نہایت گھبراہٹ سے اپنی جگہ سے ہٹ کر) دیوانی، دیوانی، وہاں تو اس کی نیرہ موجود ہے۔ اس کی عزیز
نیرہ، تو تو ایک مردہ کی تصویر تھی جس میں جان ڈالدی گئی تھی اور اس کے بستر پر مسلط ہو گئی تھی، تو تیرہ
کا ایک خیال حزیں تھی جو اُس کی قبر میں سے نکلا تھا، تو نیرہ کی بھوت تھی، کہیں جلال جنت میں اپنے
پاس بھوت کو بلا کر اپنی جیتی ملکہ، اپنی محبوب حور کو جلائیگا؟ آہ، نہیں، نہیں، یا ربی، یا ربی، میں تجھسے
پناہ مانگتی ہوں، شیطان نے میرے قلب پر قبضہ کر لیا ہے کہ مجھے تیری عدالت سے شبہ کرا رہا ہے،
کیا اسقدر شدید محبت تو نے میرے دل میں اس لیے رکھی کہ میں دنیا اور آخرت میں ہر قسم کی سعادت
سے محروم ہو جاؤں۔ مگر وہ شہید جسے تو نے دولت شہادت عطا کی کیوں تا ابد ایک ہی عورت اس کے
حصہ میں آئے۔ جلال نے نیرہ کو خدا کی راہ میں فدا کیا، میں بھی اپنے تئیں اسی راہ میں فدا کرتی ہوں، جو
نیرہ حسین تھی، میں بھی حسین ہوں گی کیونکہ جلال کہا کرتا تھا کہ میں بالکل نیرہ سے مشابہ ہوں، میں نیرہ
سے رشک نہیں کرتی، وہ مجھسے کیوں رشک کرے گی، جس دن سے کہ جلال پر میری نظر پڑی اس
دن سے میرے دل میں ایک آفتاب کی جگہ تھی، کیا آفتاب سے زیادہ نور کسی چیز میں ہے کہ نیرہ کا عشق
میری محبت پر غالب آجائے۔ آہ، وہ شہید ہوئی اور شہیدوں میں رشک جیسی ذلیل عادت کیوں ہونے
لگی؟ عدالت! مرحمت! اللہ کی عدالت اور جلال کی مرحمت میں پناہ لیتی ہوں، جلال سے، میں دنیا میں

جدا نہ رہ سکتی تھی، آخرت میں اس سے جدائی کی کیونکر متحمل ہو سکوں گی، اگر میں اُن بندوں میں سے ہوں جن میں خدا اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے گا تو جنت میں اس سے جدائی کا جہنمی عذاب اور اگر اس کے مغضوب بندوں میں سے ہوں تو جہنم میں ایک دوسرا عذاب جہنم میرے نصیب میں کرنا اس کی شان سے بعید ہے، آہ، میرے بادشاہ، کیا تو آخرت میں مجھے اپنے پاس سے ہٹا لیگا، آہ جلال ... جلال .....،

جلال الدین - (آنکھ کھول کر) آہ ... اس مغموم آواز سے کیا تم مجھے عقبیٰ سے پھر دنیا میں بلانا چاہتی ہو مہر جہاں -

مہر جہاں - میرے بادشاہ! الحمد للہ آپ عالم حیات میں ہیں -

جلال الدین - نہیں، عالم حیات کو اب جا رہا ہوں ... تمہیں کیا ہو گیا -

مہر جہاں - (جلال کے آغوش میں گر کر) کیا میں نے وعدہ نہیں کیا تھا اے میرے بادشاہ کہ خون میں تیر کر آپ کے پاس پہنچوں گی پیچھے میں نے وعدہ پورا کیا'

جلال الدین - آ، نیرہ تو میری داہنی طرف آ ... تو میری بائیں طرف آ ... عالم بقا کو ... عالم حیات کو ساتھ ساتھ چلیں ... پنجۂ اجل ... اجل ... اب میری روح کو کھینچ ... رہا ہے ... آمنت باللہ ... ورسولہ ... (تسلیم روح کرتا ہے)

مہر جہاں - آہ، ظالم! ... مجھے امید دلانے کے لیے ... مجھے زندگی دیکر پھر مار ڈالنے کے لیے ... اس کی روح اس کے بدن میں ... لوٹ آئی تھی ... کیا میری بدنصیبی جو زندگی بھر ساتھ رہی اب بھی مجھے نہ چھوڑے گی - جلال گیا اور میں زندہ ہوں - (خنجر تین چار دفع اپنے سینہ میں کھبو کر) الٰہی، مجھ عاجز پر جو ملت کو ذلت میں دیکھنا ... اپنے ناموس کو دشمن کے پنجہ میں دینے کے لیے دنیا میں زندہ رہنا نہیں چاہتی رحم کر ... مجھ عاجز پر ... جو محبت کی راہ میں شہید ... ہو رہی ہے رحم کر ... (جلال کے سینہ پر گر کر اور اس کے چہرہ پر نظر گاڑ کے) اللہ، جل جلالہٗ -

(تسلیم روح کرتی ہے) (رحمت اللہ علیہا)

ختم شد

برامکہ

بنو عباسیہ میں جو نمایاں حیثیت برمکیوں کو حاصل ہوئی وہ کسی اور فرقے کو نصیب نہ ہوئی۔ اس خاندان کا جدّ امجد برمک بلخی تھا۔ فی نفسہ برمک کسی مخصوص حیثیت کا آدمی نہ تھا اس نے اپنی تمام زندگی زہد و اتقا میں صرف کی تھی۔

بنو عباسیہ کے عروج سے قبل جب کہ خلیفۂ اول سفاح کی قسمت کا ستارہ گردش میں تھا۔ خالد بن برمک نے اس کا ساتھ دیا اور اس کی تمام پریشانیوں اور دشواریوں میں شریک رہا اور اس طرح سفاح کے دل میں کافی سے زیادہ وقعت حاصل کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوسلمی کی وفات کے بعد وزیر اعظم کے عہدے پر بجز خالد بن برمک کے کسی کا تقرر نہیں کیا جا سکتا تھا خالد بن برمک بھی اپنی زندگی کے دن پورے کر کے ۱۶۳ھ میں دنیا سے سدھارا۔ اس وقت اس کا بیٹا یحییٰ آذربائیجان کی حکومت کا انتظام پانچ سال سے متواتر بحسن و خوبی انجام دے رہا تھا اس نے اپنی قابلیت اور ذہانت کا اثر پبلک کے دل پر عموماً اور بنو عباسیہ کے خلیفۂ سوم مہدی کے دل پر خصوصاً جما لیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ خاندان برمک عروج کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتا ہے۔ مہدی نے یحییٰ بن خالد کو گورنری کے عہدے سے سبک دوش کر کے اپنے بیٹے ہارون الرشید کا معلم و مصاحب مقرر کیا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ یحییٰ بن خالد ہارون کا رضاعی بھائی بھی تھا۔ اکثر مہمات میں بھی یحییٰ ہارون کے ساتھ ساتھ رہا خلیفۂ مہدی کے بعد ہادی کے زمانہ میں بھی یحییٰ بن خالد نے وہی حیثیت حاصل کی جو اُسے گزشتہ زمانہ میں نصیب تھی بہ استثنا اس زمانہ کے جب کہ ہادی کا خیال اپنے بھائی ہارون الرشید کو ادعائے تخت سے محروم کر کے اپنے لڑکے کو ولیعہد بنانے کا تھا۔

یحییٰ بن خالد کا ہارون کو حق ولیعہدی سے دست کش ہونے کا مشورہ نہ دینا علانیہ

پڑ جیتی تھا یحییٰ کا بڑا بیٹا فضل دربار میں موجود تھا اس نے یحییٰ اور ہارون کو تمام معاملات سے آگاہ رکھا اس کا یقینی نتیجہ یہ ہوا کہ فضل کی حیثیت بے انتہا خطرناک ہو گئی۔ خوش قسمت سے ہادی کی عمر کے آخری لمحات آپہونچے اور تمام معاملات خود بخود ٹھیک ہو گئے۔

ہارون نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی یحییٰ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ درحقیقت اس خلیفہ کی کامیابی کا راز اس کے وزیر یحییٰ کی لیاقت اور ذہانت میں مضمر تھا۔ یحییٰ کے بیٹوں میں سب سے زیادہ اہم حیثیت فضل کی تھی جس نے اوائل عہد ہارون میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا اور بعدہٗ ہارون کے بیٹے امین کا معلم مقرر ہوا۔ یحییٰ بن عبداللہ کی بغاوت فرو کرنے کا کام فضل ہی کے سپرد کیا گیا جس نے بغیر خون کا ایک قطرہ بھی گرائے ہوئے ابن عبداللہ کو خلیفہ کے سامنے لا کھڑا کیا اور پھر خود ہی سفارش کر کے آزادی دلوادی۔

اخیر میں فضل "مجازِ مہر حکومت" کے عہدے پر مامور ہوا جس کا چارج خود اس کے بھائی جعفر نے لیا۔

جعفر نے بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح مختلف عہدوں پر نہایت کامیابی سے اپنے فرائض انجام دئے۔ اس نے بہت جلد داروغہ محل سرا کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر مصر کی عنانِ حکومت گرفت میں لی۔ ۱۸۰ھ میں صوبہ شام کی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لئے واپس بلالیا گیا۔ یہ کام اس نے اتنی خوبی سے انجام دیا کہ ہارون نے بے انتہا خوش ہو کر خراسان کی گورنری پر فائز کیا۔

تیسرا بھائی موسیٰ بن یحییٰ درآں حالے کہ سب سے زیادہ بہادر تھا مگر خلیفہ کی نظروں میں وتیع نہ ہونے کی وجہ سے کسی نمایاں حیثیت کا حامل نہ ہو سکا اور آخر کار اپنی زندگی نہایت خاموشی اور زہد و اتقا میں گزاری۔

سب سے چھوٹا بھائی محمد بن یحییٰ کسی بڑے فوجی عہدے پر مامور تھا۔

برامکہ کا یہ عروج دیکھ کر ہارون کے دربار میں مخالفین کی تعداد بھی بڑھ گئی یحییٰ اور اس کے بیٹے اپنے زعم امارت میں تمام دنیاوی طاقتوں سے آزاد ہو چکے تھے ان کی اس بے نیازی

کا ان کے زوال پر بہت بڑا اثر پڑا۔ ہارون ان کے اختیارات ناجائز مصرف سے باخبر ہوکر ان کی نقل وحرکت پر غور کرنے لگا۔ ادھر فضل بن ربیع نے خلیفہ کے کان بھرنے شروع کئے چنانچہ ایک رات یحییٰ بن خالد کو مع جعفر، فضل، موسیٰ اور محمد کے گرفتار کر لیا گیا۔ ہارون کے مصاحب خاص مسرور نے جعفر بن خالد کو خلیفہ کے ایما سے قتل کیا۔ پس ماندگان کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی اور انھیں حراست میں رکھا گیا۔ اس نظر بندی میں انھیں کسی قسم کی جسمانی تکلیف نہیں پہنچائی گئی یہاں تک کہ وہ اپنے اپنے ملازمین بھی اپنے پاس رکھ سکتے تھے مگر ایک سال بعد جب عبدالملک بن صالح بغاوت کے جرم میں گرفتار ہوا اور برامکہ کی اندرونی سازشوں کا حال ظاہر ہو گیا تو خلیفہ فطرتاً اپنے مجرموں کے ساتھ سخت برتاؤ کرنے پر مجبور ہوا۔

وفادار۔ بوڑھے یحییٰ کا سنہ ۱۹۰ھ میں جیل خانہ کی چار دیواریوں کے اندر ہی انتقال ہو گیا۔ اور تین برس بعد سنہ ۱۹۳ھ میں اس کے بڑے بیٹے فضل نے بھی وفات پائی موسیٰ اور محمد اپنے بھائی اور باپ کی وفات کے بعد رہا کر دئے گئے۔ مگر عبدالملک بن صالح بدستور امین کی تاج پوشی کے وقت تک مقید رہا بعدہٗ وہ بھی آزاد کر کے شام کا حاکم مقرر کیا گیا۔

مامون الرشید کے تخت پر بیٹھتے ہی برمکیوں کو پھر وہی دیرینہ اختیارات واپس دے دئے مگر بے سود!

مینا زبیری مارہروی (علیگ)

صبح غم

(سردار انور متعلم بی اے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

(۱)
پچھلی پہر کو جب میں گلشن میں رو رہا تھا
امید زندگی سے بیکار لڑ رہی تھی
عالم تمام غفلت کی نیند سو رہا تھا
دل میں دھواں اٹھا تھا اور اس پر بن رہی تھی

(۲)
بن بن کے جا رہے تھے بادل سے آسماں پر
پہنے ہوئے فضا تھی اپنا لباس ماتم
تھا سایۂ خموشی چھایا ہوا جہاں پر
منظر عجب بھیانک تھا چار سو شب غم

(۳)
بلبل کے بند لب تھے گھٹتا تھا دم قفس میں
سینے میں تھی جلن سی زخموں کی تازگی سی
گرتی تھیں بجلیاں سو ہر آہ نفس میں
اک شمع جل رہی تھی اور تھی دبی ہوئی سی

(۴)
کچھ دور اک بلندی پر گوشۂ چمن میں
یوں ٹمٹما رہی تھی اک شمع سوختہ دل
رخ زرد ہونٹ نیلے خوں آگ تن میں
یعنی خزاں رسیدہ تھی سب بہار محفل

(۵)
ہونے لگی یکایک پتوں میں ایک آہٹ
اک جانفزا سحر کی پیچھے سے راہ نکلی
خنکی ہوئی فضا میں اور دل میں تھرتھراہٹ
میں کانپنے لگا پھر اور منہ سے آہ نکلی

(۶)
تھا تار تار تاروں سے آسماں کا دامن
ابر سیاہ ٹکڑے ہو ہو کے اڑ رہا تھا
تارے دکھا رہے تھے حسرت سے چشم پُرنم
ویران و سیہ ارماں پھٹ پھٹ کے جھڑ رہا تھا

(۷)
منہ چاند بادلوں سے اپنا نکالتا تھا
تھا واقعہ سے دل کا عکس اب اترنے والا
چادر کھسک رہی تھی وہ سر پہ ڈالتا تھا
حیرت سے دیکھتا تھا ہر خواب مرنے والا

(۸)
رت گرمیوں کی ہے یہ اور چار بج رہے ہیں
بچھیں جگر ہیں کلیوں کے چاک ہونے والے
میری لحد پہ جانے کو پھول سج رہے ہیں
ہمراہ دل کے ارماں ہیں خاک ہونے والے

(۹)
القصہ چاندنی نے تن دیں بال کھولے
ناؤں نے الوداعی اک اور گیت گایا
سنتی تھی رات چپکی اپنے پروں کو تولے
یعنی پلٹ رہی تھی یک لخت ساری کایا

(۱۰)
آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور پتلیاں تھیں بھاری
زردی سی چھا رہی تھی ارض و سما پہ پیہم
گرمی گل کے دل پر خور پر ہوئی تھی طاری
ٹھنڈا تھا میرا سینہ تھی سانس صرف ماتم

(۱۱)
پر اشک ہائے شبنم سے سبز باغ تھا اب
تھا شور و غل پرندوں میں اور میں تھا غافل
یعنی حیات عاشق کا گل چراغ تھا اب
برسوں میں اڑ چکا ہوں یا جسم کے رنگ محفل

(۱۲)
جنت کے در کھلے تھے خوشبو میں آ رہی تھیں
آنکھوں کے سامنے اک دنیا سرِ عیاں تھی
خوش آمدید کہہ کر حوریں بلا رہی تھیں
جان وجگر کی ہستی میں شان [illegible]

تھی شفق کا سیرے قول کے ثبوت میں تھا
[illegible] من چہرہ [illegible] کی تھی قدرت

بس آنکھ کھل گئی پھر میں اک [illegible]
[illegible] زندگی میں [illegible]

علی گڑھ میگزین

جلد (۳)	بابت ماہ مئی و جون سنہ ۱۹۲۵ء	قیمت سالانہ مع محصول ڈاک للعہ
نمبر (۱۱ و ۱۲)		قیمت فی رسالہ مرادی ۸ر

فہرست مضامین

مرتبہ: محمد اشفاق حسین صدیقی بیخود

مطبوعہ و پبلشر محمد مقتدی خاں شروانی بمطبع مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ

شذرات

منطق کا مشہور اور مستحکم قانون کہ "اجتماع ضدین محال ہے" مئی اور جون کے مہینوں میں بالکل باطل نظر آتا ہے۔ موسم کی گرما گرمی اور اسی کے پہلو بہ پہلو ہماری یونیورسٹی کے طلبا کے مشاغل میں سرد بازاری ایک عجیب و غریب منظّرہ ہے۔ امتحان کا قرب اور تعلیمی انہماک معنًا ایک ہی چیز ہیں جس طرف نظر اٹھائیے جس شعبہ کو دیکھئے ایک مخصوص سکوت کا عمل ہے۔ یونین میں عنادل یونیورسٹی کی نغمہ خوانی کرکٹ لان پر وہ دل کش "ہٹ" کی آوازیں افسانہ ماضی ہو گئیں۔ غرض ایک خاموشی ہے کہ ہر شے پر مسلط ہے۔ امتحان کا جادو بھی کیا جادو ہے "کہ سر پر چڑھ کر بولتا ہے" کہاں ہیں وہ احباب زندہ دل جن کی زندگی کے بیشتر اوقات لہو و لعب میں بسر ہوتے تھے ع

حیف در چشم زدن ....

وہ نشۂ کیف آور اور وہ سرور خواب آلود یک لخت ایسا مبدل ہو گیا کہ چہار جانب ایک پریشان کن بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ زندہ روحیں مردہ پڑ گئیں۔ امتحان نے سارے سبق بھلا دئے بجز کتب بینی کے کوئی مشغلہ باقی نہ رہا۔ یاران طریقت نے پڑھائی میں دن رات ایک کر دئے۔ یہ منظر گو دل فریب نہ ہو مگر ناگوار نہیں اس لئے

کہ آئندہ مسرت وشادمانی کا راز اسی میں مضمر ہو عمل جب ایسا ہو تو نتیجہ اچھا کیوں نہ ہو
طرفہ تماشہ یہ ہو کہ بعض اصحاب اس شجر امید کی بار آوری کا سبب باغبان کی آبیاری
ہی کو سمجھے ہوئے ہیں واقعہ یہ ہو کہ مسلم یونیورسٹی کے امتحانات جد وجہد کے لئے
اپنے اندر ایک زبردست داعیہ رکھتے ہیں الحمدللہ الہ آباد یونیورسٹی کا وہ قدیم دور
نادرشاہی ختم ہو گیا معقولین کہن بھی یہی مصرعہ پڑھ رہی ہیں ؎

ثم باذن اللہ کتنی آئی گلشن میں بہار

یہ سیشن جو منزل اختتام کو پہونچ چکا ہو کیا بہ لحاظ آغاز اور کیا بہ اعتبار انجام
سالہا سال ہماری یاد سے فراموش نہ ہوگا۔ اس کی خصوصیات اس قدر گوناگوں ہیں
اور ہر پہلو سے یہ اس درجہ مفید نتائج کا حامل ہو کہ محتاج تشریح نہیں۔ ابتدا کی
رنگینیاں اور پرکیف حالات تو سب کو معلوم ہیں لیکن اُن کی انتہا بھی عجب عجب
دلچسپ چہل پہل اور مہتم بالشان واقعہ کی تیاری پر ختم ہو رہی ہو۔ غرض ؎

کیا خوب ابتدا تھی کیا خوب انتہا ہے

البتہ تصویر کا دوسرا رخ کسی قدر افسردگی اور پژمردگی کا پیام رساں ہو۔ یعنی
احباب قدیم کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا نہایت ہی روح فرسا ہو لیکن۔

دیدۂ سعدیؔ و دل ہمراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

جوانامرگ

قاعدہ ہے کہ "ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے" خوشی کی قدر رنج کے بعد اور آرام کی عافیت مصیبت کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ یہ ہمارا دور اس کلیہ سے مستثنا رہتا۔ اور گلشنِ بے خار کے نام سے ملقب ہوتا۔ ہمارے برادر عزیز عبدالرحمٰن مرحوم اپنی نیکی طبع اور پابندی صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے اپنے حلقۂ احباب میں خصوصاً اور طلبائے یونیورسٹی میں عموماً نہایت ہی ہر دل عزیز تھے اُن کا ہمیشہ کے لئے اس عالم آب و گِل سے اس طرح رخصت ہو جانا اور اس الم ناک طریقہ پر طالب آب بقا ہونا کافی روح فرسا اور جاں کاہ ہے۔ قاضی جلال الدین صاحب جلالؔ کا قطعہ تاریخ ملاحظہ ہو جو قطعہ تاریخ کی حیثیت سے فی الحقیقت عدیم المثال ہے۔

قطعہ

عبدالرحمٰن اے جوانِ صالح ۔۔۔ رفتن بہ کجا۔ کجا ترا دریابم

در بحر محیط رحمت یزدانی ۔۔۔ گفتا زرہ شکر کہ من غرقابم

۱۳۴۳ھ

انجمن القرض

اس انجمن کی اہمیت اور خدمات سے کون ہے جو ناواقف ہے۔ آج ملک میں سینکڑوں کیا بلکہ ہزاروں کی تعداد میں ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ موجود ہیں کہ جن کی تعلیم بلامعاونت انجمن مذکور قطعی ناممکن تھی۔ مسلمان جیسی تباہ حال اور تہی دست قوم کے لئے ایسی انجمن کا موجود ہونا جو نادار اور غیر مستطیع طلبا کے لئے تعلیمی مصارف کی کفیل ہو کس قدر ضروری ہے۔ کچھ عرصہ سے قوم کی جانب سے جو غفلت اس انجمن کے متعلق برتی گئی۔ وہ کارکنان انجمن کے لئے حد درجہ ہمت شکن تھی لیکن بحمداللہ امسال ہماری کوششیں کم وبیش امید افزا رہیں۔ گزشتہ سیشن میں ڈیوٹی کے پاس صرف سات ہزار روپیہ کی رقم موجود تھی لیکن امین اور نائب امین و دیگر حضرات کی کوششوں سے امسال بارہ ہزار روپیہ کے وظایف طلبا کو دئے گئے اور سترہ ہزار روپیہ کے قریب انجمن کے پاس موجود ہے۔

یہ رقم مجموعی حیثیت سے انجمن کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی اس لئے کہ ہر سال تیس چالیس ہزار روپیہ کے وظایف طلبا کو تقسیم کر دئے جاتے ہیں۔ انجمن کی زندگی کا یہ پہلا منحوس سال ہے اُس نے صرف سات ہزار کے سرمایہ سے سینکڑوں احباب کی کفالت کی۔

(اڈیٹر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ میگزین

جلد (۳) نمبر (۱۱ و ۱۲)	بابت ماہ مئی و جون ۱۹۲۵ء	قیمت سالانہ چار روپیہ مع محصول ڈاک قیمت فی رسالہ مرادی ۴ر

فلسفہ عقائد اسلام

مذہبی خیال کا نام عقیدہ اور عقیدہ کی جمع عقائد ہی۔ لا الٰہ اللہ محمد رسول اللہ کہنا آنحضرت کے زمانہ میں داخل اسلام ہونے کے لیے کافی تھا۔ رسالت قرآن کے ذریعہ سے تھی۔ قرآن کا برحق جاننا محمد رسول اللہ کہنے میں داخل تھا پھر علما نے یہ شرط لگائی کہ ایمان اجمالی کے لئے قرآن کے تمام احکام کو وہ معلوم ہوں یا نہوں برحق جاننا کافی ہی۔ قرآن محمد تک بذریعہ فرشتہ کے پہونچا اور گذشتہ پیغمبروں کے پاس صحائف اور کتابیں بھی اس طرح آئی تھیں۔ اس لئے گویا مسلمانوں کو اللہ، اللہ کے ملائک، اللہ کی کتابیں اور اللہ کے رسولوں کا ماننا بھی لازم آیا۔ لیکن یہ سب باتیں کچھ جدید نہیں ہیں لا الٰہ اللہ محمد رسول اللہ کے تحت میں داخل ہیں۔ پھر بھی احتیاطاً جب

کسی کے اسلام کی جانچ مقصود ہوتی ہے تو یہ سب باتیں اس مدعی اسلام سے کہلوائی جاتی ہیں اور زبانِ عربی میں اس کے لئے یہ عبارت ہے۔ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ زن مومنہ کا عقد غیر مومن کے ساتھ جائز نہیں ہوتا اسی وجہ سے نوشہ سے نکاح کے وقت اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ پڑھواتے ہیں ورنہ مسلمانوں میں نکاح کے لئے محض ایجاب و قبول اور دو گواہوں کی ضرورت ہے۔

مدت تک محض لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا اسلام کے لئے کافی سمجھا گیا۔ لیکن ضرورت زمانہ نے مجبور کیا کہ ایمان اجمالی کے بجائے ایمان تفصیلی سے لوگ آگاہ کئے جائیں تاکہ یونانی فلسفہ اور ایرانی اور ہندوستانی علوم معقول کی آمیزش سے جو دین اسلام میں دہریوں اور زنادقہ کا ایک فرقہ قائم ہو چلا تھا وہ مسلمانوں سے الگ رہے۔ یہاں تک تو خیر چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن زنادقہ کے مقابلے میں جو متکلمین اُٹھے ان میں بھی اہم اختلافات واقع ہوئے اور ایک دوسرے کو غیر ناجی کہنے لگا اور شیعوں کے عقائد کی تکذیب الگ۔ اہل سنت وجماعت کو لازم آئی کہ مسلمانوں کی کثرت رائے پر عمل کرنے والے ہمیشہ سے اپنے آپ کو سب میں بہتر سمجھتے تھے اور اختلافات کے مٹانے کی فکر رکھتے تھے اور یہ اہل سنت وجماعت کہلاتے تھے۔ خاندان نبوت سے حدیثوں کے سننے والے اپنے آپ کو شیعہ کہتے تھے۔ ان میں سے بعض سات امام کو مانتے تھے اور بعض بارہ امام مانتے تھے۔ اوّل الذکر اسماعیلیہ اور ثانی الذکر اثنا عشریہ کہلاتے تھے۔ ان شیعوں میں سے پہلے حکومت اسماعیلیوں کو ملی اس لئے ان کا زور بڑھ گیا اور سنیوں میں یہ باطنیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ متکلمین کے تین فرقے مشہور ہوئے اشعریہ، ماتریدیہ، معتزلہ۔ اثنا عشریہ کی جماعت الگ نہ تھی لیکن اثنا عشریہ کا رجحان معتزلہ کی طرف تھا۔ اُن لوگوں کی بھی ایک جماعت تھی جو علم کلام کو عبث جانتے تھے اور قرآن اور حدیث میں تاویل کرنا بُرا جانتے تھے۔ یہ فرقہ حنبلیہ کہلاتا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ چار ائمہ فقہ امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام حنبلؒ میں امام حنبل وہ فقیہ تھے جو مسائل فقہ میں بھی عقل کا دخل در معقولات بہت کم پسند کرتے تھے۔ اب

اعتقادات میں جو موشگافیاں شروع ہوئیں تو اِن سے دُور رہنے والے حنبلی مشہور ہو گئے۔
غرض کہ زمانہ وسطیٰ یعنی الپ ارسلان، ملک شاہ سلجوقی اور سلطان سنجر کی شاہنشاہی کے زمانہ
میں علما رمذہب کے پانچ مشہور فرقے تھے۔ اشعریہ - ماتریدیہ - معتزلہ - باطنیہ - حنبلیہ۔ سلجوقیوں کا
مذہب حنبلیہ تھا اور مشرق میں اسی کا بڑا زور تھا۔ شاید اسی زمانہ میں یا اس کے قریب زمانہ میں
اہلِ سنت وجماعت کی ہدایت کے لیے عقائد نسفی تصنیف ہو کر داخل درس ہوئی اور اس میں ایمان
تفصیلی کا بیان ہوا۔

اکبر اور جہانگیر کے عہد میں اثنا عشریوں کا بوجہ شاہان صفوی کے بڑا زور رہا اور اثنا عشری
اہلِ سنت وجماعت سے اپنی نمازیں الگ پڑھنے لگے اور ہندوستان کے اسلام کا تو یہ رنگ
ہوا کہ ہندوؤں کے مذہب کی ایک نئی شاخ بن کر یہ رہ گیا۔ یہ زمانہ مجدد الف ثانی سرہندی کا
تھا۔ ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ایمان تفصیلی کا وعظ اہلِ ملک کو سُنائیں۔ اور ضرورت زمانہ
کے مطابق ایمان کو مفصلاً بیان کریں۔ اس بارے میں بہت سے مکتوبات انھوں نے لکھے ہیں
منجملہ ان کے دفتر دوم میں مکتوب ۶۷ بنام خانجہان رکن سلطنت جہانگیری ہے جس کا خلاصہ
یہ ہے :-

۱- اللہ تعالیٰ اپنے ذات قدیم کے ساتھ موجود ہے اور تمام اشیا اس کے ایجاد سے
موجود ہوئی ہیں۔ حق تعالیٰ قدیم اور ازلی ہے اور تمام اشیا حادث اور نو پیدا ہیں اور فانی ہیں
۲- حق تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی شریک وجود وجوب اور استحقاق عبادت میں
نہیں ہے۔

۳- حق تعالیٰ کی صفات کاملہ میں سے حیات - علم - قدرت - ارادت - سمع - بصر
کلام اور تکوین ہیں۔ اور یہ سب صفات ثمانیہ قدم اور ازلیت کے متصف ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات
کے ساتھ قائم ہیں۔ حوادث کا تعلق صفات کے قدم میں خلل نہیں ڈالتا۔ فلاسفہ اپنی بے وقوفی
سے اور معتزلہ نابینائی سے متعلق کے حدوث سے متعلق کے حدوث کے قائل ہیں اور صفات

ثانیہ کی نفی کرتے ہیں اور خدا کو جزئیات کا عالم نہیں جانتے۔

۴- حق تعالیٰ سے تمام ناقص صفتیں مسلوب ہیں۔ حق تعالیٰ جواہر اجسام اور اعراض کے صفات و لوازم سے منزہ اور مبرا ہے۔ یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کو عرش کے اوپر جانیں اور فوق کی طرف اشارہ کریں۔ کیوں کہ عرش اور اس کے ماسوا سب حادثات سے ہیں اور اُسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ مخلوق و حادث کی مجال نہیں ہے کہ خالق قدیم کا مکان اور جائے قرار بن سکے۔ ہاں عرش اس کے تمام مخلوقات سے اشرف ہے اور آئینہ بننے کا حکم رکھتا ہے۔ اور حق تعالیٰ کی عظمت و کبریا کا وہ مظہر ہے۔ اسی ظہور کے لگاؤ سے اسے عرش اللہ کہتے ہیں۔

۵- حق تعالیٰ نہ جسم ہے نہ جسمانی ہے نہ جوہر ہے نہ عرض ہے، نہ محدود ہے نہ متناہی ہے نہ طویل ہے نہ عریض ہے، نہ دراز ہے، نہ کوتاہ ہے، نہ فراخ ہے نہ تنگ ہے۔ ہاں وہ واسع ہے لیکن ایسی وسعت کے ساتھ نہیں جو ہمارے فہم میں آئے وہ محیط ہے لیکن ایسے احاطہ کے ساتھ نہیں جو ہمارے ادراک میں آسکے۔ وہ قریب ہے لیکن ایسی قربت کے ساتھ جو ہماری عقل میں نہیں آسکتی۔ وہ ہمارے ساتھ ہے لیکن ایسی معیت اُس کی نہیں ہے جو مشہور و معروف ہے۔

۶- حق تعالیٰ کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں ہوتا اور نہ کوئی چیز اس کے ساتھ متحد ہوتی نہ اس میں کوئی شے حلول کرتی اور نہ وہ کسی میں حلول کرتا۔ تبعض، تجزی، ترکیب اور تحلیل سے اس کی جناب دور ہے۔

۷- حق تعالیٰ کا کوئی مثل یا مساوی نہیں ہے۔ نہ اُس کے بی بی ہے نہ لڑکا ہے۔ اس کی ذات و صفات بے چون اور بے چگون ہے اور بے شبہ و بے مانند ہیں۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ حق تعالےٰ ہے اور اُن صفات کاملہ کے ساتھ ہے جن سے اُس نے اپنی تعریف کی ہے۔ لیکن جو کچھ ہمارے فہم، ادراک، عقل اور تصور میں آسکتا ہے اس سے حق تعالیٰ منزہ اور برتر ہے۔

۸- اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسما ہیں۔ لیکن جو اسما شرع سے مروی ہیں صرف انھیں کا

اطلاق اس کی ذات پر کرنا چاہیئے۔ مثلاً جواد اور سخی کا ایک مطلب ہے۔ لیکن خدا کو جواد کہنا چاہیئے سخی نہیں کہنا چاہیئے کیوں کہ شرع میں جواد کا لفظ خدا کے لئے ہے۔

۹۔ قرآن حق تعالےٰ کا کلام ہے جسے حرف اور آواز کا لباس دے کر آنحضرت محمد صلعم پر حق تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اور یہی کیفیت دیگر کتب وصحفِ آسمانی کی ہے۔ کلام کی دو قسمیں ہیں لفظی اور نفسی۔ دونوں اعتبار سے کلام اللہ کلام اللہ ہے۔

۱۰۔ مومن حق تعالیٰ کو بہشت میں بے جہت وبے مقابلہ وبے کیف وبے احاطہ دیکھیں گے لیکن اس کی کیفیت ہم نہیں جانتے کیوں کہ حق تعالیٰ کی رویت بیچوں ہے اور اس جہان میں اس کی حقیقت ارباب چون پر ظاہر نہیں ہوتی۔ فلاسفہ اور معتزلہ اور دیگر بدجہتی گروہوں پر افسوس ہے کہ وہ حرمان اور کوری کی وجہ سے دیدار آخرت کے منکر ہیں۔

۱۱۔ حق تعالیٰ بندوں کا خالق اور بندوں کے افعال کا بھی خالق ہے۔ افعال خیر ہوں یا شر ہوں، سب اُسی کی تقدیر سے ہیں۔ لیکن خیر سے وہ راضی ہے اور شر سے راضی نہیں ہے، اگرچہ دونوں اُسی کے ارادے اور مشیت سے ہیں۔ لیکن صرف شر کو ادب کے باعث حق تعالےٰ کی طرف منسوب نہ کرنا چاہیئے اور اسے خالقِ شر نہ کہنا چاہیئے بلکہ خالق خیر و شر کہنا مناسب ہے اور اسی لئے علما نے حق تعالیٰ کو خالق کل شئے کہا ہے۔ معتزلہ دوئی اور بیگانگی کے باعث بندہ کو افعال کا خالق کہتے ہیں اور فعل کے خیر و شر کو بندے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ شرع اور عقل ان کی تکذیب کرتی ہے۔ ہاں علمارِ حق نے بندے کی قدرت کو اُس کے فعل میں دخل کیا ہے اور اُس کا کسب بندے میں ثابت کیا ہے، کیوں کہ حرکت مرتعش یعنی حرکت بے اختیاری اور حرکتِ مختار میں فرق ظاہر ہے۔ حرکت ارتعاش میں بندے کا کچھ دخل نہیں ہے اور حرکت اختیاری میں اُس کا دخل ہے۔ یہی فرق مواخذہ کا باعث ہوجاتا ہے۔ اور ثواب وعقاب ثابت کرتا ہے۔

۱۲۔ انبیا علیہم السّلام حق تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں اور سب کے خاتم آنحضرت محمد صلعم ہیں۔

۱۳۔ جو کچھ آنحضرت محمد صلعم نے احوالِ آخرت کے متعلق خبر دی ہے سب سچ ہے۔ یعنی

ثمانیہ کی نفی کرتے ہیں اور خدا کو جزئیات کا عالم نہیں جانتے۔

۴- حق تعالیٰ سے تمام ناقص صفتیں مسلوب ہیں۔ حق تعالیٰ جواہر اجسام اور اعراض کے صفات و لوازم سے منزّہ اور مبرّا ہی۔ یہ بھی مناسب نہیں ہی کہ حق تعالےٰ کو عرش کے اوپر جانیں اور فوق کی طرف اشارہ کریں۔ کیوں کہ عرش اور اس کے ماسوا سب حادثات سے ہیں اور اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ مخلوق و حادث کی مجال نہیں ہی کہ خالق قدیم کا مکان اور جائے قرار بن سکے۔ ہاں عرش اس کے تمام مخلوقات سے اشرف ہی اور آئینہ بننے کا حکم رکھتا ہی۔ اور حق تعالیٰ کی عظمت و کبریا کا وہ مظہر ہی۔ اسی ظہور کے لگاؤ سے اسے عرش اللہ کہتے کہتے ہیں۔

۵- حق تعالےٰ نہ جسم ہی نہ جسمانی ہی نہ جوہر ہے نہ عرض ہی، نہ محدود ہی نہ متناہی ہی نہ طویل ہی نہ عریض ہی، نہ دراز ہے، نہ کوتاہ ہے، نہ فراخ ہی نہ تنگ ہی۔ ہاں وہ واسع ہی لیکن ایسی وسعت کے ساتھ نہیں جو ہمارے فہم میں آئے وہ محیط ہی لیکن ایسے احاطہ کے ساتھ نہیں جو ہمارے ادراک میں آسکے۔ وہ قریب ہی لیکن ایسی قربت کے ساتھ جو ہماری عقل میں نہیں آسکتی۔ وہ ہمارے ساتھ ہی لیکن ایسی معیت اُس کی نہیں ہی جو مشہور و معروف ہی۔

۶- حق تعالیٰ کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں ہوتا اور نہ کوئی چیز اس کے ساتھ متحد ہوتی نہ اس میں کوئی شے حلول کرتی اور نہ وہ کسی میں حلول کرتا۔ تبعض، تجزی، ترکیب اور تحلیل سے اس کی جناب دور ہی۔

۷- حق تعالیٰ کا کوئی مثل یا مساوی نہیں ہی۔ نہ اُس کے بی بی ہی نہ لڑکا ہی۔ اس کی ذات و صفات سب بے چون اور بے چگون ہی اور بے شبہ و بے مانند ہیں۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ حق تعالےٰ ہی اور اُن صفات کاملہ کے ساتھ ہی جن سے اُس نے اپنی تعریف کی ہی۔ لیکن جو کچھ ہمارے فہم، ادراک، عقل اور تصور میں آسکتا ہی اس سے حق تعالیٰ منزّہ اور برتر ہی۔

۸- اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسما ہیں لیکن جو اسما شرع سے مروی ہیں صرف انھیں کا

اطلاق اس کی ذات پر کرنا چاہیئے۔ مثلاً جواد اور سخی کا ایک مطلب ہے۔ لیکن خدا کو جواد کہنا چاہیئے سخی نہیں کہنا چاہیئے کیوں کہ شرع میں جواد کا لفظ خدا کے لئے ہے۔

۹۔ قرآن حق تعالیٰ کا کلام ہے جسے حرف اور آواز کا لباس دے کر آنحضرت محمد صلعم پر حق تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اور یہی کیفیت دیگر کتب و صحفِ آسمانی کی ہے۔ کلام کی دو قسمیں ہیں لفظی اور نفسی۔ دونوں اعتبار سے کلام اللہ کلام اللہ ہے۔

۱۰۔ مومن حق تعالیٰ کو بہشت میں بے جہت و بے مقابلہ و بے کیف و بے احاطہ دیکھیں گے لیکن اس کی کیفیت ہم نہیں جانتے کیوں کہ حق تعالیٰ کی رویت بیچوں ہے اور اس جہان میں اس کی حقیقت ارباب چون پر ظاہر نہیں ہوتی۔ فلاسفہ اور معتزلہ اور دیگر بدجہتی گروہوں پر افسوس ہے کہ وہ حرمان اور کوری کی وجہ سے دیدارِ آخرت کے منکر ہیں۔

۱۱۔ حق تعالیٰ بندوں کا خالق اور بندوں کے افعال کا بھی خالق ہے۔ افعال خیر ہوں یا شر ہوں، سب اُسی کی تقدیر سے ہیں۔ لیکن خیر سے وہ رضی ہے اور شر سے راضی نہیں ہے، اگرچہ دونوں اُسی کے ارادے اور مشیت سے ہیں۔ لیکن صرف شر کو ادب کے باعث حق تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کرنا چاہیئے اور اسے خالقِ شر نہ کہنا چاہیئے بلکہ خالقِ خیر و شر کہنا مناسب ہے اور اسی لئے علما نے حق تعالیٰ کو خالق کل شئے کہا ہے۔ معتزلہ دوئی اور بیگانگی کے باعث بندہ کو افعال کا خالق کہتے ہیں اور فعل کے خیر و شر کو بندے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ شرع اور عقل ان کی تکذیب کرتی ہے۔ ہاں علماء حق نے بندے کی قدرت کو اُس کے فعل میں دخل کیا ہے اور اُس کا کسب بندے میں ثابت کیا ہے کیوں کہ حرکت مرتعش یعنی حرکت بے اختیاری اور حرکتِ مختار میں فرق ظاہر ہے۔ حرکت ارتعاش میں بندے کا کچھ دخل نہیں ہے اور حرکت اختیاری میں اُس کا دخل ہے۔ یہی فرق مواخذہ کا باعث ہو جاتا ہے۔ اور ثواب و عقاب ثابت کرتا ہے۔

۱۲۔ انبیا علیہم السّلام حق تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں اور سب کے خاتم آنحضرت محمد صلعم ہیں۔

۱۳۔ جو کچھ آنحضرت محمد صلعم نے احوالِ آخرت کے متعلق خبر دی ہے سب سچ ہے۔ یعنی

ثمانیہ کی نفی کرتے ہیں اور خدا کو جزئیات کا عالم نہیں جانتے۔

۴۔ حق تعالیٰ سے تمام ناقص صفتیں مسلوب ہیں۔ حق تعالیٰ جواہر اجسام اور اعراض کے صفات و لوازم سے منزّہ اور مُبرّا ہی۔ یہ بھی مناسب نہیں ہی کہ حق تعالےٰ کو عرش کے اوپر جانیں اور فوق کی طرف اشارہ کریں۔ کیوں کہ عرش اور اس کے ماسوا سب حادثات سے ہیں اور اُسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ مخلوق و حادث کی مجال نہیں ہی کہ خالق قدیم کا مکان اور جائے قرار بن سکے۔ ہاں عرش اس کے تمام مخلوقات سے اشرف ہی اور آئینہ بننے کا حکم رکھتا ہی۔ اور حق تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا مظہر ہی۔ اسی ظہور کے لگاؤ سے اسے عرش اللہ کہتے کہتے ہیں۔

۵۔ حق تعالےٰ نہ جسم ہی نہ جسمانی ہی نہ جوہر ہے نہ عرض ہی، نہ محدود ہی نہ متناہی ہی نہ طویل ہی نہ عریض ہی، نہ درازہے، نہ کوتاہ ہے، نہ فراخ ہی نہ تنگ ہی۔ ہاں وہ واسع ہی لیکن ایسی وسعت کے ساتھ نہیں جو ہمارے فہم میں آئے وہ محیط ہی لیکن لیسے احاطہ کے ساتھ نہیں جو ہمارے ادراک میں آسکے۔ وہ قریب ہی لیکن ایسی قربت کے ساتھ جو ہماری عقل میں نہیں آسکتی۔ وہ ہمارے ساتھ ہی لیکن ایسی معیّت اُس کی نہیں ہی جو مشہور و معروف ہی۔

۶۔ حق تعالیٰ کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں ہوتا اور نہ کوئی چیز اس کے ساتھ متحد ہوتی نہ اس میں کوئی شے حُلول کرتی اور نہ وہ کسی میں حلول کرتا۔ تبعض، تجزی، ترکیب اور تحلیل سے اس کی جناب دور ہی۔

۷۔ حق تعالیٰ کا کوئی مثل یا مساوی نہیں ہی۔ نہ اُس کے بی بی ہی نہ لڑکا ہی۔ اس کی ذات و صفات بے چون اور بے چگون ہی اور بے شبہ و بے مانند ہیں۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ حق تعالےٰ ہی اور اُن صفات کاملہ کے ساتھ ہی جن سے اُس نے اپنی تعریف کی ہی۔ لیکن جو کچھ ہمارے فہم، ادراک، عقل اور تصور میں آسکتا ہی اس سے حق تعالیٰ منزّہ اور برتر ہی۔

۸۔ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسما ہیں لیکن جو اسما شرع سے مروی ہیں صرف انھیں کا

اطلاق اس کی ذات پر کرنا چاہیئے۔ مثلاً جواد اور سخی کا ایک مطلب ہے۔ لیکن خدا کو جواد کہنا چاہیئے سخی نہیں کہنا چاہیئے کیوں کہ شرع میں جواد کا لفظ خدا کے لئے ہے۔

۹۔ قرآن حق تعالیٰ کا کلام ہے جسے حرف اور آواز کا لباس دے کر آنحضرت محمد صلعم پر حق تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اور یہی کیفیت دیگر کتب و صحفِ آسمانی کی ہے۔ کلام کی دو قسمیں ہیں لفظی اور نفسی۔ دونوں اعتبار سے کلام اللہ کلام اللہ ہے۔

۱۰۔ مومن حق تعالیٰ کو بہشت میں بے جہت و بے مقابلہ و بے کیف و بے احاطہ دیکھیں گے لیکن اس کی کیفیت ہم نہیں جانتے کیوں کہ حق تعالیٰ کی رویت بیچوں ہے اور اس جہان میں اس کی حقیقت ارباب چون پر ظاہر نہیں ہوتی۔ فلاسفہ اور معتزلہ اور دیگر بدبختی گروہوں پر افسوس ہے کہ وہ حرمان اور کوری کی وجہ سے دیدار آخرت کے منکر ہیں۔

۱۱۔ حق تعالیٰ بندوں کا خالق اور بندوں کے افعال کا بھی خالق ہے۔ افعال خیر ہوں یا شر ہوں، سب اُسی کی تقدیر سے ہیں۔ لیکن خیر سے وہ راضی ہے اور شر سے راضی نہیں ہے، اگرچہ دونوں اُسی کے ارادے اور مشیت سے ہیں۔ لیکن صرف شر کو ادب کے باعث حق تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کرنا چاہیئے اور اسے خالقِ شر نہ کہنا چاہیئے بلکہ خالق خیر و شر کہنا مناسب ہے اور اسی لئے علما نے حق تعالیٰ کو خالق کل شئے کہا ہے۔ معتزلہ دوئی اور بیگانگی کے باعث بندہ کو افعال کا خالق کہتے ہیں اور فعل کے خیر و شر کو بندے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ شرع اور عقل ان کی تکذیب کرتی ہے۔ ہاں علماء حق نے بندے کی قدرت کو اُس کے فعل میں دخل کیا ہے اور اُس کا کسب بندے میں ثابت کیا ہے کیوں کہ حرکت مرتعش یعنی حرکت بے اختیاری اور حرکتِ مختار میں فرق ظاہر ہے۔ حرکت ارتعاش میں بندے کا کچھ دخل نہیں ہے اور حرکت اختیاری میں اُس کا دخل ہے۔ یہی فرق مواخذہ کا باعث ہوجاتا ہے۔ اور ثواب و عقاب ثابت کرتا ہے۔

۱۲۔ انبیا علیہم السّلام حق تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں اور سب کے خاتم آنحضرت محمد صلعم ہیں۔

۱۳۔ جو کچھ آنحضرت محمد صلعم نے احوالِ آخرت کے متعلق خبر دی ہے سب سچ ہے۔ یعنی

قبر کا عذاب۔ قبر کی تنگی، منکر و نکیر کا سوال، جہان کا فنا ہونا، آسمانوں کا پھٹ جانا، ستاروں کا پراگندہ ہونا، زمین اور پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہونا، مرنے کے بعد جی اٹھنا، روح کا جسم میں واپس آنا۔ قیامت کا زلزلہ اور خوف۔ اعمال کا حساب، اعمال پر اعضا کی شہادت، نیک و بد اعمال نامے کا دائیں بائیں ہاتھ میں اڑ کر آنا۔ برے بھلے اعمال کے تولنے کے لئے میزان کا قائم ہونا۔

۱۴۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور صالحین امت کی شفاعت برحق ہے لیکن یہ شفاعتیں اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوں گی۔

۱۵۔ پل صراط برحق ہے۔ دوزخ کی پشت پر اسے رکھیں گے مومن اسے عبور کر بہشت میں جائیں گے اور کافر پھسل پھسل کر دوزخ میں گریں گے۔

۱۶۔ بہشت مومنوں کے آرام کے لئے ہے اور دوزخ کافروں کے عذاب کے لئے ہے۔ یہ دونوں مخلوق ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گے۔

۱۷۔ جس کے دل میں ذرا ایمان ہوگا وہ دوزخ سے نکال لیا جائیگا بقدر گناہ عذاب بھگتنے کے بعد۔

۱۸۔ فرشتے حق تعالیٰ کے بندے ہیں اور احکام الٰہی بجا لاتے ہیں نہ وہ عورت ہیں اور نہ مرد نہ اُن میں توالد ہے نہ تناسل ہے۔

۱۹۔ جو احکام دین کے تواتر اور ضرورت کے ساتھ مجمل اور مفصل طور پر ہم تک پہنچے ہیں۔ ان کے متعلق تصدیق قلبی اور اقرار زبانی کرنے کا نام ایمان ہے۔ اعضا کے اعمال نفس ایمان سے خارج ہیں لیکن ایمان میں کمال اور خوبی پیدا کر سکتے ہیں۔ جتنی ہی اطاعت زائد ہوگی اتنا ہی ایمان کامل ہوگا۔

۲۰۔ گناہ کرنے سے اگرچہ وہ کبیرہ ہوں کوئی مومن ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ توبہ اور انابت سے وہ مشرف نہ ہوا تو اس کا معاملہ اللہ تعالےٰ کے حوالہ ہے۔ وہ معاف کرے اور

بہشت میں بھیجے، یا گناہ کے موافق عذاب کرکے نجات دے۔

۲۱۔ خلافت اور امامت کی بحث اہل سنت وجماعت کے نزدیک اگرچہ اصول دین میں نہیں ہے اور نہ اعتقادات کے ساتھ اسے کچھ تعلق ہے لیکن چونکہ شیعوں نے اس بارے میں بڑی افراط اور تفریط کی ہے اس لئے علمائے حق نے اس بحث کو داخل علم کلام کرکے حقیقت حال بیان فرمائی ہے۔ آنحضرت محمد صلعم کے بعد امام برحق اور خلیفۂ مطلق حضرت ابوبکر صدیق رض پھر حضرت عمر فاروق رض پھر حضرت عثمان رض اور پھر حضرت علی بالترتیب تھے۔ اور ان کی فضیلتیں بلحاظ ترتیب خلافت کے ہیں۔

۲۲۔ حضرت امام حسن رض اور حضرت امام حسین رض افضل ہیں۔

۲۳۔ علمائے اہل سنت وجماعت حضرت عائشہ صدیقہ رض و حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دونوں کو فضیلت دیتے ہیں۔ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کتاب غنیہ میں حضرت فاطمہ رض کو مقدم سمجھتے ہیں۔ لیکن فقیر کا اعتقاد یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا علم و اجتہاد میں بڑھی ہوئی ہیں اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا زہد و انقطاع میں بڑھی ہوئی ہیں اسی واسطے حضرت فاطمہ رض کو بتول کہتے ہیں جو انقطاع میں صیغۂ مبالغہ ہے۔

۲۴۔ لڑائیاں جو اصحاب کرام کے درمیان واقع ہوئیں۔ جیسے جنگ جمل اور جنگ صفین انھیں نیک نیتی پر محمول کرنا چاہیئے اور سمجھنا چاہیئے کہ ہر ایک گروہ نے اپنے اجتہاد کے موافق عمل کیا تھا۔

۲۵۔ قیامت کی علامتیں جو مخبر صادق آنحضرت محمد صلعم نے بیان کی ہیں سب برحق ہیں۔ مثلاً (۱) آفتاب خلاف عادت مغرب سے طلوع کرے گا (۲) حضرت مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہوگا (۳) حضرت عیسٰی نزول فرمائیں گے (۴) دجّال نکل آئے گا (۵) یاجوج وماجوج ظاہر ہوں گے (۶) دابۃ الارض نکلے گا (۷) دھواں آسمان سے پیدا ہوگا اور تمام لوگوں کو گھیرے گا اور دردناک عذاب دے گا۔ لوگ بے قرار ہو کر کہیں گے اے ہمارے رب یہ عذاب

دُور کرے ہم ایمان لائے (۱۸) اخیر کی علامت وہ آگ ہے جو عدن سے نکلے گی۔

۲۶۔ آنحضرت محمد صلعم نے فرمایا ہے کہ تمام ارض کے سالک چار اشخاص ہوئے ہیں۔ دو مومن دو کافر۔ ذوالقرنین اور سلیمان مومنوں میں سے تھے اور نمرود اور بخت نصر کافروں میں سے تھے۔ پانچواں سالک ارض میرے اہل بیت سے ہوگا جس کا نام مہدی ہوگا۔

۲۷۔ عقائد کے دُرست ہونے کے بعد شرع کے اوامر کا بجا لانا اور نواہی سے دُور رہنا نہایت ضروری ہے۔ ان باتوں کا تعلق اعمال سے ہے۔ ایمان کے پانچ اصول ہیں (۱) خدا اور رسول پر ایمان لانا (۲) پنجوقتہ نماز پڑھنا (۳) زکوٰۃ دینا (۴) ماہ رمضان میں روزے رکھنے (۵) حج بیت اللہ کرنا۔

اس مکتوب کے آخر میں حضرت مجدد ذیل کی عبارت لکھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط فی الواقع جہانگیر بادشاہ کے نام لکھا گیا محض خان جہاں کا توسط تھا۔

"سات پشت سے بادشاہِ وقت مسلمان ہے اور اہلِ سنت و جماعت سے ہے اور حنفی المذہب ہے۔ چند سال سے بعض طالب العلموں نے اپنی کم بختی طبیعت سے جو پلیدی باطن سے تعلق رکھتی ہے امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ تقرب حاصل کیا ہے اور خوشامد کرکے دین متین میں تشکیکات اور اعتراض کئے ہیں۔ عظیم الشان بادشاہ وقت آپ کی باتوں کو اچھی طرح سُن سکتا ہے اور قبول کرسکتا ہے۔ یہ بڑی بھاری دولت آپ کے لئے ہے کہ بہ تصریح یا بہ اشارہ کلمۂ حق یعنی معتقدات اہلِ سنت و جماعت اس کے گوش گزار کر دیجئے۔"

ابوالفضل محمد احسان اللہ (عباسی)

گورکھپور ۱۴ ؍ جنوری ۱۹۲۵ء

ہلالِ عید

اے مہِ عید تجھکو کیا کہیے — ابروئے یار مہ لقا کہیے

یار ہی بے وفا تو تجھکو بھی — خنجرِ یارِ بے وفا کہیے

عقدۂ وصل اگر کھلا تو تجھے — ناخنِ اُس رشکِ ماہ کا کہیے

نہ ملے عید وہ تو پھر تجھکو — ق — نیش عقرب سے بھی سوا کہیے

نہ ستائے بلا نصیبوں کو — عید کے چاند سے ذرا کہیے

بام پر وہ ہیں چرخ پر مہِ عید — کس کو دیکھے کوئی بھلا کہیے

عید وہ مِل رہی ہیں غیروں سے — ہم سے کہتے ہیں مُدّعا کہیے

تاریخ انقلاب فرانس کا ایک صفحہ

(از اناطول فرانس)

میں اندر داخل ہوا تو ڈی لیوزی نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ تھوڑی دیر ہم دونوں خاموش رہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چادر، ریچہ اور ٹوپی ایک کرسی پر بے ترتیبی سے پڑی ہوئی ہے۔ ایک تپائی پر دعاؤں کی کتاب کھلی رکھی ہے وہ مجھے بٹھا کر دریچے کے پاس جا کھڑی ہوئی اور لالہ گوں اُفق کے پیچھے سورج کے ڈوبنے کا نظارہ کرنے لگی۔

آخر میں نے اس سے یوں خطاب کیا "میڈم" آپ کو وہ الفاظ تو ضرور یاد ہوں گے جن کو آپ کی زبان سے نکل کر دو سال ہوتے ہیں۔ آج ہی کے دن دریا کے ساحل پر اُس پہاڑی کے نیچے جس پر آپ کی نگاہیں اس وقت جمی ہوئی ہیں، کیا آپ کو یاد نہیں کہ کیوں کر مجھ کو گردش دیگر پیشین گوئی کے انداز میں گویا بحالتِ خواب، آپ نے مجھے بلاؤں، گناہوں اور خطروں کے آنے والے دہشت ناک ایام سے آگاہ کیا تھا؟ اظہارِ محبت کے الفاظ میرے ہونٹوں پر آچکے تھے کہ آپ نے اُن کو وہیں روک دیا اور مجھے انصاف اور آزادی کے عہد کا انتظار کرنے اور اُن کے لئے تیار ہونے کی تاکید فرمائی۔ میڈم، جب سے تمہارے دست نازنین نے جس کی تواضع میں اپنے بوسوں اور اشکوں سے جی بھر کے کرنے نہیں پایا تھا مجھے یہ راستہ دکھایا ہے میں آنکھیں بند کر کے اسی پر چل رہا ہوں۔ آپ کے حکم کے آگے میرا سر جھک گیا اور میں نے اس کی تعمیل میں اپنے قلم اور زبان کو وقف کر دیا۔ دو سال تک میں نے کیا کیا معرکے جھیلے۔ فاقہ مستوں کا غرور توڑا جن کی شوریدہ سری اس ساری مخالفت اور منافرت کا منبع ہے بازاری مقرروں کا منہ بند کیا جو جھوٹی ہمدردی سے بھری ہوئی پُرشور دھواں دھار تقریروں

سے عوام کو بھڑکاتے پھرتے ہیں، غنڈوں اور بدمعاشوں کے دانت کھٹے کئے جو نئے حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی شرارتیں کر رہے ہیں۔

اُس نے ہاتھ کی حرکت سے میری گفتگو کا سلسلہ قطع کر کے سننے کا اشارہ کیا۔ دفعتہً چند بھیانک آوازیں پائیں باغ کی خوشبو میں بسی ہوئی فضا کے اندر گونجتی اور پرندوں کے چہچہوں سے ٹکراتی ہوئی ہمارے کانوں میں پہنچیں "پکڑلو! مار ڈالو! سر نیزے پر پڑھاؤ۔" اُس نے حیرت زدہ ہو کر انگلی دانتوں میں دبائی۔ چہرہ کا رنگ اُڑ گیا اور خوف سے کانپنے لگی۔ میں نے کہا، شاید کسی شامت زدہ کا تعاقب ہو رہا ہے۔ شہر میں آج کل خانہ تلاشیوں کی بھرمار ہے اور گرفتاریوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ کیا عجب ہے کہ بدمعاش یہاں پر دندانہ گھس آئیں۔ میں رخصت ہوتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی نقصان پہنچے۔ اگرچہ اس نواح میں کوئی مجھے جانتا پہچانتا نہیں ہے، تاہم زمانہ کے حالات پر نظر کرتے ہوئے میں ایک خطرناک مہمان ثابت ہو سکتا ہوں۔ ۔۔۔۔ اُس نے مجھے دبی آواز میں حکم دیا "ٹھہریئے!"

شام کی خاموش فضا چیخوں سے پھر گونجنے لگی۔ اب ان میں پاؤں کی آہٹ اور ہتھیاروں کی جھنجھناہٹ بھی شامل تھی آوازیں اور نزدیک پہونچ گئیں۔ پھر ہم نے ایک شخص کو یہ چلاتے ہوئے سُنا "راستہ بند کر دو کہیں بدمعاش نکل نہ جائے"۔ میں نے میڈم ڈی لیوزی کو دیکھا معلوم ہوتا تھا کہ خطرہ کے لمحہ بہ لمحہ قریب آنے کی مناسبت سے اس کی ہمّت اور متانت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ بولی "آؤ اوپر چلیں شاید کھڑکی کی جھلملیوں سے جھانک کر ہم معلوم کر سکیں کہ نیچے کیا ہو رہا ہے۔ دروازہ کھلا ہی تھا کہ دہلیز پر ہم نے ایک پناہ گیر کو دیکھا۔ نیم ملبوس اُس کا چہرہ فق تھا، خوف سے دانت بج رہے اور گھٹنے باہم ٹکرا رہے تھے۔ ہمیں دیکھکر نہایت لجاجت سے گلوگیر آواز میں بولا "میری جان بچالو! مجھے کہیں چھپا دو! وہ یہیں آ رہے ہیں بدمعاشوں نے میرا دروازہ توڑ ڈالا، باغ پامال کر دیا۔ لو وہ آن پہونچے!"

میڈم لیوزی نے پہچان لیا کہ مفرور اس کا ہم سایہ پلان شونٹ فلسفی ہے جو پاس کے مکان میں رہتا تھا دبی آواز میں پوچھا، کیا میری باورچن نے تو آپ کو نہیں دیکھا ؟

وہ جیکوین ہے ؟"

ابھی تک کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔

خدا کا شکر ہے!

وہ فوراً اُسے خوابگاہ میں لے گئی۔ میں بھی ساتھ گیا۔ ہم نے مشورہ کیا کہ ایسی کوئی جگہ تجویز کیجائے کہ جہاں پلان شونٹ کو چند روز یا چند ساعت ہی کم سے کم اتنی دیر تک پناہ مل سکے کہ متعاقبین کو جکمہ دے کر ٹال دیا جائے۔ یہ ٹھیری کہ میں کھڑکی کے پاس جاکر کھڑا ہوں راستوں پر نگاہ جمائے رکھوں اور مناسب موقع پاکر اشارہ کروں تو چاہئے کہ پلان شونٹ باغ کے پچھلے دروازہ سے نکل کر فرار ہو جائے۔

ادھر پلان شونٹ کا یہ حال تھا کہ حواس مختل اور اعضا روجوارح معطل، قریب تھا کہ لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑے۔

وہ بمشکل تمام ہم کو اتنا سمجھا سکا کہ ڈمی کا زوٹ سے حکومت کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں اُس کا تعاقب کیا جا رہا ہے دوسرا الزام یہ کہ دس آٹھ آگسٹ کو اُس نے ٹولیریز کی مدافعت میں حصّہ لیا تھا تیسرے یہ کہ وہ پادریوں اور بادشاہ کا دشمن ہے۔

اصل میں یہ سارے الزام بے بنیاد تھے۔ لوبن موقعہ پاکر اس بیچارہ پر اپنا بغض نکال رہا تھا۔ کون لوبن ؟ وہی قصاب جس کی دوکان سے پلان شونٹ گوشت خریدا کرتا تھا۔ جسے اس نے سینکڑوں بار کم تولنے پر آڑے ہاتھوں لیا تھا اور جواب اس حلقہ کا منتظم تھا جس میں پہلے وہ دوکان لگایا کرتا تھا۔ جب اِس نے نحیف آواز میں لوبن کا نام لیا تو اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ لوبن سچ مچ اُس کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور دہشت زدہ ہو کر اس نے ہاتھوں سے اپنا مُنہ چھپا لیا واقعی اِس وقت زینے پر سپاہیوں کے چڑھنے کی

آہٹ آ رہی تھی۔ میڈم ڈی لیوزی نے چٹخنی چڑھا دی اور بڑے میاں کو ایک پردے کے پیچھے ڈھکیل دیا۔ سپاہی دروازہ کو پیٹنے لگے۔ ڈی لیوزی نے اپنی باورچن کی آواز پہچانی جو پکار کر کہہ رہی تھی کہ "دروازہ کھول دیجیے، میونسپلٹی کے افسر نیشنل گارڈ کو لئے ہوئے دروازہ پر کھڑے ہیں۔ تلاشی لینا چاہتے ہیں"۔ ایک لحظہ کے بعد وہ پھر پکار کر بولی "یہ لوگ کہتے ہیں کہ پلان شونٹ مکان کے اندر موجود ہیں میں نے ہزار سمجھایا کہ تم لوگوں کا خیال ٹھیک نہیں ہے جانتی ہوں کہ میڈم ایسے پاجی کو کبھی اپنے گھر میں پناہ دینے کی روادار نہ ہوں گی لیکن یہ لوگ میری بات کا یقین ہی نہیں کرتے"۔

میڈم ڈی لیوزی نے اندر ہی سے پکار کر کہا "اے تو اُن کو اوپر کیوں نہیں لے جاتی؟ تہ خانہ سے لے کر بالاخانہ تک گھر کا چپّہ چپّہ ان کو دکھا دے"۔

اُدھر یہ سوال وجواب ہو رہے تھے ادھر بیچارہ پلان شونٹ پردے کے پیچھے بیہوش پڑا ہوا تھا۔ میں پانی چھڑک چھڑک کر اُسے ہوش میں لایا۔ ذرا حواس درست ہوئے تو نوجوان لیڈی نے اِس کے کان میں چپکے سے کہا کہ حضرت، خاطر جمع رہیں آپ نہیں جانتے عورتیں کیسی ذوفنون ہوتی ہیں۔

متعاقبین، پکڑو، مارڈالو، کے نعرے مارتے ہوئے بالاخانے سے اُترے۔ اِدھر ہمارے انتظامات درست ہو گئے۔

غریب پلان شونٹ کا بند بند کانپ رہا تھا اور دل کے دھڑکنے کی یہ حالت تھی کہ اس کی آواز تہ خانے تک پہونچتی ہوگی ڈی لیوزی ہاتھ مل کے کہنے لگی، خدا رحم کرے اپنی اس چھوٹی سی تدبیر پر مجھے بڑا اطمینان تھا مگر خیر ہمیں مایوس نہ ہونا چاہیئے۔

دروازہ ایک زبردست گھونسے کے صدمے سے تھرتھرانے لگا۔

میڈم نے پوچھا "کون کھٹ کھٹا رہا ہے؟

قوم کے نمائندے۔

ذرا صبر کیجئے۔

کھولو نہیں تو دروازہ توڑ ڈالیں گے۔

مہربان من اٹھئے دروازہ کھول دیجئے۔"

دفعتاً گویا یہ بھی ایک معجزہ تھا کہ پلان شونٹ کا ہانپنا اور کانپنا موقوف ہوگیا نہایت اطمینان سے گویا کہ کسی معمولی روزمرہ کے کام میں مشغول ہو اس نے اپنا چھپر کھٹ جو دیوار سے لگا ہوا تھا تھوڑا سا سامنے سرکایا۔ توشکیں تہ کیں اور میری مدد سے ان کو یوں ترتیب دے کر رکھا کہ دیوار کے متصل تھوڑی سی جگہ خالی رہ گئی پھر اوڑھنے کی چادر لے کر اس طرح سے توشکوں پر ڈال دی کہ اس کا ایک دامن نیچے لٹک کر فرش کو چھو رہا تھا وہ اپنے اس انتظام سے فارغ نہ ہوئی تھی کہ جوتوں کی چرچراہٹ کرچوں کے پرتلوں اور بندوقوں کے کندوں کی کھڑکھڑاہٹ سے ملی ہوئی زینے پر بلند ہوئی۔ ہم تینوں کے لئے یہ کیسی نازک گھڑی تھی! لیکن شوروغل کا رخ رفتہ رفتہ اوپر کی منزل کی طرف منتقل ہوگیا۔ ہمیں اطمینان ہوگیا کہ تلاش کنندہ جیکوبن بادرجن کی صلاح سے پہلے بالائی منزل کی دیکھ بھال کرنا چاہتے ہیں۔ چھت کی کڑیاں چرچرا رہی تھیں۔ دھمکیوں اور قہقہوں کے آوازے بلند تھے۔ کنگروں پر لاتوں اور سنگینوں کی چوٹیں پھٹاپھٹ پڑ رہی تھیں ہم نے ذرا دم لیا لیکن ایک لمحہ ضائع کرنے کے قابل نہ تھا۔ میں نے پلان شونٹ کو اس خالی جگہ میں جوں توں کرکے بٹھایا جو چھپر کھٹ اور دیواروں کے درمیان چھٹی ہوئی تھی۔

میڈم ہماری کوششوں کو دیکھتی اور سر ہلاتی جاتی تھی۔ چھپر کھٹ کی ابتری شبہ پیدا کرنے والی تھی میڈم نے اسے مکمل کرنا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی بحالت موجودہ اسے قدرتی رنگ دینا مشکل تھا۔ آخر سوچ کر کہنے لگی، مجھے خود بچھونے پر لیٹنا ہوگا۔

اس نے گھڑی کو دیکھا۔ ٹھیک سات بجے کا وقت تھا اس نے محسوس کیا کہ اتنے سویرے بچھونے پر جانا خلاف عادت معلوم ہوگا۔ اگر علالت کا بہانہ کیا جائے تو بادرجن فوراً تاڑ جائے گی

یہ حیلہ بھی نہیں چل سکتا۔ وہ چند لحظہ کے لئے غور و فکر میں ڈوب گئی آخر بجمال سادگی و متانت شاہانہ تمکنت کے ساتھ اُس نے میرے سامنے اپنا لباس اُتار ڈالا۔ بچھونے پر جا لیٹی اور فرمایا۔

آپ بھی اپنا جوتا اور گلوبند وغیرہ اُتار ڈالئے اِس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے کہ آپ میرے آشنا بن جائیں۔ ہم دونوں مخلع بالطبع ہو کر بیٹھیں۔ وہ یہاں اچانک پہنچ کر ہمارے تخلیہ میں خلل انداز ہوں اور سمجھیں کہ ہم کو اتنی مہلت نہیں ملی کہ اپنا لباس درست کرتے تم کو یونہیں زیر جامہ پہنے بال پریشان کئے دروازہ کھولنے کے لئے اُٹھنا پڑا۔

پہلے لوبن داخل ہوا اس کی گردن میں گلوبند لپٹا ہوا تھا اور کوئی درجن بھر سپاہی سنگینوں سے مسلح اس کے ہمراہ تھے اوّل میڈم ڈی لیوزی پر اور پھر مجھ پر ایک ایک نظر ڈال کر پکارا غارت ہو! معلوم ہوتا ہے کہ ہم عاشق و معشوق کے لطف صحبت کو درہم برہم کر رہے ہیں حسین میڈم معاف فرمائیے گا۔ پھر اپنے ہمراہیوں سے مُڑ کر کہا، سان کلوتی ہی صرف ایسے انسان ہیں جو اخلاق برتنا جانتے ہیں: باوجود اپنے اصولوں کی سختی کے اس موقع نے لوبن کو خوش مزاج بنا دیا۔

وہ چھپر کھٹ پر بیٹھ گیا اور اِس خوبصورت مہذب تربیت یافتہ خاتون کی ٹھڈی کو چھو کر کہنے لگا "یہ بات ظاہر ہے کہ یہ مُنہ دن رات تسبیح پڑھنے اور دُعائیں گنگنانے کے لئے نہیں بنا ہے ایسا ہوتا تو کس قدر افسوس کی بات تھی۔ مگر جمہوریہ سب چیزوں سے مقدم ہے۔ ہم باغی بلان شونٹ کو تلاش کرنے کے لئے نکلے ہیں وہ یہاں موجود ہے مجھے یقین ہے میں اسے گرفتار کر کے دم لوں گا۔ بدمعاش کو شکنجے میں کسواؤں گا۔ جب کہیں میرے دل کو چین ملے گا۔

تو پھر تلاش کر لیجئے۔

اشارہ پا کر وہ لوگ میزوں کرسیوں کی آڑ میں اور الماریوں کے اندر جھانک جھانک کر ڈھونڈنے لگے۔ پلنگ کے نیچے جھک کر دیکھا الماری کے پیچھے بھالے مار کر دیکھا۔

لوبن سر کھجانے اور کن آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میڈم ڈی لیوزی اس اندیشہ سے کہ کہیں وہ لوگ مجھے لٹے سیدھے سوالات کا نشانہ نہ بنائیں بولی میرے مہربان، آپ میری طرح سارے مکان سے واقف ہیں یہ کنجیاں لیجئے۔ اور موسیو لوبن کو ساتھ لیجا کر گھر کا چپہ چپہ دکھا دیجئے مجھے یقین ہے کہ آپ گائیڈ کے طور پر فدائیانِ وطن کی خدمت کر کے نہایت خوش ہوں گے۔

میں انہیں تہ خانوں میں لے گیا۔ لکڑی کے گٹھوں کے گرد پھر کر دیکھا بھالا شراب کے پیپے کھلے آناً فاناً میں کئی بوتلیں خالی ہوگئیں اس کے بعد لوبن نے اپنی بندوق کے کندے کو بھرے ہوئے پیپوں میں ڈال کر دیکھا اور تہ خانے کو شراب کے بھبکوں میں بسا ہوا چھوڑ کر روانگی کا اشارہ کیا میں ان کے پہنچانے کو پھاٹک تک ساتھ گیا جسے میں نے ان کی پیٹھ پھیرتے ہی بند کر دیا اور دوڑ کر میڈم ڈی لیوزی کو خطرہ کے دور ہونے کی خبر کی۔

یہ سن کر وہ پلنگ کی پٹی پر جو دیوار کی طرف تھی جھک کر پکاری، موسیو پلان تسونٹ!

موسیو پلان شونٹ! جواب میں ایک نحیف سی آہ سنائی دی۔

بولی "خدا کی حمد کرتی ہوں، موسیو پلان شونٹ آپ نے مجھے عجب تشویش اور خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ خدانخواستہ آپ مر گئے۔

پھر میری جانب مڑ کر بولی "میرے عزیز دوست آپ ہر وقت میری محبّت کا دم بھرتے رہتے تھے، کہئے اب تو آپ کی کچھ ڈھارس بندھی۔

اس امر کے اظہار میں بڑی مسرت ہوتی تھی کہ آپ مجھ پر عاشق ہیں۔ کہئے اب آیندہ تو آپ کو یہ دعویٰ کرنے کی ضرورت نہو گی۔

(مترجمہ) سید تفضل حسین نا ترمترجم جولیس سینیرز و تسخیر فرانس (ترجمہ ہنری دی متھ)

رکن انجمن ادب

حیدر آباد دکن

رُباعیاتِ گرامی

ماہست الستیم دریدل گیریم
ماسوختہ ایم زآتشِ جلوۂ دوست
مازندہ دلیم بردرِ دل میریم
خاکسترِ ما دست دہد اکسیریم

ماواعظِ شہریم چہ بالغ نظریم
برصورتِ شیخانۂ ماعشوہ مخور
ازنکتۂ مرگ وزندگی باخبریم
برمنبرِ دیگر وبخلوت دگریم

درصبح ازل زنیست ہستم کردند
دربیخودیِ عشق زہوشم بُردند
درجذبۂ عقل وعشق مستم کردند
درمستیِ عقل خود پرستم کردند

(گرامی)

میں اپنے قیصر باغ والے مکان کو از سرِ نو تعمیر کرا رہا ہوں۔ ایک موقعہ پر بنیاد کی کھدائی کراتے ہوئے ایک صندوقچہ برآمد ہوا ہے۔ عوام کا خیال ہے کہ بیگماتی جواہرات میں سے کچھ حصّہ میرے بھی ہاتھ لگا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس صندوقچہ میں سے صرف چند کاغذات برآمد ہوئے ہیں جو غالباً کسی بدنصیب رئیس زادے مُسمّی سلیمان کی خود نوشت سوانح عمری کے چند اوراق ہیں۔ بہرحال جو کچھ ہے یہ ہے۔

مجھے اس سے عشق تھا! عشق کیوں پیدا ہو جاتا ہے؟ محبت کیا شے ہے؟ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے لئے دنیا بھر کی خوشیاں ایک ہی شخصیت میں جمع ہو جاتی ہیں یا صرف ایک نام جو کسی حسین ہستی کو اس کی تمامی حیثیت میں پیش نظر کرتا ہے ہمیں موسیقی مجسّم اور انبساط متحیّر بنا دیتا ہے۔ صرف ایک ہی خیال ہمارے دل و دماغ پر حکومت پذیر ہو جاتا ہے۔

میں تمہیں اپنا قصّہ سُناؤں۔ محبت کے فسانے تمام دُنیا میں کم و بیش ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ میں نے عذرا کو پہلی مرتبہ ایک محفل میں دیکھا۔ اس سے تعلقات پیدا کئے۔ اس طرح ہم ملے اور اس طرح ہماری محبت کی ابتدا ہوئی۔ آخرکار ہماری شادی ہو گئی۔ سال بھر تک ہم دونوں اکٹھے رہے۔ میری زندگی اس کی زندگی کا ایک پُرلطف اور شاعرانہ حصّہ بن گئی۔ اس کی خوشی میرے لئے انتہا درجے کی مسرّت تھی۔ اس کا پیارا پیارا چہرہ۔ سڈول جسم۔ متناسب اعضا جنّت نگاہ تھے اور اس کی محبّت بھری آواز فردوس گوش۔ مجھے دُنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ سورج کے طلوع و غروب کا علم مجھے شاید ہی ہوتا تھا۔ اس کے سوا میرے لئے سب چیزیں بے معنی تھیں۔

عذرا کا انتقال ہو گیا! کیسے؟ مجھے اس کا علم نہیں صرف اس قدر یاد ہے کہ ایک مرتبہ وہ رات کو اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلی۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ اتفاقاً بارش بھی ہو رہی تھی۔

صبح سے اسے کھانسی شروع ہو گئی۔ ایک ہفتہ تک کھانسی میں زیادتی ہوتی گئی۔ متعدد حکیموں نے علاج شروع کیا۔ نسخے لکھ لکھکر دیئے دوائیاں پلائی جاتی رہیں۔ اس کے ہاتھ بہت گرم رہتے تھے اس کا ماتھا جلتا رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے محبت و ملال مترشح تھی۔ جب میں اس سے گفتگو کرتا تو وہ جواب دیتی تھی۔ مگر مجھے قطعی یاد نہیں کہ ہم نے کیا باتیں کیں وہ مر گئی اور میں سب کچھ بھول گیا۔ غرض کہ اس طرح شوق کی وارفتگیاں اور تدبیر کی واماندگیاں صرف نسیاں ہو گئیں ہاں اتنا یاد ہے کہ میرا سکون قلب محشرستان صد اضطراب تھا۔

عذرا مر گئی۔ لیکن میں اس کا دمِ واپسیں نہیں بھول سکتا۔ اس نے ایک ہچکی لی! خدمتگار ملازمہ نے ایک آہ کھینچی!!

میں فوراً سمجھ گیا!!!

میں تجہیز و تکفین میں مشغول ہوا۔ اسے خاک میں ملا دیا۔ زمین کے سپرد کر دیا۔ سب زیادہ سے زیادہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ لوگ تعزیت کے لئے آئے۔ مجھے ان عزاداروں سے سخت نفرت تھی۔ بصد مشکل ان سرگشتگان رسوم و قیود سے پیچھا چھڑایا۔ شہر کے قریب کھنڈرات میں دن دن بھر پھرتا رہا اور شاید روتا بھی رہا۔ مگر غمخواروں نے مار ڈالا۔ اور اس لئے میں فوراً مختلف مقامات کے سفر کے لئے روانہ ہو گیا۔

اب کل میں لکھنؤ میں واپس آ گیا ہوں۔ مکان پر آتے ہی عذرا کے کمرے میں پہنچا۔ جہاں اس کی کتابیں اور اس کی چیزیں اس مرجانے والی کی زندگی اور میری محبت کی شہادت دے رہی تھیں۔ برداشت کی قوت نہ رہی۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ خودکشی کا خیال دل میں آیا۔ مگر میں رک گیا اور اپنے ارادے سے باز رہا۔ شاید مجھے جان عزیز تھی۔ میں سرد ساکت اور مبہوت ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا کمرے کے ایک کونے میں ایک قدِ آدم آئینہ الماری میں نصب تھا۔ وہ تبدیل لباس کے بعد اس میں اپنی صورت دیکھا کرتی تھی۔ اس نے بارہا اپنے حسنِ خداداد کا اس میں معائنہ کیا ہوگا۔ لیکن اس میں اس کا عکس نہ تھا۔

میں وہاں کھڑا رہا۔ میرے جسم میں رعشہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میری نگاہ آئینہ پر جمی ہوئی تھی وہ کور بارطن آئینہ میرے سامنے تھا۔ اس کا نقشہ اس میں ایسا ہی جم جاتا تھا کہ جیسے وہ میری آنکھوں میں سما جاتی تھی مجھے اس آئینہ میں ایک جذب مقناطیسی کا کرشمہ نظر آیا۔ میں نے بیتابانہ بڑھکر اسے چھوا۔ لیکن یہ بالکل سرد تھا۔

ہائے کیا وہ بھی سرد مہر تھی؟

نہیں! اس میں محبت کی حرارت تھی۔ ایامِ عیش کی یاد۔ فراوانئ تمنا خوشکامئ عشق کے تمام مناظر آنکھوں میں پھر گئے۔ ماضی کی خوشیاں حال کے حزن و ملال سے مبدّل ہو گئیں۔

ہاں وہ اشخاص جن کے دماغ میں گذرے ہوئے واقعات محفوظ رہکر افسانہ از افسانہ می خیزد کے مصداق نہیں بنتے نہایت ہی خوش نصیب اور قابلِ رشک افراد ہوتے ہیں!!

بیہوشی اور دیوانگی نے مجھے اس قابل رکھا کہ میں اُسی دن عذرا کی قبر پر جا سکتا۔ ہفتے یا عشرے کے بعد میرے معالج نے مجھے چلنے پھرنے کی اجازت دی۔ لیکن قبرستان کا رُخ بھی کرنے کی سخت ممانعت کی۔ مگر اس کی پروا کسے تھی۔ میں گھر سے نکل کر پیادہ پا سیدھا عیش باغ پہونچا۔ قبر میری عدم موجودگی میں میرے ملازمین نے تیار کرادی تھی۔ لیکن مجھے تلاش میں قطعی دقت نہ ہوئی اور عذرا کی سیدھی سادی سنگ مرمر کی قبر فوراً مل گئی۔ قبر کے تعویذ پر میرا نوشتہ کتبہ کندہ تھا۔

"عذرا محبت کی دیوی تھی اور اس کا عاشق اس کا پجاری۔ اس نے اپنی آزادی کی زندگی محبت کی زندگی پر قربان کردی تھی۔ حق مغفرت کرے۔ سال وفات ~~~"

اس منظر کے تاثرات کا بیان میرے قبضۂ قدرت سے باہر ہے مختلف النوع خیالات کا میرے دماغ میں ہجوم تھا۔ حتیٰ کہ اس بیہوشی اور بے خودی میں شام ہو گئی۔ لیکن میرا جی وہاں سے اُٹھنے کو نہ چاہتا تھا۔ رات وہیں گذارنے کا ارادہ کیا۔ اور شاید شب بیداری کی تیاری میں اُٹھکر اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا۔ مختلف قبور کے کتبے جو حقیقتاً مرنے والے کے متعلق پسماندگان کی دی ہوئی رائے ہوتی ہے پڑھنے شروع کئے۔

شہرِ خموشاں ہمارے شہروں کے مقابلے میں بیحد چھوٹا ہے۔ لیکن نسبتاً بہت زیادہ آباد ہے۔ یہاں اونچے اونچے محلات۔ وسیع باغات اور کشادہ سڑکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہاں کے باشندے مختصر مکان پر ہی قناعت کرتے ہیں۔ ہمارے شہروں سے لوگ انتقال کرکے یہاں آتے ہیں اور کچھ مدّت کے بعد یہ مکانات کہ جو ان کا مسکن تھے اوروں کے لئے خالی کردیتے ہیں۔ زمین انھیں ہضم کرجاتی ہے۔ صفحۂ عالم سے ان کا نشان لحد بھی مٹ جاتا ہے۔

بہت رات گذر چکی تھی۔ بلا کی اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہ آتا تھا۔ میں اس تاریکی میں اس کی قبر تک واپس پہونچنے میں قاصر تھا۔ انتہائے تلاش سے تھک کر میں ایک قبر پر بیٹھ گیا تھا ناامیدی اور بدنصیبی کے خیال سے آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ رفتہ رفتہ اس قبر کو کہ جہاں میں بیٹھا تھا کچھ حرکت ہوئی۔ سنگ مرقد ہلا۔ اور آہستہ آہستہ اوپر کو ابھرنا شروع ہوا۔ میں سہم کر کھڑا ہوگیا۔ اور بھوچکا ہوکر دیکھنے لگا۔ اس قبر کا باشندہ باہر نکل آیا۔ قبر کے سرہانے تعویذ پر کافی روشنی ہوگئی۔ میں نے زیرِ لب کتبے کو جلد ہی پڑھ لیا۔

"مولوی عبدالواحد یہاں مدفون ہیں۔ ان کی اکیاون سالہ زندگی محبت کا نمونہ تھی۔ انھوں نے اپنی تمام عمر خلق اللہ کی بہبودی تک اور قوم کی خدمت میں بسر کی آخر وقت تک اپنے مال و دولت سے غربا کی پرورش کرتے رہے اور فدائے مذہب و ملت رہے۔ سال وفات ...."

مُردے نے بھی با آوازِ بلند اس کتبے کو پڑھا اور پڑھتے ہی کھل کھلا کر ہنس پڑا پھر اپنی انگشت شہادت سے جواب ایک قلم استخوانی تھی اپنے کتبے کی یوں اصلاح کی۔

"مولوی عبدالواحد یہاں مدفون ہیں ان کی اکیاون سالہ زندگی شقاوت کا نمونہ تھی۔ انھوں نے اپنی عمر خلق اللہ کو تکلیف و ایذا پہونچانے میں صرف کی۔ یہ ملک اور قوم کی خدمت ذاتی مفاد کی بنا پر کرتے تھے۔ آخر وقت تک غربا کی مال و دولت اور اوقاف سے اپنے دنیاوی خزانے کو بھرتے رہے۔ مذہب ان کی نظر میں محض ایک ڈھکوسلا تھا۔ تتمہ

اس ترمیم و تنسیخ کو دیکھ کر میرے اوسان اُڑ گئے۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ زمین نے اپنا خزانہ اُگل دیا ہے۔ شہر خموشاں آباد ہو رہا ہے۔ ہر شخص اپنے کتبے کی اصلیت کے مطابق صحت و درستی کرنے میں مصروف ہے۔ مجھے اپنی محبوبہ کا خیال آیا۔ میں فوراً اس کی قبر پر پہونچا۔ وہ اپنے کتبے کی اصلاح ختم کر چکی تھی۔

عذرا اپنے عاشق سے نہیں بلکہ اس کی بے انتہا دولت سے محبت
کرتی تھی۔ اس نے غیر اشخاص سے تعلق قایم رکھنے کی کوشش برابر جاری
رکھی۔ سال وفات سنہ

جذبۂ انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی۔ میں نے چاہا کہ اس اقبالی مجرم کو سزا دوں۔ لیکن وہ غائب ہو چکی تھی اور شہر خموشاں پھر ویسا ہی سنسان تھا۔

ہائے وہ مجھ سے محبت نہ کرتی تھی!!!

دوسرے دن صبح کو میرے ملازمین مجھے قبرستان سے اُٹھا کر مکان پر لائے۔ میرے ہوش و حواس اب قطعی درست نہیں۔ میں اب کبھی محبت نہ کروں گا۔

سلیمان
(ہاشمی)

ارشاداتِ عزیز

کیوں نہ ہو شوق ترے در پہ جبیں سائی کا
اس میں جوہر ہے مری آئینہ سیمائی کا

طور کشتہ ہے اسی ناز خود آرائی کا
برق کی لہر ہے نقشہ تری انگڑائی کا

اشک جو آنکھ سے ٹپکا ہے دمِ سرمہ کشی
ایک ٹوٹا ہوا تارا ہے خود آرائی کا

آج اک خاک کا ذرّہ بھی نہیں ہے باقی
دلِ برباد نتیجہ ہے یہ خود رائی کا

عشق اک تبصرہ ہے حسن کی رعنائی پہ
حسن اک فلسفہ ہے عشق کی رسوائی کا

یاد ایام کہ تھی لب پہ مرے مہرِ سکوت
اب تو ماتم ہے بپا دل میں شکیبائی کا

اس طرف بھی نظرِ مہر ہو اے جلوہ فروش
دل بھی محتاج ہے اک عینکِ بینائی کا

موج در موج رواں بادہ سرِ جوشِ شباب
عالم کیف ہے عالم تری انگڑائی کا

تیرگی شامِ لحد کی بھی ڈراونی ہے مگر
ہے یہ اترا ہوا جامہ شبِ تنہائی کا

اُس کی دزدیدہ نگاہوں سے کرو اندازہ
حال پوچھو نہ مرے زخم کی گہرائی کا

جزر و مد حسن کے دریا میں نظر آتا ہے
قابلِ دید ہے عالم تری انگڑائی کا

تیرے دیدار سے محروم رہیں جب آنکھیں
کوئی مصرف ہی نہیں پھر مری بینائی کا

نیند اُن کی اگر اڑ جائے تو کچھ دُور نہیں
سو گیا جاگنے والا شبِ تنہائی کا

عالمِ گورِ غریباں کا یہ غمناک سکوت
اک نمونہ ہے مرے دل کی شکیبائی کا

شعر دلکش ہو اگر صفحۂ کاغذ پہ عزیزؔ
ہے یہ معیار کمالِ سخن آرائی کا

تغافلِ تقدیر

عموماً گوئٹے[1] کے تمام خطوط اپنے احباب اور ہم عصر شعرا کے حالات سے پُر ہیں لیکن اس نے اپنی سوانحِ حیات کو غیر معمولی طور سے پسِ پردہ رہنے دیا ہے اور خصوصاً کسی مفید مطلب واقعہ کا اظہار وہ بالکل معرضِ تحریر میں نہیں لایا تاہم ایک دلچسپ اور اہم واقعہ کو اس نے کسی قدر ضرور واضح کیا ہے۔

اس کی صحت گو ظاہری یا باطنی امراض سے بالکل مبرا تھی لیکن تلون مزاجی گویا اس کے خمیر میں تھی۔ کراہت موت کا تحمل اس کے امکان سے باہر تھا۔ اور مبروص اشخاص یا کسی مریض کے قابلِ رحم نظارے سے اس کے قلب میں ایک وحشت اور تنفر کی سی حالت پیدا ہو جاتی تھی علاوہ اس کے جب کبھی اس کی نظر بلند اور مرتفع مقام سے مائل بہ پستی ہوتی تو اس کے دماغ میں انتشار اور سرگرانی کی انتہا نہ رہتی۔ اس جسمانی ضعف کو اس نے کسی قدر شدت اور عزم بالجزم کے ساتھ زائل کرنا چاہا۔ چنانچہ اکثر طلوعِ آفتاب کے وقت جب کبھی افواج کی گولہ اندازی کی مشق کی آواز آتی تو گوئٹے قریب جا کر اسے سنتا اور اسی طرح اپنے ضعفِ اعصاب کو کم کرتا اور بسا اوقات گرجے کے بلند ترین حصے پر جا کر نیچے کی طرف دیر تک نظر ڈال کر اپنے دماغ کے انتشار اور گھبراہٹ کو دور کرتا۔

اس طور سے ان تمام تکلیف دہ اثرات کو بتدریج زائل کر کے اس نے عجیب قوت حاصل کر لی۔ حتیٰ کہ خوف ناک سے خوف ناک شے بھی اس کے قلب کو نہ متاثر کر سکتی اور اکثر وہ تیرہ و تار راتوں کو دہشت ناک مقامات پر بالکل تنہا جا کر اپنے خیالات پر قدرت حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ یہاں تک کہ اگر کبھی وہ اواخرِ عمر میں مہیب خیالی تصویروں کا تصور کرتا تو کبھی ان کا نقشہ

---

[1] اٹھارویں صدی کا جرمنی کا مشہور و معروف شاعر، فیلسوف۔ موجد اور ادیب جس نے دنیائے ادب میں ایک نئی روح پھونکنے میں شیکسپیر سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔

نہ جمتا۔ بایں ہمہ وہ اپنی خلقی تلون مزاجی پر پوری طور سے کامیابی نہ حاصل کر سکا۔

اسٹراس برگ میں ایک خوبصورت اور شکیل نوجوان کا علم رقص سے بے بہرہ رہنا عوام الناس میں ایک مضحکہ آمیز اور عجوبہ چیز سے کم نہ تھا۔ کوئی اتوار ایسا نہ جاتا تھا کہ شہر کے پارک اور چمن میں رقاصوں کا ایک جم غفیر نہ ہو جاتا ہو۔ گوئٹے ان تمام مجالس میں حاضر ہوتا لیکن علم رقص سے قطعاً ناواقف ہونے کی وجہ سے ان مجالس کے لطف سے بہرہ اندوز نہ ہو سکتا۔ بالآخر ایک بے تکلف دوست کے اصرار سے اس نے بھی سیکھنا شروع کیا۔ اور بہت جلد قابل تحسین ترقی کر لی

حسن اتفاق سے اس کا معلم بھی ایک مشہور فرانسیسی رقاص تھا جس کے ساتھ اس کی دونوں لڑکیاں لوسنڈا اور ایمیلیا گوئٹے کو اپنی معیت میں تعلیم دیتی تھیں۔ دونوں خوبرو و زہرہ جبیں اور فرانسیسی حسن کا سچا نمونہ تھیں۔ ان کی دوشیزگی اور چلبلی طبیعت نوجوان شاعر کے لئے کافی ولولہ انگیز تھیں لیکن ہمارے خوبصورت ہیرو کے حسن فسوں ساز نے بھی مد مقابل کو نمایاں طور سے ایک کشمکش میں ڈال دیا تھا۔

ان تاثرات نے جانبین کو ایک دلچسپ داستان کے ورق الٹنے کے لئے آمادہ کیا لیکن واقعات کی خرابی قابل افسوس اس وجہ سے اور تھی کہ نوجوان گوئٹے کی منظور نظر صرف ایمیلیا تھی کہ جو پیشتر سے براانڈن برگ کے ایک فوجی افسر سے منسوب ہو چکی تھی اور اس کی بڑی بہن لوسنڈا گوئٹے پر دارفتگی کی حد تک مائل تھی۔ ایمیلیا اپنی نسبت موعود کا خیال رکھتے ہوئے محفل رقص میں اپنے شاگرد کو اپنی معیت کا موقع دیتے ہوئے گھبراتی تھی لیکن لوسنڈا ہمیشہ اس کی ہمدردی کے ساتھ نگراں رہتی حالانکہ گوئٹے عموماً اسے نظر انداز کرتا رہتا تھا۔

فرانسیسی رقاص کے مدرسہ میں چونکہ متعلمین کی کثرت نہ تھی اس لئے گوئٹے کو اپنی نئی اور دل فریب میزبانوں کو کوئی دلچسپ قصہ سنانے کا ہر روز موقع مل جاتا۔ اس روزمرہ کی عادت نے اس پر عجیب کیفیتوں کا ہجوم کر دیا۔ اس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ ایمیلیا کے محتاط

ربط وضبط اور اس کے خیالات کا اندازہ لے۔ بالآخر ایک دن اس کو اس واقعہ کی اصلیت معلوم ہو ہی گئی۔

ایک شب حسب معمول تعلیم رقص کے بعد جب امیلیا موجود نہ تھی گوتھ غیر معمولی طور سے منتشر اور متفکر معلوم ہونے لگا۔ لوسنڈا نے یہ حالت محسوس کرکے اسے یوں مخاطب کیا۔

"امیلیا اسی متصل کمرے میں ایک نجومی سے اپنے منسوب شوہر کی بابت جسے وہ دل سے پسند کرتی ہے حالات دریافت کر رہی ہے۔" اتنا کہکر لوسنڈا کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ لیکن اس نے سلسلۂ کلام کو قائم رکھا۔ اور نوجوان شاعر کی طرف ایک معنی خیز نگاہ ڈال کر کہنے لگی "میرا دل ابھی تک آزاد ہے اور مجھے اس کے اکثر اس طرح ناقابل توجہ اور غیر مسؤل ہونے کا عادی بھی ہونا چاہیئے۔"

اس فقرے کا گوتھ پر بالکل اثر نہ ہوا اور اس نے ظاہرا کچھ بات بنا کر اس سے بھی نجومی کے پاس جاکر اپنی قسمت کے حالات دریافت کرنے کے لئے اصرار کیا جس پر لوسنڈا نے ایک تفکرانہ لہجہ میں کہا۔

"مجھے قسمت کا کھیل بالکل بے ڈھب معلوم ہوتا ہے اور نیز نجومی کے احکامات کو لایعنی سمجھکر نظر انداز کرنا بھی ایک بڑی اہمیت رکھتا ہے اور خطرہ سے خالی نہیں۔"

ان الفاظ پر گوتھ نے پھر اپنے اصرار کو دہرایا اور نجومی کے پاس جانے پر اسے مجبور کیا۔ ان دونوں نے امیلیا کو نجومی کے جوابات سے بہت خوش وخرم پایا۔ لوسنڈا نے بھی نجومی کو آئندہ واقعات کی صداقت اظہار پر ایک گراں قدر انعام دینے کا وعدہ کیا۔ نجومی نے حسب معمول ناول کے ساتھ اس کا بھی زائچہ ٹھیک کیا۔ لیکن کچھ تذبذب ظاہر کیا۔ جس پر امیلیا نے فوراً کہا۔

"شاید معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ ناخوشگوار بات کہنے پر مجبور ہیں۔"

لوسنڈا کے چہرے پر زردی نمودار ہوئی۔ لیکن اس نے ہمت سے کام لے کر کہا۔

"تکلف نہ کیجئے جو کچھ ہو فرما دیجئے زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ مجھے جان سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔"

نجومی نے ایک آہ سرد لے کر کہا۔

"لوسنڈا کو محبت ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کے محبوب کو اس سے نہیں۔ اس لئے کہ لوسنڈا اور اس کے درمیان ایک دوسرا شخص حائل ہے" اور اسی طرح کی تقریر کے بعد خاموش ہوگیا۔ اس کی خاموشی نے اس مختصر جلسہ پر تھوڑی دیر کے لئے مہر سکوت کر دی۔

حاضرین کا حال اس وقت ایک شکسپیر کے سے شاعر کے لئے ایک ڈراما کا پلاٹ ضرور طیار کر دیتا۔ لوسنڈا اس وقت اظہار حسرت و یاس سے بالکل پژمردہ ہوگئی تھی بالآخر نجومی نے مہر سکوت توڑ کر پھر سلسلۂ کلام شروع کیا۔

نجومی — بایں ہمہ لوسنڈا اطمینان رکھنا کہ تیرے پاس دولت کی قلت نہ ہوگی اور نہ کبھی خطوط اور رقعات کی۔

لوسنڈا — خطوط ... مجھے اس کی امید نہیں اور دولت کی مجھے ضرورت نہیں" اگر جیسا آپ فرماتے ہیں کہ مجھے کسی سے الفت ہے" تو میرا یہ یقینی حق ہے کہ میں بھی محبت کی جاؤں"

نجومی نے پھر قرعہ پھینکا لیکن کوئی امید افزا جواب نہ پاکر خاموش ہوگیا۔

لوسنڈا سے ضبط نہ ہو سکا اور بے اختیار رونے لگی۔ ایمیلیا نے تسلی و تشفی کرنی چاہی لیکن وہ کمرے سے باہر آگئی۔ اس نے پھر گوتھ سے اس کے ساتھ ہمدردی کرنے پر اصرار کیا۔ مگر گوتھ بہت ہچکچایا۔ اس لئے کہ وہ اس سے کیا ہمدردی کا خیال رکھ سکتا تھا جب کہ وہ اس کی محبت کا جواب دینے پر طیار ہی نہ تھا۔ اور کہنے لگا۔

"بہتر ہو اگر ہم دونوں ساتھ چلیں"

ایمیلیا اولاً مذبذب ہوئی لیکن بالآخر رضامند ہوگئی۔ اس اثنا میں لوسنڈا نے اندر سے دروازہ مقفل کر لیا تھا اور گوتھ ناکام واپس ہوا۔

گوتھ کی اب یہ حالت نہ رہی کہ وہ ان دونوں میں سے کسی سے ملاقات کرتا۔ لیکن تیسرے دن آخر کار ایمیلیا نے اسے تعلیم رقص کے لئے بلا بھیجا مگر لوسنڈا وہاں نہ تھی اور گوتھ کے سوال پر اسے معلوم ہوا کہ وہ بستر مرض پر زندگی کے آخری لمحات شمار کر رہی ہے۔ یہ کہکر ایمیلیا نے اس کی

سرد مہری پر بہت ملامت کی مگر گوئٹھ نے بغیر کوئی اثر لئے جواب دیا۔
"میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے لوسنڈا سے کسی قسم کے اظہار محبت کے جرم کا ارتکاب کیا ہو۔
اور میں اس کی شہادت میں بھی ایک دوست کو پیش کر سکتا ہوں"

ایمیلیا (اس کا مطلب سمجھکر) میرا خیال ہے کہ اگر ہم لوگ عقل سلیم سے نہ کام لیں تو ضرور
ایک اضطراری اور غیر ذمہ دار حرکت کے مرتکب ہو جائیں گے۔ مجھے معاف کیجئے اگر میں عرض کروں
کہ آئندہ آپ ہم لوگوں کے ساتھ تعلیم رقص سے گریز فرمائیں اس لئے کہ والد صاحب آپ جب تک آپ
اس تعلیم کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لئے طیار ہوں مختانہ لیتے ہوئے محجوب ہوتے ہیں اور
علاوہ بریں ان کا خیال ہے کہ فی زمانہ ایک نوجوان کے لئے جس قدر آپ نے ترقی کی ہے بہت کافی
اور مناسب ہے۔

گوئٹھ۔ ایمیلیا کیا تمھاری خواہش ہے کہ آئندہ میں تمھارے در دولت کی حاضری سے
اعراض کروں۔

ایمیلیا۔ ہاں۔ قریب قریب ایسا ہی لیکن میری وجہ سے نہیں۔ اس دن جب کہ وہ
اہم واقعہ پیش آیا تھا آپ کا زائچہ بھی درست کیا گیا تھا اور اس سے بالکل اسی قسم کے جوابات کا جیسے
لوسنڈا کو ملے تھے مترشح ہوتا تھا۔ نجومی نے یہ بتلایا کہ آپ کے پاس بھی احباب اور دولت کی کثرت ہے
لیکن صنف نازک کا قرب آپ کو نہ حاصل ہوگا خصوصاً میری بیچاری ہمشیرہ ..... گو ایک دوسرے کو
ہمیشہ آپ کے قرب کا حظ حاصل رہے گا لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ قابل ذکر ہو۔ اس لئے کہ ایک تیسرا شخص
درمیان میں حائل ہے۔ گوئٹھ! میرا ظن غالب ہے کہ میں ہی وہ دوسری خاتون ہوں اور مجھے اب امید ہے
کہ آپ میری نصیحت ضرور گوش گزار فرمائینگے۔ اولاً میں دوسرے کی موعود ہوں اور اس وقت تک
مجھے بھی اس سے سب سے زیادہ الفت اور محبت رہی ہے۔ آپ کی موجودگی اس صورت میں ممکن ہے کہ
اور زیادہ خطرات کی پیش خیمہ ہو اور مابعد آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ آپ کی ان دونوں بہنوں کے
درمیان جس میں ایک کو آپ نے اپنے اظہار عشق سے اور دوسری کو اپنی سرد مہری سے عجیب پریشانی

میں ڈال رکھا ہے کیا حالت ہوگی۔"

اس قدر گفتگو کے بعد ایمیلیا نے الوداع کہا اور دروازہ تک اس کو پہنچانے چلی اور اس خیال سے کہ وہ ان دونوں کی آخری ملاقات ہے وہ گوتھ سے ہم آغوش ہوگئی۔ اس اضطراری حالت کو صرف چند لمحہ ہی گزرے تھے کہ بغل سے ایک دروازہ کھلا اور لوسنڈا نہایت مرصع لباس میں نمودار ہوئی اور فوراً گویا ہوئی۔ "صرف تم ہی تنہا اس سے الوداع کہنے والی نہیں۔"

ایمیلیا بسرعت دوسری جانب ہوگئی اور لوسنڈا نوجوان شاعر سے ہم آغوش ہوگئی لیکن پھر فوراً علیٰحدہ ہوکر گوتھ کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی۔ گوتھ نے لوسنڈا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر چند الفاظ اس کی تسلی و تشفی میں کہے لیکن دوران تکلم ہی میں وہ منہ پھیر کر کمرے میں ایک غم آلود انداز کے ساتھ ٹہلنے لگی اور بالآخر ایک سوفے پر پژمردہ ہوکر پڑ رہی۔ ایمیلیا اس کے نزدیک گئی لیکن لوسنڈا نے اس کو نہایت خفگی کے ساتھ لعنت اور ملامت کی اور کہنے لگی۔

"یہ پہلی مرتبہ نہیں کہ تم نے میرے دل پر اس طرح جابرانہ اور غیر ذمہ دار سلوک کیا ہے۔ کیا اس سے پہلے اپنے موجودہ منسوب کے ساتھ کہ جب وہ تمھاری نسبت سے قبل میرے ساتھ تھا ایسی بدعنوانیوں کی مرتکب نہیں ہوئی تھیں۔ میں صاف گو ہوں اور سادہ لوح۔ اور تمام لوگ اسی وجہ سے خیال کرتے ہیں کہ وہ مجھ سے بخوبی واقف ہیں اور مجھے نظرانداز کرتے ہیں۔ تم خاموش اور دمساز ہو اور عوام الناس کو تعجب میں ڈال دیتی ہو کہ خدا جانے تمھاری ہستی کے ساتھ کیا راز مضمر ہے حالانکہ انھیں نہیں معلوم کہ پس پردہ ایک کس قدر سرد مہر۔ خود غرض دل ہے کہ جو اپنی منفعت کے سامنے ہر چیز کو قربان کر دینے کے لئے طیار ہے۔"

ایمیلیا اپنی بہن کے پہلو میں خاموش بیٹھی رہی لیکن لوسنڈا نے اپنے اظہار تاسف کا سلسلہ قائم رکھا۔ حتیٰ کہ اس کے منہ سے کچھ اس قسم کے راز ہائے سربستہ کا انکشاف ہونے لگا کہ جن کا اظہار اس کے لئے کسی طرح موزوں نہ تھا۔ اس پر ایمیلیا نے گوتھ سے علیٰحدہ چلے جانے کا اشارہ کیا۔ لوسنڈا اس کو سمجھ کر بہ تعجیل درمیان میں آگئی۔ لیکن اس قدر مبہوت ہوگئی تھی کہ بول نہ سکی۔ پھر کچھ

سکوت کے بعد کہنے لگی۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ ... میرے ۔نہیں ۔میں آپ پر دعویٰ نہیں کرتی۔لیکن ایمیلیا بھی آپ سے بغیر دست بردار ہوئے نہیں رہ سکتی"

اس قدر کہکر اس نے گوتہ کو پھر آغوش میں لے لیا اور کئی مرتبہ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور مزید طعن و تشنیع کے بعد آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاکر تونسٹا دیر تک کہتی رہی۔

" جو میرے بعد ان لبوں کا بوسہ لے یا ان سے اظہار محبت کرے خدا کرے وہ ہمیشہ محزون و ملول رہے۔ اے خدا ایک مظلوم کی فریاد رسی کیجیو"

گوتہ یہ سنکر بہت پریشان اور مایوس ہوکر فوراً وہاں سے روانہ ہوگیا اور پھر اس نے واپسی کا نام نہ لیا۔

محمد بشیر احمد

جواہر افکار

وہ پوچھتے ہیں تو نے تو پیکاں نہیں دیکھا
گر زخم نہ کہدیں تو کہوں ہاں نہیں دیکھا

اللہ رے سیاہی تری اے روز جدائی
وہ دیکھتے ہیں جو شب ہجراں نہیں دیکھا

وحشت کدۂ دل کا مرے حال نہ پوچھو
کیا تم نے کوئی خانۂ ویراں نہیں دیکھا

تو نے ابھی اے زخم جگر دیکھنے والے
پیوست ہے جو دل میں وہ پیکاں نہیں دیکھا

کوچے میں ترے صادق کو مثل گل و شبنم
خنداں نہیں دیکھا ہے کہ گریاں نہیں دیکھا

حضرت صادق جائسی

خواب و خیال

(۱)

سنسان پہاڑ کے دامن میں اک جنگل ہے سرسبز کھڑا
گنجان بھی ہے تاریک بھی ہے اور وحشت ناک ہے اس کی فضا

دیکھے ہیں درندے جھاڑیوں میں سانپ درختوں سے لپٹے
اک دریا جوش و خروش میں ہے مستانہ گزرتا جنگل سے

سنگین ہے گھاٹ جو دریا کا زینہ ہے بلند و وسیع اس کا
اس زینہ پہ سنگِ درخشاں کا اک عالی شان محل ہے کھڑا

دو صدیاں گزری ہیں کہ یہاں اک شاہ کا گزرا تھا لشکر
شاداں ہوا دیکھ کے دل اس کا اس جنگل و دریا کا منظر

فرمان سے اس کے بنا یہ محل جو دامنِ کوہ میں پنہاں ہے
دریا پہ پڑا ہے جو عکس اس کا اک نور کا دریا غلطاں ہے

جلسے کئے عیش و تجمل کے اس شاہ نے سرگرمی سے یہاں
حوروں کے یہاں پھرتے تھے پرے چھایا تھا یہاں جنت کا سماں

اب خوابِ خیال کے پردے میں گم ہوگئے وہ نیرنگ نظر
خاموش ہے اب جنگل کی فضا طاری ہے محل پر غم کا اثر

(۲)

تفریح کی نیت کرکے یہاں آ نکلا قضارا ایک جواں
منظر جو یہاں کا پسند آیا گرمی میں ہوا خوشباش یہاں

اک شام وہ گھاٹ پہ تھا بیٹھا جنگل کی فضا کو دیکھ رہا
چھپنے کو تھا سورج مغرب میں زرد اس کا رخِ روشن تھا ہوا

اک چادرِ زریں نور کی تھی پھیلی ہوئی تختۂ دریا پر
سب فرشِ محل کا بسنتی تھا اور گھاٹ تھا گویا تودۂ زر

بو سونف کی اور پودینہ کی آتی تھی پہاڑ کے دامن سے
اس پار کنارۂ دریا بھی آراستہ تھا سکھدرشن سے

چاہا یہ جواں نے کہ گھوڑے پر ہو چڑھ کے ذرا جنگل کو رواں
زینہ پہ بیک یک پیروں کی آہٹ سی ہوئی محسوس وہاں

پیچھے کی طرف دیکھا تو نہ آیا کوئی انسان نظر
سمجھا کہ یہ ہے خود وہم مرا جاتا رہا دل سے خوف و خطر

یک لخت بھاگتے پیروں کی آہٹ سنی اس نے کانوں سے
آنکھوں نے مگر پایا خالی میدانِ نظر انسانوں سے

دل خوف سے اس کا لرزنے لگا رعشہ سا بدن پہ ہوا طاری
آوازِ قدم کا تسلسل تھا زینہ پہ مگر پیہم جاری

گویا کہ بہت سی پریزادیں دریا کی طرف آتی ہیں چلی
آوازیں ہیں ان کے قدموں کی پیجنیوں کے ساتھ ملی

ہنستی ہوئی چند پریزادیں پہلو سے جواں کے گزرنے لگیں
رفتار سے زمزمہ کرتی ہوئی اُس آبِ رواں میں اُترنے لگیں

دریا میں اُترنے سے اُن کے پانی میں ہوئی جنبش پیدا
پانی کے لگے اُڑنے چھینٹے چہلوں کا ہوا طوفاں برپا

دریا میں لگیں جب تیرنے وہ پانی میں ہوئی ہلچل سی عیاں
دریائے تحیر میں ڈوبا تھا دیکھا یہ ہنگامہ جواں

تاریک لگی جب ہونے فضا پانی کو ہوا دریا کے سکوں
دل خوف سے اُس کا دھڑکتا تھا سر فکر کے عالم میں تھا نگوں

(۳)

اک رات جواں اُس ہال میں تھا جس کے تھے ستوں گلرنگ حسیں
تھا اپنے نقش و نگار سے وہ ہم مرتبۂ فردوسِ بریں

تاریکیٔ شب میں یہ ہال مگر آتا تھا سیہ پوش اُس کو نظر
یک لخت ہوا کچھ شور عیاں بدلا یہ خموشی کا منظر

اُس ہال کے اندر حوض جو تھا فوارے اُس میں اُچھلنے لگے
دھاریں جو ہوئیں پانی کی رواں دھاروں سے راگ نکلنے لگے

پھر گھنگروں کی چھم چھم کی صدا اُس ہال کے فرش سے آنے لگی
یہ ناچ کی دُھن کچھ سازوں کو بجنے کے لیے اُکسانے لگی

تاروں پر ہاتھ سے چلنے لگے نغموں کا ہوا ہنگامہ عیاں
اندر کے اکھاڑے کا تھا سماں پریاں تھیں مگر پردے میں نہاں

اُس ہال کے اندر تھی جو ہوا اک بار وہ عطر آمیز ہوئی
خوشبوؤں سے گلشنِ رضواں کی وہ ساری فضا لبریز ہوئی

مستی سے ہوا کی غش کھا کر کمرہ کی زمیں پہ گرا وہ جواں
جب نیند سے اُس کی آنکھ کھلی تھا سامنے نورِ سحر کا سماں

(۴)

اک شب کہ تھا گہری نیند میں وہ آہٹ سے کسی کی چونک پڑا
اک نازک جسم قریب اُس کے تھا ہاتھوں کو پھیلائے کھڑا

تکیہ سے اُٹھا کر سر اُس نے چاہا کہ پکڑے ہاتھ اُس کے
وہ صورت ہاتھ چھڑا کے چلی لیکن یہ جواں بھی ساتھ اُس کے

نکلا وہ بہت دروازوں سے گزرا وہ بہت دالانوں سے
آنکھوں سے نہ کچھ آتا تھا نظر سنتا تھا صدا اُس کانوں سے

شاخوں پہ درختوں کی گویا خوش لہجہ پرند چہکتے تھے
کچھ اپنے پروں سے صدا دیتے لہروں میں ہوا کی لپکتے تھے

چادر کی اُدھر گرنے کی صدا آتی تھی پہاڑ کے دامن سے
شیروں کی گرج سنتا تھا اِدھر دریا پہ جو آئے تھے بن سے

ناگاہ وہ پہنچا اک در پر محراب تھی جس کی قوس نما
تھا قوسِ قزح کے رنگوں کا اک پردۂ رنگیں اُس پہ پڑا

پردہ کے قریں ٹھہری وہ پری تھا سایہ پہ جس کے رواں وہ جواں
اک خواجہ سرا تلوار لئے اُس در پہ نظر آیا درباں

کھینچا جو پری نے پردہ وہ در اندر کا سماں تھا پیشِ نظر
اک فرش تھا واں گلکار بچھا تھے سطح پہ جس کی ٹانکے گوہر

اک تخت جو نہر بیچ میں تھا تھی جس پہ پری اک جلوہ نما
کرتی تھی تبسم جب وہ ذرا کمرہ میں لپکتا نور سا تھا
پوشاک تھی رنگا رنگ اسکی زیور سے لدا تھا اس کا بدن
گویا کہ نگاہِ تخیل میں تھا جلوہ نما جنت کا چمن
الفت سے بڑھایا ہاتھ اس نے بوسہ کے لئے لپکا یہ جواں
نرم انگلیاں جب ہونٹوں سے ملیں اک بار ہوئی جاں تن سے فدا
تا وقتِ سحر غش اس کو رہا چڑیوں کی صدا سے ہوش آیا
اک نورِ ظہور کا عالم تھا دریا کے کناروں پہ چھایا

(۵)

القصہ محل کی راتیں تھیں یا سحر بھرے تھے افسانے
کمرے جو محل کے اندر تھے گویا کہ وہ سب تھے پریخانے
آتے تھے ہوا کے اگر جھونکے خوشبوؤں سے گویا تھے لدے
کھل جاتے تھے اکدم کے لئے کمروں میں ہزاروں عطر کدے
چھڑتے تھے ہزاروں ساز کبھی نغموں کی صدائیں آتی تھیں
پریاں تھیں ہزاروں حسن بھری جو ناچتی تھیں اور گاتی تھیں
پڑتے تھے کبھی دیواروں پر نورانی عکس حسینوں کے
گلبازی میں مشغول کبھی تھے طلعتِ ماہ جبینوں کے
مرغانِ چمن کے چہچہے بھی آتے تھے جو محل کی ہواؤں میں
کچھ کبکِ دری کے قہقہے تھے ہوتے تھے بلند فضاؤں میں
کچھ روشنیاں تھیں جو رہ رہ کر کمروں میں محل کے چمکتی تھیں
کچھ راگنیاں تھیں جو تھم تھم کر کانوں کی سمت لپکتی تھیں
تھے چھت سے برستے پھول کبھی ہوتی کبھی فرش پہ تھے غلطاں
تھے مے کے چھلکتے جام کبھی ہوتے تھے چراغ کبھی تاباں
پڑتی تھی پھوار محل پہ کبھی آتی تھی ہوائے سرد کبھی
جو پھول تھے واں گلدانوں میں تھے سرخ کبھی اور زرد کبھی
ہوتی تھی جو شام تو دریا پہ تھے ٹوٹتے گردوں سے تارے
جب بھیگتی رات تو ساحل پر تھے لوٹتے پھرتے انگارے
منظر یہ عجیب و غریب ہوئے ہر رات جواں کے پیش نظر
پہلے تو ہوا کچھ خوف اسے پھر رہ گیا حیرت سے ششدر
سودہ ہوا، دیوانہ ہوا، یاروں کو ہوئی جب اسکی خبر
فصّاد کو آئے لیکے وہاں تھا ہاتھ میں جسکے اک نشتر

وہ خوابِ خیال کا دریا بھی بہتے ہوئے خوں کے ساتھ بہا
آیا نہ اسے پھر کچھ بھی نظر جبتک کہ وہاں وہ ٹھہرا رہا

تسلیم

دنیا کی کہانی

(از سید محمد احسن صاحب شوقؔ [illegible] رضوی)

چار دن کی بہار ہے دنیا — کیا ہی ناپائیدار ہے دنیا

باتوں باتوں میں دل لبھاتی ہے — کس قدر ہوشیار ہے دنیا

کوئی سایہ ہے یا کہ خواب و خیال — کچھ تو پروردگار ہے دنیا

اس کے چھٹنے میں جلنے والے — ان پہ صدقہ نثار ہے دنیا

خام کاروں سے میل جول اس کا — کیوں نہ پختہ کار ہے دنیا

فتنہ ہے سحر ہے قیامت ہے — یا کہ باد بہار ہے دنیا

پوچھتے کیا ہیں آپ دنیا کو — یہی لیل و نہار ہے دنیا

ہاں اگر مفت ہاتھ لگ جائے — کس کو کب ناگوار ہے دنیا

شام غربت میں نیند کیوں آئے — جب کہ سر پر سوار ہے دنیا

اہل دنیا کا ہے یہ دار عمل — نہ کہ جائے قرار ہے دنیا

پھنس گیا آکے گل بھی دنیا میں — یہ نہ سمجھا کہ خار ہے دنیا

کوئی آتا ہے کوئی جاتا ہے — کب یہ جائے قرار ہے دنیا

کار دنیا کسے تمام نہ کرد — گرچہ سرگرم کار ہے دنیا

آ نہ جائیں کہیں فریب میں آپ — فتنۂ روزگار ہے دنیا

نقش بر آب اس کے سارے طلسم — پیکر زرنگار ہے دنیا

تم غلط عاشقوں کا کرتی ہے — اک فسانہ نگار ہے دنیا

کل کی بھی فکر ہو تمھیں شوقؔ — جیتے ہی جی کی یار ہے دنیا

ایک عزیز پروفیسر کی ڈائری

کا

ایک ورق

ہم نہایت مسرت کے ساتھ ذیل کا مضمون میگزین میں درج کرتے ہیں اور اپنے پروفیسر صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جناب موصوف نے اپنی طالب علمی کے زمانہ کی دلچسپ ڈائری کا ایک ورق ناظرین میگزین کے لئے عنایت فرمایا۔

حقیقت یہ ہو کہ زبان اردو اکثر ارتقائی منازل و مدارج طے کرنے کے باوجود ہنوز پستی کی طرف جارہی ہو یہ ڈائری آج سے بارہ برس قبل کی لکھی ہوئی ہو اس کی سلاست زبان قابل رشک ہے۔ زبان اردو میں روز بروز جو عربی اور فارسی ترکیبوں کا عنصر شامل ہو رہا ہے وہ آیندہ چل کر یقیناً اردو کے لئے تباہی کا باعث ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہو کہ اردو کو اردو ہی رہنے دیا جائے زبان کی ترقی کا دار مدار قوم و ملک کا صحیح مذاق اور اخلاق ہو۔ ابھی زبان اردو کے پرستاروں میں بیداری کی لہر نہیں دوڑی ہو ان کو اپنا مذاق دور کرنے کے لئے پہلے اخلاق و اطوار کو درست کرنا چاہئے۔ ڈائری نویسی ہر ملک و قوم کی ترقی کا راز ہے اور خصوصاً طلبا کے لئے تو بہت ہی ضروری ہے۔

ایڈیٹر

ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ نقاروں کی آواز نے پھر جگا دیا۔ اٹھ کر باہر بھاگا معلوم ہوا شلجہ کی فتح کا تار آیا ہو۔ منٹوں میں تمام طلبا جمع ہو گئے۔ خوب خوشی منائی گئی۔ سوانگ نکالے گئے نقارے بجائے گئے۔ نعروں کی آواز سے کالج گونج اٹھا مسجد میں نفل ادا کر کے سب اپنے اپنے کمروں کو چل دئے نیند اڑ گئی تھی باتوں کو جی چاہتا تھا۔ ناظم۔ محمود۔ فیاض اور چند اور دوست میرے ہی کمرے پر چلے آئے۔ لیمپ روشن کیا جنگ کے متعلق گفتگو ہوا کی۔ پھر فرط خوشی میں محمود نے

گانا اور ناچنا شروع کیا خوب لطف رہا۔ اگرچہ یہ باتیں سنجیدہ مذاق کے خلاف ہیں مگر یہ طالب علمانہ زندگی کی شاعری ہے۔ ایسے ناچ کے آگے یورپ کے بال ہیچ، اس گانے کے مقابلے میں کوئل کی کوک بلبل کی نوا شرمندہ۔ یہی وہ جنون اور وحشت ہے جو آزاد ملکوں کے طلبا کی زندگی کی چاشنی ہے اور جس کی ہم قیدیوں نے اصل نہیں نقل تو اختیار کر لی ہے اگرچہ کالج کے تھیٹر گاہ میں ایسی نقل کو ممنوع خیال کیا جاتا ہے اور اس کے روکنے کے لئے مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ مگر سخت سے سخت دباؤ بھی مسلمان طلبا کے دلِ زندہ کی حرکت کو یکدم نہیں روک سکتا۔ یہ مرغِ بسمل سخت جان ہے۔ مدتوں تڑپے گا۔

اسی گانے بجانے میں ساڑھے بارہ ہو گئے۔ سب اپنے اپنے کمروں کو چلے گئے اور میں پندرہ بیس منٹ تک میدان جنگ اور مسلمانوں کی موجودہ حالت پر غور کرتا ہوا سو گیا۔ (۱۱ بجے قبل از دوپہر)

...... حسبِ معمول پانچ بجے جاگا اور صبح کاذب ہی کے وقت سیر کو نکل گیا۔ اندھیرا کم ہوا۔ افق مشرق میں اُجالا ہوا۔ آفتاب کے ڈر سے تارے یکے بعد دیگرے غروب ہوئے حسن خاور نقاب احمری میں پنہاں نکلا اور ذرات نور چھن چھن کر سبز گھاس اور درختوں کے ہرے ہرے پتوں پر گرنے لگے۔ شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ یہ سب کچھ ہوا۔ نیچر کی حسینہ کے چہرے پر مختلف رنگ آئے اور گئے اور میں دیکھ کر بیتاب ہوا گیا۔ غرض سیر میں قدرت کی نیرنگیوں نے خوب حظ بخشا۔

آج فلسفہ کی کلاس میں ایک جھوٹ بول کر ارتکاب گناہ کیا۔ کتاب نہ تھی۔ پروفیسر کے پوچھنے پر کہہ دیا کہ ہاں ہے۔

ڈائننگ ہال کے بعد احمد علی سندھی آئے کہا بھئی پانی پلاؤ۔ گلاس صاف نہ تھا۔ چار کی پیالی میں پانی دیا۔ چھوٹی سی پیالی میں بھلا پانی کتنا آئے۔ دوبارہ سہ بارہ بھر کر دی خالی کر کے پانی دیتے اور شعر پڑھتے ؎

ساقیا شرمندہ ام از لطف بے پایان تو
تو مرا پُر مے دہی من باز خالی مے دہم

ایک تو شعر پُرکیف دوسرے ان کی طرز ادا دل کش عجیب سرور آیا۔

بھائی .... کا خط آیا، لکھا تھا۔ "خط میں دیر ہوگئی ہے۔ سب پریشان ہیں" اپنے عزیزوں کو پریشانی میں ڈالنے کا سخت رنج ہوا مگر خوشی تھی کہ دنیا میں میرے خط کا منتظر بھی کوئی شخص ہے۔

ڈھائی بجے کی گاڑی پر افضل آئے۔ شادی کی مبارک باد دی .... پھر خوب مذاق ہوا کئے۔

کالیداس کے ڈرامہ (شکنتلا) کا انگریزی ترجمہ پڑھتا رہا۔ تھوڑا سا باقی تھا دو سے تین بجے تک پڑھ کر ختم کرلیا۔ نہایت اعلیٰ ڈراما ہے۔ ہندو تہذیب پر بہت روشنی ڈالتا ہے۔ سہیلیوں کے مذاق ہندو خاتونوں کی نرم دلی۔ پھولوں اور نیچر کے سینوں سے بے حد دل چسپی، اُن کی شاعرانہ گفتگو لڑکیوں کی سسرال جاتے وقت آہ وزاری اور اس کی وجہ۔ یہ سب کچھ نہایت قابلیت سے دکھایا گیا ہے۔ کنّیا کی شکنتلا کو سُسرال جاتے وقت کی نصیحت نہایت موثر ہے۔ آج کل کے نہایت قابل والدین بھی اپنی لڑکیوں کو اس سے بہتر نصیحت نہیں کرسکتے۔ اخیر کا حصّہ پھیکا ہے۔ مگر اس زمانہ کے مذاق کے مطابق ہے جب یہ ڈراما لکھا گیا۔ کالیداس وشیانتا کی زبان سے کہتا ہے کہ:۔

پہلے پھول ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر پھل۔ پہلے بادل جمع ہوتے ہیں پھر مینہ برستا ہے۔ اسی طرح پہلے اسباب پیدا ہوتے ہیں پھر ان کے نتائج۔

ساڑھے تین سے ساڑھے چار تک میور ہیڈ کا "رسالہ علم الاخلاق" دیکھتا رہا۔ توبہ توبہ کیسی ثقیل کتاب ہے اچھے اچھے مضامین کو کیسے بُرے پیرایہ میں لکھا ہے۔ چھوٹے بڑے فلاسفروں کے نام اور ان کے خیالات کی ایک نمبروار فہرست ہے۔ یہ فلسفہ کی دکان کے باہر چسپاں ہونی چاہیے یا اس سے لغات کا کام لینا چاہیے۔ جانے کورس میں کیوں داخل کردی گئی ہے۔

اس ثقالت مجسم نے ایک ہی گھنٹہ میں دماغ پریشان کردیا میز پر چھوڑ سیر کو نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں دماغ تروتازہ ہوگیا۔ درحقیقت سارے دن میں سیر ہی کا وقت ایسا ہوتا ہے جس میں طبیعت

تمام کاموں کو چھوڑ کر نیچر کی دل ربا صورت سے حظ اٹھاتی ہو۔ اگرچہ علی گڑھ میں کوئی عمدہ باغ نہیں
کوئی اچھی سیرگاہ نہیں ۔ نہر، دریا، جنگل، آبشار سب سے محروم ہے تاہم شیدائے حسن کو کون سی
جگہ ہے جہاں حسن نہ مل جائے ۔خزاں کے زرد پتوں کی جھنکار تک میں وہ سامان دل بستگی پالیتا
ہے اور یہاں تو ہرے ہرے کھیت اُن میں جاہل دیہاتی لڑکے نہایت بے فکری کے عالم میں
کھیلتے ہوئے جا بجا ملتے ہیں۔

ٹہلتے ٹہلتے ایک کھیت کے کنارے پہونچا۔ جہاں ایک ملیح رنگ کا لڑکا چھوٹی سی لنگوٹی باندھے
ہاتھ میں لکڑی لئے کھیت میں سے پرندوں کو اڑا رہا تھا اور اپنے دیہاتی لہجہ میں باآواز بلند گا رہا تھا۔
ہائے ۔ ہائے ۔ ہائے جانی تیر مارا دل نشانہ ہوگیا ؛ اس پری کو جب سے دیکھا دل دوانہ ہوگیا ....
ہائے ۔ ہائے ..... " اس عجیب شعر نے اس کی زبان سے وہ مزا دیا جو شاید بعض اوقات اقبال کے
شعروں میں بھی نہ ملتا ہو۔ کیوں نہ ہو۔ غروب آفتاب، رنگ شفق سرسبز باجرے کے کھیت۔ ہرے
ہرے بکھرے بکھرے بلند درخت ان پر پرندوں کا چہچہانا ۔جھاڑیوں میں چھپی ہوئی فاختہ کی نوا۔
اور اس پر دنیا کی فکروں سے آزاد دیہاتی لڑکے کا مستانہ وار جھوم جھوم کر ایک عشقیہ شعر پڑھنا سخت
سے سخت دل پر بھی اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ قدرتی مناظر اور فطرت کے سہانے گیت شراب
محبت کے پیاسے کو بادہ گلگوں کا مزا دیتے ہیں۔ دل میں احساس ہو تو خوشنما چیزیں اور سریلی آوازیں
وجد میں لے آتی ہیں۔ تار رباب کی جنبش سے نغمہ پیدا ہوتا ہے ۔نغمہ کے اثر سے جسم کا ہر رگ و ریشہ
تار رباب بن جاتا ہے اور متاثر ہو کر ویسے ہی لرزش میں آجاتا ہے .... وہاں سے چلا تو ایک
کپاس کے کھیت پر پہونچا۔ پیارے کپاس کے پھولوں نے نہایت ہی لطف دیا اور کیا کہوں کیا یاد
دلایا۔ یہ پھول کیا ہے بادۂ ناب ہے اور میں بادہ نوش ۔ یہ نرگس بیمار ہے اور میں مستانہ۔ اس کے
چھلکتے جام مجھے مخمور کر دیتے ہیں۔ اس شاہد بسنت کے بسنتی رنگ میں خدا جانے کیا چیز پائی
جاتی ہے جو دل کو کبھی متاثر کئے بغیر نہیں رہتی ۔ جی چاہتا تھا کہ توڑ لوں مگر دل بہت نازک
ہو رہا تھا۔ کیسے ہو سکتا تھا کہ اسے ہاتھ میں کملاتا دیکھوں۔

وہاں سے چل کر جب مدرسۂ زراعت والی سڑک پر پہنچا دیکھا چند دیہاتی لڑکے کھیل رہے ہیں ایک نے بچپن کی شوخی و آزادی سے پڑھا۔ "ہائے جانی تیرے دونین ہم جان گئے! ڈا، ڈا، ڈوڈی، ڈا، ڈوا، ڈاڈا۔ ڈاڈا۔ ڈاڈا۔ ڈاڈا۔ اس کی ڈوڈی ڈاڈا نے اپنی طفلی کا زمانہ یاد دلایا پھر ان لڑکوں کو دیکھا، اُن کے گرد سبز کھیتوں کو دیکھا۔ زمین و آسمان کو دیکھا اور دل سے ایک سرد آہ نکلی۔

غرض اس طرح دن کا سب سے اچھا وقت صرف کر کے شام کو کالج پہنچا۔ آج بہت دنوں کے بعد نماز مسجد میں ادا کی۔ کھانے کے بعد حسب معمول سات بجے سے آٹھ بجے تک مختلف کمروں میں پھرتا رہا۔ ناظم سے بہت مذاق رہا۔ بشیر کو بہت بنایا۔ محمود سے نہایت سنجیدہ گفتگو ہوئی۔ مشتاق کے مجبور کرنے پر کہانی شروع کر دی بلقیس مبارک منزل .... شب ماہتاب..... کشمیر تھوڑی سنا کر چلا آیا۔ ۸ سے ۹½ تک پڑھنے کا وقت تھا۔ مگر چونکہ آج نواب وقار الملک آرہے تھے ان کے استقبال کو اسٹیشن جانا تھا۔ اس لئے مشتاق کے کمرہ ہی سے ان کے ساتھ اسٹیشن چلا گیا۔ تمام ٹرسٹی۔ اسٹاف کے مسلمان پروفیسر اور قریباً تین سو لڑکے جمع تھے۔ تمام پلیٹ فارم بھر گیا گاڑی آئی۔ نواب صاحب کا دیکھنا تھا کہ خوشی کے نعروں سے اسٹیشن گونج اٹھا خوب تالیاں بجائی گئیں۔ مسافر باؤں کے نیچے پھیلے گئے نواب صاحب گاڑی پر بیٹھ گئے ہم لوگوں نے گھوڑے کھول دئے اور خود گاڑی کھینچکر کوٹھی تک لائے وہ بہتیرا کہتے رہے "بچو! کیا کرتے ہو مجھے معلوم ہوتا تو نہ آتا۔ بس اب چھوڑ دو۔ مگر وہاں کون سنتا۔ وہ فخر قوم اپنے آپ کو جانے یا نہ جانے ہم تو پہچانتے ہیں۔ کوٹھی پر آکر انھوں نے مختصر سی تقریر کی۔ تقریر کے لفظ جاتی بہار کے پھول تھے خوب چنے اور دل میں گلدستے بنا کر رکھے۔ کل لفٹنٹ گورنر اور نواب رام پور آئیں گے پرسوں مسٹر ناٹینگ کو دیکھیں گے لطف رہیگا ...... مگر خدا کی قسم جو مزا نواب صاحب یا مولانا شبلی جیسے بزرگوں کو دیکھ کر آتا ہے ہزار .... ہوں تو نہ آیگا۔ کیوں نہ ہو ان ہستیوں میں اسلامی شراب کا جوش ہے دیکھا اور مخمور ہو گئے۔ ساڑھے دس بجے رات گئے واپس آیا۔ اب ڈائری لکھ لی اور سوتا ہوں نمازیں صرف تین پڑھیں

نعت

لکھا جب کلکِ قدرت نے ازل میں نام احمدؐ کا ۔۔۔ دبستانِ محبت میں سبق ٹھیرا وہ ابجد کا

مقام لامکاں ہے مستقر محبوبِ سرمد کا ۔۔۔ ہوا ہے دل نشیں قلبِ احد میں میمِ احمدؐ کا

ہوا جس نور سے روشن دیا ہر ایک معبد کا ۔۔۔ مرا سینہ ہے گنجینہ اُسی نورِ مجرّد کا

ترا ثانی نہیں کوئی تو وہ محبوب یکتا ہے ۔۔۔ کہ خود قربان تجھ پر ہو گیا سایہ ترے قد کا

ہوئے تھے جس سے مسجودِ ملائک حضرتِ آدمؑ ۔۔۔ وہ اک ادنیٰ کرشمہ تھا تمھارے حسنِ بے حد کا

مقامِ سرمدی پایا ملا رتبہ شہادت کا ۔۔۔ یہ جرمِ عشق تو دیکھو کہ مستوجب ہے کس حد کا

یدِ بیضا ۔ دمِ عیسیٰ نمونہ تیری بخشش کا ۔۔۔ جمالِ یوسفیؑ صدقہ ترے انوارِ بے حد کا

صدائے حضرت داؤدؑ نغمہ تیری مدحت کا ۔۔۔ عصائے موسوی نقشہ تری گیسوئے ممتد کا

تری بے تابیوں سے مرغِ بسمل مات ہیں حاذقؔ
کوئی دیکھے تماشہ آکے تیرے شوقِ بے حد کا

حاذق (علیگ)

مسئلہ آزادگی خیال در زمان خلفا بنی عباس

بیشتر علاقہ مندی و اہمیت با حزب قادریہ یعنی طرفداران آزادگی خیال و اقتدار داریم ۔ طایفۂ قادریّہ نیز موسوم است بہ اسم معتزلہ ۔ نقطہ مرکزی افکارِ شان در الفاظِ داکتور ستینر عبارت است " از شکایت و مقاومتِ لایزال عقل صحیح و کمال انسانی با مطالبات مستبدانہ شریعت و تعصّب" ایشان خود شان را " اہل العدل والتوحید خواندند یعنی طرفدارانِ عدل ربّانی و توحید الٰہی ۔ عدل ربّانی بعلّت آں کہ مسئلہ تقدیر اہل السنت والشریعت کہ بمطابق آں خدا انسان را سیاست و عقوبت برائے عصیاں کہ انسان قہرًا و جبرًا مرتکب آنہا ست (یعنی انسان بہ میلِ خاطر خود معصی نیست بلکہ بموجب حکم الٰہی ست چناں کہ عمر خیام فرماید دراں معنی ؎

بر رہ گذرم ہزار جا دام نہی	گوئے کہ بگیرمت اگر گام نہی
یک ذرّہ ز حکم تو جہاں خالی نیست	حکم تو کنی و عاصیم نام نہی

خدائے یکتا را بہ لباس جبّار ۔ قہار بے رحم جلوہ دہد چہ ظاہر است کہ ازیں نقطہ نظر انسان ہیچ قوت و قدرت مقاومت بہ تقدیر ندارد و معصوم است فی گناہ اوست مطابق حکم الٰہ دیگر توحید الٰہی بعلت آں کہ قادریہ گفتند کہ اہل سنت و شریعت کہ قرآن مجید را ہم زمان و ہم موجود باذات اقدس پروردگار و اوصاف ایزدی را لیفوت یا ممکن الیفوت از جواہر ایزدی پندارند اصلاً مشرکین باشند یعنی کسانیکہ دیگر خدا ہا را با خدا شریک کنند ۔

امّا عبارت است ازیں کہ مابین روایات و حکایات راجعہ بہ اصل و اسم قادریّہ یا معتزلہ عمومًا واصل بن عطا الغزال ایرانی کہ مریدی از مریدان و طلاب نقیہ تحریر حسن بصرہ بودہ و استادش یعنی خود حسن بصری تخلف رای واقع شد در معنی ایں کہ آیا مومنی

بعد از ارتکاب گناہ کبیرہ باید حق ملقب بہ لقب مومنی داشتہ باشد؟ او علیہ واصل بود کہ ہم چو شخصی نہ باید مومن خواندہ شود و نہ کافر دارد درجہ متوسطی ما بین این دو درجہ بود پس واصل بمقام دیگر مسجد رفتہ این خیال خود را با کسانی از طلاب کہ ہم عقیدہ او بودہ اظہار کرد و گویند کہ حسن بصرہ چوں واصل را دریں حالت دید بہ زبانش یافت کہ "اعتزل عنا (یعنی او از ما معتزل. علیحدہ شد) و بواسطہ این کلمہ حزب واصل بہ اسم "المعتزلہ" موسوم گردیدند۔ و این اسمی بود کہ مخالفین بہ آنہا دادند۔ واگر این حکایت معتمد و صحیح است باید کہ عراق مقام ولادت و گہوارہ این طایفہ شود۔ ولی بعد از امعان نظر دقیقی بہ عقیدہ آن است کہ مسقط الراس این طایفہ دمشق بودہ است۔ و نیز این کہ آثار نفوذ فقہا و علما نصرانیہ و قسطنطانیہ مخصوصاً و از وجنات بیان و فلتات لسان معتزلہ ظاہر۔

اسم دیگر معتبر معروف این طایفہ قادریہ است زیرا کہ با عقیدہ شان انسان تمام تر آزاد و مستقل و در ہمہ افعال و اعمال کلیتاً با اقتدار و اختیار است و حدیث باطل القادریہ مجوس ھذہ الامۃ کہ در حق این طایفہ بکار بردہ شدہ کار مخالفین و منافقین معتزلہ است۔ و سالہا بعد یعنی در اوایل قرن سیزدہم مسیحی محمود شبستاری اشارہ اجمالی بدین حدیث می کند۔ عین قول او در گلشن او راز بدین قرار است۔

ہر آن کس را کہ مذہب غیر جبر است
نبی فرمود کہ مانند گبر است

چنانچہ سابقاً مذاکرہ شد گمان می برد کہ مسئلہ آزادگی خیال و اختیار در دمشق و اواخر قرن ہفتم مسیحی رواجی تمام داشتہ و معبد الجوہانی (کہ در سنہ ۶۹۹ء وفات یافتہ است) حامی قادریہ بودہ این درسی بود کہ سنبویہ ایرانی کہ بحکم خلیفہ عبد الملک یا حجاج بن یوسف مقتول شد۔ معبد الجوہانی آموختہ است و عوفی در جوامع الحکایات سخن میراند کہ غیلان قادری در دمشق بہ امر ہشام بن عبد الملک مقتول شد۔ و تبیان کند کہ

چه طور در حضور خلیفه در مکالمه و مباحثه با فقها شام خجل شد بطوریکه او را مجال سخن نماند۔ ولی در مقابل می گویند که یزید ثانی خود هم، هم عقیده قادریه شده۔ اما تحقیق و تدقیق می توان گفت که کار معتزله در زمان خلفا بنی عباس، بالخصوص خلیفه المامون و پسرش الواثق بندوه اوج علیین ہمی رسید۔ خلفا متقدمین بنی عباس و در بارہا شان معاو گاه علما معتزله بود و فلسفه یونانی چون ممزوج و منضم بمسئلہ اختیار الاعمال شد اہل معتزله قوی دست و گران مایه شدند به اندازه که گویا حزب اہل شرع وسنت نزدیک بود که منهدم و منهزم شود۔ و معتزله گرچه عموماً روشن رائی و حرّ الفکر وجید الرویه بوده اند ولی با اہل سنت منازعت لاینفهم و مخاصمت لایدرک داشته۔ وادعا این که قرآن مجید کلام ناآفریده است در نظر معتزله بغایت و نہایت مستقبح و متنفر بود۔ در ۲۱۱ہ ہجری (۸۲۶ مسیحی) المامون از طرفداری اہل شیعه و مخصوصاً از تصویب ماموریت امام ہشتم علی الرضا به سمت نیابت منصب خلافت یعنی به عہدۂ ولی عہدی سلطنت نزدیک بود که جنگ داخله را برانگیزد و شعلہ آتش این غایله ہا بلا چون ہا گرفت دست به تزویر و زرق و حیله برده سراً امام ہشتم را مسموم کرد و وزیر معروف خود فضل بن سہل را که درین معاملہ نامزد کردن امام مسموم به نیابت سلطنت معاون و مستشار مامون بوده سراً به قتل رسانید۔ چندی بعد ازین واقعه این مامون توسط شیپور چیان براطراف ممالک منادی کرد که قرآن مجید نامخلوق و ناآفریده نیست بلکه مخلوق و آفریده است و حکم فرمود تا این اعلان را ہیچو حق مبین بےچون وچرا پذیرائی کنند۔

ہفت سال بعد ازین واقعه در سنۂ اخیره خلافتش مامون ہفت علما تبحر و متدین اسلام را که در زمرۂ شان ابن سعد دبیر مخصوص مورخ کبیر الواقدی بود مجبور و مقہور کرد تا قول نامخلوق بودن قرآن مجید را تصویب کنند۔ پس مامون نامه تطویلی به اسحاق بن ابراہیم نوشت و او را امر فرمود تا علما و فقہا شہیر و نحریر را که متہم به داشتن عقیده ممنوع

باشند و از این جهت سوظن عوام در حق شان بود احضار کرده سوال و جواب نماید و کسانی را که ابا عقیده و مذهب سلطنتی کنند سیاست و تشدید و تضییق کند- تقریباً بیست و چهار علما مشهور و محترم اسلام را که اشهر شان احمد بن حنبل بود پیش اسحاق بن ابراهیم حاضر گردانیدند- و به تهدید و وعید و تشدید اغلب شان رضایت و تصویب عقیده معتزله حسب الامر و خواهش خلیفه نمودند- ولی احمد بن حنبل بالجبر ثابت و راسخ بماند و اگر مرگ مامون عجالتاً واقع نشدی احمد بن حنبل را هیچ چیزے از مرگ غیر طبیعی مانع نمودی-

الواثق متابعت پدرش کرد و بدین علت فتنه و فساد سهمگین در سنه ۲۳۱ هجری آغاز- احمد بن نصر الخزائی سر افسر مفسدین بود- ولی چون بعضے از اصحاب و احباب فتنه نلیذ خوار بوده اسرار پیش از وقت آشکار شد و سعی این طائفه بجای نرسید ولی همان سال در واقعه تبدیل اسرا الواثق اسرا مسلمین را یک یک درباره عقیده مذهبی و شخصی وی سوال نمود و از کسانے که گفتند قرآن مجید نا مخلوق است احدی را آزاد نه کرد و بلکه را اغلال و زنا جیر بزندان باز فرستاد-

طبری حکایت دیگری راجع باین حال ذکر نماید و می گوید که اسرا خلاص یافته نیز مجبور می شدند تا منکر متبصر شدن پروردگار در یوم القیامت شوند و چنانچه که کافه خواص و عوام را معلوم است و اینجا احتیاج بذکر و بسط کلام لازم نداریم- اہل شرع و سنت از آیات قرآن مجید کلماً و کلتماً بل حرفً و حرفً معنی گیرند بدون آن که معنی تاویل گرفته باشند و ازینجاست که بعضی حافظ را منصوب به اطاعت الاشعری کرده اند- زیرا که اشعار ذیل را سروده است

دزکوی نیک نامی ما را گذر ندارند	گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را
این جان عاریت که به حافظ سپرده دوست	روزی رخش ببینم و تسلیم وی کنم

حسن ظن ما در حق اہل معتزله که وسعت نظر شان عالم ظلمات را کرہ نور گردانیده البته نباید که ما را از فحص قبایح افعال و اعمال شان و مخالفت شان به اہل سنت و شرع مجتنب

وُ محترز نماید۔ ولی در مقابل شاید مخالفت معتزله تمام تر بی معنی نبوده۔ ممکن است که دور بینی و پیش بینی آنها را مستبعد گردانیده که تقدیر و قبول مسئلهٔ تقدیر بالآخره منتج اثر بسیار قبیحی و به نهایت مضرّ به مصالح امور مسلمانان می شود یعنی منهدم سعی و جهد و مانع ترقی و ارتقا می شود ممکن است که پیش بینی آنها ملتفت این نکته گردانیده که مستمراً از الفاظ کلام ربانی معانی مطابق لفظ گرفتن و معنی دادن که از آن لفظ هویدا است بالاخره باعث کوتاه بینی و تنگ چشمی شود و بدین جهت مذهب را از تبدیلی و تغییری از تازگی و طراوتی از ترقی و موافقت با کتشافات و اختراعات محروم گرداند و راه علم و عقل را در امور و مسائل مذاهب و ادیان مسدود دارد۔

قول پروفسور براون است که اختلال و اضمحلال اسلام که از خروج الاشعری مُظهر و از خروج چنگیز خان و انفصال و استیصال خلافت بغداد تکمل شد انوار لامعه ترقی عقلیه و علمیه را بکلّی مظلم ساخت۔ و رای خود را در خصوص معتزله بطریق بسیار مبسوط و نفیس اظهار کند۔ و هو هذا۔

در تحت نفوذ فلسفه ارسطا طالیس مسئله اختیار اعمال و اقتدار افعال تشکیل و تبلیغ یافت۔ خود معتزله چند احزاب و فرق بوده اند۔ ولی در چندین مسائل تمام شان یک رای و یک خیال و یک آواز بوده۔ منکر وجود اوصاف در خدا بوده اند۔ و نیز مخاصم هرشئی که توحید الٰهی به علت آن در معرض خطر بود۔ تا هر خیال بی انصافی را از خدا علیحده کنند۔ معتزله آزادگی عمل انسان را معتبر بودند و گفتند که انچه که بحیات و نجات انسان متعلق باشد متعلق به عقل باشد و اکتسابش تمام تر منحصر به نور عقل است۔ پس حیات و سلامتی انسان منوط و مربوط به تنزیل نیست و مردمان در همه مواضع و در همه اوقات می توانستند مسائل حق را طلب کنند و درک نمایند۔ و محتاج به تنزیل نیستند۔ از ینجاست که ادعای آنسر مدیگی قرآن مجید کرده اند در صوری که نص صریح پیغمبر منافی

و متفند و همچو کلام است. گفتند که گر قرآن مجید نامخلوق است اعتراف وجود دو اصل لایزال لازم آید.

و بدیهی است که کلام الله چون به حیث کلام مخلوق متصور شود از همان زمان نظر به لایتبدّل و لایتغیّر بودن خدا کلام الله دیگر نتواند که جوهر خدا به باشد. و بدین طریق سایر مسئله تنزیل متدرجاً متزلزل شد. و بسیاری از معتزله صریحاً گفتند که که کتابی هم چو قرآن مجید یا بهتر از قرآن مجید نوشتن ناممکن نیست. پس مخالفت اصل ایزدی قرآن و مخالفت الهام نیز هم نمودند. اہل معتزله در خیالات و افکار شان خدا را خدا تصور نموده هیچ تخیّل جسمانی الیتت را یا مجازاً یا استعارةً در بارۀ خدا جای ندادند. قال حضرت محمّد روزی خدای تان را می بینی چنان که ماه تمام و بدر را در جنگ بدر می دیدی. و این الفاظ که اہل سنت و شریعت از او معنی لفظی گرفتند برای معتزله سدّ راه عظیم و گرهِ لایذاب بود. پس الفاظ پیغمبر بدین نهج تفسیر می کردند که بعد از مرگ انسان خدای را به عیون الروح یعنی به عقل بشناسد. و معتزله منکر خلق نمودن خدا کفر را بودند (یعنی این که هر انسان اصلاً مومن آفریده شد و او خود را و از دست خود و به اختیار خود به کفر انداز دونی مشیت الهی) و کمتر معترف کلمه بوده اند که خدا را به رسانیدن منفعت و مضرت منصوب کند. و معجزه ها که در قرآن مجید ضبط است اعتراف نه نمودند و منکر خشک شدن دریا و دادن راه به حضرت موسیٰ و تبدیل عصا موسیٰ به ثعبان و زنده کردن حضرت عیسیٰ مردگان را بوده اند. در حق حضرت رسول نیز هم تسلح شدید زدند. طائفه از معتزله می گفت که پیغمبر بسیار زیاد زنها گرفت. و این که ابوذرّ الغفاری که هم عصر پیغمبر بود و متقی تر و مجتنب تر از پیغمبر بود و خود را بهتر نگاه می داشت.

بهترین و دلکش ترین شرح احوال اہل معتزله از قلم می باشد. و نتیجه تفحصات و

تجسسات تنقیدات ایشان راجعه به ترقی و نفوذ و روابط و اختلال این طائفه به طریق ایجاز و اجمال ازین قرار است۔ در جای ولادت و ظهور معتزله هردو مستشرقین معروف یعنی برضد دیگراند۔ این یکی برآن است که از همان زمان آغاز و خروج معتزله افکار و خیالات معتزله در تحت اثر مذهب و فعته عیسیه در آمده۔ وآن دیگری گمان می برد که معتزله اصلاً و فرعاً زائیدهٔ اسلام اند و از هیچ گونه اثر خارجی مؤثر نه شده۔ در هر حالت به طریق قطع و یقین توان گفت که معتزله هم در اوایل حیات شان از فلسفه یونان تشکیل یافته چنان که گوید۔

معتزله اول کسے بودند که تراجم کتب فیلسوفان و معلمین علوم طبیعیه یونان را که به بخت و مساعدت و همت المنصور والمامون دسترس عوام شده مطالعه نمودند وازین اوراق انواع علوم مختلفه نافعه را درک واخذ نمودند وسعی اهتمام شان آن بود افکار شان را که سابقاً در تنگ دایرهٔ خیالات قرآن مجید محصور بود ازان تنگ جای تجاوز کرده وسعت داده مذهبیت ادبیه و فلسفیه یونان را جذب با وجدان اسلامیه شان ممزوج کنند۔ علوم مذهبیه و فلسفیه و طبیعیه را از یک دیگر جدا ساختند و نیز علم و عقل را از دین و ایمان علیحده کردند۔ ابن سینا مسلمان متقی و زاهد بوده ولی شهرستانی او را در زمرهٔ اهل الأهوا جاے دهد۔ یعنی کسانے که خارج از اهل سنت و شریعت اند و خیالات شان فقط به رؤس خود شان متعلق۔

تخیلات

ہو جائے تمام خلش اضطراب کا
کھول اے فریب حسن معما حجاب کا

شکوا مجھے نہیں تری چشم عتاب کا
مارا ہوا ہوں میں کرم بے حساب کا

طوفان اُٹھ رہا ہے غم اضطراب کا
بس اب خدا ہی کشتی عمر حباب کا

خود ظرف بادہ نوش ہے گمراہ معصیت
آلودگی سے پاک ہے دامن شراب کا

حسن ازل کی ہے یہ نمائش کہ دہر کو
آئینہ اک بنا دیا اپنے جواب کا

ہوتی ہے اک نگاہ میں طے راہ بیخودی
ہے تیری چشم مست کہ ساغر شراب کا

موج ہوا نے قطرہ کو دریا بنا دیا
یہ ناخدا ہے کشتی عمر حباب کا

ذروں میں دیکھتا ہوں میں شان جمال دوست
میلا مری نظر میں ہے رنگ آفتاب کا

دل جب سے ہو گیا ہے فنا راہ عشق میں
سب کھل گیا ہے راز جہان خراب کا

فطرت پرست میں بھی ہوں اے ذوق میکشی
ہلکا سا ایک جام شب ماہتاب کا

بیخود (علیگ)

انتقام

ظالم آباد کے شاہی دربار میں بختیار کا بے گناہ قتل ہونا کچھ ایسا واقعہ نہ تھا جو اس کے
خاندان والوں کو خون کے آنسو نہ رُلاتا۔ یہ ایک مصیبت جاں سوز تھی جو اس خاندان پر نازل
ہوئی۔ اسد خاں اس کا ضعیف باپ جو کہ ابھی زندہ تھا اس کے قلب پر جو گذری اس کا اندازہ
قابل وجواں مرد بیٹے کی وفات کا صدمہ اُٹھانے والا دل خوب کر سکتا ہے یہاں تک کہ اس نے
جلا وطنی اختیار کر لی اور عہد کر لیا کہ جب تک اپنے بیٹے کا انتقام نہ لے لوں گا نہ تبدیل لباس
کروں گا نہ خط بنواؤں گا او بیٹے کی قبر پر آکر جاروب کشی کرنے لگا۔

اسد ایسے خاندانی بزرگ کو جب جلا وطنی اختیار کئے ہوئے عرصہ گذر گیا تو پس ماندگان
کے لئے ایک تازہ رنج والم کا سامنا ہُوا۔ اور لوگ بھی یکے با دیگرے تلاش میں نکلے وہ بھی بزرگ
گم شدہ کے ساتھ گم گشتہ راہ ہو کر رہ گئے۔ اب گھر میں فقط ایک نوجوان لڑکی زہرہ نام رہ گئی
یہ اس غریب کی نورِ نظر تھی جو مظلوم پور سے ظالم آباد کے شاہی دربار میں آکر بے قصور قتل ہُوا تھا
باپ کے قتل ہونے کا قلق۔ بزرگ خاندان کے تباہ ہونے کا رنج پھر اس پر اوروں کی
گم گشتگی اس غریب کے لئے اور بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔

اب اس نے تنہائی میں بسر کرنا گوارا نہ کیا خدا کا نام لے کر چل کھڑی ہوئی اور سیدھی اس
رستہ پر آگئی جو ظالم آباد سے مظلوم پور کو آیا تھا۔ رستہ سے بے خبر۔ منزل سے نا آشنا۔ سینکڑوں
تکلیفیں اٹھائیں۔ ہزاروں آفتوں کا سامنا ہُوا۔ پاؤں آبلوں سے بھر گئے۔ ہر ایک آبلہ بجائے خود
ناسُور بن گیا۔ ان مصائب اور سختیوں کا مقابلہ کرتی ہوئی یہ لڑکی ظالم آباد کے نواح میں پہنچی
اور ایک مٹھ میں فروکش ہوئی۔ سادھوؤں نے اس کی صورت و غربت پر رحم کھایا اس کا نام نسب

پوچھا اس نے صاف صاف بے کم وکاست بیان کر دیا۔ اس رحم دل سادھو نے اسے ایک حجرہ دیں رہنے کے لئے جگہ دیدی سچ ہے روشن دلی اور خدا ترسی مذہبی اعتصاب کو ایسا جلا کر خاک کر دیتی ہے جیسے آگ لکڑی کو اور پھر اپنے و پرائے کی تمیز باقی نہیں رہتی۔

بلا رسیدہ زہرہ ایک دن مٹھ میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کے سامنے ایک تصویر آکر کھڑی ہوگئی جس کے سر اور داڑھی کے حد سے زیادہ بڑھ جانے والے بال چہرہ کے نقش و نگار کو چھپائے ہوئے تھے۔ اس ہیبت ناک صورت نے اس کے دل میں ایک کپکپی پیدا کر دی مگر اتفاق سے وہی سادھو اس وقت آنکلا۔ اب وہ صورت تو اس کی نگاہوں سے غائب ہوگئی مگر اس نے اپنے شفیق سادھو سے اس مہیب النظر انسان کی بابت سوال کر ہی لیا۔

سادھو۔ بیٹی! یہ بھی ایک خدا رسیدہ فقیر ہے۔ دن رات عبادت سے کام رکھتا ہے مگر مجذوب ہے۔

زہرہ۔ کیا یہ شخص یہیں کا رہنے والا ہے اور آپ کے مٹھ سے اس کو کچھ تعلق ہے؟

سادھو۔ نہیں! نہیں!! یہ تو سیاحانہ ادھر آنکلا ہے اور چند روز سے یہاں مقیم ہے۔

زہرہ۔ یہ نہیں معلوم کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟

سادھو۔ (ذرا سوچکر) صحیح صحیح تو پتہ نہیں معلوم ہوتا۔

زہرہ۔ پھر یہاں کیا کرتا ہے؟

سادھو۔ اس مٹھ کے پاس ہی جھاڑیوں کے قریب ایک قبر بنی ہے۔ یہ اُسی قبر پر اکثر بیٹھا رہتا ہے۔

زہرہ۔ تو کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ قبر کس کی ہے؟

سادھو۔ (تھوڑے تامل کے ساتھ) ہاں صاحب قبر کا نام مجھے معلوم ہے مگر بتاؤں گا نہیں۔

زہرہ۔ کیوں؟

سادھو۔ شاید تیرے دل کو صدمہ پہونچے۔

زہرہ۔ (چونک کر) ہائیں۔ مجھے اس سے کیا علاقہ۔ آپ کہئیے۔

سادھو۔ ہاں نیک بخت بیٹی تجھے معلوم نہیں۔ لے سُن۔ یہ قبر تیرے باپ کی ہے جو ظالم آباد کی شاہی تلوار کا شکار ہو کر اپنی زندگی سے قبل از وقت دست بردار ہو گیا۔

غمزدہ زہرہ یہ سُن کر بیہوش ہو گئی۔ اور ہوش میں آکر کہنے لگی۔ آہ! مجھے کیا معلوم کہ میں اپنے مظلوم باپ کے پہلو میں بیٹھی ہوں۔ ہائے میری نادانی۔ میں کچھ بھی اس قبر کی خدمت نہ کر سکی اچھا تو اب میں جاتی ہوں۔

سادھو۔ نہیں میری دردرسیدہ لڑکی نہیں۔ آج یہیں ٹھہر جا۔ ظالم آباد کا بادشاہ شکار کے لئے نکلا ہے وہ اس وقت اس مٹھ میں داخل ہوگا مناسب یہ ہے کہ تو اس وقت اس کی نگاہوں سے الگ رہے اور اس مٹھ کے اُدھر کیلوں کی جھاڑیوں میں جا بیٹھ رہ۔ وہیں سے تو اس کے جلوس کو بھی دیکھے گی اور محفوظ رہے گی۔

زہرہ نے یہ سننے کو تو سُنا مگر سر سے پیر تک اِس کے خون میں ایک حرکت غیر امتیازی پیدا ہو گئی۔ جرأت وہمت کی لہروں نے بے گناہ باپ کے قاتل سے بدلہ لینے کی طرف سلسلۂ جُنبانی کی۔ اس کے چہرہ پر ایک رنگ آنے اور ایک جانے لگا۔ چاہتی تھی کہ کچھ اپنے شفیق سادھو سے دلی بخار کی حالت بیان کرے اور اس کے دفعیہ کی فکر میں اسے بھی شریک کار بنائے مگر اس نے دلی اضطراب اور قلبی بے چینی کو روک کر کیلوں کی گھنی چھاؤں میں جانا پسند کر لیا اور لگی جلوس کی انتظار کرنے۔

(۲)

شاہزادہ یہاں کا نہایت بدچلن شخص تھا۔ اِس کی خود پسندی ونخوت شعاری سے لوگ ڈرتے تھے۔ ضد وہٹ کا لحاظ کرتے تھے اور کوئی بات اس کے سامنے ایسی زبان سے نہ نکالتے تھے جس میں اس کی برہمی کا اندیشہ ہو۔ اسے اپنے عیش ونشاط کے علاوہ کوئی دُوسرا

کام پسند نہ تھا ہمیشہ راگ رنگ سے چرچا تھا۔ اِس کے مصاحب عموماً نوجوان لڑکے تھے جو ہر محفلِ شوق کے محرم راز ہوتے اور ہمیشہ نئی شراب پیتے و پلاتے اور اکثر نشہ میں مست ہوکر رنڈیوں کے ساتھ ناچتے۔ وہ اکثر سیر و شکار میں مصروف ہوتا مگر اس میں بھی نئے مقام و نئی جگہ کے قیام سے وہی غرض مقصود ہوتی جو آتش عشق کو تیز کرتی۔

چنانچہ اس دفعہ جو سیر و شکار کو نکلا تو ظالم آباد سے نکلکر پہلی منزل اس لئے اسی مٹھ پر کی جہاں کہ غم نصیب زہرہ چند روز سے سکونت پذیر تھی۔ اِس کے آتے ہی تمام مٹھ کا میدان مخملی فرش سے بات کی بات میں آراستہ ہوگیا اور یہ ننگ بنی آدم تمکنتِ شاہی کے ساتھ وہاں جاکر بیٹھ گیا جہاں سے کہ ان کیلوں کی گھنی باڑھ بھی دکھلائی دیتی تھی۔ شراب و کباب کی محفل گرم ہوئی اور قسم قسم کے میوے کشتیوں میں چن کر رکھ دیئے گئے اور محفل رقص و سرود گرم ہوئی کہ یکایک شاہزادہ کی نگاہ زہرہ پر جا پڑی۔ نظر کے دوچار ہوتے ہی شاہزادہ نے سادھو سے پوچھا۔

شاہزادہ کیلے کی جھاڑیوں کے پاس کون ہے ؟

سادھو۔ سرکار یہ ایک لڑکی ہے۔

شاہزادہ۔ کیا یہ نووارد ہے ؟

سادھو۔ جی ہاں ابھی چند روز سے آئی ہے۔

شاہزادہ۔ (وزیر سے کچھ مشورہ کرکے) اچھا تو دیکھو وزیر کی کیا رائے ہے۔

وزیر۔ سادھو کو شاہزادہ کے ساتھ زہرہ کی شادی کا پیام دیتا ہے۔ سادھو چلا جاتا ہے اور زہرہ سے یوں باتیں کرتا ہے۔

سادھو۔ بیٹی میرے خیال میں تم بڑی خوش قسمت ہولو۔ ایشور نے میرے شرن میں آنے کی لاج رکھ لی۔ شاہزادہ تمھیں اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اب تم بہت جلد راجہ کی رانی بننے کا شرف حاصل کروگی۔ کہو کیا کہتی ہو ؟

ان لفظوں کو سُن کر زہرہ کے دل پر ایک بجلی سی گری۔ اس وقت اس کی عجیب حالت تھی اس نے سر جھکا لیا اور بہت دیر تک سوچتی رہی۔ اس وقت اس کے چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ کبھی تو مایوسی و ناکامی کا غلبہ ہوتا اور تمام چہرہ سفید پڑ جاتا کبھی اُمید کی جھلک سُرخی بن کر دوڑ جاتی اور کچھ کچھ تبسم کے آثار انتقامی جوش کی خوشی میں اس کے ہونٹوں پر آجاتے تھے۔ جسے دیکھکر سادھو بھی حیران ہوا اور کہنے لگا۔

سادھو۔ بیٹی! تمہاری خاموشی کو میں شرمیلی رضامندی سمجھوں یا دراصل تمہیں انکار ہی؟

زہرہ۔ (جی کڑا کر کے نہایت استقلال سے) نہیں مجھے منظور ہی۔ آپکے ارشاد کی تعمیل کو حاضر ہوں۔ مجھے منظور ہی۔ سادھو اس بات کو سُن کر کھل پڑا اور خود شاہزادے کے پاس جاکر اطلاع دیدی کہ وہ حضور کی خدمت میں رہنے کو تیار ہی۔

چنانچہ آج ہم اپنی اُس ستم رسیدہ زہرہ کو جس کے حُسن کی شہرت باپ کے قتل کی باعث ہوئی اس شاہی عشرت کدہ میں دیکھ رہے ہیں جہاں کہ وہ باپ کی نامنظوری کی وجہ سے نہیں آئی اور وہ بے گناہ قتل کیا گیا۔ مگر واہ رے حُسن واہ! کہ آج وہی تو ہی اور تیرا ظالم بادشاہ۔ سچ ہی تیری طاقت کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ تو دنیا کی انمول جنس ہے صانع قدرت کے کمال کی معراج ہی۔ اے حُسن اگر تو نے سینکڑوں ملک تباہ کرنے اور سینکڑوں سلطنتیں خاک میں ملادیں تو کوئی تعجب نہیں مگر زہرہ ضرورت سے زیادہ غمگیں ہی۔ چہرہ سے حسرت برستی ہی گو اس وقت وہ حریر کے نرم نرم بستروں پر لیٹی ہوئی ہی مگر وہ اسے کانٹوں سے بھی زیادہ بدتر معلوم ہوتے ہیں۔ بار بار کروٹوں کا بدلنا۔ بے لاگ اُٹھکر بیٹھنا بڑھے ہوئے اضطراب کی دلیل ہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ دل میں کچھ عجب قسم کے خیالات ہیں جو مختلف رنگوں سے چہرہ پر آشکار ہو رہے ہیں۔

قاعدہ ہی کہ جب عالمِ تنہائی میں کسی فکر کا غلبہ ہوجاتا ہی اور تمام پس و پیش پر نظر کرکے

ایک مستقل راے قایم کر لی جاتی ہی تو بسا اوقات وہ رائے لفظی جامہ پہن لیتی ہے۔
ہمارے دعوے کی دلیل یہ ہی کہ ایک بار اس پریشان لڑکی کی زبان سے نکلا۔ ہاں! ہاں!!
بس یہی موقع ہی۔ انتقام لیا جائیگا اور ضرور لیا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی وہ چونک پڑی اور بھیانک
ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ مگر جب ہر چہار طرف سناٹا نظر آیا تو اس نے اپنی قمیص کے اندرونی
پردے سے ایک چمکدار چیز نکال کر چپکے سے تکیہ کے نیچے رکھدی۔ کسی نے نہ دیکھا مگر متعدد شمعوں
کی روشنیوں نے یہ ظاہر کر دیا کہ یہ ایک صیقل شدہ خنجر ہی جو باپ کے خون کے انتقام کا آلہ ہی۔
اس اثنا میں ایک ضعیفہ اس کمرے میں داخل ہوئی اور کہنے لگی۔

ضعیفہ۔ کہو! بیٹا مزاج کیسا ہی؟

زہرہ۔ مادر مہربان میں اچھی ہوں۔ سر میں درد ہی۔

ضعیفہ۔ (سر پر ہاتھ رکھکر) لو میں دم کئے دیتی ہوں درد ابھی جاتا رہیگا (کچھ پڑھکر
دم کرتی ہے)
کہو اب درد کی کیا حالت ہی۔

زہرہ۔ (مسکرا کر) کم ہو گیا۔

ضعیفہ۔ اب تیرا شوہر (بادشاہ) بھی داخل ہی ہوا چاہتا ہی۔

ان الفاظ کے سنتے ہی زہرہ پھر بے چین ہو گئی مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ضعیفہ چلی گئی
شاہزادے کی آمد آمد کا غل ہوا۔ آیا۔ بیٹھ گیا۔ دستر خوان چنا گیا۔ شراب و کباب سے فراغت ہوئی
تخلیہ کا حکم ہوا۔ سب سامان بڑھا دیا گیا۔ دروازے بند ہو گئے۔ صرف ایک صراحی و ساغر اور
تھوڑی سی گزک یہاں رہ گئی۔ بادشاہ نے زہرہ کا شانہ ہلا کر میخواری کی درخواست کی زہرہ نے
انکار کیا مگر ایسے انداز معشوقانہ سے کہ اسے ناگوار نہ گذرا۔ چاہا کہ رخت خواب پہنے کہ کسی نے
دروازہ کھٹکھٹایا۔

بادشاہ۔ (غصہ سے) کون ہی؟

آواز۔ حضور! خادم دولت۔ ناظر محل۔

بادشاہ۔ کیوں؟ کیا کام ہے؟

آواز۔ جہاں پناہ۔ وزیر صاحب تدبیر بہر سلام حاضر ہیں۔ ایک ضروری کام ہے۔

بادشاہ۔ کہدو۔ جائیں۔ اس وقت ہم نہیں مل سکتے۔

آواز۔ حضور! میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا مگر وہ عرض کرتے ہیں کہ امور سلطنت کے متعلق ایک ضروری گذارش ہے۔ خدا حضور کو سلامت رکھے حضور مل لیں۔

بادشاہ۔ اچھا۔ شرق رُویہ کمرہ میں بلاؤ۔

غلام جاتا ہے اور صاحب تدبیر کو بُلا لاتا ہے۔ بادشاہ بھی اس کمرے میں چلا جاتا ہے۔

وزیر۔ تعظیم دے کر خدا حضور کو سلامت رکھے میں نے ایک خاص غرض سے تکلیف دی ہے۔

بادشاہ۔ وہ کیا۔ کہو؟ مجھے تو تکان کی وجہ سے سخت نیند کا غلبہ ہے۔

وزیر۔ کیوں نہو۔ اٹھارہ کوس کی منزل بھی تو ہو گئی مگر جہاں پناہ میں نے سخت مجبوری پر اس وقت تکلیف دینے کی جرأت کی۔ ورنہ ہرگز ایسی بے ادبی نہ ہوتی۔

بادشاہ۔ اچھو کہو کیا کام ہے۔ خیریت تو ہے۔

وزیر۔ جہاں پناہ۔ مجھے شام کو معلوم ہُوا ہے کہ وہ لڑکی جو آج شاہی محل میں اپنے حُسن کی قوت کی وجہ سے داخل ہوئی ہے اور جس کے لئے کہ حضور بے حد بے چین تھے وہ بختیار خاں کی دختر نیک اختر ہے جو حضور کے حکم سے بے گناہ قتل ہوا ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس کے یہاں آنے میں کوئی راز ہو اور باپ کے انتقام کی آگ اس کے اس سفر کا باعث ہو۔

بادشاہ۔ (گھبرا کر) پھر تو اب اس کی کیا تدبیر ہے۔ اس کی دلی حالت کیسے معلوم ہو سکتی ہے؟

وزیر۔ بہت آسان تدبیر ہے۔ ابھی حضور اسے حمام میں لے جانے کا حکم دیں۔

بادشاہ۔ (بادشاہ بشاش ہوکر) بہتر بہتر۔ کہتا ہوا وہیں آیا جہاں زہرہ بیٹھی تھی اور ضعیفہ کو بُلاکر حمّام میں لیجانے کا حکم دیا۔ زہرہ نے بھی اُنکا رمناسب نہ جانا چلی گئی۔ جاتے ہی بادشاہ نے بستر کی دیکھ بھال شروع کی کہ یکایک تکیہ کے لوٹتے ہی ایک آبدار خنجر رکھا ہوا ملا۔ اُٹھایا اور خوف سے تھرآتا ہوا وزیر کے سامنے لاکر پھینک دیا اور کہنے لگا۔

اُف! یہ کمبخت حُسن کی دیوی ایسی خطرناک نکلی (وزیر سے) میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کرسکتا کہ تمہاری جودت طبع نے مجھے بال بال بچالیا۔

وزیر۔ یہ ہم لوگوں کا عین فرض ہے اب یہ ارشاد فرمایئے کہ آپنے اس کی سزا کیا تجویز کی ہے۔

بادشاہ۔ اس کی سزا سوائے قتل کے اور کیا ہوسکتی ہے؟

وزیر۔ کچھ سوچ کر (رقیبانہ انداز سے) یہ ٹھیک نہیں۔

بادشاہ۔ (غور سے دیکھکر) تو کیا اسے چھوڑ دیا جائے۔

وزیر۔ جہاں پناہ! نہیں! نہیں!! یہ میرا منشا نہیں ہے بلکہ میں اس راز کا افشا اس خیال سے نہیں چاہتا کہ کل کو کوئی پھر ایسی جرأت کر بیٹھے لہذا اس کے قتل میں زہر سے کام لینا چاہیئے۔

بادشاہ۔ بہتر مگر اس کا انتظام جلد ہو تاکہ یہ منحوس صورت صبح ہونے سے پہلے دُور ہوجائے۔

وزیر۔ ابھی! ابھی!!

وزیر۔ (ناظر محل سے مخاطب ہوکر) طبیب شاہی کو بلاؤ۔

فوراً طبیب شاہی حاضر ہوا اور شربت زہر آلود کی تجویز پاس ہوگئی وزیر وطبیب اپنے اپنے کام کے لئے رخصت ہوئے۔ بادشاہ خیمۂ خاص میں جسم وروح کو غذائے خواب دینے کے لئے چلا گیا۔ زہرہ نے حمّام کی واپسی کے بعد خنجر کو موجود نہ دیکھکر سمجھ لیا کہ راز فاش ہوگیا اب موت سے اور میں، لیکن پھر بھی عالم بیخودی میں یوں کہنے۔ اُہو۔ شفیق باپ سے چھُٹ کر اور عزیز واقارب سے

جُدا ہو کر جینا بھی کوئی جینا ہے اس سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ ممکن تھا کہ مجھے اپنے پیارے باپ کے انتقام کا موقع مل جاتا اور پھر یہ نوبت آتی اگر نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ میرے باپ کے قاتل نے یہ معلوم تو کر لیا کہ یہ لڑکی اپنے باپ کے خون کے عوض کی پیاسی ہے اسے اس خون کی آگ کے سامنے اپنی زندگی شاہی آرام و آسایش کے ساتھ بسر کرنی منظور نہیں۔

اس اُمید و بیم میں تھی ہی کہ صبح صادق کے آثار پیدا ہوئے۔ طبیب شاہی شربت کا گلاس لے کر آیا اور بولا کہ لیجئے یہ شاہی ہدیہ ہے اس کے پینے سے تمام تکلیفیں و بےچینیاں دُور ہو جائیں گی (گو زہرہ کو یقین تھا کہ یہ پیالہ پیالۂ موت ہے مگر) وہ نہایت خندہ پیشانی سے پیالہ کو لے کر یہ کہتی ہوئی پی گئی کہ لے او! ظالم بادشاہ تیرے سر میرا اور میرے باپ یعنی دو بے گناہوں کا خون عائد ہوتا ہے۔ تجھے اس کا جواب اپنے معبود برحق کے سامنے دینا ہوگا مگر اس کے بعد ہی غشی طاری ہوگئی۔ حالت دگرگوں ہونے لگی۔ ہاتھ پاؤں میں تشنج کے آثار پیدا ہو گئے پُتلیاں اوپر کو چڑھ گئیں۔ موت کے آثار نمودار ہوئے تھوڑی دیر کے بعد دیکھنے والوں کو یقین کامل ہو گیا کہ مُرغِ رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا اور حُسنِ حسینہ خاک میں مل گیا۔

(۳)

وزیر۔ (سامنے بیٹھی ہوئی عورت سے مخاطب ہو کر) تم مجھ سے شادی کر لو۔

عورت۔ (آہ سرد بھر کر) نہیں! ہرگز نہیں!!

وزیر۔ آخر اس کی وجہ؟

عورت۔ وجہ پوچھنے سے تجھے مطلب۔ سروکار۔ تو کون۔ میں شادی نہیں کرتی

وزیر۔ نہیں نہیں مجھے اس کی وجہ معلوم ہے تو اپنے باپ بختیار کا بدلہ بادشاہ سے لینا چاہتی ہے تو اس کی لڑکی ہے۔ اپنے بزرگ خاندان اسد کی آوارہ گردی کے بعد نکلی ہے۔ مجھ سے میرا دوست سادھو کہہ گیا تھا۔ مگر میں نے تیری جان بادشاہ کے پنجۂ غضب سے اس لئے بچائی ہو کہ اے ملکۂ حُسن! تیری دلفریب صورت کا نقشہ میرے آئینۂ دل میں کھنچا

رہا اور تو ہر وقت میرے سامنے بیٹھی ہو۔ اے صانع قدرت کے کمال معراج کی پرتو اور حسن کی دیوی تجھے اپنے اس حسن فسوں ساز کی قدر کرنی چاہیئے جس نے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا کہ میں شاہی طبیب سے سازش کر کے تیری جان بچاؤں اور تجھے قبر کی تاریکی سے نکال کر ایوان وزارت میں رکھوں اور تیرے بجائے مصنوعی تابوت دفن کروں۔ اُف! اس پر بھی تجھے میری قدر نہیں ہے سچ ہے معشوق محسن کش واحسان فراموش ہوتے ہیں انھیں کسی کے جان کی فکر نہیں ہوتی۔

وزیر۔ اے میری پیاری زہرہ اب بھی میرے کہنے کی قدر کر۔

زہرہ۔ تم کیا اور تمہارا کہنا کیا۔

وزیر۔ کچھ نہیں؟

زہرہ۔ کچھ نہیں اور بالکل کچھ نہیں۔

وزیر۔ کیوں۔ کیا تو در اصل شادی کا اقرار نہ کرے گی۔

زہرہ۔ ہرگز نہیں کیوں کہ میرے سامنے تیری ہستی کیا ہی تو بادشاہ ظالم کا زرخرید غلام بنا ہوا ہی اور میں اپنے باپ کے خون ناحق کا بدلہ لینے کے لئے تیار ہوں۔ تو اس کی وفاداری میں کتوں کی طرح مصروف ہی اور مجھے اس کے ناپاک جسم پر شیرانہ حملہ کی ضرورت ہی۔ لہذا تیرا میرا ساتھ کیا۔ تو اس خیال خام سے باز آ۔ میں تیرے دام میں نہیں آنے کی؟

وزیر۔ (غصہ سے دیکھکر) او ملکہ حسن ہوش میں آ ورنہ تیری جان میرے ہاتھ میں ہی؟

زہرہ۔ (مسکرا کر) میں ہوش میں ہوں میری جان تیرے ہاتھ میں نہیں ہی۔

وزیر۔ کیا میں نے ابھی تجھے نہیں بچایا۔

زہرہ۔ نہیں چوں کہ میری حیات کے چند لمحات اور باقی تھے خداوند کریم نے اسباب مہیا کر دیئے بچ گئی۔ تو تو میرے خیال میں سخت نادان ہی کہ اس چیز کو اپنے اختیار میں جانتا ہی جس کا

مالک خدا ہی - او غافل سُن اور اچھی طرح سُن - مجھے زندگی کی بالکل پروا نہیں ہی اس لئے جب تک میرے دم میں دم ہی تیری آرزو پوری نہیں ہو سکتی -

وزیر - غصہ سے خنجر لے کر آگے بڑھا اور بس ہوشیار ہو جا کہکر چاہا کہ قتل کرے مگر جادوئے حسن کی قوی قوت سے زیر ہو کر بجائے اس کے کہ قتل کرے ستون ایوان سے باندھکر چلا گیا اور یہ کہہ گیا کہ اچھا کچھ عرصہ اور سوچ لے -

زہرہ نے کرنے کو تو مقابلہ مردانہ وار کیا اور دلیرانہ پیش آئی مگر آہ! بیقراری و مایوسی کو کیا کرے تنہائی کے ساتھ یہ سب باتیں بھی جمع ہو گئیں جس سے اس کی آنکھیں ابر نوبہار کی طرح برسنے لگیں اور آہوں کے دھوئیں فلک سائی میں مصروف ہو گئے - اب نہ کوئی یار ہے نہ مددگار - بس ایک وہی بیچاری یکہ و تنہا زہرہ رحمت معبود کی منتظر بیٹھی ہے کہ ناگاہ وہی فقیر نمودار ہوا جس سے منھ میں آنکھیں چار ہو چکی تھیں - بس اس نے آتے ہی جلدی جلدی اس کے بند کھولے اور اشارہ سے اس کو اپنے ساتھ لے کر قریب کے ایک تہ خانے میں داخل ہو گیا جہاں سے کچھ دُور جا کر ایک ویرانہ میں نمودار ہوا -

جب وزیر آیا تو زہرہ کو اپنی جگہ نہ پاکر سخت متوحش و پریشان ہوا - اطراف و جوانب میں بغرض تلاش آدمی بھیجے - ہر کھنڈر و ویرانے کی تلاش کی گئی مگر نہ ملنا تھا زہرہ نہ ملی - بالآخر مجبور ہو کر شاہی لشکر کے ساتھ کوچ کی تیاری کر دی اور سب کے سب ظالم آباد آپہونچے - زہرہ فقیر کے ساتھ ویرانہ میں پہونچی تنہائی کا عالم ہے - متحیر ہو کر کبھی آسمان کو دیکھتی ہے اور کبھی فقیر کو تکتی ہی مگر جب بادشاہ کا بستر حریر اور وزیر کا ایوان یاد آتا ہی تو تھرّا اُٹھتی ہے اور کہنے لگتی ہی کہ اے معبود - تیری قدرت کا کیا کہنا - تو بڑا بچانے والا ہی - کہاں مجھ سی ناچیز و گنہگار لونڈی اور کہاں تیرا یہ احسان - اتنا کہکر پیرمرد کی طرف مخاطب ہو جاتی ہی -

زہرہ - (مودبانہ لہجہ سے) اے پیرمرد تو کون ہی - اب اپنی حالت بیان کر اور مجھے اس غم و الم سے نجات دے -

پیرمرد۔ (سکوت اور لمبی خاموشی کے بعد) اے زہرہ ابھی تیرا یہ سوال بیجا ہی جب وقت آئے گا تو میرے حال سے واقف ہو جائے گی دیکھو وہ وقت قریب ہی۔ آ چل اب چل کر کسی دیر میں بیٹھ رہیں۔

زہرہ۔ (سامنے کی طرف ہاتھ اٹھا کر) کیا اسی دیر میں۔

پیرمرد۔ نہیں۔ اب یہاں کام نہیں بنے گا یہاں فائدہ کی امید کم ہی چلو دیر لکفر میں چل کر جو بحر کیپین کے پاس ہی ہم تم رہیں۔

زہرہ۔ وہ دیر کہاں ہی؟

پیرمرد۔ یہاں سے چند منزل کے فاصلہ پر مغرب کی طرف واقع ہی۔

غرض یہ دونوں متنفس رات بھر اسی مقام پر رویا کئے مگر سورج نکلنے سے پہلے دیر لکفر کی طرف روانہ ہو گئے۔

(۴)

درویش۔ اوہو پیاری ایلس تم آ گئیں ہیں تمہارا انتظار ہی کرتا رہا تھا۔

ایلس۔ ہاں اے بزرگ میں حاضر ہوں جو ارشاد ہو بجا لاؤں۔

درویش۔ دیکھو اس دیر میں آئے ہوئے ہمیں کامل دو برس گزر گئے اور مہتمم دیر نے اپنی مہربانی سے ہمیں ٹھہرنے کی بھی اجازت دے دی۔

ایلس۔ بیشک۔ اچھا پھر۔

درویش۔ پھر کیا اب وہ وقت نزدیک ہی جس کے انتظار میں آنکھیں پتھرا رہی تھیں آج وہ ظالم بادشاہ ادھر سے گزرے گا اور تمام رات یہیں مقیم رہیگا اس لئے اب تو انتقام کے لئے تیار ہو جا۔

ایلس۔ اُف۔ وہی ظالم (کانپ کر) وہی ظالم جس نے میرے باپ کو مارا ہی۔

درویش۔ ہاں ہاں وہی ظالم۔ جو تیرے بے گناہ باپ کا قاتل ہی اور جس کا انتقام کی

آگ تیرے سینہ میں ہی۔

ایلس۔ اب سمجھی اور خوب سمجھی اچھا آپ یہ تو فرمایئے کہ اگر اُس نے پہچان لیا کہ یہ وہی زہرہ ہی تو کیا ہوگا۔

درویش۔ نہیں نہیں اس خیال سے باز آ۔ کیوں کہ اسی لئے تو تجھے گیسٹ کے حوالہ کر دیا تھا۔ اب تیری وضع میں خاصی تبدیلی ہی جس کی بنا پر بعض اوقات مجھے بھی دُھوکا ہوتا ہی کہ یہ زہرہ نہیں ہی۔

ایلس۔ (زہرہ) اچھا جب آپ اس طرح اطمینان دلاتے ہیں تو پھر کیا (ذرا تیور کڑے کرکے) اب بلا باپ کے خون کا بدلہ لئے جانے نہیں دیتی۔ میرے سینہ میں ابھی وہی دل ہی۔

درویش۔ شاباش! شاباش!! آفریں صد آفریں۔

ایلس۔ ہاں تو پھر کیا میں اس موقع پر اپنے اُسی طریقہ سے کام لوں۔ یعنی وہی تیز و تند گریبان میں چھپا ہوا خنجر۔

درویش۔ نہیں نہیں۔ ایک کمسن لڑکی کے کمزور اور کانپتے ہاتھ اِس مُہم کو سر نہیں کر سکتے۔

ایلس۔ تو کیا اس کے علاوہ کوئی اور سہل ترکیب ہی؟

درویش۔ ضرور۔ ضرور لو (کمر سے پڑیہ نکال کر) یہ ایک پڑیا ہی تیری دائمی آگ کے بجھانے کے لئے یہ کافی ہی۔ جاؤ وقت کو ہاتھ سے نہ دینا اور خوف و ہراس کو پاس نہ آنے دینا۔ میں پھر ملوں گا۔

ایلس۔ جایئں آپ بیفکر رہیں۔

آنے کو تو ایلس آئی مگر ٹھیک اُس وقت پہونچی جب کہ شاہی خدمت کے لئے کلیسا کے تمام مرد وزن اکٹھا تھے اور لڑکیاں ایک طرف تماشہ میں مصروف تھیں۔ ایلس بھی جا کر اسی جھُرمٹ میں کھڑی ہوگئی۔ مگر بادشاہ کی نظر جوں ہی اس طرف آئی اس کے حُسنِ فسوں ساز

کی دلآویزی تیر آتشیں بن کر شاہی قلب مضطر پر پڑی۔ بادشاہ بے چین ہو گیا اور ایک گزشتہ تصویر کا نقشہ اس کی نظروں کے سامنے پھر گیا۔ پہلے تو ذرا جھجکا مگر پھر سمجھلا اور اُس کے موت کے واقعہ نے تسکین دی تشفی فرمائی اب اسے بغیر اس کے لطفِ زندگی ہیچ نظر آنے لگا فوراً امیر طلب ہوا اور سرگوشیاں ہونے لگیں۔

بادشاہ ۔کیوں جی کس انتظار میں ہو؟ اب تو آرام کی فکر ہونی چاہیے۔

امیر ۔جہاں پناہ۔ بیشک ۔جو حکم ہو۔

بادشاہ ۔میں اس داہنی بازو والی سادہ لڑکی کو آج بسترِ استراحت پر دیکھنا چاہتا ہوں

ورنہ ۔۔۔۔۔

امیر ۔حضور ضرور یہ لڑکی اسی قابل ہے کہ شاہی خدمات کو انجام دے۔ مگر تردد صرف اسی کا ہے کہ کلیسا کی رہنے والی عورتیں مرد کی صحبت سے دور بھاگتی ہیں۔ یہ ان کا ایک قسم کا عہد ہوتا ہے اور پادری کسی کو بطیب خاطر نہیں دیتے۔ خیر جو کچھ بھی ہو آپ گھبرائیں نہیں میں اس کی کوئی سبیل نکالوں گا۔

بادشاہ ۔نکالوں گا کیا معنی۔ اب سرِ دست کوئی تدبیر کرو اور فوراً کرو۔

امیر ۔کیا ابھی ابھی۔ اتنی جلدی۔

بادشاہ ۔ ہاں ہاں ابھی ابھی میں اس وقت آرام نہ کروں گا جب تک کہ یہ مرحلہ طے نہ ہو جائے گا۔

امیر ۔ بہتر۔ بہتر۔ جاں نثار کو کیا عذر۔

غرض امیر نے جا کر سردارِ دیر سے بادشاہ کا یہ پیام بیان کیا کہ "میں آپ کی مہمان نوازی سے بہت خوش ہوں۔ اب اس اطراف کے تمام علاقے اس دیر کے خرچ میں دیتا ہوں" وہ آپ لوگوں کے اخلاق سے بہت خوش ہیں۔

سردارِ دیر ۔ کہیئے اور تو کسی قسم کی بادشاہ سلامت کو تکلیف نہیں ہے۔

امیر۔ نہیں صرف ایک امر اس وقت باعثِ تشویش واقع ہوگیا ہے۔ وہ یہ کہ شاہی مطبخ میں ایک نوجوان طباخہ تھی راہ میں علیل ہوکر راہی عدم ہوگئی اب اس سفر میں ایسی حسین ہوشیار باورچن کا ہاتھ آنا جو شاہی باورچی خانہ کا انصرام کرسکتی ہو غیر ممکن ہے البتہ اگر آپ کوشش کریں تو ممکن ہے۔

سردار۔ تو کسی ہوشیار سلیقہ شعار باورچن کی ضرورت ہے۔

امیر۔ ہاں ہاں۔ ہمیں سردست بس اسی کی ضرورت ہے۔

سردار۔ میں ان لڑکیوں میں سے جسے حضور پسند فرمائیں خدمتِ شاہی کے لئے دیسکتا ہوں مگر اس قسم اور عہد پر کہ یہ اور تعلقات دنیاوی سے بالکل بری اور محفوظ رکھی جائیں اور ان کے معاملہ میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھا جائے۔

امیر۔ ہاں ہاں۔ میں آپ کے ارشاد کو سمجھ گیا۔ بس۔ بس رہنے دیجئے لاحول ولاقوۃ ایسا کیسے ممکن ہے۔

سردار۔ تو بس آپ جسے انتخاب فرمائیں۔

امیر۔ حضور والا نے ایلس کو منتخب فرمایا ہے۔

سردار۔ (مسرت کے ساتھ) کیوں نہ ہو۔ شاہی انتخاب ہے وہ در اصل نہایت نیک بخت اور سلیقہ مند لڑکی ہے یہ کہا اور ایلس کو آواز دی (ایلس سے مخاطب ہوکر) تم یہ بتاسکتی ہو کہ میں نے اس وقت کیوں بلایا ہے۔

ایلس۔ جی نہیں!

سردار۔ تم ایک خاص خدمت کے لئے بلائی گئی ہو۔

ایلس۔ ارشاد۔

سردار۔ تمھیں شاہی طباخی کا کام انجام دینا ہوگا۔ اور وہ اس لئے کہ اوّل تو شاہی طباخہ کا انتقال ہوگیا دوسرے وہ تمہارے مہمان ہیں۔ یہ صاحب جو بیٹھے ہیں تمہارے

لینے کے لئے آئے ہیں۔

ایلس۔ (مسرت ظاہر کرتے ہوئے) بسروچشم۔ بدل وجان منظور۔ مگر کیا عمر بھر کے لئے۔

امیر۔ نہیں نہیں! چند روز کے لئے۔

سردار۔ اگر عمر کے لئے بھی ہو تو کیا مضائقہ

ایلس۔ جی نہیں۔ بلکہ یہ خدمت تو میرے لئے سعادت ہے۔

غرض یہ شریر النفس امیر ایلس کو خیمۂ شاہی کی طرف لے چلا۔ ایلس بھی انتقامِ دائمی کی آگ کو دامنِ حکمت میں چھپائے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ خیمہ میں آئی اور کرسیِ زرنگار پر بیٹھے ہوئے بادشاہ سلامت کو دعا دے کر باادب کھڑی ہو گئی۔ امیر بھی اشارہ شاہی پا کر رخصت ہوا۔

بادشاہ۔ سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرکے (......)

ایلس۔ میں حضور کے الطافِ خسروانہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور عرض پرداز ہوں کہ خدّام شہریار کے ساتھ بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

بادشاہ۔ یہ تہذیب تمہارے حسن کو اور بھی دوبالا کرتی ہے۔

ایلس۔ میں نہ تہذیب سے واقف نہ حسن سے آشنا۔ ایک دیر کی خدمت کرنے والی۔ دنیا اور اہلِ دُنیا سے قطع تعلق کرنے والی بدنصیب عورت ہوں۔

بادشاہ۔ اُف! یہ جوانی۔ یہ عنفوانِ شباب اور یوں اہلِ دُنیا سے ناآشنائی آخر یہ جوگ کس لئے۔

ایلس۔ حوادثِ روزگار کی سختیاں جب انسان کو پیستی ہیں تو انجام کار یہی سوجھتا ہے کہ قبل از وقت اس ناپائدار دنیا سے رشتہ قطع کر لیا جائے۔

بادشاہ۔ تمہارے دل پر کس سخت صدمہ کا اثر ہے۔

ایلس۔ صدمہ؟ اُف صدمہ!!

بادشاہ۔ وہ ایسا کون قسی القلب تھا جو ایک حسینہ کے لئے ظالم ثابت ہوا۔
ایلس۔ دُنیا اہلِ شقاوت سے بھری پڑی ہے کس کا نام لوں۔
بادشاہ۔ کاش میں اس ظالم کا نام معلوم کرسکوں اور پھر اسے کافی سزا دے سکوں۔
ایلس۔ حضور کیوں تکلیف فرمائیں۔ اِس بدبخت کو عنقریب سزا مل جانے والی ہے۔
بادشاہ۔ کیا میرے ہاتھ سے؟
ایلس۔ جی نہیں۔ ایک عورت کے کمزور ہاتھ سے۔
بادشاہ۔ اِس عورت سے مُراد کیا خود تمہاری ذات ہے؟
ایلس۔ کیا عجب خدا کے نزدیک سب آسان ہے۔
بادشاہ۔ سزا دینے کا طریقہ کیا ہوگا۔ کیا تمھیں اس پر دسترس حاصل ہے؟
ایلس۔ اب سے چند ساعت پہلے وہ میرے قابو سے باہر تھا مگر اب وہ میرے پھندے میں آگیا۔
بادشاہ۔ اِس مُعمّہ سے کچھ خلجان سا پیدا ہوتا ہے۔
ایلس۔ یہ نہ کوئی مُعمّہ ہے اور نہ اس سے کسی قسم کا خلجان پیدا ہو سکتا ہے۔ جب اس بارگاہ تک رسائی ہوگئی تو پھر وہ ایسا کون شخص ہے جو میرے دست اختیار سے باہر ہے۔
بادشاہ۔ تمہارا یہ خیال قابل تسلیم ہے (مسکراتے ہوئے) اور اب تو خود میرے دل پر تمھیں قابو ہو چکا ہے۔
ایلس (شرمندہ ہو کر) لونڈی اپنی زبان سے یہ کلمہ نہیں کہہ سکتی۔
بادشاہ۔ تم کہو یا نہ کہو۔ میں تو صاف صاف اظہار کر رہا ہوں۔
ایلس۔ کیا تعجب ہے جو یہ فرمان صحیح نکل آئے۔
بادشاہ۔ یقیناً صحیح ہے۔
ایلس۔ بس پھر تو مجھے دشمن پر ہر طرح سے قدرت حاصل ہوگئی۔

بادشاہ - ہاں حاکمِ وقت کی محبوبہ کو ایک فرد پر اختیارِ کلی حاصل ہے۔

ایلس - اور خود حاکم پر بھی۔

بادشاہ - (مسکرا کر) بیشک! بیشک!!

ایلس - اگر یہ اقرار صحیح ہے تو میرا تیر بھی نشانہ پر بیٹھ چکا۔

بادشاہ - تو یہ دن تمہارے لئے نہایت ہی مبارک ہے۔

ایلس - ابھی تو نہیں مگر ہاں یقین ہے کہ مبارک ثابت ہو جائے گا اور فقط میری ہی لئے نہیں بلکہ ایک دنیا کے لئے۔

بادشاہ - مجھے تمہاری باتوں سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہو چلی ہے۔

ایلس - جی ہاں مگر صرف چند ساعت کے لئے۔

بادشاہ - اس کے کیا معنی؟

ایلس - معنی صاف ہیں اب حضور آرام فرمائیں گے صبح ہوتے ہوتے دیکھئے نظر کا کیا حال ہوا اس طرف رہی یا کسی اور . . . . .

بادشاہ - میں دعا کرتا ہوں کہ تمہارے سوا اور کسی دوسرے دلفریب چہرے پر نظر نہ ڈال سکوں۔

ایلس - آمین! ثم آمین۔

بادشاہ - ہاں یہ تو بتاؤ تمہارا نام کیا ہے اور کون سی زمین کو ایسی دل رُبا تصویر کی پیدائش کا شرف ملا ہے؟

ایلس - اس لونڈی کو ایلس کہتے ہیں جیسا کہ حضور نے سُن بھی لیا ہوگا۔ رہا وطن چند ساعت قبل دیر تھا اب بارگاہِ سلطانی ہے۔ آیندہ دیکھئے کہاں ٹھکانا ملے۔

بادشاہ - تمہاری باتوں سے کچھ وحشت سی پیدا ہوتی ہے۔

ایلس - میں اس وحشت کے دُور کرنے کی کوشش کروں گی۔

بادشاہ - میں ایک معاملہ میں سخت حیران ہوں۔

ایلس - وہ ایسا کیا معاملہ ہے۔

بادشاہ - ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہمارے محل میں ایک لڑکی داخل ہوئی تھی بجنسہٖ تمہاری ہم صورت مگر اس کی پیاری چتونوں میں جفا کاری کے طور پنہاں نکلے اُس کے پاس سے ایک خنجر بھی برآمد ہُوا جس نے مجھے اس طرف سے مشکوک کر دیا اور اُسی شب کو وہ جمیلہ قبر میں جا سوئی

ایلس - کیا حکم شاہی سے ؟

بادشاہ - ہاں یہی سمجھو۔

ایلس - اچھا پھر ؟

بادشاہ - پھر کیا جب سے تمہیں دیکھا ہے۔ وہ رہ کر اس خوفناک لڑکی کی تصویر نظروں میں پھرتی ہے۔

ایلس - کیا تعجب ہے کہ ارکان دولت نے کوئی چال کی ہو اور وہ لڑکی اس وقت صحیح وسلامت ایلس کے لباس میں موجود ہو اب آپ کو میری طرف سے ہرگز مطمئن نہ رہنا چاہیئے۔

بادشاہ - (ہنس کر) نہیں! نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا اس کی تو اب ہڈیاں بھی دستیاب نہیں ہو سکتیں۔

ایلس - (شوخی سے) پھر بھی انسان کو احتیاط لازم ہے حضور اس وقت کسی حسادمہ خاص کو بُلوا کر میری جامہ تلاشی کرالیں۔

بادشاہ - میں ان فقروں کو تمہارے تقاضائے سن پر محمول کرتا ہوں یہ شوخیاں اس عمر کا زیور ہیں۔

ایلس - خیر آپ جانیں۔

بادشاہ - اچھا اب رات زیادہ گذر چکی ہے میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ رستے کی تکان سے دل بیٹھا جاتا ہے اگر اس وقت شہد کا شربت بنالا دُو تو کچھ تسکین ہو۔

ایلس۔ ابھی لائی ابھی۔ اور اس شربت کی تیاری میں تو مجھے خاص ملکہ ہے۔ یہ کہتے ہی اس نے گلاس اٹھالیا۔ بوتل سے صاف و شفاف شہد لیا اور سرد پانی ملانے کے لئے آبدار خانہ کی طرف چل نکلی۔ تھوڑی دیر میں لبالب گلاس لئے آپہونچی۔ پیر مرد کا منتر بھی آہستہ میں پورا کرکے بولی۔

"لیجئے شربت حاضر ہے"

بادشاہ سلامت۔ (غٹ غٹ پی کر) اوہو۔ کیا لذیذ شربت ہے اور بیشک یہ ساری لذت ان ہاتھوں کی بدولت ہے۔

ایلس۔ تسلیم قدر دانی۔

"میں نے عمر بھر ایسا شربت نہیں پیا"

ایلس (چپکے سے) اور نہ اب آئندہ پی سکتے ہو۔

"کیا کہا"

ایلس۔ کچھ نہیں۔ یہ عرض کرتی ہوں کہ اب حضور آرام فرمائیں میں سرہانے بیٹھکر مورچھل جھلتی ہوں۔

"اچھا"

کہنے کو تو کہا مگر بیٹھتے ہی غنودگی طاری ہوگئی اور چند منٹ کے بعد ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ زہرہ نے دیکھا کہ اب میرا جادو کام کرگیا اس لئے اب ٹھہرنا مفید نہیں فوراً وہاں سے اٹھی اور بے ساختہ یہ کہکر چلی کہ اب ٹھنڈا ہوگیا مگر باہر نکل کر بجز تاریکی کے کچھ نہ دیکھکر ڈری جھجکی اور گھبرائی کہ یکایک وہی پیر مرد اس کی دستگیری کو آپہونچا۔ اور زہرہ کو اپنے ساتھ لیکر ایک مخفی راہ سے ویرانے کی طرف نکل گیا کئی ہفتہ تک برابر چلتا رہا۔

زہرہ کو اثنائے راہ میں تو پیر مرد کی بابت کچھ نہ معلوم ہوا لیکن جب مظلوم پورر ت بے کار استہ رہ گیا اور ان سے دو اور اجنبی مسافر آکر وہیں مل چکے تو اسے معلوم ہوا کہ یہی میرا خاندانی بزرگ اسد اور یہی میرے وہ گم شدہ عزیز ہیں جو آج تک گم گشتہ راہ تھے۔

منیر حیدر۔ قریشی۔ ماہلی

درسِ اُلفت

(۱)
راتوں سوزِ اُلفت سے
پھنتا تھا میں بستر پر -
یادِ کسی کی مدت سے
کرتی تھی دل کو مضطر

(۲)
ہجر کا مارا - نیند کہاں!
بے چینی سی رہتی تھی
وادیِ چشم - اوراشک رواں!
اُمنڈی ندی بہتی تھی

(۳)
بھرآتا دل رہ رہکر
آنکھیں خوں میں ستی تھیں
کالی گھٹائیں منڈلاکر
آتی اور برستی تھیں

(۴)
ڈھونڈا برسوں دلبر کو
شمعِ محبت لے کر
وشتِ قضا میں - رہبر کو
تند ہوائیں بڑھ بڑھ کر

(۵)
دنیا سے کیا مطلب تھا؟
دُنیا کس کو بھاتی تھی؟
رندانہ سا مشرب تھا
دنیا خود گھبراتی تھی -

(۶)
کٹتے تھے بس یونہی دن
ہوتی تھیں دل سے باتیں
پاس نہ تھا کوئی محسن
تنہائی کی تھیں راتیں

(۷)
صحرا کے بیگانوں میں
میں ہی اک دیوانہ تھا
باغِ اُلفت آنکھوں میں
اُجڑا سا - ویرانہ تھا

(۸)
ہر شے سے کچھ نفرت تھی
نازِ وفا پر کرتا تھا -
دل میں شمعِ حسرت تھی
ٹھنڈی سانسیں بھرتا تھا

(۹)

جس کشتی میں بہتا تھا
ٹوٹی تھی - بے لنگر تھی
جس دنیا میں رہتا تھا
بربادی کا وہ گھر تھی

(۱۰)

جوشِ الفت بڑھتا تھا
موجوں کی طغیانی میں
دریا سر پر چڑھتا تھا
ڈوب رہا تھا پانی میں

(۱۱)

محو ہوا ان خوابوں میں
بھولا اپنی ہستی کو
پایا چند حبابوں میں
ارمانوں کی بستی کو

(۱۲)

کم سن - نازک - اک گلپوش
شرمیلی کن انکھیوں میں
کچھ کچھ خنداں - پر خاموش
گویا میٹھے سانسوں میں!

(۱۳)

سبزے پر - سادہ - یخ پا
دور کھڑی یہ گاتی تھی:-
(کان لگا کر سنتا تھا -
بھینی خوشبو آتی تھی -)

(۱۴)

"الفت جس کو کہتا ہے
"کم ظرفی ہے - دیوانے!
"ہر شے میں وہ رہتا ہے
"وحدت کے سو میخانے

(۱۵)

"ہر ذرّے سے لطف اٹھا
"دنیا کو محدود نہ کر
"خوش رہ - آ تو راہبرِ خدا
"راہِ دل مسدود نہ کر"

سردار انور - متعلم بی اے (علیگ)

کھوانی

وفاکیش، قانع، خدمتگذار کھوانی خدا معلوم اب بھی زینت کالج ہے یا عدم آباد جاچکا
برسوں کی خدمت کے بعد کون ہے جو علیگڑھ رہگیا اور اس ہر دلعزیز شخصیت کو فراموش کر
سکا۔ کھوانی کی سرگذشت خود اُس کی زبانی سنا جو لطف دیتا وہ ہماری سوانح نگاری سے
کہیں بالا تر ہے۔ پان۔ بیڑا پان، کی خوش کُن صدا کھوانی کی آمد پر اُس کے پرستاروں کو
لبیک کہنے پر آمادہ کرتی۔ سرسید کورٹ کے عقبی دروازے اُس کے راز و نیاز سے ہمیشہ
آشنا رہے۔ عموماً یہی راہیں اُس کے تحائف کی درآمد کا وسیلہ بنتیں۔ کھوانی کی شان قناعت
اور استغنا بس اُس کے ہی ساتھ مخصوص تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سوہن لال بھی اُس سے کم نہ تھا۔ مگر
افسوس ہم اُس کو نہ دیکھ سکے۔ سوہن لال کے پاس تو کچھ ٹوٹا پھوٹا نام نہاد حساب کتاب رہتا
بھی تھا اگرچہ وہ سیکڑوں روپیوں کے کارڈ لفافے روزانہ ساکنان کالج کو محض ذاتی اعتبار
پر دیتا اور کبھی کوئی خاص تقاضا ادائگی قیمت کا نہ کرتا۔ مگر ہمارے ہیرو کی شان قناعت اس
سے بھی ارفع رہی۔ ہزاروں مرتبہ طلبا رآتے جاتے کھوانی سے پان کھاتے۔ بہت حضرات کے
نام سے بھی کھوانی واقف نہ ہوتا۔ تاہم نہ حساب تھا نہ قیمت کی ادائگی پر اصرار۔ یہی سلسلہ برسوں
جاری رہا۔ کھوانی سے اگر پوچھیے کہ بھائی تجھکو کچھ مل بھی جاتا ہے تو اُس کا ہمیشہ ایک ہی جواب
ہوتا۔ سرکار آپ صاحبان کی بدولت اور خدا کی دیا سے سب کچھ ملجاتا ہے۔ یہ سب کچھ، اس کی
عجیب وغریب شان قناعت کی کامل تفسیر سمجھیے کون سنگدل ہوگا جو ایسے خدمتگذار کو اُس کے
صلۂ خدمت سے محروم رکھتا۔ کھوانی کا عمل حساب دوستاں در دل، پر اس درجہ تھا کہ نہ وہ
خود کوئی حساب کتاب رکھتا اور نہ طلبا ہی اُس کی اس کمزوری سے کوئی بیجا نفع اُٹھاتے
اُس کا قول تھا کہ اُس کو اس قدر بخشش ملجاتی ہے کہ مال کی قیمت ادا کردینے کے بعد وہ

پین سے روٹی کھا لیتا ہے۔

شدید موسم سرما میں کھوانی کا روئی بھرا سوٹ چوبیں گھنٹے اُس کے نحیف جسم کی حفاظت کرتا، بہت رات گئے تک اُس کے فرائض کی انجام دہی میں اُس کی حفاظت اور اعانت کرتا اُسی قدیم رفیق کا ذمہ تھا۔ کھوانی اگر صاحب فراش ہی ہو جاتا تو مجبور تھا ورنہ طواف کالج اس کو کاشی جی کی جاترا سے کم نہ تھا۔ مسن ہونے کے ساتھ ہی کھوانی کی طبیعت قصہ گوئی اور کسی قدر تمسخر کی طرف مائل تھی۔ وہ دراصل ہمیشہ سے طبعاً خوش مزاج تھا۔ اُس کی طبیعت کی یہ رنگت اس کو ہر وقت تفکرات زندگی سے مستغنی رکھتی۔ اور اُس کے کثیر آقاؤں سے اُسکی ہر دلعزیزی کا خراج تحسین خوب خوب وصول کراتی۔ یہ سچ ہے کہ کھوانی کا کالج سے تعلق بغیر مادی فوائد کے نہ تھا۔ مگر تاہم اس کے کسب معاش میں ایک عجیب شان دلربائی مضمر تھی اُس کو کالج سے حقیقتاً عشق تھا۔ وہ اکثر کہتا کہ میں سرسید کے زمانہ سے طواف کالج میں مشغول ہوں اور جیتے جی اس مشغلہ کو عزیز رکھوں گا۔ با وجود پیرانہ سالی وہ چست و چالاک تھا۔ کرکٹ لان پر، کبھی ہاکی گراؤنڈ پر، جبکہ سرسید کورٹ کی عقبی سڑک پر کھوانی کی جسمانی ورزشیں۔ ون۔ ٹو۔ تھری۔ کی برجستہ صدا کے ساتھ بہت سے متفکر نوجوان دلوں کو فکر و تردد کے شکنجوں سے چھوڑاتیں۔ اثنا ورزش میں کھوانی اپنی طلاقت لسانی اور انگریزی دانی کا مظاہرہ اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ کی پوری تقطیع کو اس فراٹے اور شد و مد کے ساتھ دُہرایا کرتا کہ تماشائیوں کو خوف ہوتا کہ کہیں اُس کے بچے سہے چند دانت باہر نہ نکل پڑیں۔ یا کہیں اُس کی یہ ریاضتیں یکایک اُس کی قلبی حرکت مسدود کر کے اُس کی طفولیت ثانیہ کا ہمیشہ ہمیشہ کو خاتمہ نہ کر دیں۔ اور کالج اس عجیب و غریب دلچسپ ہستی سے محروم ہو جائے۔ تماشائیوں کا یہ خوف ہمیشہ غلط ثابت ہوا۔ کھوانی کی ریاضتیں برابر قائم رہیں۔ کبر سنی اُس کی خوش مزاجی اور دلچسپیوں کو کم نہ کر سکی۔ کالج کے بنگلوں کی مدت العمر خدمت کا صلہ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا۔ اُس کی طبیعت بند غم، اور رنج و تردد کے اندوہناک شکنجوں سے قطعی آزاد تھی، اُس کا

نصب العین ہمیشہ ایک ہی رہا۔

زندگی زندہ دلی کا ہے نام،

مردہ دل زندگی سے وہ بالطبع متنفر تھا اور اس کو اس قسم کی زندگی بسر کرنے والوں کے ساتھ ایک شائبہ ہمدردی رکھنا ناقابل برداشت تھا۔ وہ اپنے فرائض کو خندہ پیشانی کے ساتھ انجام دیتا۔ دوسروں کو بھی اپنی خوش مزاجی کی بدولت شاداں اور فرحاں رکھتا۔ کالج کی شمع کا یہ عجیب پروانہ خدا کرے کہ ابتک زندہ ہو اور موجودہ زندہ دلانِ یونیورسٹی کے لیے سرمایۂ دلچسپی۔ کھوانی کے بعد غلام حسین کا بھی کچھ کم درجہ نہیں۔ اگرچہ ان کی سنجیدہ زندگی کھوانی کی دلفریب صفات سے معرّا ہے۔ کبھی آیندہ ان کا ذکر بھی ضرور ضبط تحریر میں آئیگا۔

سید شفاعت حسین۔ بی اے (علیگ)

غزل

اجل بھی تیری طرح بیوفا نہیں آتی	پکارتا ہوں شب غم کہ آ نہیں آتی
یہ تیرے بزم میں غیروں کی گرموشی ہے	کسی طرف سے بھی ٹھنڈی ہوا نہیں آتی
یہ کیا ستم ہے ستمگر کو روز محشر بھی	خدا کے سامنے جاتے حیا نہیں آتی
ترے مریض سے تنگ آگئے مسیحا بھی	لبے تو راس کسی کی دوا نہیں آتی
ہماری عمر رواں میں ہے شان معشوقی	پلٹ کے پھر یہ کبھی بیوفا نہیں آتی

وہ مست خواب ہے آغوش غیر میں خاموش
مرے لیے کوئی اس کی بلا نہیں آتی

صاحبزادہ عبدالستار بیگ صاحب تیموری (علیگ)

رنگینیِ تخیل

کل سے جی آج ہے بیمار محبت بیکل ‌ ‌ رات کٹتی ہے کسی طرح نہ آتی ہے اجل

بیقراری کا ہے اصرار کہ اب لی نہ قرار ‌ ‌ ناتوانی کا تقاضا ہے کہ کروٹ نہ بدل

ضبط الفت کا ہے ایما کہ نہوں تر پلکیں ‌ ‌ جوش رقت کا اشارہ ہے کہ بھر دے جل تھل

سوز پروانہ یہ کہتا ہے کہ مر بھی کہیں جلد ‌ ‌ شمع کہتی ہے نہیں اور غم ہجر میں جل

آس کہتی ہے کہ جی وعدۂ فردا سے نہ ہار ‌ ‌ یاس کہتی ہے بس اب جسم سے اے روح نکل

عہد بد عہد کا کہتا ہے کہ لے صبر سے کام ‌ ‌ شوق کہتا ہے کہ اس وقت نہیں اسکا محل

جذب کہتا ہے کہ کھینچ اُن کو وہ کتنا ہی کھنچیں ‌ ‌ ضعف کہتا ہے کہ اللہ رے تیرے کس بل

دل کا ہے قول شب آخر ہے ہتالالے لے ‌ ‌ درد کہتا ہے کوئی لاکھ سنبھالے نہ سنبھل

عشق لاتا ہے کوئی شکوہ زباں تک جو کبھی ‌ ‌ حسن کہتا ہے کہ ظالم نہ بہت زہر اُگل

ایسی کچھ آگ لگی ہے کہ الٰہی توبہ ‌ ‌ دل ہی جلتا ہوا انگارہ تو سینہ منقل

جی میں آتا ہے سر شام ہی دیدیجے جان ‌ ‌ صبح کرنی شب غم کی تو ہے اک طول امل

تار اشکوں کا نہیں شام سے ٹوٹا اب تک ‌ ‌ دل پہ چھائے ہیں وہی رنج والم کے بادل

ہو چکی قاصد ناشاد کے آنے سے بھی یاس ‌ ‌ اب تو بیمار ہے بس منتظر پیک اجل

حسرتیں روتی ہیں ارمانوں سے مل مل کے گلے ‌ ‌ کائنات دل عاشق میں پڑی ہے ہلچل

ہچکیاں نزع کی آغاز میں کھنچتی ہیں رگیں ‌ ‌ حل ہو کب دیکھیے یہ عقدۂ مالا ینحل

دیکھتا جو ہے وہ منہ پھیر کے کہتا ہے یہی ‌ ‌ ہو بھی جائے کہیں یہ روز کا قصہ فیصل

اُسی انداز سے بیمار بھی ہے اور نڈھال

جس طرح رات مصیبت کی گئی ہے کچھ ڈھل

صدق جائسی

حُمق

نہ جاننا بھی مزے کی چیز ہے، مگر ایک "عقلِ کُل" کا یہ بھی نہ جاننا کہ "نہیں جانتا کہ وہ کچھ نہیں جانتا" اس سے کہیں مزہ دار ہے۔ ایسا "جہلِ مرکب" میرا خیال ہے، باستحقاق غائر نظر چاہتا ہے، ورنہ صریحاً اس کے یہ معنی ہوں گے، کہ ایک مہربان تو اپنے تفریح بخش وجود سے سوسائٹی کی خاطر داری کرتا ہے، لیکن آپ ہیں کہ دانستہ منہ موڑ کر افسوس! کفرانِ نعمت پر مائل ہیں، بہت ممکن ہے، بعض حضرات یہاں "بے وقوفی" کی بحث چھیڑ دیں، یعنی ایسی زبردست شخصیت کے رشک آور وقار سے منحرف ہو کر ان گنتی کے فردوں کو بھی بے وقوف توبہ! توبہ!! "مستغنی عن الوقوف" کہنے لگیں، لیکن ظاہر ہے، یہ محض حاسدانہ کوتاہ بینی ہوگی۔ اچھا ان کی معذوری کے لحاظ سے قابلِ معافی ہے، رشک البتہ ایک فطری اور کام کی شے ہے، آپ شوق سے رشک کریں، لیکن حاسدانہ نظریں دوڑانی ٹھیک نہیں! اس قسم کی مخلصانہ کوشش کہ آپ بھی ایسے خوبیوں والے ہو جائیں، یقیناً بجا ہے، مگر جان بوجھ کر کسی کے محاسن پر پانی پھیرنا صرف اس جلن سے کہ آپ میں وہ خوبیاں نہیں، خیال کیجیے، کیسی مکروہ بات ہے!

سمجھ میں نہیں آتا، جب یہ مسلمہ ہے کہ انسان جواہرِ عقلیہ سے عاری نہیں، چھپے چھپائے ہوتے سب میں ہیں، صرف علمی سان پر رکھنے کی دیر ہے۔ جگمگا جائیں گے، اور معیارِ عقلمندی بھی ایک من گھڑت چیز سے زیادہ نہیں ہے، تو پھر ایک معصوم ہستی کو "بنا کر" اس کے قول و فعل کا ا دم سے "نامعقول" گردانا کونسی عقلمندی ہے؟! اس کا تو بظاہر یہ مطلب ہے کہ اول تو واقعات کی اصلیت سے انحراف ہو دوم اس بات کا چیلنج دیدیا جائے کہ فریقِ ثانی بھی اخلاقاً اتنا ہی یا بمراتب کچھ اور بڑھ چڑھ کر کہہ ڈالے۔ جو میری دانست میں، بھٹیاریوں کی "تو تو میں میں" سے بھی گری ہوئی اور گئی گزری بات ہے۔

زمانہ کو کوئی ایسا حق حاصل ہے کہ کسی "عقل کل" کے "ارشادات عالیہ" قصور فہم
سے سمجھ میں تو آ سکیں نہ آئیں، لیکن انھیں کو لایعنی ٹھہرا دیا جائے اور بجائے اس کے کہ اپنے
شعور کی کمی محسوس کر کے اس پر نادم ہو، صاحب ارشاد سے گلچھپ ہونے لگے۔ کیوں کہ کون
کہہ سکتا ہے جو باتیں آج موجودہ معیار عقلمندی کی رو سے لچر پوچ سی ہیں (صرف اس لیے کہ
سمجھ میں نہیں آتیں!) کل بھی ان کے ساتھ ایسی ہی بے توجہی برتی جائیگی، سمجھنے والے پیدا ہی
نہوں گے! جبکہ زمانہ کا ہر قدم آگے کو ہے اور کائنات کی جملہ اشیا اپنے درجۂ کمال تک
پہنچنے کے لیے جلد از جلد ارتقائی کینچلیاں بدلتی جاتی ہیں، اس استدلال کا گو "رُخ تیر گوں"
بھی ممکن ہے، یہی کہ آج کی لچر سی چیز کل لچر (؟) ہو جائیے، لیکن ظاہر ہے، بحالت موجودہ یہ محض
پیشگی تنگ خیالی اور "حسن ظن" کا صریح فقدان ہے! جسے پست نظری اور کم ہمتی کی کھلم کھلا
"بدمزاقی" اور ایک "اشرف المخلوق" کی نسبت سے علی الاعلان "بد توفیقی" کہیے! جو کسی حال بھی
خوش گوار نہیں ہو سکتی،

سوسائٹی کی یہ سنت دیرینہ بھی عجیب غیر ضروری اور پیچ ہے، کہ جہاں تک ہو سکے اپنی "بیوقوفی"
دوسرے کے سر تھوپتے رہیے دوسرے کو بیوقوف کہنا گویا اپنی عقلمندی کی نشانی ہے۔ ظاہرا
اس میں دعوے کی یہی وجہ معلوم دیتی ہے کہ اعترافِ "بے وقوفی" میں شائبہ ندامت گھلا
ملا ہوتا ہے -- اور ندامت کا احساس ایک طرح کی اخلاقی کمزوری خیال کیا جاتا ہے، "بے وقوفی"
کا دائرہ ضمیر واحد و جمع حاضر تک محدود ہو کر رہ گیا، گو زمانہ نے "ضمیر متکلم" کے گلے پر چھری رکھ دی
یعنی کل کی بیشتر عقلمندیاں آج اسی نسبت سے "بے ہودگیاں" ہیں، جس نسبت سے کہ کل کی
بہت سی بے وقوفیاں، آج علم و حکمت کے عنوانات ہیں، تاہم سوسائٹی اپنی غیرت مندی
کو کس طرح صدمہ پہنچا سکتی تھی، کہ اپنی روش خاصہ چھوڑ دیتی - اس کے کان پر جوں بھی نہ چلی!
ذرا دیکھیے گا، ایک آرٹسٹ، سائنٹسٹ، یا شاعر بیشتر متحرفانہ جانا پہچانا گیا ہے، کیوں؟ کہ
عام سطح خیال سے اونچا تھا، جس کی یہ غیر معمولی اُڑان، تاریخ شاہد ہے، بسا اوقات دوان

بن اور بہکی بہکی باتوں پر عمل کی گئی، صدیاں ہی گزریں کہ اس کے عقلی وادراکی سوتے ہمارے ا ر
کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اور جب لکھیں عوام میں، اتنا علمی مذاق رچ گیا کہ اپنے دماغی جمود کو حرکت
دیکھئے تو آج اسی کے عقلی بچپن کے کارناموں کو بے گنتی صفحوں پر پھیلانا "فرض عین" قرار دیا گیا ہے!
یہ سب کچھ ہوا اور ہوتا جاتا ہے، لیکن سماجی باچھیں اب بھی آنکھیں بند کرکے
کہنے میں کھل ہی جاتی ہیں! اللہ رے غیرتمندی!

غرض سماج کے اس رویہ نے عموماً کیا نقصان اور خصوصاً کیا فائدہ پہنچایا، تفصیل طلب بحث
ہونے کے علاوہ اس جگہ غیر متعلق بھی ہے، چنانچہ قلم انداز کر دی گئی، لیکن اس کا سب سے
بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے بیسیوں باہمت "عقلمندوں" کی بڑھتی ہوئی امنگوں کو پامال کر دیا
جس سے وہ غریب اتنے تُل رہے ہیں کہ کم از کم "لیڈری" سے بھی انھیں ہاتھ دھو لینا پڑا، حالانکہ اک
"لیڈر" کی جون اختیار کر لینا آج جس طرح "مبادیاتِ ترقی" میں داخل ہے، سہل الحصول بھی تھا
ہے، "لیڈری بھی کیسی؟ جس کی صاف سے صاف اور ساری منطقی موشگافیوں کے ساتھ سا
یہ تعریف کی جاسکتی ہے، کہ انسان دوسروں کو الّو بنا کر (معزز حضرات لیڈرز معاف فرمائیں!)
اپنا الّو سیدھا کرتا ہے! -

مبادا قارئین کرام اس تمہیدی بھول بھلیوں سے چکرا جائیں، اور ان کی Latent
heat بجائے ہنسی کے غصہ کی صورت میں نمودار ہونے لگے! وہ یقین فرمالیں کہ بھول
بھلیوں کا ہیر پھیر ختم ہوا، مگر ساتھ ساتھ اسقدر اور بھی خواہانہ گوش گزار کر دینا خلاف موقع
نہ ہوگا کہ عنوان مندرجہ کی "شرافت" اور اس کے سایہ میں ایک غیر معمولی "شخصیت" کے چند
واقعات بھی یکجا جگہ پا سکے نہایت شرافت آزما ہیں! یعنی ان میں سے بہت سی باتیں "عامیانہ"
سطح خیال سے اونچی ہیں، لیکن جیسا کہ تمہید میں باربار عرض کر چکا ہوں۔ ہمیں کوئی حق نہ ہوگا
کہ انہیں لچر کہکر ناک بھوں چڑھالیں، نیز شرافت نفس کی رو سے یہ بھی اخلاق سے گری ہوئی بات
ہوگی کہ ایک شخص کی "حکیمانہ" دماغ سوزی ہماری سرسری نظر کی بھی مستحق نہ ہو! یہ سچ ہے، کسی

شے کا سمجھ میں نہ آنا بڑی حد تک مایوس کر دیتا ہے لیکن ہمت ہار دینا بھی تو اصول ترقی کے بالکل منافی ہے! امید کہ کوشش سے مُنہ نہ موڑا جائیگا!!

ایک "مرزا پھویا" ہیں جن کی ہستی دنیا کے لئے باعث یا کم از کم دلی میں تو وہ اس مقولہ کے ٹھیک ٹھیک مصداق ہیں، (اپنی تن تنہا ذات فرسودہ تو بہ استو دہ صفات کو خاندانی خصائص کی (جنھیں شرافت کا نچوڑ فرماتے ہیں) نمائش اور نمایندگی کا واحد وسیلہ قرار دیا ہے۔ ہر نیازمند جسے پہلے ہیں شرف باریابی حاصل ہوا ہو، اس قسم کا "اقرار صالح" کرنے پر مجبور ہوتا ہے، کہ جاتا وہ موصوف کو "بد نام کنندہ نکو نامے چند" نہ خیال فرمائے (مشہور کر لگا) مطلب کیا انھیں بھی اچھے گھرانے کا ایک سعادت مند فرزند کہیے۔ واقعی سعادتمندی کی حد ہوگئی، بزرگوں کی "ناک" اتنی حفاظت سے تو رکھی جائے! اس عہد کی بار بار توثیق بھی کی جاتی ہے، یعنی تاوقتیکہ اپنے ہر "فاضلانہ قول و فعل پر "نیازمندان ادب" کی رائے صائب (جس کا تائیدی ہونا بھی لازمی ہے) نہ لے لیں، تنکا نہیں توڑتے، مبادا کسی سبک و جاہل نکتہ چینی سے واسطہ پڑ جائے اور "نکو نامے چند" والی سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل جائے!

موصوف کی ایک خصوصیت "فلسفۂ پدری" کی تلقین ہے جس کا درس ہماشا سب کے لئے باعث تبریک فرماتے ہیں! اُن کا خیال ہے ہر شخص "پدرم سلطان بود" کہنے کا اسی نسبت سے مستحق ہے، جس سے کر وہ اپنے صحیح النسب ہونے کا یقین رکھتا ہے۔ اس کا احساس ہے کہ علم، ذہانت، ذکاوت کی واقعی (؟) میراث کیا معنی کچھ بھی نہ مل سکا، تاہم ممدوح کا یہ کہنا ہے کہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہو سکتا کہ حقیقی باپ دادا کے صلبی بیٹے پوتے ہونے سے بھی خواہ مخواہ ہاتھ دھو لیا جائے، کسی بیٹے یا پوتے کا تمام اوصافی پہلو سے لایق باپ دادا کا ہو بہو چربہ نہ ہونا، اس کا مقتضی نہیں کہ مجہول النسب بن کر وہ "فلسفۂ پدری" کے ورد و تو ظیف سے بھی بے بہرہ رہے! چنانچہ اسی عیب کے زائل کرنے کی خاطر موصوف نے دادا آدم سے لیکر اپنے نامِ نامی تک "شجرۂ طیبہ" ترتیب دے رکھا ہے، جسے اپنے بیگانے سب

ہی کو تو بطور تلاوت دو زانو ہو ہو کر سُنا دیتے ہیں یقین تھا، موصوف کی عقل رسا ان موجودہ
مدوں سے بھی انھیں پار لے جاتی لیکن اُدھر ماورار" دادا آدم سلبی تانتے کو طول دیتے ہوئے
زندیقی کی کھائی سے بدک گئے تو اِدھر خود کے "ایثار" (؟!)، سے خاتم خاندان کا رتبہ مل چکا
تھا، لہذا چپکا ہو جانا پڑا، ورنہ ضرور تھا کہ فلاں ابن فلاں کا کچھا اور دکھڑا رو دیا جاتا! اِس
طولانی شجرہ کے ناظرین کی ذہنی تکان کے ازالہ کی خاطر خاتمہ پہ تفنن طبع کا لطیف سامان بھی
مہیا کر دیا ہے، یعنی اپنا ایک زندہ جاوید شعر مزین کیا ہے، جس سے ممدوح کے ادبی مذاق کی
معنوی پرچھائیاں ایک دم سے آنکھوں کے روبرو آجاتی ہیں، ارشاد ہوا ہے کہ ؎

" ہم بھی ستے کبھی امیروں میں   اب ہو گئے سب کے نیچے غریبوں میں"

سبحان اللہ! کس سادہ طریقہ سے "واردات قلب" کا اظہار کیا ہے! سچ پوچھیے تو روشن
خیال ناظم نے ان معمولی سے دو مصرعوں میں گہرا، اعلیٰ اور فلسفیانہ رنگ جس نئے ڈھنگ
اور نرالی شوخی سے کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ میرے آپ کے اعتراف سے بے نیاز ہے
پھر لطف یہ ہے اوزانی لحاظ سے بھی ہر دو مصرعے گنگا جمنی! مصرع ثانی کے تین لفظ "سب
کے نیچے" کے سلجھے ہوئے ذریعہ سے تو جس برجستگی کے ساتھ ذہن کو "درجہ اسفل" کی جانب مائل
کیا ہے، واقعہ یہ ہے، دماغ پر زور ڈالنے کی حاجت ہی نہیں ہوتی، نہ یہ معلوم دیتا ہے
کہ ناظم کو اظہار خیال میں کچھ اہتمام کرنا پڑا، میں نہیں جانتا منفرد ایک یہ شعر ہی دنیا کے
منتخب لٹریچر کے اعلیٰ مجموعہ میں کونسی جگہ پانے کا مستحق ہے!

سب سے زیادہ اہم بات موصوف کی "خوش بیانی" ہے جس میں نون غنہ کے استمراری
نغمہ کی آمیزش ہر ہر لفظ کو موسیقی کے تحفہ سانچہ میں ڈھالتی رہتی ہے، پھر یہ وصف اکتسابی
نہیں، وہبی ہے، قدرت سے خود موسیقارانہ اُتار چڑھاؤ کی تحفگی حصہ میں آئی ہے، ناک کا پھننگ
پر گادو دم پن، بیچ میں شکاری زین کے مانند یک قلم ڈھلاؤ، پھر بھوؤں کے قریب جا کر اُس کا
بے تحاشا ابھار جس میں دائمی نزلہ کی وجہ سے بار بار "سٹر سٹر" والی آواز کچھ ایسے لطیف تصورات

ہیں، کہ ظرافت کے رجحان میں بے ساختہ گدگداہٹ ہونے لگتی ہے! اگر یہ واقعہ ہے یہ صنف بیان زیادہ کر کے نظم کے لیے مختص کر دیا گیا ہے، نثر ہمیشہ تیز رفتاری کے گھوڑے پر سوار رہتی ہے، ذہن اس طرف مائل ہو سکتا ہے کہ موصوف کو پورے جملے کی ادائیگی میں زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ درکار ہوگا، راقم کی یہ رائے ہے کہ لیسے جومیٹری والے نکتہ کی طرح جتنا ظنی تصور کیا جائے، اُس کی صحیح صحیح تعریف ہو سکے گی! مادیات میں پنجاب میل، شہاب ثاقب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مگر اصل یہ ہے کہ یہ بھی سمجھوتہ ہے ورنہ کہاں وہ مولوی "مدن" کی رفتار گفتار اور کہاں یہ دھوکی سی تعبیر "چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک"!

پہلے پہل راقم سے جو گفتگو ہوئی، اُس کا پہلا فقرہ تفریح طبع کے لیے عرض کرتا ہوں "آپ سے ملنے کو مدت سے جی چاہتا تھا، آپ کب آئے"؟ آپ سے . . . . آئے "تک کے صرف تین لفظ کو ضرور شرمندۂ فہم ہیں، ورنہ باقی سارے لفظ وہ صاحب ایک سانس ہی میں تو اس طرح اُگل گئے کہ میں منہ دیکھنے لگا، اور مشکل ہی سے پتہ چل سکا کہ کہنا کیا چاہتے تھے، گویا آغاز اور انجام کلام دو مُرادِفُ لفظ ہیں، مابعد کی تین ملاقاتیں بھی لطف سے خالی نہیں، وہ مطالب بیان ہوئے کہ عقل دنگ تھی، اور پھر برق صنعتی کا یہ عالم کہ ہر مرتبہ کیا مجال جو سننے والے کو تکرار کلام کی تمنا نہ رہی ہو، جس کی تفصیل بخوفِ طوالت مجبوراً ترک کر رہا ہوں، سچ ہے "ایں سعادت بزور بازو نیست"!

ممدوح ایک "تک بند" لاحول ولا! ایک سخن سنج شاعر بھی ہیں اور ایک "بے بدل" منشی بھی، ظلم ہوگا، اگر قارئین کرام کی ضیافت مذاق کے خاطر اُن کے فاضلانہ تراش خراش والی نثر و نظم کے منتخب نمونے ملاحظہ نہ پیش کیے جائیں، ورنہ کیا فائدہ کہ راقم کے عرض کر دینے سے صرف "ایمان بالغیب" کی حیثیت سے کوئی رائے قائم کر لی جائے! راقم کا تو یہ عقیدہ ہے کہ موصوف کا گیا گذرا کلام بھی آج ثانی نہیں رکھتا، لیکن فرصت کسے اور کس میں اتنا دم خم رکھا ہے جو پورے کلام پر جلد توصیفی رکھ رکھاؤ کے ساتھ نظر ڈال سکے راقم صرف چیدہ

اشعار، جو حسنِ اتفاق سے ہاتھ لگ گئے، ابھار کے دکھائیگا، "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطّار می گوید" یہ خود ہی ظاہر ہوجائیگا، کہ لٹریچر میں اُن کا کیا پایہ ہے۔ نیز یہ کہ اُتر تا چڑھتا دوسرا کلام کیا مرتبہ چاہتا ہے۔

مرزا صاحب کے جملہ کے جملہ کلام پر تنقیدی نظر ڈالنا اصل یہ ہے بچوں کا کھیل نہیں، یا کم از کم راقم تو، جیسا عرض کرچکا ہوں، اس سے یقیناً عاجز ہے، قطع نظر اور مشکلات کی بڑی مصیبت اس میں ہے کہ اول تو وہ "اینٹ الیجا وہ" جسے موصوف دیوان فرماتے ہیں، مقفل رہتا ہے، اور یہ جکڑ بندی صرف اس وجہ سے ہی نہیں کہ سرقۂ مضامین کا انھیں دھڑکا ہے، بلکہ رونا اس کا ہے کہ عام حضرات کا بھونڈا اور گرا ہوا مذاق موصوف کے طبع زادوں کی پرستش اور ستائش سے قاصر ہے، جس کی اکثر کرکے انہیں شکایت ہے، دوسری اور سب سے بڑی دشواری ان کی "حرکات بالحروف" ہیں، جنھیں صرف چند اختراعی علامتوں کے سوا کچھ کہہ سن دنیا ان کی اصلیت سے صریحی انکار کرنا ہے، جدتِ طبع چاہتی، کہ رسم الخط کے اصول موضوعہ میں سے کوئی اصول بھی وہ صاحب اپنے کام میں لائیں، یہی وجہ ہے، کہ موصوف کے "مخلوقات حرفی" کے جب درشن ہوتے ہیں، نرالے رنگ اور روپ میں! اُس پر اضافہ کیجیے موصوف کی دقتِ نظری اور بلند پروازی تو باوجودیکہ انسان اپنی ساری ذہانت و فراست کے بوتہ پر اُن کے اعاظم معانی اور نازک نازک فلسفیانہ بحثوں کی گتھیوں کے سلجھانے کا دعویٰ کرے کیا مقدور جو ذرا ٹس سے مس ہوجائیں، اور یوں بھی کیسے؟ "یہ طبع خداداد" کے نتائج افکار سننے والوں کے دماغ میں بقول موصوف "گوبر بھرا ہوا" پھر موصوف کی سطح مذاق عالم بالا کے متوازی سننے والے کا "گودڑی دماغ" ان عالیہ مطالب کے سمجھنے بوجھنے سے عاجز، آخر بے جوڑ چیزیں میل کھائیں تو کیونکر؟ آپ عام مذاق کو بہتیرا سہارا دیجیے کر ابھار دیجے گا، مگر موصوف کے کمالِ مذاق کے آگے وہ تو گرا ہوا ہے ہی گا۔ غرض ان تمام مصیبتوں کے باوصف بھی طبیعت نے گوارا نہ کیا، کہ ایسی رو دار شخصیت سے پبلک روشناس نہ ہو، ساتھ ساتھ

اس کا اعادہ بھی ضروری ہے، کہ یہ چند کلمے بحیثیت تقریب (Introduction)
جو عرض کر رہا ہوں، حاشا اشتہاری نہیں، اور نہ مہربانی سے اشتہاری خیال فرمائے
جائیں، بلکہ مقصود اس سے صرف اسی قدر ہے کہ ایک مربیٔ اردو کی عوام سے بیگانگی دُور
ہو جائے، ورنہ موصوف کے "جواہر ریزے" بقولِ خود "اشتہاری" شاعری سے بے نیاز
ہیں ان کی علو مرتبت اور متانت تالیف قطعاً اس کی روادار نہیں کہ "موجودہ زمانہ" جیسا وہ
فرمایا کرتے ہیں۔ "اس سے بہرہ مند ہو" کیوں؟ کہ ممدوح کا یہ کہنا ہے فی الحال کسی میں (سوائے
موصوف!) سمجھ کا مادہ ہی باقی نہیں رہا قرنہا قرن کے بعد شاید زمانہ آئے تو آئے کہ اس
شاعری کی منزلت ہو سکے، اور عجب نہیں یہی زمانہ ہو کہ جب بھی موصوف ہی (Rebirth) کے مسئلہ
کی رو سے "بزرگوار ثانی" کے "متورعین" بنکر آئیں اور اس کلام بلاغت التیام کو سمجھیں!
اپنے ایک "لنگوٹیا" دوست کو جن سے ایک زمانہ تک گاڑھی چھنتی رہی، فارغخطی دینا چاہتے
ہیں، اسباب تحریک تو پورے طور پر معلوم نہیں، اتنا پتہ چل گیا ہے، کہ کسی "بناتنے" کی لے
دے میں اَن بَن ہو گئی تھی، چنانچہ "فارغخطی نامہ" جس نرالی طرزِ ادا سے گلفشانی کی ہے،
اس کے چیدہ چیدہ مقامات نمونہ نثریہ کی حیثیت سے عرض کئے جاتے ہیں —
فرماتے ہیں:- کرم کرنے والے لنگوٹی من سلامت" سبحان اللہ اردو کی ایک سکھی زبان
کو دیکھیے، یہ سلیقہ تحریر اور فارسی عربی کی پیوندکاریاں دیکھیے! خدائے تعالیٰ نظر بد سے
بچائے! میرے خیال میں تو دنیا کی ساری زبانیں ایسے نایاب اور اچھوتے ادب سے
تہی دست ہیں اس القاب آداب کے بعد ہی خطاطی کے مختلف نمونے اس اہتمام سے
شروع ہو گئے کہ حال تو خیر کیا، گزشتہ زمانہ بھی نظیر نہیں پیش کر سکتا۔ ہر حرفِ خود اپنا نمونہ
تھا۔ غرض نصف صفحہ کی قلم فرسائی کے بعد پھر یہ زبان "اُردو" یوں پھول جھاڑے:-
"میں آج سے دوستی ترک کرتا ہوں اور مضمون نثر نظم" لکھتا ہوں، (یہ پہلے طویل متعصبانہ
القاب کے بعد قلم سے نکلے جسے سمجھنا تو درکنار، افسوس! نقل بھی نہیں کر سکتا!)

میں خود نہیں توڑتا، البتہ دل دوستی توڑتا ہے" "دوستی چینی ہی تو دل شیشہ ہے" (بل بے بوڑھے بچے "تیری نازک بیانی!) اس میں مجبور ہوں، دگرنہ" "کوئی آپ کا دشمن ہوتا، جان و دل نظر کراتا، کیونکہ" "انسان کو ہمیشہ اپنے سے زائد عمر والے سے دوستی کرنی چاہیے" "کبھی چھوٹے یا بڑے سے دوستی ہی نکرے (اس طبع جملہ کی" باریکی پوری توجہ چاہتی ہے!) کیا آپ صدق دل سے" "دوستی ترک نہ کر دینگے، ورنہ مجبوراً مجھے سرکاری کمشنر صاحب" "کو عرضی دیگر ساری باتوں کو تشہیر کرنا پڑیگا" (عرضی کا ہے کو وہ تو جبر مجرمانہ کا استغاثہ ہوگا!) "دوستی کی بائیکاٹ کے لیے تھوڑے سے بنائے ہوئے" "آخری شعر بھی پڑھ لیجیے"

طویل تحریر میں سے جیساکہ اوپر عرض کر چکا ہوں یہ چیدہ حصہ ہے، اور جسقدر صاف ستھرا ہے، ناظرین کرام سے پوشیدہ نہیں، طوالت کے خوف سے مزید تنقید قلم انداز کی جاتی ہے، حصۂ نظم کو تو آگے دیکھیے گا، مگر خاتمۂ "گرامی نامہ" پر ایک "مربع نما" "نوحۂ دوستی" کے عنوان سے معنی خیز جو نظم ہوئی ہے، اس سے لطف اندوز اور ہوتے چلئے!۔ اس میں دو مصرعے" ایسی اُلفت کو تو" ہے میرا اسلام۔ ایسے ہمدم کو تو ہے میرا اسلام" استائی یعنی بطور (Refrain) ہیں ارشاد ہوا ہے کہ:۔

مربع نما نوحۂ دوستی

۱۔ عیش میں جن کی گزرتی تھی مدام — مٹ گئے اُنھیں خاندانوں کے نام
ایسی اُلفت کو تو ہے میرا اسلام — ایسے ہمدم کو تو ہے میرا اسلام
۲۔ کیے احسان جو کچھ دلبہ روشن ہیں میرے — صبح شام تم نے اُجالے اندھیرے
ایسی اُلفت " " " " — " " " " "

۳ - آپ کی اس دوستی کی کچھ مجھے پرواہ نہیں		اب مجھے کرتے ہیں سب امرا رسلام

- - - - - - - - - - - - - - - ایسی الفت

---

۴ - تم نے میری قدر نہ جانی افسوس		تم امیر ہو تو میں ہوں مفلس جناب

- - - - - - - - - - - - - - - ایسی الفت

نوٹ - (توقع کہ ناظرین کرام یہ یا دوسرے اشعار کی "تلاوت" کے وقت استمراری "نون غنہ" کی آواز کی پوری طرح ادائگی کا لحاظ فرمائیں گے - تاکہ ایک حد تک توصیح خاکہ کھنچ سکے!)

ناظمانہ حیثیت سے یہی کیا، رباعی، تاریخ، سہرا، راسوخت، تضمین، محاکمہ، رزم بزم، تشبیہ و استعارہ، وصل (ہجر) حیت ن و معاملہ بندی شوق وانتظار، ناز و نیاز، تحسین، تمثیلات، سراپا، غرض کوئی صنفِ کلام نہیں جو اس شاعرِ "نغز گو خوش گفتار" سے چھوٹ گئی ہو ہر شے میں طاق! اوپر والی نظم "مشتے نمونہ از خروارے" کی حیثیت سے بتاتی ہے، کہ دوسرا کلام بھی اسی قبیل کا ہوگا، لیکن ناظرین کرام اطمینان رکھیں، میں ان چند اشعار پر ہی مضمون ختم کرکے اُن کی ضیافت مذاق میں حارج نہوں گا! افسوس یہ ہے کہ نہ تو ممدوح کا پورا دیوان ہاتھ لگ سکا - اور بدقسمتی سے نہ مجھے فرصت ملی ہے، ورنہ امکانی کوشش ہوتی کہ ایسے خوش آب موتیوں کو توسطِ "قرطاس" پہ بلا انقطاع سلسلہ بکھیرتا ہی رہوں -!

موصوف کے شاعرانہ رجحان کا یکایک حرکت میں آنا بھی لطف سے خالی نہیں، استاد داغ مرحوم کا "گلزار داغ" جو ابھی حال ہی میں طبع ہوا ہے، سامنے ہے، لیاقت خیال اور روز مرہ کی نسبت احباب میں لے "د و قدح ہو رہی ہے کہ موصوف وارد ہوئے" شجرۂ طیبہ" کی سرسری تلاوت کے بعد بحث پر ہی کا اظہار کیا، اور فرمایا داغ بھی کوئی شاعر تھے، ان سے کہیں بہتر

ملائی، اور یہ اسی طنطنہ میں "مضمحل" "سہانا تخلص رکھکر، چلو شاعر بن گئے، مگر یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں، اپنے ہاں کے شاعروں میں، غور کیجیے گا، تو بیشتر حصہ ایسے ہی زبردستی کے۔ "برساتی" شعرا کا ملیگا، یعنی حشرات الارض کی طرح گلی بہ گلی بھنبھناتے پھرتے ہیں! استعداد کی یہ حالت کہ پرانی دقیانوسی ایک آدھ فارسی کی کتاب (آمدنامہ!) رٹ لی اور پھر عروض کا سلسلۂ درس شروع کر دیا بالآخر کتاب تو ختم ہو گئی، مگر شاعر صاحب ہیں کہ کولو کے بیل کی طرح جہاں تھے وہیں رہے! ہاں، ایک آدھ قافیہ کہیں سے سن پایا، یا خود رو طریق سے ذہن ابھرا، کہ ان صاحب نے بے غایت مصرع موزوں کیا، حتیٰ کہ مصرع ابتدائی کی تک بندی کے لیے بے ہنگام "بڑ" شروع کر دی! گاتے گاتے انسان کلاونت ہو جاتا ہے، یہ کہتے کہتے اپنی جانم میں شاعر بن گئے! القصہ یہ کہ حضرت مضمحل نے بھی شاعری شروع کر دی، چنانچہ پہلے ہی چند قطعات (یا واللہ علم کیا بلا ہیں!) "شبرات نامہ" "رمضان نامہ" اور "عید نامہ" کے پھڑکتے ہوئے عنوانات سے ظہور میں آئے۔ صرف یہ قطعات ہی توجہ سے دیکھ لیجیے، اور مجھے یقین ہے، اگر آپ معاصرانہ جلن کی وجہ سے امساک نہ برتیں تو جس حد تک یہ تین اور سلجھا ہوا لٹریچر آپ کے مذاقِ ادب کو اُبھارے گا میں مایوس ہوں کہ اتنی بلند نظر نہیں ڈال سکتا۔ اور نہ صاف صاف بتاتا۔ کہ صرف یہ نمونہ ہی کس قدر تحمل کر داد چاہتا ہے، یہ لکھ رہا ہوں لیکن دل ایک دوسری چیز میں ہے، جو اپنی طرف کھینچے لیتی ہے "دولہا کا سہرا" آپ نے بیشتر سُنا ہوگا، یہاں جدت طبع نے عوام کے چبائے ہوئے لوالے کو نگلنا پسند نہیں کیا، "دولہن کا سہرا" کہا ہے، اس کے موقعی خصوصیات سے تو بحث نہ رکھیے، نہ میں خود مصلحتاً عرض کرونگا۔ کیونکہ جس منحوس گھڑی یہ سہرا پڑھا گیا تھا۔ موصوف کو "داد مخصوصہ" کی اسقدر ناگوار زحمت اُٹھانی پڑی بس توبہ ہی بھلی ہے! پہلے سہرا سُن لیجیے۔ پھر علی الترتیب قطعات عرض کرونگا۔

دلہن کا سہرا

ہو کے تیار گلستاں سے جو آیا سہرا
مل کے پھولوں نے مری دلہن کا سجایا سہرا

کونسی مالن پیاری نے سجایا سہرا
نقدِ دل پیش کروں جس نے بنایا سہرا

اک مچا شور سرِ بزم میں اللہ اللہ
پیاری مالن نے دلہن جانی کا بنایا سہرا

کیوں نہ مضمحل دلہن کو خوشی آج کے دن
کہ تو دل و جان سے لایا ہے کتا سہرا

شبرات نامہ

مچ رہی ہے دھوم کیا عالم میں جانِ شبرات کی
ابھی تصدیق کر لو چاہے جاں شبرات کی

پھلجڑی چھتایاں چھٹیں گی آج کے دن
کیونکہ گھر گھر ہے خوشی شبرات کی

"وعدہ" اس نے کیا ہے شب کو ملنے کا ضرور
کیوں پھر "خوشیاں" منائیں مضمحل شبرات کی

اللہ رے نازک خیالی، حرف حرف سے شوخی ٹپک رہی ہے!

رمضان نامہ

رمضان شریف کے زمانے میں
جو کوئی کھائے پیے ہے حرام

"ترابیاں" پڑھ کے جو آئے ہم شام
تھک کے سو گئے تھے چوراہم لا کلام

مضمحل تو داغ ثانی ہے
لوگ خواہ مخواہ کرتے ہیں بدنام

حسن کلام کے ساتھ ساتھ الفاظ کی تلاش بھی لائقِ داد ہے، نیز واقعات کو قلمبند کر دینا تو اُلٹے ہاتھ کا کھیل ہے، جناب کا داغ ثانی بلکہ بدنصیب اُردو کے لیے داغ ملامت بننا اصل یہ ہے، حضرت مضمحل کا ہی حصہ ہے!

(نظم تک بندی میں)

عید نے روزوں کو کل رخصت کیا — پھر مسلمانوں نے میٹھا منہ سویّوں سے کیا
عید کے جا پہنچو گھر اُس صنم کے مضمحل — جس نے تجھ سے وعدہ "شب کے ملنے کا کیا"

کیا خوب ایک ایک حرف آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے "تیس" دن کی "قید" (؟!)
یعنی۔ ہجر یار، کے بعد ذکر وصال، لیکن نیت سویّوں میں ہے!

اس کے علاوہ بھی بہتیرے بیش بہا جواہر پارے ہیں :—

شب کو لی میں نے جو کروٹ تو بگڑ کر بولے — کیا غضب کی یہ تمہاری ابھی انگڑائی ہے
میرے ڈسنے کے لئے آئے وہ ناگن بن کے — اس لیے تجھ سے خدا میری دہائی ہے
مضمحل کون سنے گا تری غزل بزم سخن میں — لوگ کہہ دیں گے کہ ہنس کے یہ سودائی ہے

دیگر

مقابل غیر کے ایک صورت پیکر چاہیے اُن کو — کوئی تصویر گھڑ دی صورت خنزیر تیتر کی

دیگر

بے حجابانہ وہ آیا آج بزم غیر میں — مے کشی کی بزم سے بوتل چرا کر لے چلا
آنکھ کے پردوں میں ظالم تو چھپا کے لے چلا — میرے دل کو اپنے دامن میں چھپا کر لے چلا
گل "رانا" نے اب جوڑ کر رکھا ہے زیب تن — اس لیے میں اُن کی خاطر عطر کا کنستر لے چلا
ہو گی مجھ پر عنایت اُس صنم کی مضمحل — خود بخود وہ "گلبدن" مجھ کو ہنسا کر لے چلا

دیگر

میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا — تو جل کر دشمن نے اسے بجھا دیا
پوچھا میں نے ان سے انکے گھر کا پتہ — تو اشاروں سے انگلی کے "جہاں" کو بتا دیا

دیگر

دیکھ صورت چاند سی جب فدا ہو جائیگا ۔۔۔ ایک دم میرا دل مجھ سے جدا ہو جائیگا
کھود دیوانے میری وہ نہ آئے قبر پر ۔۔۔ گر اٹھا تعظیم کو محشر بپا ہو جائیگا
زندگی میں داغ کی مضمحلؔ کسی نے یوں کہا ۔۔۔ ابھی آپ کا ثانی کوئی دوسرا ہو جائیگا

دیگر

ہو گئے اک دم فدا ان کو مسکتا دیکھ کر ۔۔۔ جیسے گل ہوتا ہے خوش بلبل چہکتا دیکھکر
جائیں گے وہ قتل گہ میں قتل ہونے کے لیے ۔۔۔ اس لیے احباب رہ گئے سرخ کرتا دیکھکر
مضمحلؔ سونچکر تو لکھا کر اپنی غزل ۔۔۔ لوگ ہنس دیتے ہیں مصرعہ گھٹتا بڑھتا دیکھکر

اللہ رے احساس! اتنی اتنی سی باتوں کا بھی تو خیال ہے!

غرض حضرات! یہ ہیں وہ مربیٔ اُردو جو ایک عمدہ ناثر، اچھے شاعر ہونیکے علاوہ اور بھی بہت سی خوبیوں والے ہیں آپکا وطن مالوف انوپ شہر نزد سکندر پور ہے! کچھ عرصہ سے بدنام دلی کو اس طرح نیک نام فرمارہے ہیں، کہ دلی بلی ماراں میں فکرِ معاش کی ساتھ ساتھ فکرِ سخن بھی فرماتے رہتے ہیں، ذہانت اور فراست کے متعلق خود انکا کلام اپنی ضمانت ہے، جو آپ دیر ملاحظہ فرما چکے ہیں، اس کے بعد سمجھتا ہوں کہ فرضِ تقریب سے میں پورے طور پر سبکدوش ہو چکا ہوں، دو جملے اور ہیں، ممکن ہے بعض حضرات، اشعار کی غیر موزونی، یا مصرع کا "گھٹتا بڑھنا" ممدوح کی "بد مذاقی" پر محمول فرمائیں، لیکن بات یہ ہے، یہ قوت آخذہ کا زور ہے، آمد کی رو میں یہ آنکھیں بند کر کے کہہ جایا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جملہ اشعار آپ کو گنگا جمنی ملیں گے! لیکن خیال کی پاکیزگی لفظ لفظ سے پڑی ٹپکتی ہے!

یہ لکھ رہا ہوں، لیکن بار بار حق تلفی کا خیال سامنے ہے یعنی استعدر جگر کاوی کے بعد بھی موصوف کو داد نہ ملی! زمانہ بھی افسوس! عجب "مردہ پسند" واقع ہوا ہے، کہ جیتے جی داد ملنی بھی دشوار ہو گئی، خیر، مجبوری سب کچھ کراتی ہے، میرا دوستانہ مشورہ تو یہی ہے، کہ اپنی دماغ سوزی اور جگر کاوی کی موصوف پوری پوری داد چاہتے ہیں، تو خیر سے اب سدھاریں! اسلئے حد تک ان کی خدمات سے امید سے زیادہ ہیں، ایسی صورت میں خاکسار راقم تو اس مخلصانہ خدمت سے نہ باز نہیں رہسکتا کہ موصوف کے لیے قلتِ عمر کی دعا نہ کرے!!

سید وزیر حسن